امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے سوانح علمی و عملی شاہکار
سیاسی افکار، دینی نظریات اور تحقیقات و تفردات کا بسیط جائزہ

حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری

بیت الحکمت دیوبند

باسمہٖ تعالیٰ

خضر کی صورت رہا جو جادہ پیمائے حیات
وہ جلالِ علم ہے تاریخ میں "نقشِ دوام"

نقشِ دوام

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری

کے

سوانح، علمی و عملی شاہکار، سیاسی افکار، دینی نظریات

اور

تحقیقات و تفردات کا ایک بسیط جائزہ

از: انظر شاہ مسعودی

شاہ بک ڈپو، دیوبند۔ (یو، پی)

نام کتاب :۔۔۔۔ ”نقشِ دوام“

مرتب :۔۔۔۔ انظر شاہ مسعودی

کتابت :۔۔۔۔ محبوب الرحمٰن قاسمی بجنوری

مصحح :۔۔۔۔ انیس الاسلام القاسمی و احمد خضر شاہ مسعودی

مطبع :۔۔۔۔ شیروانی آفسٹ پرنٹرز دہلی

تعداد طباعت :۔۔۔۔ ایک ہزار

باہتمام :۔۔۔۔ حکیم مصباح الدین مردانی

قیمت :۔۔۔۔ تیس روپیہ

ناشر :۔

شاہ بکڈپو، دیوبند (یو،پی)

فہرست مضامین

نقشِ اوّل

"شاہ برادران (ازہر شاہ وانظر شاہ) نے ادھر اُدھر کے عنوانات پر بہت کچھ لکھ ڈالا لیکن اپنے والد مرحوم (مولانا انور شاہ کشمیری) پر کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ ان کے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ مجھے اس کا ہمیشہ دکھ وافسوس رہے گا۔"

پیشانی کی یہ چند سطور اس شکایتی مکتوب سے لی گئی ہیں جو مولانا الحاج محمد بن موسیٰ میاں سملکی ثم افریقی تغمدہ اللہ بغفرانہ نے آج سے بیس سال پہلے میری والدۂ مرحومہ کو لکھا تھا۔ مرحوم کو حضرت والد کی ذات، ان کے علمی اثاثے صلبی اولاد، بلکہ متعلقین سے جو بااختصاص تعلق تھا جس کی بنا پر موصوف نے والد ماجد کے ایک ایک علمی گوہر وجوہر کو اِدھر اُدھر سے جمع کیا اور جس ولولہ سے خانوادۂ انوری کی دیکھ بھال بلکہ پرورش کی اسکے پیشِ نظر یہ انتباہ پشت غفلت کے لئے ایک تازیانہ تھا، مگر غفلت کوش لاابالی مزاج کو کیا کہیئے کہ وہ خدا اور اس کے مقدس رسول کے احکام کی اطاعت سے بھی مجرمانہ اعراض کرتا رہا۔ اسلئے یہ تنبیہ بھی خواب سے بیدار کرنے یا بیداری سے آمادۂ کار بنانے میں وقتی طور پر تو ناکام ہی رہی۔ حاجی صاحبؒ کی عادت تھی کہ جب وہ بری بھلی باتوں پر دلگیر ہوتے تو مراسلت ومکاتبت کا سلسلہ فی الجملہ بند کر دیا جاتا۔ چنانچہ اس وعید شدید کے باوجود جب افسردہ وفسردہ ہمتوں میں انھوں نے کوئی ہلچل نہ پائی تو حسبِ دستور دو حرفی خطوط سے بھی ان نیازمندوں کو محروم کر دیا۔ وقت گزرتا گیا تاآنکہ شفقت ورافت کا یہ نہرِ منیر، محبت وسعادتوں کا بدرِ کامل افریقہ کے مغرب میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔ ان کے دنیائے دوں سے اُٹھ جانے کے بعد جہاں ان کی آرزو کی تکمیل، قلب ناہنجار کا سب سے بڑا داعیہ بن گئی وہیں مستعدی وتوانائی کے لئے یہ تصور روح فرسا تھا کہ اب محنت کی قدر اور اسپر بزرگانہ کلمات دعا سے نوازنے والا کون رہ گیا؟ اسی کشمکش میں مولانا یوسف بنوریؒ کی "نفحۃ العنبر فی ھدی شیخ انور" جدید ترتیب واضافوں کے ساتھ منظرِ عام پر آئی اور مؤلف کی عنایت سے اس کا ایک نسخہ پاکستان سے اس ظلوم وجہول کے پاس دیوبند پہنچ گیا۔ چند صفحات کے مطالعہ کے بعد الہامی خیال پیدا ہوا کہ اسی کی اردو ترجمانی

حاجی صاحبؒ کے تقاضوں سے سبکدوشی کی بہترین راہ ہے۔ ترجمہ شروع کیا گیا لیکن چند ہی صفحات کے بعد اپنی علمی کم مائیگی نے یقین دلایا کہ مولانا بنوریؒ کے عالمانہ و فاضلانہ اسلوب ونگارش کو اسی تازگی و ندرت، شوکت وشادابی کے ساتھ بعنوانِ ترجمانی بھی اردو میں منتقل کرنا کم از کم میرے بس میں نہیں۔ قلم رکھ دیا گیا اور چند صفحات کا یہ مسودہ پھر طاقِ نسیاں کی یادگار بن گیا، ادھر دارالعلوم کی تعلیمی خدمات اور گوناگوں مصروفیات کی بنا پر دن میں کچھ لکھنا ممکن نہیں اور شب کے سکون میں بصارت کا ضعف سلاسل بدست رہتا ہے توانائی و مستعدی کی وہ بہار جو "نفحۃ العنبر" کو دیکھنے کے بعد دھیمی رفتار سے چلی آئی تھی، ان اعذار کی بنا پر خزاں آشنا ہو کر رہ گئی کہ میرے خویش وعزیز ڈاکٹر مولوی مظفرالحسن نے ایک بار پھر تہیہ کیا اور تسوید کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہوئے طے کیا کہ یہ بے بضاعت املاء کرائیگا اور وہ اسے قلمبند کرتے چلیں گے۔ ابھی چند ماہ ہی اس مہم کے آغاز پر بیتے تھے کہ میری اہلیہ کے سانحۂ وفات نے سکوں آشنا دل و دماغ کو افکار وآلام کا آشیانہ بنا دیا۔ اب نہ ہمتوں میں بلندی تھی، نہ قویٰ میں بالیدگی، نہ تخیل کی رفعت اور نہ خیالات کا شباب، بلکہ اپنی گھر گرہستی کے اجڑ جانے اور مختصر کائنات کے درہم برہم ہونے سے زندگی ساحل کا ایک ایسا نامراد گوشہ محسوس ہوتی جسے شور دریا سے کبھی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس بے کیف زیست میں نہ صرف "نقشِ دوام" کی تسوید کا خیال بھولی بسری داستان بن کر رہ گیا بلکہ رشتۂ کار بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔

حسنِ اتفاق کہ ۱۹۷۵ء میں "ری یونین" کا سفر ہوا جسمیں مولوی مظفر رفیقِ سفر تھے "نقشِ دوام" کا مسودہ اس خیال سے ساتھ رکھ لیا گیا کہ شاید درماندہ فرصت قلم کچھ فرصت پاکر پھر اس منزل کی جانب رواں دواں ہو جسکا سفر آسودۂ منزل ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

سینٹ لوئس کا وہ دن عجیب وغریب تھا جب مولانا مفتی عبدالحئ بسم اللہ مرحوم نے مسودہ کو پڑھکر وہ اصرار اس کی تکمیل وطباعت کے لئے شروع کیا جسکو نظر انداز کرنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں بلکہ مرحوم نے برفاقت مولانا رشید بزرگ اسکی طباعت کے انتظامات اپنے ذمہ لئے اور دیوبند پہونچنے کے بعد برابر ایفاء وعدہ کیلئے خط وکتابت کرتے رہے۔ عزیز مظفر اب خود صاحبِ اہل وعیال ہیں اور ان کی مصروفیات اتنی وسیع ہو گئیں کہ میں ان سے کسی تعاون کی امید نہیں رکھتا تھا، پھر تسوید وتصنیف کے سلسلہ میں

ہر کسی سے مدد لی بھی نہیں جا سکتی، لیکن جب قدرت کوئی کام لینا چاہتی ہے تو اسکے وسائل بھی بہم پہونچاتی ہے۔ ہوا یہ کہ عزیز مولوی سید انیس الاسلام متعلم دارالعلوم جو عرصہ سے میرے ساتھ مقیم ہیں اور اپنی خوبیٔ استعداد کی بناپر اس کام میں میرا بھرپور تعاون کرسکتے تھے وہ تیار ہوئے اور خدائے تعالےٰ کا شکر ہے کہ ان کی محنت، مستعدی، ذوق و شوق سے یہ کوہ بے ستوں انجام کو پہونچا۔

طباعت کا مرحلہ لطیف و قدیر کی چارہ سازیوں سے اسطرح طے ہوا کہ مولانا حکیم مصباح الدین جو دہلی میں عرصہ سے مقیم اور "ربانی بکڈپو" کے قیم ہیں۔ حسن طباعت، جاذب نظر کتابت اور طباعتی مرحلوں میں کارآمد چابکدستی رکھتے ہیں۔ کتابت وطباعت کی ذمہ داریوں میں بدل وجاں تعاون پر تیار ہوگئے اور اس راہ میں دلچسپیوں کا وہ مظاہرہ کیا کہ دھلی اور دیوبند کے درمیان خاص اس مقصد کے لئے اسفار سے بھی گریز نہیں کیا، مسودہ کو مبیضہ کرنے میں برادر عزیز مولوی روح الحق مدراسی متعلم دارالعلوم دیوبند کا تعاون ملا، مقدمہ کے لئے حضرت المحترم مولانا قاری محمد طیّب صاحب مدظلہ پر نظر انتخاب پہونچی اور ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود قلم سے نہیں بلکہ دل سے "مقدمہ" لکھا جو درحقیقت میری اس تصنیفی کاوش کا ایک دیدہ زیب ومتوازن متن ہے۔ خدائے تعالےٰ ان سب حضرات، احباب اور متعلقین کو جو اس "نقشِ دوام" کی تیاریوں میں میرے دست وبازو رہے اپنے بہترین اجر سے سرفراز فرمائے۔

والد مرحوم پر بہت کافی لکھا گیا مضامین ومقالات کی صورت میں بھی اور مسلسل سوانح بھی، تاہم جس انداز پر لکھنے کی ضرورت تھی یا میرے پیش نظر ایک خاص طریق کار تھا اسکے لئے کافی جد وجہد کرنی پڑی۔ اور یہ نتیجہ تھا میری بے مائگی اور تصنیف وتالیف کے مروّجہ سلیقہ وقرینہ سے ناواقفیت کا، خصوصاً ان کے نوادرات علمی کا اخذ والتقاط، پھر سہل اردو میں عام فہم بنانے کی جد وجہد دشوار ترین کام تھا میرا اپنا ارادہ یہ تھا کہ سوانحی تفصیلات کو مختصر کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ ان کے علمی شہ پاروں وجواہر پاروں کو نظر قارئین کیا جائے۔ آپ یقین کیجئے کہ ان کی املائی تقریر بخاری سے چند ہی صفحات میں اس قدر انتخاب ہوگیا کہ "نقشِ دوام" کی تنگ دامنی مزید قبول کرنے سے آبی ہے اسکے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ ایک مستقل جلد میں ان تفردات ونوادرات کو جستہ جستہ پیش

کیا جائے، قاضیٔ الحاجات کی بے کراں رحمتوں سے کیا بعید ہے کہ اس نے جلد اوّل کے ہمہ قسم سروساماں کئے وہ جلد ثانی کے لئے بھی انتظامات بہم پہونچائے۔ رحمٰن ورحیم جس نے اس ناقابلِ ذکر خدمت کا موقعہ عنایت فرمایا اسی سے دست بدعا ہوں کہ وہ اِسے قبولیت اور منفعت کے شرف سے سرافراز فرمائے اور ایک ناخلف بیٹے کی یہ کوششیں صالح ترین باپ کی بارگاہ دین ودانش میں شفقت پدری کا سکون واختصاص حاصل کرسکیں۔ اس سے زیادہ آرزو اپنے منصب ومحنت سے زائد کی تمنا ہوگی۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

انظر شاہ مسعودی

خادم التدریس بدار العلوم دیوبند

۲؍ذی الحجہ ۹۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوش و تاثرات

حضرۃ المحترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رئیس الاہتمام بدار العلوم دیوبند

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

حضرت الاستاذ الاکبر علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی مبارک ہستی نہ کسی تعارف کی محتاج ہے نہ کسی تاریخ کی دست نگر۔ ان کی حقیقی تاریخ ایک پیروں چلتی تاریخ ہے جو ان کے تلامذہ اور آثار علمی کی صورت میں ہمہ وقت دائر و سائر نمایاں اور چشم دید رہتی ہے۔ اس اُمتِ مرحومہ میں لاکھوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دنیا کے لئے چھوڑ گئے، لیکن ایسی ہستیاں معدودے چند ہیں جن کا فیض عالمگیر اور محبوبیت عام قلوب کی امانت ہو اور جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی امت نے استفادہ کیا ہو۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم کی ہستی انھیں مبارک اور معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو علم و فضل سے رنگین کر جاتی ہیں۔ حضرت مرحوم کا علم اگر متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل سلف صالحین کو زندہ کئے ہوئے تھا اور اسوۂ سلف کے لئے نمونہ ساز تھا۔ علم، حافظہ، تقویٰ، طہارت اور زہد و قناعت مثالی تھی۔ علمی حیثیت سے ہم تلامذہ انھیں "چلتا پھرتا کتبخانہ" کہا کرتے تھے۔ اور عملی حیثیت سے جو ہمہ جہت اتباع سنت کے نور میں ڈھلا ہوا تھا۔ اکثر و بیشتر ان کے عمل ہی سے مسائل معلوم کر لیتے تھے اور مسئلہ وہی نکلتا تھا جو ان کا عمل ہوتا تھا۔ ان کے روشن چہرہ پر ایمان کی چمک اس طرح نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ اگر اسلام مجسم صورت میں آتا تو وہ علامہ انور شاہ کی صورت میں ہوتا۔

چنانچہ آج سے ستّر اسّی سال قبل جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ جوان العمر تھے مظفر نگر کے ایک جلسۂ مناظرہ میں جو مسلمانوں اور آریوں کے درمیان ہوا تھا۔ حضرت مرحوم بھی دار العلوم

دیوبند کی طرف سے اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ کے ساتھ شرکت جلسہ کے لئے تشریف لے گئے اور اسٹیج پر تشریف فرما تھے تو آریہ مبلغ نے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ "اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاتا تو آج مجھے مولانا انورشاہ کی صورت دیکھ کر مسلمان ہو جانا چاہیئے تھا جن کے چہرے ہی پر اسلام برستا ہوا دکھائی دیتا ہے"۔ درس حدیث کیلئے جب حضرت مرحوم اپنے قیام کے کمرے سے درسگاہ کی طرف چلتے ہوئے نظر آتے تو ہم لوگوں میں ایک دوسرے کو آمد کی اطلاع دینے کے لئے بے ساختہ جو کلمہ زبان زد تھا وہ یہ تھا کہ "جاء الشیخ الثقۃ الامین" جو درحقیقت ان کے ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے خود بخود قلوب میں وضع ہو گیا تھا۔ درس میں اس وقار سے بیٹھتے جیسے کوئی پُر رعب و ہیبت بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے تخت نشین ہو۔ کلام نہایت باعظمت، متین اور علمی مواد سے لبریز ہوتا اور نقل و رُواۃ کی قسم سے جو بھی دعویٰ فرماتے اسی وقت کتب متعلقہ کھول کر اسکی عبارت سامنے کر دیتے۔ کتب حدیث کا ڈھیر خصوصیت سے سامنے رکھا ہوا ہوتا تھا۔ درس میں تبحر اور تفقہ دونوں یکساں چلتے تھے۔ درس حدیث فقط فن حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ جمیع علوم وفنون کے حقائق پر مشتمل تھا۔ میں خود حضرت کی تقریر قلم بند کرتا تھا۔ اپنی کاپی کو طوالت عنوانات سے بچانے کے لئے تقریباً سات کالموں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر کالم پر فنون کے عنوانات دئے ہوئے تھے جیسے فن صرف ونحو، فن معانی و بلاغت، فن تفسیر و حدیث فن فقہ واصول فقہ، فن منطق و فلسفہ اور فن ہیئت و ریاضی اور فن تاریخ وغیرہ۔ کیونکہ اہم مسائل میں ان فنون کے مسائل تقریباً ہر روز آتے تھے جو مسئلہ جس فن کا ہوتا میں اسی کالم میں اسکا اندراج کر لیتا اور درس سے اُٹھ کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم لوگ صرف حدیث ہی پڑھ کر نہیں آئے ہیں بلکہ جمیع فنون متداولہ کا درس لے کر آ رہے ہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

ظاہر ہے کہ اس جامع ہستی کی تاریخ درحقیقت علوم وفنون کی تاریخ ہے جسے لکھنا کسی جامع عالم ہی کا کام ہو سکتا ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں جبتک کہ لکھنے والے ہر فن سے کچھ نہ کچھ حصہ لئے ہوئے نہ ہوں تاہم کسی محبوب استاد کی تاریخ چونکہ محض علم ہی کا تقاضا نہیں ہوتی بلکہ عشق و محبت کا مقتضیٰ بھی ہوتی ہے اور عشق کے لئے مہارت علوم ضروری نہیں عقیدت و محبت کا جوش وجذبہ بھی کافی ہے اس لئے لکھنے والوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اور پھر بھی وہ قلیل ہے۔ جذبات وعقیدت و محبت سے لکھا ہے اور حضرت مرحوم کے روشن چہرہ کو نمایاں کرنے کی جو بھی کوشش کی ہے وہ ہر آئینہ

مستحسن اور قابل صد تعریف ہے پھر بھی ؂

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

حضرت شاہ صاحبؒ کی تاریخ فقط یہ نہیں کہ وہ کشمیر کے باشندے تھے، فلاں سن میں پیدا ہوئے اور فلاں سن میں جنت کو سدھار گئے اور فلاں فلاں جگہ رہے اور کسبِ فیض کیا بلکہ ان کی تاریخ، ان کا علم لفظ واسرار، کردار وگفتار، جذبہ ورفتار اور قلب و دماغ بیدار ہے۔ جو اس تک پہنچ جائے وہی ان کی تاریخ کا حق ادا کر سکتا ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد؛ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

بلاشبہ مرحوم پر اردو عربی میں بہت کافی لکھا جا چکا ہے۔ عربی میں انکے نامور شاگرد اور ہماری برادریٔ تلامذہ کیلئے باعثِ فخر تلمیذ انور مولانا محمد یوسف بنوری زادہ اللّٰہ علماً وعرفاناً مہتمم وصدر مدرس مدرسہ اسلامیہ نیوگاؤں کراچی "نَفْحَۃُ الْعَنْبَرِ فِی ھَدْیِ شَیْخِ اَنْوَر" نامی ایک ضخیم سوانح بہت پہلے لکھ چکے ہیں جسکا حال ہی میں دوسرا ایڈیشن بھی کراچی سے شائع ہوا ہے۔ "علمائے حق" مصنفہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب مرحوم شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مرحوم کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ "نگارستانِ کشمیر" میں مولانا ظہور الحسن سیوہاروی نے اور "تاریخ اقوام کشمیر" میں جناب مولوی محمد الدین فوقؔ نے بھی طویل تذکرہ کیا ہے۔ چند سال گزرتے ہیں کہ حضرت مرحوم کے فرزند اکبر مولوی ازہر شاہ قیصرؔ مدیر رسالہ "دار العلوم" دیوبند نے ساڑھے تین سو سے زائد صفحات پر "حیات انور" شائع کی جسمیں حضرت شاہ صاحبؒ کے نامور تلامذہ کے اہم مقالات حضرت الاستاذ پر شائع فرمائے اور حال ہی میں ڈاکٹر رضوان اللّٰہ صاحب لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے مرحوم پر ریسرچ کی اور انکا تحقیقاتی مطالعہ بنام "مولانا انور شاہ اور انکے علمی کارنامے" منظرِ عام پر آچکا ہے جسمیں باوجود متعدد اغلاط کے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللّٰہ کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ اسکے علاوہ متعدد مقالات ومضامین ہندو پاکستان کے اخبارات ورسائل حضرت مرحوم پر آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن "صاحبُ البیتِ اَدریٰ بِمَا فیہ" عزیز محترم مولانا انظر شاہ استاد دار العلوم دیوبند نے اپنی اس تازہ تصنیف میں ان واقعات وحالات کا امکانی حد تک احصار کیا ہے جو گھر کے کسی فرد ہی کو صحیح اور تفصیل سے معلوم ہو سکتے ہیں جن سے حضرت مرحوم کی عائلی وقبائلی، علمی اور عملی اور خلوۃ وجلوۃ کی پاکیزگی سامنے آجاتی ہے۔ اس لئے یہ تازہ تصنیف سابقہ مضامین وتصانیف کے لحاظ سے مکمل بھی ہے اور مفصل بھی، جامع بھی ہے اور حاوی بھی

مستند بھی ہے اور قابل وثوق بھی۔ فجزاہ اللہ عنا وعن جمیع تلامذۃ الشیخ احسن الجزاء۔

(۱) مؤلف نے ان تمام شخصیات کے احوال وکوائف اور سوانحی خدوخال کو نہایت شگفتہ اور دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے جنکا ذکر کسی بھی عنوان سے اس جدید تالیف میں آیا ہے جس سے یہ تالیف حضرت شاہ صاحبؒ کا سوانحی تذکرہ ہی نہیں بلکہ اکابر اور حضرت مرحوم سے مستفید اصاغر کا بھی ایک مفصل تذکارہ ہے جس سے حضرت مرحوم کی مقدس زندگی مع مالہ وماعلیہ سامنے آجاتی ہے۔

(۲) جیسا کہ معلوم ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری زندگی "تردید قادیانیت" میں صرف ہوئی انھیں کامل شغف اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال سے رہا جس سے حضرت مرحوم کا بغض فی اللہ نمایاں ہوجاتا ہے جو محبت حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین کا ایک واضح نشان اور ورثۂ انبیاء کی کھلی دلیل ہے۔ حضرت مرحوم کے اس سلسلہ کے مضامین ومقالات جن کا تعلق تردید قادیانیت سے ہے خصوصاً مقدمۂ بہاولپور میں آپ نے کئی روز مسلسل ردِ قادیانیت اور قادیانیوں کے کفر کے اثبات میں جو نہایت پُر مغز اور علمی بیانات دئے تھے جو بدقسمتی سے اب نایاب ہیں مؤلف سلمہٗ نے ان بیانات کے اہم اقتباسات بھی اس کتاب میں اس طرح جمع کر دئے ہیں کہ قادیانیت سے متعلق اکابر دار العلوم دیوبند کا نقطۂ نظر مدلل طور پر سامنے آگیا ہے اور ساتھ ہی متعلقہ علوم اور اصول ومقاصد دین بھی واشگاف ہوگئے ہیں۔

(۳) جمعیۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ۸۰ صفحات سے زائد پر مندرج ایک ایسا معرکۃ الآراء خطبہ دیا تھا جس سے مسائل وحوادث پر آپ کی سیاسی بصیرت، دور اندیشی عاقبت بینی پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑجاتی ہے۔ یہ خطبہ اب نایاب ہے مگر مؤلف نے اس کے اہم اقتباسات بھی اس تالیف میں جمع کر کے علمی طبقوں پر احسان فرمایا ہے اور اس طرح اب اس خطبہ کی تلاش میں شائقین کو سرگردانی کی ضرورت نہیں رہی۔

(۴) حضرت شاہ صاحبؒ کا فارسی وعربی کلام جو مجموعی طور پر اب تک شائع نہیں ہوسکا اسکا غالب حصہ بھی اس تالیف میں موجود ہے اور سب سے اہم یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی بلند پایہ علمی تحقیقات، حدیث وتفسیر، فقہ ومعانی اور علوم متداولہ میں آپ کے نادر علوم ومعارف اور منفردانہ اجتہادی اقوال بھی آپ کی تمام تصانیف سے اخذ کر کے اردو ترجمہ کے ساتھ اس طرح پیش کر دئے ہیں کہ اب اردو داں حلقہ بھی حضرت مرحوم کی علمی ژرف نگاہی سے قریبی واقفیت حاصل کر سکیگا۔

(۵) اب جبکہ دار العلوم "جشن صد سالہ" کی تیاریوں میں مصروف ہے اور اس مثالی تقریب پر اکابر دار العلوم کے مفصل اور مختصر تذکرے اشاعت پذیر ہوں گے تو حضرت شاہ صاحب مرحوم پر یہ جدید تالیف اس پروگرام میں بھی ایک خوشگوار اضافہ ہوگا۔

اس جمع و تالیف پر مؤلف صد تحسین و مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے بہت سے سمندروں کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور ایک زندہ ہستی کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اس سے جہاں ناظرین کتاب ایک مثالی ہستی سے متعارف ہوں گے وہیں اس چشمۂ فیض "دار العلوم دیوبند" سے متعارف ہوسکیں گے جسکے فیوض و برکات نے ایسی ایسی نادر روزگار اور یگانہ ہستیاں تیار کیں۔ اس اصول پر کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" حضرت شاہ صاحب کی مادر علمی کی عظمت بھی حضرت شاہ صاحب کی عظمت سے بآسانی نمایاں ہوجائیگی۔ اسلئے یہ تالیف ایک شخصیت ہی کا تعارف نامہ نہیں بلکہ کتنی ہی علمی ہستیوں کی کتاب تعارف ہے اور کسی ایک ہی علمی حصہ کی تاریخ نہیں بلکہ علوم و کمالات کے کتنے ہی گوشوں کی تاریخ ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ اور حضرت شاہ صاحب سے متعلق اور دوسری تمام تالیفات حضرت شاہ صاحبؒ یا ان کی علمی اصل کی احصائی تاریخ کے طور پر منصہ شہود پر نہیں آرہی ہیں بلکہ ان کے فی الجملہ تذکرہ سے اپنے قلوب کی تسلی و تسکین کا سامان بہم پہنچانے کے لئے ایک مستحسن مواد کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ مؤلفین "من احبّ شیئا اکثر ذکرہ" کے مصداق بن جائیں اور اس پردے میں اپنے محبوب حقیقی حضرت حق جلّ مجدہ کے ذکر کو تازہ رکھ سکیں۔ کیونکہ ان اکابر کی شان لسان نبوت پر یہی ظاہر کی گئی ہے کہ "اذا ذکر وا ذکر اللّٰہ واذا ذکر اللّٰہ ذکروا" جب ان کا ذکر آئیگا تو اللہ کا بھی ذکر آئے گا اور جب اللہ کا ذکر آئے گا تو ان اہل اللہ کا ذکر بھی آئے گا کہ

خاصانِ خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس تالیف کو مقبول فرما کر ہر خاص و عام کے لئے نافع فرمائے اور اس سے مؤلف سلمہٗ کے مراتب بلند فرمائے .... ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد طیبؒ
مہتمم دار العلوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزار قافلۂ شوق می کشد شب گیر
کہ بارِ عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

حضرت شاہ صاحب مرحوم کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی و کشش، جاذبیت و دلکشی، شادابی و شادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے۔ جسکی پرُحسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوشگواری، مناظر کا حسن، قدیم زمانہ سے سیاحوں کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ بادشاہوں نے یہاں پر بارِ عیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیا اس کے جمال دل افروز میں پا گرفتہ۔ یہ وہی کشمیر ہے جس کی مدح و ثنا میں فارسی شاعری کے طناز و نغز گو عرفی شیرازی نے یہ کہہ کر وادی کے صحت افزا، خوشگوار ماحول کو مستند کر دیا۔

ہر سوختہ جانیکہ بہ کشمیر در آید گر مرغ کباب است با بال و پر آید

یہ وہی کشمیر ہے جس نے حضرت سید علی ہمدانی اور میر سید کرمانی کے قدم روک لئے، یہ وہی کشمیر ہے جس کے لالہ زاروں سے پنڈت جواہر لال نہرو کا خاندان، ڈاکٹر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور خدا جانے علم و فن اور دانش و بینش کے ترشے ہوئے کتنے نگینے انگشتری کمال پر اسطرح جمائے گئے جس سے کمال نے فروغ حاصل کیا۔ ہندوستان کا سپرو خاندان، کنزرو، کچلو، نہرو، اسی وادی کے وہ گل و لالہ ہیں جو صدیوں سے ہندوستان کی زندگی کی بہار، اس کے پھولوں کا حسن اور برگ گل کی نظافت بنے ہوئے ہیں۔ اگر وطن کی خصوصیات ابنائے وطن پر مرتب ہوتی ہیں تو اہل کشمیر میں وہ خوبیاں اور رعنائیاں بہ قوت موجود ہوں گی جن سے اس حسین وادی کی فضائیں معمور ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کشمیر کے اکثر و بیشتر خاندان دوسرے ممالک سے آکر یہاں مقیم ہوئے اور ہمیشہ یہیں کے ہو رہے۔ خود حضرت شاہ صاحب کے آباء بغداد سے اٹھے لاہور و ملتان ہوتے ہوئے وادی لولاب، مظفر آباد اور ریاست کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ پھر اس خانوادہ کی کچھ شاخیں ہندوستان میں دیوبند اور پاکستان میں لاہور، ملتان وغیرہ میں منتقل ہوئیں۔ مناسب ہے کہ اس سوانحی

خاکہ میں مرحوم کے وطن مالوف کے متعلق کچھ تفصیلات تحریر کر دی جائیں۔ ہندوستان کے شمالی سرحدی حصہ پر جہاں یہ وادی موجود ہے وہیں سوویت یونین (روس) تبت اور چین کی سرحدیں اس کے حسن کو چھونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ وادی تیرہؔ اضلاع میں تقسیم ہے۔ اسلامی عہد عروج کے مشہور خلیفہ ولید کے زمانہ میں جب کابل اور ترکستان مقبوضات اسلامی میں شریک ہوئے تو مجاہدین کی نگاہوں نے دور سے کشمیر کے حسن وجمال کو جھانک کر دیکھا اور نصر بن سیار سب سے پہلا وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑوں کو گلگت اور کاشغر کے میدانوں تک پہنچا دیا۔ لیکن جبینِ کشمیر سے ہم آغوشی کی سعادت اس فاتح اوّل کی تقدیر میں نہیں تھی۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا معمار و مؤسس عرب کے ریگزاروں سے ایک آندھی کی طرح اٹھا سندھ کو روندتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوا۔ یہاں کے دریاؤں کی موجوں نے اسے ملتان میں پہونچا دیا۔ وہی ملتان جس کے متعلق کسی ظریف نے کہا ہے ؎

چہار چیز است تحفۂ ملتاں گرد و گرما، گدا و گورستاں

ملتان کے خشک علاقے اور یہاں کی بادِ سموم نے محمد بن قاسم کے قلب و دماغ میں کسی شاداب مرغزار کی جستجو پیدا کی تو ہندوستان کے طول وعرض نے وادی کشمیر کو آرزوؤں کے مطابق اس کے سامنے پیش کیا۔ اس سپہ سالار نے اپنی ظفر موج فوجوں کو وادی کے دروازے پر لا کھڑا کیا لیکن تاریخ کی ستم رانیاں محمد بن قاسم جس نے سندھ سے لیکر تا ملتان فتحمندی کے پھریرے اڑائے تھے اپنی انفرادیت کا بار انقلاب زمانہ سے چور چور کمر پر اٹھائے ہوئے جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ گیا۔ پھر حصار غزنی سے وہ جیالا انسان چلا جسے تاریخ محمود غزنوی کے نام سے جانتی ہے اور جس کے حادثۂ رحلت پر فرخی شاعر نے یہ کہہ کر تڑپا دیا تھا

ع شہر غزنی نہ ہمانست کہ دیدم پار

جس کے عہد میں فردوسی شاعر کا تخلیقی کارنامہ یعنی "شاہنامہ" کائناتِ شاعری میں ایک فاتح کی حیثیت سے علم وادب کی بہت سی آبادیوں کو آج تک اپنا باج گذار کئے ہوئے ہے لیکن محمود غزنوی کی ترک تازیاں بھی اس حسن وجمال کی وادی کو پوری طرح مسخر نہ کر سکیں تا آنکہ تیرھویں صدی عیسوی میں شاہ میر نے وادیٔ کشمیر پر کامیاب حملہ کیا اور کوٹہ رانی کے خاندان کو نظر بند کر کے دو سو سال تک وادی کو اپنے زیر نگیں رکھا۔ پھر پندرھویں صدی عیسوی میں سکندر مرزا، زین العابدین، حیدر شاہ، فتح شاہ، مرزا حیدر، قاضی خان اور بہت سے سلاطین اس وادی پر حکومت کرتے رہے۔ سترھویں

صدی عیسوی میں احمد شاہ درانی کشمیر میں داخل ہوا اور وادی اس خاندان کے زیر سلطنت علاقوں میں شریک ہوگئی۔ اٹھارہ ۱۸ سو انیس عیسوی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آخری افغان گورنر جبار خان کو شکست دے کر کشمیر کو سکھوں کا مقبوضہ علاقہ بنالیا پھر عالمی سیاست کا شاطر یعنی فرنگی اقتدار کشمیر کی طرف متوجہ ہوا اور سبھراؤں کے مقام پر سکھوں کی بچی کھچی طاقت کو توڑتا ہوا کشمیر تک جا پہنچا۔ انگریز کے لئے کشمیر پر اقتدار اسلئے ضروری تھا کہ یہی وادی دنیا کی دو بڑی حکومتوں کیلئے ایک بہترین دروازہ ہے جس سے گزر کر یہ دونوں حکومتیں برطانوی زیر اقتدار علاقہ یعنی ہندوستان میں بہ آسانی پہونچ سکتی تھیں لیکن انگریز شہنشاہی مزاج سے زیادہ سیاسی شعبدہ بازیوں میں مشہور قوم ہے۔ وہ خرید و فروخت سے ریاستی حدود میں بھی باز نہ رہی اور کشمیر کو کل پچھتر لاکھ روپے کے عوض فروخت کر ڈالا حقیقی انتداب انگریز کا تھا اور برائے نام راج گلاب سنگھ کا۔ ۱۸۴۶ء میں ایک معاہدہ کے تحت کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ کے زیر نگیں ڈوگرہ راج کا بھرپور تسلط قائم ہوگیا۔ یہ ریاست اپنی شدید فلاکت، جہالت اور عوام کی شعوری ناپختگی کی بنا پر غلامی کی طویل زندگی گذارتی رہی۔ کچھ نوجوان کشمیر سے باہر نکلے اور ہندوستان میں آزادی کی اس تڑپ کا براہ راست مطالعہ کیا جو عام ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی ڈپلومیسی کے خلاف موج زن تھی۔ یہ حریت کے جذبات لیکر کشمیر پہونچے لیکن انھیں کام کرنے کی راہ اور کوئی واضح نصب العین نظر نہیں آتا تھا۔ خس و خاشاک جمع ہو جاتا ہے تو ایک چنگاری بھی اسے آتش فشاں بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ طویل استبداد اور ڈوگرا شاہی کی غیر منصفانہ پالیسی نے جو متشددانہ آمریت کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی کشمیری عوام کے ذہنوں میں اتھل پتھل پیدا کردی تھی اتفاقاً ایک خاص موقع پر ایک نوجوان نے اپنے آتشیں جذبات کو اُگل دیا۔ ڈوگرا شاہی اس خانساماں کے خلاف حرکت میں آگئی۔ دوسری جانب وہ تلاطم جو ابھی تک دماغوں میں بند تھا سیلاب بن کر کشمیر کے طول و عرض میں اچھلنے لگا۔ مولانا محمد سعید مسعودی، شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، مرزا افضل بیگ میر قاسم محی الدین، میر صادق اور دوسرے پرجوش نوجوان ولولۂ قیادت کے ساتھ سامنے آئے اور راج شاہی سے کشمیر میں براہِ راست تصادم کا آغاز ہوگیا۔ نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی جس کے لیڈر شیخ عبداللہ موجودہ وزیر اعلیٰ کشمیر، تحریک کا دماغ مولانا محمد سعید مسعودی اور دوسرے ارکان تحریک کے اعضاء تھے۔ بہ تدریج نیشنل کانفرنس کے تعلقات انڈین نیشنل کانگرس سے پیدا ہوئے اور آنجہانی جواہر لال نہرو نے اپنے وطنی تعلق کی بنا پر کشمیر کی تحریک آزادی کو استحکام دیا۔ وہ وقت

بھی آیا کہ جواہر لال کیلئے کشمیر کے دروازے بند کر دئے گئے اور وہ قانون شکنی کرتے ہوئے حدودِ کشمیر میں درانہ گھس گئے جبکہ ڈوگرا شاہی فوج کی سنگینوں سے جواہر لال کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا۔ اس دوران نیشنل کانفرنس کو معطل کرنے کے لئے مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ شیخ اور ان کی پارٹی کے افراد بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس نے برطانیہ سے براہِ راست "ہندوستان چھوڑ دو" کا مطالبہ کیا تو نیشنل کانفرنس نے بھی اسی لب و لہجہ میں ڈوگرا شاہی سے "کشمیر چھوڑ دو" کا مطالبہ کر دیا۔ ہندوستان آزاد ہوا نقشۂ عالم پر دو نئی سلطنتیں ہند و پاکستان کے نام سے ابھر آئیں۔ حالات کی سنگینی نے ڈوگرہ راج کو بھی کشمیر آزاد کرنے کیلئے مجبور کیا۔ عوامی حکومت بہ قیادت شیخ عبداللہ سامنے آئی اور پھر بخشی غلام محمد، میر قاسم، میر صادق وغیرہ کی وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ اور اب کہ یہ سطور زیرِ قلم ہیں تو کشمیر میں شیخ عبداللہ کی وزارتِ اعلیٰ قائم ہے۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم کا تعلق کشمیر کی اس وادی لولاب سے ہے جس کے قدرتی حسین مناظر کی تعریف میں حکیم مشرق اقبال نے ایک طویل نظم کہی ہے۔ تحصیل ہندواڑہ ضلع بارہ مولا کے ایک موضع "ورنو" میں ان کے والد مرحوم کا سکونتی مکان ہے اس قریہ تک پہونچنے کے لئے "کپواڑہ" سے اب براہ بس سفر کرنا پڑتا ہے جبکہ عوامی وزارتوں سے پہلے گھوڑوں پر سفر کیا جاتا تھا۔ ورنو کے قریب سوگام ہے جو چنار کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک نہایت حسین بستی ہے۔ کپواڑہ سے ایک مواج دریا ورنو کی طویل القامت پہاڑیوں سے گذرتا ہوا تا بحد نظر وسیع میدانوں کے سینہ پر موج زن ہے۔ اسی دریا کے کنارے پر "دودواں" ہے جہاں حضرت شاہ صاحب کی ننھیال ہے بلکہ اسی چند مکانوں پر مشتمل بستی میں ۱۲۹۸ھ میں حضرت شاہ صاحب کی پیدائش ہوئی۔

ورنو اخروٹ کے درختوں، بہتے ہوئے چشموں، سرسبز و شاداب پہاڑوں، اچھلتے ہوئے دریا سے گھری ہوئی ایسی بستی ہے جس طرح کہ صحن چمن میں کوئی خاص شجرِ قدرت پھولوں سے لدا ہوا ہو۔ کشمیر کی عام آبادی بھیڑوں اور بکریوں کے گلہ کی مالک اور پہاڑوں پر آباد قوم ہے۔ رات کے سہانے منظر میں زیرِ فلک کھڑے ہوئیے تو پہاڑی سلسلہ میں موجود مکانات میں جلتے ہوئے چراغ چاند اور تاروں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں اخروٹ، سیب، زرد آلو، شفتالو، بادام، رس بھری انگور شہ اور اسی قبیل کے خوش ذائقہ پھل موجود ہیں۔ زعفران کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور شالی (چاول) سے لبریز وادی فردوس منظر پیش کرتی ہے اون سے تیار شدہ شالیں اونی قالین اور اس صنعت میں کشمیریوں کی چابک دستیاں مشہور عالم ہیں۔ لیکن جہالت کی وجہ سے یہ وادی بدعات و محدثات

کی گرفت میں ہے۔ مصنوعی پیروں کے غول اِدھر سے اُدھر دوڑ کر متاعِ دین کی قزاقی کر رہے ہیں۔
دینی درسگاہوں کا نام و نشان نہیں اور جہاں تہاں کوئی مکتب ہے اسے کشمیریوں کے شقاق
و نفاق نے کام کرنے کی مہلت نہیں دی۔ مسجدیں نمازوں سے زیادہ لایعنی نعروں سے گونج رہی ہیں۔
اکثر مساجد میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنوعی موئے مبارک پر کشمیر کا سادہ لوح مسلمان پروانہ
وار گر رہا ہے۔ حضرت بل کی خانقاہ میں ایک نیم سرکاری مدرسہ ہے جس نے اپنی طویل تاریخ میں دین
کی کوئی معتد بہ و مفید خدمت انجام نہیں دی۔ ہر سال دار العلوم دیوبند سے فضلاء کی ایک بڑی کھیپ
نکل کر کشمیر پہونچتی ہے اور بجائے دین کے شعبوں میں کوئی بار آور خدمت انجام دینے کے اسکولوں
کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔ پونچھ، کشتواڑ، اور اس وادی کے پورے علاقہ میں دینی تعلیمی صورت
حال افسوسناک و حسرت انگیز ہے اور کشمیر کا ذرہ ذرہ اس طویل تمنا میں وقت گذار رہا ہے کہ ع
مردے از غیب بروں آید و کارے بکند، حالانکہ یہ وادی اپنی قدیم تاریخ میں اہل کمال اور دانشوروں
کا مرکز رہی ہے۔ یہاں جو پہنچا اس نے یہاں کے حسن میں اپنا دامن دل اسطرح الجھا ہوا پایا کہ مدتوں
کے لئے پابزنجیر ہو گیا۔ فیضی اکبر بادشاہ کے ساتھ پہونچا تو حسن کشمیر نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال
دیا۔ عرفی کے چشم ہوش نے وادی کے مسحور کن حسن پر ایک لاثانی قصیدہ کہہ ڈالا۔ شاہجہانی عہد کا
ملک الشعراء حکیم ہمدانی کشمیر میں آیا تو سالہا سال یہاں سے نکلنے کا نام نہ لیا اور اپنی شہرۂ آفاق
تصنیف "بادشاہ نامہ" کی یہیں تسوید کی۔ عہد جہانگیر میں حیدر ملک بن حسن نے کشمیر کی تاریخ لکھی۔
البیرونی ہندوستان وارد ہوا تو اس کے قلم نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا کہ کشمیر میں سائنس و فلسفہ
کی بڑی بڑی درسگاہیں رہی ہیں۔

یوں تو پوری وادی صناعی قدرت کا ایک دلآویز نمونہ اور دستِ خالق کا تیار کردہ
گلدستہ ہے لیکن پھر بھی قدرتی مناظر میں "گلمرگ"، پہلگام، چشمۂ شاہی، جھیل، ڈل دریا، خاص
سری نگر میں شالیمار، نسیم باغ، نشاط باغ اور بہت سے مناظر سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتے
ہیں۔ مقدس مقامات میں خانقاہ معلّیٰ، خانقاہ شاہ ہمدان، مقبرۂ سلطان زین العابدین، مسجد مدنی،
خانقاہ بابا شیخ مسعود نروری (مورث اعلیٰ حضرت شاہ صاحب مرحوم)، مقبرۂ حضرت بڈشاہ،
حضرت بل، زیارت مخدوم شاہ وغیرہ ہیں۔
مشہور شہروں میں سری نگر، اسلام آباد، قاضی کنڈ، بارہ مولا، ہندواڑہ، کپواڑہ،
سوپور اور کشمیر کا حسین ترین حصہ وادی لولاب ہے جس کے سبز پوش سلسلۂ کوہسار پر

اور دسے اور دسے بادل اکثر موجود اور اسکی زمین پر بہتے ہوئے دریا اور رواں دواں چشمے ہیں۔
وادی کا کچھ علاقہ پاکستان کے قبضہ میں ہے۔
یہ ایک مختصر تفصیل ہے حضرت شاہ صاحبؒ کے وطنِ مالوف کشمیر کی۔

حسب و نسب

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ مرحوم ابن شیخ معظم شاہ ابن شاہ عبدالکبیر ابن شاہ عبدالخالق ابن شاہ محمد اکبر ابن شاہ محمد عارف ابن شاہ حیدر ابن شاہ علی ابن شیخ عبداللہ ابن شیخ مسعود دی نروری الکشمیری رحمہ اللہ۔ علامہ مرحوم نے اپنی بعض تصانیف میں بسلسلۂ نسب صرف اتنا لکھا ہے آپ کے خیال میں شجرہ کے یہ سلسلے قطعاً صحیح تھے جبکہ موجود سلسلۂ نسب کی باقی تفصیلات ناقابل اعتبار ہیں۔ اس سے قطع نظر اسلام نے جن بعض بے بنیاد مفاخر کے اصنام کو شکست و ریخت کیا۔ ان میں سے ایک بڑا صنم غرور قومیت، غرور شرف نسب، فخر بالآباء اور خاندانی حد بندیوں پر زعم باطل تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ شرف نسب خدائے تعالیٰ کی ایک نعمت اور خاص انعام ہے لیکن اس کا تقاضا حسن عمل کا ذوق و شوق، کردار کی درستگی، معاملات کی نزہت، ظاہر و باطن کی نظافت ایسی ہونی چاہیئے جس سے اعلےٰ روایات کی نکہتیں، روش چمن سے باہر فضاؤں کو معمور رکھیں نہ یہ کہ کردار کی نازیبائی، معاملات کی نادرستگی عمل کوش زندگی سے محرومی اور صرف حسب و نسب پر اعتماد اور دوسری قوموں کی دل شکنی و دلآزاری مطمح نظر بن جائے۔ قرآن کریم نے اپنے بلیغ و معجز اسلوب میں قومیاتی تقسیم کو باہمی معرفت اور امتیاز کا حد فاصل قرار دیا ہے اور بس۔ ارشاد ہے: "وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا" یہ بھی تسلیم کہ طویل تجربات نے اعلیٰ و پست اقوام میں ازدواجی تعلقات کو عموماً ناکام ہی دکھایا ہے۔ الّا ماشاءاللہ اور اسے بھی قبول کیا جاسکتا ہے کہ حسب و نسب اور خاندانی وجاہتوں کے اثرات نسلوں میں منتشر اجزار کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت مرحومہ کے ممتاز دقیقہ رس سیدنا امام ابوحنیفہ تغمدہ اللہ بغفرانہ نے ازدواجی رشتوں میں حسب و نسب کا بھرپور اعتماد کیا ہے۔ آپ کے معاصر امام مالک علیہ الرحمہ نے اگرچہ اس نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کیا تاہم تجربات کی طویل تاریخ ابوحنیفہ الامام کی رائے کی توثیق و تصویب کرتی ہے مگر یہ امام ابوحنیفہ سے کہیں منقول نہیں کہ فخر بالانساب کو انھوں نے سراہا ہو یا ان کی کوئی دماغی کاوش یا فقہی نکتہ اس صنم پرستی کا موئید

بن کر سامنے آیا ہو۔ اس عالم رنگ و بو میں انھیں اخلاف کو اپنے آبار کی نسبی وجاہت پر فخر کا بلاشبہ جواز ہے جنکی زندگیاں خود اسلاف کے حسین و پاکیزہ آثار سے مشابہت ومناسبت رکھتی ہیں ورنہ بقول شاعر ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو　　　پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

بلند حوصلہ اخلاف نے اپنے مفاخر کی راہیں خود ہموار کی ہیں۔ انھوں نے اسلاف کے بچھائے ہوئے دستر خوان سے زلہ ربائی میں کوئی عزت محسوس نہیں کی۔ محمد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بنیاد مفاخرا ور عرب وعجم کے مابین امتیازی خطوط کو اپنے کلک رسالت سے اولین لمحہ میں حرف غلط کی طرح محو کر دیا تھا لیکن پچھلوں کی بے عنوانیاں کہ وہ بتدریج اسلام کے پاکیزہ تصورات سے ہٹنے کا جو عمل اختیار کرتے رہے اسکا ظہور اس شعبہ میں بھی بدقسمتی سے ہو کر۔ با خصوصاً ہندوستانی مسلمان یہاں کی گود پرستوں کے جھمیلے میں خود فراموشی بلکہ اسلام فراموشی میں اسطرح مبتلا ہوا کہ اب اسے اسلام کے صحیح تصورات بھی نامانوس نظر آتے ہیں۔

صاحب سوانح حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے متعلق ایک صاحب نے سب سے پہلے حسب ونسب کی بحث اٹھا کر بخیال خویش چاند پر پہونچ جانے کا حیرت انگیز مرحلہ طے کرلیا۔ وہ قرآن کے کسی مخفی گوشے کو اپنی خداداد بصیرت سے حل کرتے یا حدیث کے کسی مستور رخ کی نقاب کشائی ان کے علم زیر قلم کے حصہ میں آتی یا وہ کوئی معاشی واقتصادی نیا نکتہ پیدا کرتے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ ہوا تو کیا ہوا کہ حسب ونسب کی بحث اٹھا کر غیر شعوری طور پر فخر بالآبار کے اس صنم کو استحکام دیا جسے اسلام کا گرز شکست وریخت کرنے کے لئے کائنات میں متحرک ہوا تھا مگر ان "محقق عصر" نے اس ناپسندیدہ بحث میں الجھ کر اسلامی تصورات سے جو کھلی بغاوت کی وہ بھی تصنیف وتالیف کی کائنات کا ایک حادثہ ہی قرار دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کے عہد میں ایک دنیا انھیں "سید" سلسل لکھ رہی تھی اور لکھنے والے عام طبقہ سے تعلق نہ رکھتے بلکہ وہ اکابر تھے جنکا قلم محتاط اور جنکی نگارشات ثقاہت کا دلآویز عنوان ہیں پھر مولانا انور شاہ کے تدیّن، ان کے تقوی، ان کی احتیاط پسندی، ان کی حق پژوہی کو آخر کیا ہوا تھا کہ انھوں نے اس شہرت کو اپنے قلم وزبان سے قطعی تردید میں ناپسندیدہ غفلت وکتمان کا مظاہرہ ہمیشہ کیا!

پھر آج اس بحث کو اٹھا کر مرحوم کے کچھ حلقہ بگوش کیا اپنے مرحوم استاذ کی کوئی مناسب خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بہ ادنیٰ غور وفکر اس فیصلہ میں کوئی تذبذب نہیں کہ نصف صدی

کے بعد خود حضرت شاہ صاحبؒ کو رسوا کرنے کی یہ شعوری وغیر شعوری خدمت بھی ایک بھیانک ظلم ہے۔ اپنے جذبات پر شدید احتساب کے باوجود جو کچھ چھلک پڑا بہ لہجۂ غالب اسکی معذرت بھی پیش ہے ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ سلسلۂ نسب کو حدیث کی طرح مسند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ حسب ونسب کے باب میں شنیدہ روایتوں پر اعتماد کرلیا جائیگا۔ اصطلاح فقہاء میں اسے تسامح کہا جاتا ہے۔ فقہاء کے اس واضح فیصلہ کے بعد حضرت شاہ صاحب سے متعلق ان کی قومیت کا مسئلہ عام شہرت کے مطابق طے شدہ ہے۔ تاہم تاریخ نگار کے فریضہ کی حیثیت میں ان مشکوک ومشتبہ تفصیلات پر بھی نظر ڈال لی جائے جو سر دست فراہم ہیں۔

کشمیر میں موجود حضرت موصوف کے خانوادہ میں تین شجرے خود راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب نے اپنے تحقیقاتی مقالہ بنام "مولانا انورشاہ" میں ان میں سے کچھ جمع بھی کر دئے ہیں۔ ماہرین انساب انھیں دیکھ لیں کہ یہ کس حد تک صحیح ہیں۔ پھر خود کشمیر میں خانوادۂ انوری میں ایک مخطوطہ موجود ہے جسمیں حضرت شاہ صاحبؒ کے مورثِ اعلیٰ کو "از اولاد میر سید کرمان" لکھا ہے اور یہ تو بالکل حقیقت ہے کہ اس خاندان میں ابتدا سے تا راقم الحروف سادات کی لڑکیاں یا اس خاندان کی لڑکیاں سادات میں آتی جاتی رہیں۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم کی والدہ سیدہ تھیں آپ کی اہلیہ سیدہ تھیں۔ برادر اکبر مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کی موجودہ اہلیہ سیدہ ہیں۔ خاکسار کی مرحومہ اہلیہ سادات سے تھی۔ میری ایک ہمشیرہ سادات ہی میں بیاہی گئیں۔ ایک برادر زادی خاندان سادات میں منسوب ہے۔ راقم الحروف کا پورا ننھیالی سلسلہ قصبہ گنگوہ کے سید خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ چپ وراست میں سادات سے ایک طویل وعریض تعلق موجود ہے۔ مفسرین ومحققین علماء نے بعض آیات کے تحت واضح طور پر لکھا ہے کہ شرف نسب حاصل کرنے کے لئے اگر ننھیال سادات سے ہو تو اسکی جانب انتساب کرتے ہوئے خود کو سید کہنا ولکھنا جائز ہے۔ اسلئے خانوادۂ انوری کے بعض افراد اگر خود کو سید لکھتے ہیں یا حضرت شاہ صاحب نے اپنے نام کے ساتھ سید کے ضمیمہ کو حرف غلط قرار نہیں دیا تو یہ کوئی مجرمانہ اقدام نہیں تھا جس کے لئے نصف صدی کے گذرنے پر بعض ناعاقبت اندیش قلم سزادہی کے لئے پر تول رہے ہیں۔

یہ تصریح بھی غیر مناسب نہ ہوگی کہ یہ بے بضاعت اپنے قلم سے اپنے لئے سید نہیں لکھتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس انعام خداوندی کی وسعتوں اور گہرائیوں کا منکر ہے بلکہ اسلام سے معمولی واقفیت نے اسے اس راہ پر بے اختیار پہونچا دیا کہ فخر بالانساب کی اسلامی تصورات میں کوئی اہمیت نہیں۔ سوانح کی تکمیل کے لئے وہ شجرے بھی شریکِ کتاب ہیں جو کشمیر کے خاندان میں محفوظ ہیں اور جنکی صحت مشکوک ہے۔

ان شجروں میں حضرت شاہ صاحب کا منتہائے نسب حضرت سیدنا امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ ہیں۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کی نسلی شاخیں ہندوستان میں موجود ہیں اور الحمدللہ کہ ان میں ہندوستان کی بعض اساسی شخصیتیں وارباب شیخیت شریک ہیں۔ پانی پت کے بعض اولیاء کبار اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصبہ گنگوہ کے مشہور و معروف قطب عالم حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ نسلاً امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ ہی سے شرف نسب لئے ہوئے ہیں۔ گنگوہ میں یہ حضرات قدوسی و پیرزادگان سے شہرت یاب ہیں۔ بمبئی کے حکیم محمد سعید صاحب اجمیری جن کی حفیدہ حال ہی میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے صاحبزادے جناب اعظم صاحب لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے عقد میں آئیں۔ قدوسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کی بچیاں شیوخ وسادات میں بیاہی گئیں اور سادات کی اولاد اس خاندان سے منسوب رہیں۔ غرض یہ کہ ہندوستان میں حضرت امام اعظمؒ کی اولاد معزز خاندانوں سے متعلق ہے اور بجائے خود وہ احترام نسبی سے تہی دست بھی نہیں۔ اسلئے جن صاحب کے قلم نے حضرت شاہ صاحب کو سادات سے نکال کر "نعمانی" سلسلہ میں ڈال کر یہ مسرت حاصل کرنا چاہی تھی کہ اسطرح مرحوم کا استخفاف کریں، سطور بالا کی روشنی میں قارئین انھیں اس مسرت سے محروم ہی سمجھیں گے۔

اب ان شجروں کو دیکھئے جو کشمیر کے خانوادۂ انوری میں موجود ہیں یہ دو شجرے ہیں اور قدرے اشتراک کے ساتھ، پھر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہی امر ان کی صحت کو مشکوک کرتا ہے۔

شجرہ کا

بر صفحہ

نمبر ۲۴

انور شاہ کشمیری

معظم شاہ
عبدالکبیر
عبدالخالق
پیر اکبر
پیر حیدر
عارف باللہ
بابا علی
شیخ عبداللہ
شیخ مسعود نوری
شاہ جنید
میمون شاہ یا قاسم شاہ
ہومان شاہ
ہرمز

معظم شاہ
عبدالکبیر
عبدالخالق
پیر اکبر
پیر حیدر
عارف باللہ
بابا علی
شیخ عبداللہ
شیخ مسعود نوری
شاہ جنید
میمون شاہ یا قاسم شاہ
عبداللہ
عبدالرشید
عبدالرحمٰن
تقی اللہ
عبدالسلام
مجید الدین
عبدالرب
عبدالوہاب
نجی اللہ
نجم الانصاری
حارث
ناوطی

حضرت شاہ صاحب مرحوم کے آباء و اجداد دو سو سال قبل بغداد سے ہندوستان پہونچے اور مختلف مقامات پر قیام کرنے کے بعد کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ آپ کا پورا سلسلہ اولیاء اللہ اور کاملین سے سرافراز ہے۔ خصوصاً "شاہ فتح اللہ" اور "شاہ مسعود نروری" ہر دو کے مزارات کشمیر میں مرجع خاص و عام ہیں۔ شیخ مسعود نروری رحمۃ اللہ علیہ جن تک حضرت شاہ صاحبؒ نے بیشتر اپنا نسب پہونچایا ہے۔ سری نگر کے ایک دور افتادہ محلہ "نروره" میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا شمار کشمیر کے متمول لوگوں میں تھا اور اس قدر وسیع کاروبار تھا کہ "ملک التجار" کے لقب سے شہرت پائی۔ حضرت شاہ کرمان ابو الفیاض رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ یہ وہی شاہ کرمان ہیں جو میر سید کرمانی رئیس الاولیاء کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ان اشعار میں ان کی منقبت بیان کی ہے۔

نالم کہ خستہ حالم از نفس زشت کردار	افتادہ ام نگوں سار از جرم خویش ناچار
شرمندہ ام ز عصیاں لیکن گرفتہ از جاں	فتراک شاہ کرماں، سرخیل خیل ابرار
قطب مدار دوراں، ہادیٔ پیر پیراں	سر حلقۂ کریماں، دریائے فیض دادار
انور چہ چیز دارد کہ آں ارمغانے آرد	رسوائی و ندامت، انجام کار نادار

میر سید کرمانی قدس سرہٗ کے حالات مشہور ہیں بلکہ کشمیر کے ہر مؤرخ نے ان کے تفصیلی حالات کا ذکر کیا ہے۔ ۹۷۶ھ میں شاہِ کرمان نے شیخ مسعود نروری کو ایک خاص تحریر خلافت کے ساتھ کچھ تبرکات عطا فرمائے اور دستاویز خلافت میں لکھا "یہ تبرکات میرے بزرگوں سے حاصل ہوئے ہیں اور اب میں انھیں شیخ مسعود نروری کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس وثیقہ پر بابا شنکر نظام الدین اور حسن کو گواہ بنایا گیا ہے "نروره" محلہ میں سطح زمین سے مرتفع چبوترہ پر شاہ مسعود نروری اور ان کے دو صاحب زادوں کے مزار ہیں جن میں ایک شاہ مجنوں ہیں جو مدتوں خدمتِ خلق میں مصروف رہے۔ شیخ نروری کے لوح مزار پر چند اشعار کندہ ہیں جن سے آپکی ان عظمتوں کا کچھ پتہ چلتا ہے جو عوام کے اذہان و شعور میں آپکے لئے تھیں۔ صاحب سوانح کے والد مولانا معظم شاہ صاحب[عہ] ضلع مظفر آباد تحصیل کرناؤ میں پیدا ہوئے

عہ مرحوم نے دو شادیاں کیں جن سے اولاد ذکور میں سب سے بڑے صاحبزادے جواں مرگ مولانا محمد یسین شاہ ذکی ذہین، مستعد عالم، پرگو شاعر اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد انور شاہ مرحوم سے بہت مانوس، طالب علمی میں حضرت شاہ صاحب شعر فرماتے اور وہ لکھتے۔ شادی ہوئی نئے نئے ایام عروسی گھر پر وار دین و صادرین کا ہجوم، بیاہی دلہن (بقیہ)

یہ وادیِ کشمیر کے ایک جید عالم اور خانقاہ نشین بزرگ تھے۔ ہزاروں کشمیریوں نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ سہروردیہ سلسلہ میں مجازِ طریقت تھے۔ ایک سو پندرہ سال[۱۱۵] کی طویل عمر میں وفات پائی اور اپنے نامور و فاضل روزگار بیٹے کے سانحۂ وفات کا دلدوز منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مرحوم کے حادثۂ رحلت سے پہلے قادیانیوں نے ازراہِ شرارت نہ صرف اخبار میں حضرت شاہ صاحب کی رحلت کی خبر شائع کی بلکہ مرحوم دادا کو حادثہ کا ٹیلیگرام بھی دے ڈالا

صفحہ کا بقیہ :- کے ساتھ بالاخانہ پر اور گھر میں صرف دادی صاحبہ کھانے کی تیاری میں مشغول، مرحوم دادا جو صاحبِ جلال بھی تھے باہر سے تشریف لائے دادی صاحبہ کو تنہا مصروف پاکر تایا کی دلہن کے بارے میں دریافت کیا اور انہیں بالاخانہ سے نیچے آکر کھانے کی تیاری میں شرکت کے لئے فرمایا۔ سوءِ تقدیر کہ مرحوم نے عدول حکمی کی بلکہ اپنی دلہن کو لے کر سسرال منتقل ہو گئے۔ دادی صاحبہ اس حادثہ کا اخفاء چاہتی تھیں لیکن جدامجد کو معلوم ہو گیا اور بے اختیار زبان پر آیا کہ چالیس[۴۰] روز کے بعد یٰسین شاہ کا جنازہ آئے گا اور میں نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھوں گا۔ حدیث شریف میں ماں باپ کی دعا و بددعا کی تاثیر و انکشاف کی گئی ہے۔ یہ کلمات حقیقت بن کر سامنے آئے اور ٹھیک چالیسویں دن ان کا جنازہ "ورنو" لایا گیا جسے دیکھ کر دادا صاحب اپنے رہائشی کمرہ میں تشریف لے گئے اور جنازہ کی نماز میں شرکت نہیں فرمائی۔ مولانا یٰسین شاہ صاحب کتخدائی کے مختصر عرصہ کے بعد لاولد ہی دنیا سے رحلت پذیر ہوئے۔ فرزند دوم صاحب سوانح اور تیسرے لڑکے مولانا عبداللہ شاہ صاحب ہیں جنھوں نے علومِ متداولہ کی تحصیل اپنے والد سے کی اور پھر طب پڑھی۔ اس فن میں حذاقت ایسی بہم پہونچائی کہ کشمیر کے عام باشندے ان سے رجوع کرتے بعمر تقریباً اسی[۸۰] برس وفات پائی۔ صرف ایک صاحبزادے محمد سعید اور کئی لڑکیاں پسماندگان ہیں۔ چوتھے صاحبزادے سلیمان شاہ صاحب جو ایک انگریزی اسکول میں ماسٹر تھے نہایت خوش خلق ملنسار حضرت شاہ صاحب کے حلقہ سے متعارف اور پابندی سے سب سے مراسلت رکھتے بعمر ساٹھ[۶۰] سال کشمیر ہی میں وفات پائی۔ پسماندگان میں لڑکے و لڑکیاں ہیں۔[۵] پانچویں نظام الدین شاہ صاحب معمولی پڑھے لکھے لیکن فارسی میں ماہر و شاعر، چوراسی[۸۴] سال کی عمر میں وفات ہوئی کئی بچے و بچیاں یادگار ہیں۔ چھٹی اولاد مولانا سیف اللہ شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے فاضل، صورۃً حضرت شاہ صاحب سے اشبہ اور اپنے عہدِ شباب میں جوان رعنا تھے۔ طلبِ علم کے لئے طفولیت میں کشمیر سے خفیہ نکلے اور سیدھے دیوبند اپنے برادرِ بزرگوار کے پاس پہونچے۔ والد مرحوم اس وقت درس میں تھے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے بڑے بھائی کی نظر اٹھی اور برادرانہ شفقتوں نے بیتابانہ بلائیں لیں اسی وقت سبق ختم کر دیا اور اپنے رہائشی کمرہ میں لے کر پہونچے۔ دادا صاحب کی پریشانی کے پیشِ نظر چند روز کے بعد کشمیر روانہ کیا لیکن یہ کچھ عرصہ کے بعد پھر وارد دیوبند ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب سے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ فراغت پر کشمیر چلے گئے۔ فتویٰ نویسی کا شغل رہا آج سے تیس[۳۰] پینتیس[۳۵] سال پہلے دوبارہ دیوبند آئے تو مولانا قاری محمد طیب صاحب کی عنایت سے بعہدۂ مدرسی و افتاء نویسی دارالعلوم میں تقرر ہوا۔ چند ماہ تدریس کا سلسلہ رہا کہ کشمیر سے جدامجد کی وفات کی اطلاع پہونچی تو واپس کشمیر چلے گئے اور اب وادی کے گلزاروں میں موت کی چادر لپیٹ کر ہمیشہ کے لئے محوِ خواب ہیں۔ اسی[۸۰] سے متجاوز سن و سال ہوا ظریف الطبع و بذلہ سنج تھے۔ اپنے والد مرحوم کے بعد ان کے جانشیں ہوئے کشمیر کا بڑا حلقہ سلسلۂ بیعت میں داخل ہے۔ مرحوم کا صرف ایک لڑکا شریف اللہ اور کئی لڑکیاں ہیں۔ دادا مرحوم کی ان اہلیہ سے علاوہ ان اولادِ ذکور کے لڑکیاں بھی تھیں جن میں سے صرف ایک پھوپھی کی صاحبزادی بقیدِ حیات ہیں۔ دوسری اہلیہ سے ایک ہی لڑکا ہوا جنکا نام محمد شاہ ہے پچاس[۵۰] و ساٹھ[۶۰] کے درمیان عمر ہے اور ہمارے چچاؤں میں اب صرف ایک ہی رہ گئے ہیں۔ پھواڑہ اور ورنو کے درمیان درگولا نامی بستی میں تجارتی پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ عافاھم اللہ فی الدنیا والآخرۃ۔

وہ اس وقت مسجد سے بعد نماز عصر نکل رہے تھے کہ یہ ٹیلیگرام پہونچا۔ ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ جب ترجمہ کر کے مضمون بتایا گیا تو کمر کی ہڈی اس زور سے چٹخی کہ قریب کے لوگوں نے سنا اور پھر ہمیشہ کے لئے کوز پشت ہو گئے لیکن صبر کامل کے ساتھ پیکر تسلیم و رضا بن گئے۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد سالہا سال بہ قیدِ حیات رہے۔ کشمیر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور "ورنو" میں مزار پرانوار ہے۔

ولادت، طفولیت، آغاز تعلیم:۔ ۱۲۹۲ھ شوال کی ستائیس تاریخ مطابق ۱۶ / اکتوبر ۱۸۷۵ء ہفتہ کا دن، صبح صادق کے وقت علامہ مرحوم اپنی ننھیال "دودوان" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں کپواڑہ سے قریب وادی لولاب میں واقع ہے۔ آپ کی والدہ عابدہ زاہدہ تھیں۔ والد اپنے علاقہ کے ایک معروف شیخ بلکہ خواص وعوام میں ایک مقبول شخصیت کے مالک تھے۔ اسطرح آپ کی پرورش اور طفولیت کا ابتدائی دور ایسے ماں باپ کی آغوش میں گذرا جن سے زہد و قناعت نیکی وولایت کے اولین سبق ملے۔ عمر کا پانچواں سال شروع ہوا تو والد ماجد سے قرآن کریم پڑھنا شروع کیا اور مختصر مدت میں ناظرہ مکمل کر لیا ساتویں سال کی عمر میں فارسی کی بعض کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔ والد مرحوم نے بعد میں گلستاں بوستاں جامی نظامی خسرو دہلوی اور جلال الدین دوانی کی نظم ونثر میں معیاری کتابیں پڑھا دیں جس سے فارسی میں وہ قوت و دستگاہ حاصل ہوگئی جسکا اظہار آپ کی بے تکلف فارسی نثر و نظم سے ہوتا ہے۔ فارسی سے فراغت کے بعد مولانا غلام محمد رسونی پورہ سے عربی شروع کی اور ڈیڑھ ہی سال میں صرف ونحو فقہ واصول فقہ وغیرہ کی تکمیل کر لی۔ بچپن میں ذکاوت و ذہانت اور ایک تابناک مستقبل کے آثار چہرہ و بشرہ سے عیاں تھے۔ آپ کے والد صاحب کا بیان ہے کہ انور شاہ جب مختصر القدوری مجھ سے پڑھ رہے تھے تو کبھی ایسے سوالات کرتے جنکا جواب اہم فقہی کتابوں سے مراجعت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کشمیر میں علوم وکمالات کی ابتدائی تکمیل کے بعد حصول علم کے لئے ۱۳۰۵ھ میں وطن عزیز چھوڑ دیا۔ شفیق ماں باپ نے اس ارادے سے روکنے کی کوشش کی لیکن درخشاں مستقبل کا یہ امین وطنِ مالوف سے ہزارے کے لئے چل پڑا۔ اس دور میں ہزارہ علم کا مرکز اور پختہ کار علماء کا مستقر بنا ہوا تھا۔ تین سال یہاں قیام فرما کر علوم کی تحصیل کی لیکن جو تشنگی آپ محسوس کر رہے تھے اسکی سیرابی یہاں ممکن نہیں تھی۔ کشمیر میں بعض اساتذہ سے دیوبند کا ذکر سنا اور یہ بھی کہ علوم اسلامیہ کی واحد یونیورسٹی دیوبند میں ہے جہاں کے اکابر اساتذہ کی شہرت عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ

گئے ہوئے تھی۔ دیوبند کا یہ وہ دور تھا جسکی سیادت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے تھے جنکی شخصیت میں ایک طرف اگر شیخ السنۃ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے کمالات باطنی جلوہ گر تھے تو دوسری جانب لسان الحکمۃ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف پرتو فگن تھے۔ چنانچہ ۱۲۸۳ھ میں دیوبند تشریف فرما ہوئے

عہ حضرت مولانا محمود حسنؒ :۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ کے فاضل روزگار تلمیذ، ملا محمود دیوبندی کے ابتدائی شاگرد، دارالعلوم دیوبند کے صدر نشیں اور تحریک استخلاص وطن کے امام، وطن مالوف دیوبند عثمانی خاندان کے گلشن سدا بہار، فطری ذکی و ذہین ستارۂ بلندی ان کے فلک سر پر ضوفگن، حضرت نانوتوی ایسا آفتاب نشاں استاد میسر آیا تو اس چشمۂ نور سے انوار علم و ولایت کے وہ ذخیرے اخذ کئے جنکی مثال ممکن نہیں۔ مولانا نانوتوی کے ایسے جاں نثار و فداکار شاگرد کہ استاذی و شاگردی کی تاریخ میں اسکی مثال کم ہی ملے گی حضرت نانوتوی ہی کیا انکے اعزاء و اقارب کی خدمت بھی اس فدائیت سے انجام دی جو انکی خاص سعادتوں سے تعلق رکھتی ہے فراغت کے ساتھ دارالعلوم میں معین المدرس بنا دئے گئے ابتدائی کتابیں زیر درس رہیں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی آپکے اسی دور کے شاگرد ہیں۔ بتدریج دارالعلوم کے عہدۂ صدارت پر پہونچے تو اپنے علمی و عملی کمالات سے اس عہدۂ جلیل کو وہ زینت بخشی کہ ہند و پاکستان کی دینی درسگاہیں اس اجاگر تاریخ سے خالی ہیں۔ حضرت مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ حلقۂ تلامذہ سے علم و عمل کے آفتاب و قمر اٹھے۔ صاحب سوانح حضرت شاہ صاحب کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ صاحب، علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا فخرالدین مرحوم، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی وغیرہ آپکے وہ تلامذہ ہیں جو آپ کے کمالات علمی و عملی کا تعارف ہیں۔ حریت وطن کی تڑپ اپنے استاذ اکبر سے لی اور پھر یہ امین و وارث جہد آزادی کا خود ہی علمبردار بن گیا آپ سے متعلق تفصیلی تذکرے منظر عام پر آچکے ہیں اسلئے ہیچ پوچ قلم اسی مختصر پر اکتفا کرتا ہے۔

عے مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ :۔ حضرت موصوف نے دہلی میں تعلیم پوری کی اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی، بدعات و محدثات کے خلاف جہد مسلسل میں صلابت کا یہ عالم تھا کہ اپنے مرشد کامل کے بعض افکار سے متصادم رہے۔ چشتی سلوک کے امام اور اہل اللہ کے حلقوں میں قطب و عالم ربانی کے القاب سے شہرت رکھتے ہیں۔ بدعات و محدثات کی بیخ کنی میں تن تنہا وہ کام کر دکھایا جو علماء حق کی ایک مجلس اور انجمن ہی کر سکتی ہے۔ آج دیوبند کے مزاج میں سنت کا غلبہ بدعات سے نفرت اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ وافر اور دین حق کے قیام کے لئے سرگرمی بلاشبہ حضرت مولانا گنگوہی کی وراثت ہے اور بہت کم لوگوں کو اسکا علم ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کو بھی منہاج قویم پر کھینچنے والے موصوف ہی ہیں۔ گنگوہ کی خانقاہ میں تزکیہ و تصوف کی تعلیم کے ساتھ درس حدیث کا بھی مسلسل شغل رہا حضرت شیخ الہندؒ مولانا خلیل احمد صاحبؒ مولانا صدیق احمد صاحبؒ انبیٹھوی۔ شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائپوری مولانا حسین احمد مدنیؒ اور انکے برادر اکبر حضرت ہی کی خانقاہ سے طلوع ہونیوالے آفتاب ہدایت ہیں۔ آخر عمر میں زہریلے جانور کے کاٹنے کی وجہ سے شہادت کے عالی مقام پر رسائی ہوئی۔ پسماندگان میں حکیم مسعود صاحب نامی گرامی طبیب اور بڑے طنطنہ کے صاحبزادے تھے اسوقت مولٰینا سعید احمد گنگوہی نبیرۂ حضرت مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند اور جناب مولٰینا حکیم عبدالرشید محمود صاحب اور ان کے برادر اصغر بقید حیات ہیں۔ آپ کا مفصل تذکرہ مؤلفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی (تذکرۃ الرشید) کے نام سے بار بار شائع ہوا ہے۔

سہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی :۔ صبح ازل سے شام حشر تک نہ جانے ربانی آگئے

تو مدرسہ کے جائے وقوع اور ذمہ داران مدرسہ سے ناواقفیت کی بنا پر دارالعلوم سے قریب شہر کی مشہور مسجد قاضی میں فروکش ہوئے۔ غربت و ناداری کی بنا پر کئی وقت مسلسل فاقہ رہا لیکن اس فقر و فاقہ کا کسی سے تذکرہ بھی نہ آیا۔ اس زمانہ میں اس مسجد کے متولی قاضی احمد حسین تھے موصوف نے اس ہونہار طالب علم کے چہرے پر آثار نجابت و شرافت کے ساتھ شدید گرسنگی

صفحہ ۲۸ کا بقیہ:۔ افق کائنات پر علم و کمال، دانش و بینش، عبقریت و نابغیت کے کتنے آفتاب و قمر طلوع ہوئے اور ہوں گے۔ زمین بیشمار ان ہستیوں کو اپنے بطن میں امانت کے طور پر لئے ہوئے ہے جنکے مقدس وجود خود اس زمین پر کائنات کا اجالا، دنیا کی روشنی، چمنستان کی بادِ نسیم اور گلشن کے برگہائے گل تھے۔ نانوتہ کیا ہے نہ کوئی تاریخی بستی نہ کوئی نام آور شہر نہ سیاحتگاہِ عالم نہ دامن کش قلوب مگر خدائے تعالیٰ کی غیر محدود رحمتوں کو کون ہے کہ جو کسی خاص قوم، کسی علاقہ، کسی بستی و کسی خاندان تک محدود کرلے۔ جب لطیف و قدیر ہستی ہندوستان میں امت مرحومہ کی زبوں حالی و نکبت، تنزل اور پستی کی تحریر کلک تقدیر سے لکھ چکی تو اسی مقتدر و توانا کی مشیت نے مریضِ امت کے لئے ایک ایسے طبیب کا بھی وجود مقدر کیا جس کی تدبیر، جس کا علم جس کا فضل اور جس کا کمال اس امت کے لئے نسخۂ شفا ہو، عمارت کو گرانے کا فیصلہ ہوا تو خلاقِ عالم نے ایک ایسا معمار بھی تجویز کیا جو تیرھویں[۱۳] صدی کے اوائل اور بارھویں[۱۲] صدی کے اختتام پر مسلم قوم کی نشأۃ ثانیہ کا علمبردار ہو۔ اگر "دلی" اجڑے تو معمورۂ "دیوبند" اس کے دم قدسی سے ایک تازہ رونق پائے۔ اگر دنیوی سلطنت لٹے تو علم و دانش کی ایک نئی حکمرانی وجود میں آئے۔ اے خدائے لم یزل ولایزال تیرے بے نہایت افضال کا شکریہ کہ تو نے بربادی میں آبادی تخریب میں تعمیر، موت میں حیات اجڑنے میں بسنے کے انتظامات کئے۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ صرف ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں بلکہ فکر کے امام ہیں وہ صرف ایک عالم نہیں بلکہ جنود ربانیہ کے سپہ سالار ہیں وہ ایک فرد نہیں بلکہ وقت کی ایک امت ہیں انھوں نے دارالعلوم قائم کرکے پچھلوں کو وہ متاعِ بے بہا عنایت فرمائی جسکے بارِ احسان سے اخلاف کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ وہ کیا تھے؟ داعی الی اللہ، مبلغِ اسلام، متکلم دین، حکیم الاسلام، محدث و مفسر، فقیہ و مناظر، عالم باعمل، درویش صفا کوش، فقیر خرقہ پوش، اسرارِ شریعت کے ایسے بحرِ ناپید اکنار جس نے عقائدِ اسلام میں پیدا کردہ رخنوں کی درستگی میں اپنی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ صرف کیا۔ آپ کے علوم کتابی نہیں بلکہ کمالات وہبی ہیں پھر ان معارف کو ایسی زبان سے ادا کیا جسکی کاٹ شمشیر براں سے تیز ہے۔ خود مولانا نانوتوی کے شیخ عارف باللہ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی موصوف کے متعلق فرماتے تھے کہ "مولانا قاسمؒ کی نظیر اسلام کے شاندار ماضی ہی میں مل سکتی ہے۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی تحصیل علوم ہی میں ایک دوسرے کے رفیق نہیں بلکہ سلوک و تصوف میں بھی ایک دوسرے کے رفیق سفر ہیں۔ ان دونوں کے شیخ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دونوں مریدان باصفا کے متعلق "ضیاء القلوب" نامی تصنیف کے آخر میں رقمطراز ہیں کہ "انقلاب کا یہ رنگ بھی قابل دید ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے بیعت کی حالانکہ مجھے ان سے مرید ہونا چاہیئے تھا۔" مہاجر مکی رحمۃ اللہ کا یہ ارشاد انکی فطری تواضع کا آئینہ دار ہے ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے علوم و کمالات ان کے مرشد کامل کے کمالات کا عکس و ظہور ہیں۔ تاہم مرشدِ کامل کا یہ ارشاد دونوں باصفا ارادت مند حضرات کے علمی و عملی کمالات کا ایک پاکیزہ اعتراف ہے۔ امام العصر

(باقی آگے)

کا نمایاں اثر دیکھا تو دریافت کیا کہ میاں تم کس ارادے سے دیوبند آئے ہو؟ ارشاد ہوا کہ حضرت مولانا محمود حسن سے حدیث پڑھنے کے لئے کشمیر سے آیا ہوں۔ متولی صاحب نے پہلے کھانا کھلایا پھر اس نووارد کو لے کر شیخ الہند مرحوم کی خدمت میں پہنچے اس وقت دارالعلوم میں نہ مطبخ تھا اور نہ دارالاقامہ میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مطابق گنجائش، چنانچہ آپ پٹھانپورہ کی جامع مسجد میں مقیم ہو گئے اور مدتوں اس مسجد کی امامت کے ساتھ حمام میں پانی بھرنے مسجد کی صفائی، صفیں بچھانے اور اٹھانے کا کام انجام دیتے رہے یہیں آپ کا تعلق بجنور کے ایک رئیس زادے مولانا مشیت اللہ[ع] صاحب سے ہوا۔ پٹھانپورہ کی مسجد کے حجرہ میں بھی کچھ

ص۲۹ کا بقیہ :- مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ان دونوں حضرات کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں اس طرز کی ہستیاں ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مبدء فیاض کبھی کبھی ابر نیساں سے ان قطرات کی بارش کرتا ہے جو انسانی صدف میں سب سے قیمتی موتی بنتے ہیں ان دونوں اکابر کے تعارف میں یہ مختصر تفصیل اس وجہ سے ضروری تھی کہ علامہ کشمیری کے کمالات علمی و عملی ان دونوں کا آئینہ دار ہیں وہ اسطرح کہ شاہ صاحب نے صحیح امام بخاری، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور ہدایہ آخرین حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں۔ موصوف مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے علوم و معارف کے سب سے بڑے ترجمان اور وارث تھے۔ یہ ہے وہ پُرانوار و سنہری کڑی جو مولانا کشمیری کو ان دونوں سے جوڑتی ہے۔

ع مولانا مشیۃ اللہ صاحب مرحوم بجنوری :- بجنور کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ، دل کے غنی، پوشاک کے غریب، عمل کے مسلمان، عقیدہ کے مومن، معصومیت، بھولا پن اور سادگی کے پیکر تھے سینکڑوں بیگھہ زمین کے مالک بعض گاؤں بھی ان کی ملکیت میں، لیکن معمولی کرتا شرعی پاجامہ دھوڑی کا جوتہ سر پر دوپلی ٹوپی، اپنے طرز میں صلابت کا یہ عالم کہ مولوی سلطان الحق ناظم کتبخانہ دارالعلوم دیوبند ایک مرتبہ گرگابی پہن کر ان کے یہاں جا پہونچے تو بولے کہ "اللہ جانے مولوی صاحب تم میں بھی فرنگیت آگئی"۔ اللہ جانے مرحوم کا تکیۂ کلام تھا۔ شاہ صاحبؒ کے رفیق درس اور ایسے رفیق کہ اپنی امارت کے باوجود مرحوم کی غربت کے شریک کار، شاہ صاحب پٹھان پورہ کی مسجد میں امامت کرتے تو بجنور کا یہ رئیس زادہ حق رفاقت ادا کرتے ہوئے سقایہ بھرتا بعد مغرب دونوں ہمراہ دارالعلوم آتے تو راہ چلتے شاہ صاحب مولانا مشیت اللہ صاحب کو آسمان پر موجود ستاروں کی تشخیص و تعیین ان کی بروج و گردش، فلکیات کا سبق پڑھاتے مولانا مشیت اللہ صاحب کو بھی اپنے اس نامور ساتھی سے عجیب و غریب تعلق تھا۔ زمانہ طالب علمی میں گھر پہونچے اور اپنے ماموں مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب جنکی حذاقت پر اعتماد کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی، ٹی بی کے مریض کو بجنور علاج کے لئے ان کی خدمت میں بھیج دیتے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب نے ان سے شاہ صاحب

باقی
آگے

وقت گذارا۔ اس دور میں دار العلوم کا اہتمام منشی فضل حق صاحب سے متعلق تھا اور صدارت تدریس حضرت شیخ الہندؒ سے۔ نصاب میں ہر فن کی معیاری کتابیں داخل تھیں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۱-۱۳۱۲ھ میں بخاری شریف، ترمذی شریف، جلالین شریف، ہدایہ جلد اول، قاضی مبارک اور ۱۳۱۲ھ میں ابو داود شریف، مسلم شریف، بیضاوی شریف، تصریح، شرح چغمنی، صدرا، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، شمس بازغہ، طب میں نفیسی پڑھی۔ دار العلوم

صفحہ ۳۰ کا بقیہ:- کا وقیع تذکرہ کیا اور یہ بھی خوشخبری سنائی کہ میری دعوت پر وہ بجنور آرہے ہیں۔ حکیم صاحب طبی مشغولیت کے باوجود بڑے علم دوست وعلماء پرور تھے پھر اپنے بھانجے سے آنے والے کا وقیع تذکرہ سنا تو سراپا اشتیاق بن گئے اسٹیشن پر اپنے خادم کو استقبال کے لئے بھیجا شاہ صاحب اترے تو بے ریش وبروت جوان رعنا حسن وکشش کا پیکر، خادم نے حکیم صاحب سے جاکر کہا کیسا عالم کہاں کا عالم وہ تو ایک طفل نوخیز ہے مشیت اللہ نے اسکے تعارف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ شام کو میزبان اور مہمان یکجائی کھانا کھاتے تھے کہ اچانک حکیم صاحب تشریف لے آئے شاہ صاحب ان کو دیکھ کر سروقد ہوگئے چارپائی پر نشست اسطرح تھی کہ سرہانے حکیم صاحب اور پائنتی پر سبزہ آغاز مہمان، علمی گفتگو شروع ہوئی جسکا سلسلہ اس وقت کے مشہور عنوان امتناع نظیر پر جا پہونچا حکیم صاحب اس زمانے میں امتناع نظیر پر کتاب تصنیف کر رہے تھے چند ہی لمحات کی گفتگو کے بعد جوہر شناس حکیم صاحب نے شاہ صاحب کو پہچان لیا بے اختیار کھڑے ہوگئے ہاتھ پکڑ کر سرہانے بٹھادیا اور خود سامنے کی چارپائی پر آگئے صبح ہوئی تو جس خادم نے طفل نوخیز کا عنوان دیا تھا تو ان سے فرمایا میاں جسے تم محسن کہہ رہے تھے وہ ہم بڑوں کے کان کتر رہا ہے پھر اپنی تصنیف پر شاہ صاحب سے تقریظ بھی لکھوائی جو حکیم صاحب کی مطبوعہ تصنیف میں موجود ہے غرض یہ کہ اس خاندان سے شاہ صاحب کا تعلق اس درجہ مستحکم تھا کہ دار العلوم کی تعطیلات سالانہ بجنور ہی گذارتے بیمار ہوتے تو مولانا مشیت اللہ چونکہ یہ جانتے تھے کہ شاہ صاحب پرہیز کے عادی نہیں جبراً مرحوم کو بجنور لیجاتے اور یہاں مکو کی ترکاری خرفہ کا ساگ کاسنی کی بھجیا پیہم کھلاتے۔ رفیق درس ہونے کے باوجود بھری مجلس میں سوال کرتے تو لب ولہجہ یہ ہوتا، اللہ جانے مولوی صاحب وہ مسئلہ کیا تھا یاد نہیں رہا۔ تعلقات کے استحکام کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کو تنبیہ آمیز لہجہ میں بھی مخاطب کر لیتے۔ ایک بار ان کے وطن کشمیر کا بھی سفر کیا۔ اپنے ہمشیرزادہ مولانا شفیق الرحمٰن کی شادی میری بڑی بہن عابدہ مرحومہ سے کرکے تعلقات کی اس حسین عمارت کو رنگ وروغن بخشا۔ مولانا مشیت اللہ مرحوم ہر ماہ دیوبند آتے اور شاہ صاحب ہی کے پاس قیام کرتے۔ شاہ صاحب بھی اپنے خانگی معاملات میں انھیں اپنا مخلص گردانتے جس دن شاہ صاحب کا سانحۂ وفات پیش آیا تو خانوادۂ انوری کی جانب سے مولوی سلطان الحق صاحب ناظم کتبخانہ دار العلوم کو مامور کیا گیا تھا کہ وہ متعلقین کو ٹیلیگرام کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع دیں سوء اتفاق کہ مولانا مشیت اللہ صاحب کو بروقت ٹیلی گرام نہیں کیا جاسکا وہ اس کوتاہی پر مولوی سلطان الحق صاحب سے مدتوں کبیدہ خاطر رہے۔ پھر ہم پسماندگان سے بزرگانہ شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ دیوبند آتے تو ہمیں گھیر گھار کر بجنور لیجاتے۔ راقم الحروف کی عمر نو دس سال کی تھی ورم جگر کا مرض ہوا تو دیوبند آکر زبردستی بجنور لے گئے اور میری دلبستگی کے لئے اعزاء میں سے ایک ہم عمر کو ہمراہ لیا بجنور پہونچے وہی خرفہ کی ترکاری کاسنی کا عرق مکو کی بھجیا۔ رات ہوئی تو مجھے اپنے ساتھ ہی لیکر سوئے۔ بچپن اور ان کی نادانیاں والدہ مرحومہ کی یاد میں ساری رات چلایا

میں حضرت شیخ الہند، مولانا خلیل احمد صاحب[عہ] سہارنپوری، مولانا اسحاق صاحب[عہ] امرتسری اور مولانا غلام رسول صاحب[سہ] سے کسب علم فرمایا۔ دیوبند کے ان اساتذہ کے علاوہ

صلا کا بقیہ :۔ اور ان کے تسلی آمیز رویہ پر اور تو کچھ بن نہ پڑی۔ عیاذاً باللہ اپنی ننھی ننھی لاتوں سے مرحوم کی تواضع کی اس پر بھی مکدر نہ ہوئے صبح کو بہ مجبوری دیوبند روانہ کیا۔ چار عدد جوڑے خاکسار کے لئے زادِ رفیق سفر کے اور یہ ہرگز ہرگز نہیں بھولے گا کہ تانگے کے ارد گرد طواف کرتے اور اضطراب تمام سے کہتے "اللہ جانے تمہیں کیا ہو گیا تمہارے والد تو یہاں مدتوں قیام کرتے۔"

مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے دیوبند آتے تو مجھے اور برادر اکبر کو بہ خاموشی ایک گوشہ میں لیجاتے کمر بند میں بندھے ہوئے پچاس سے سو تک کے نوٹ نکال کر ایسی اخفائی کوششوں سے ہماری جیب میں ڈالتے گویا کوئی جرم کر رہے ہیں۔ راقم الحروف دار العلوم سے فارغ ہوا تو انکی مدرسی کیلئے انکی سعی و کوشش خود ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بائیس سال گذرتے ہیں کہ یہ پیکرِ شرافت، مجسمۂ انسانیت، شریفانہ روایت کا حامل بجنور کی خاک میں ہمیشہ کے لئے مستور ہو گیا۔ پسماندگان میں مولانا حکیم محبوب الرحمٰن القاسمی جو حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں۔ جناب مطلوب الرحمٰن صاحب بجنور میونسپلٹی کے ممبر رہے اور سب سے چھوٹے صاحبزادے جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند مؤخر الذکر کے انداز و اداؤں میں مرحوم باپ کی سیر چشمی، مہمان نوازی، مروت و شرافت کی جھلک آتی ہے خدائے تعالیٰ اس خانوادہ کو اپنی خاص رحمتوں سے سرفراز فرمائے کہ بجنور کی زمین پر ان کا گھرانہ مرجع انام اور دار الاضیاف ہے۔

عہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری :۔ دار العلوم کے طالب علم، مظاہر العلوم کے فاضل، شیخ الہند کے معاصر اور دار العلوم کے نائب صدر مدرس، حضرت گنگوہی مرحوم کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ جس وقت دار العلوم کی صدارت تدریس پر شیخ الہند جلوہ افروز ہوئے تو موصوف نے مظاہر العلوم سہارنپور بعہدۂ صدر مدرسی منتقل ہو کر فرمایا "دوست (محمود الحسن) کی ماتحتی میں نہ رہیں گے"۔ خلفاء میں اس وقت حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور حیات ہیں۔ تصانیف میں بذل المجہود لشرح ابی داؤد آپ کا علمی و تصنیفی شاہکار ہے۔ مدتوں مظاہر العلوم کی صدر مدرسی کے بعد موت نے ایک مقدس سرزمین میں اس خزینۃ الاصفیاء کو قیامت تک کے لئے بطور امانت لے لیا۔

عہ مولانا اسحٰق صاحب امرتسری :۔ افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اساتذہ میں سے مولانا اسحاق صاحب امرتسری کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

سہ مولانا غلام رسول صاحب :۔ ہزارہ کے رہنے والے دار العلوم دیوبند کے قدیم استاذ، شباب سے شیب تک کا زمانہ دار العلوم کی تدریس میں صرف کر دیا بلکہ لحد بھی دیوبند میں تلاش کی، عجیب و غریب مزاج اور حیرت انگیز روایات کے مالک جب بڑھاپے میں داخل ہوئے تو دار العلوم کے لئے تبرک بن گئے۔ سردی کے زمانہ میں مرزئی، اس پر فرغل اس پر چادر اور پھر لحاف کا بوجھ کھینچکر درسگاہ میں داخل ہوتے آتے ہی لیٹ جاتے اور فرماتے کہ ارے کوئی ہے جو مجھے دابے، طلبہ جسم دبانے کی سعادت حاصل کرتے اور سبق شروع ہوتا عبارت کے اختتام پر فقدہ آتا تو اندر ہی سے دریافت فرماتے کہ اس صفحہ کا فقدہ یا اس صفحہ کا نشاندہی پر تقریر شروع ہو جاتی نامور شاگرد شاہ صاحب دار العلوم کے صدر مدرس ہو چکے تھے اور ان کے علم کا بحر مواج تلاطم پذیر تھا۔ ان مفتی محمود صاحب نانوتوی سابق رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند صاحبزادہ ہونے کی بنا پر کہنے سننے میں جری

استاذ العلماء مولانا مفتی لطف اللہ علیگڈھی کے فخرِ روزگار شاگرد مولانا عبد الجمیل افغانی سے علم ہیئت کی تکمیل کی۔ دار العلوم سے فراغت پر آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا

ص۳۲ کا بقیہ:۔ تھے عرض کرتے کہ

"جب آپ سے پڑھایا نہیں جاتا تو مفت میں دار العلوم سے مشاہرہ کیوں لے رہے ہیں وہ دیکھئے آپ کے شاگرد حضرت شاہ صاحب کس شان کا درس دے رہے ہیں"

اس طنزیہ جملہ پر یہ سادہ دل پٹھان زائد کپڑے اتار کر پھینک دیتا سنبھلتے ہوئے ارشاد ہوتا "تو پھر میں کہوں گا کہ انور شاہ کو آتا ہی کیا ہے؟"

طلبہ کہتے کہ آپ عربی میں تقریر نہیں کر سکتے شاہ صاحب تو عربی میں تقریر کر لیتے ہیں۔ مرحوم کی عربی میں تقریر شروع ہو جاتی۔ اچھا آپ فارسی میں تقریر نہیں کر سکتے جبکہ آپ کے شاگرد فارسی میں قادر ہیں۔ اس پر فارسی میں تقریر ہوتی فرماتے کہ میں کئی زبانوں کا ماہر ہوں ان زبانوں کی فہرست میں اردو بھی داخل تھی۔ مفتی محمود صاحب نے عرض کیا اگر آپ اردو جانتے ہیں تو کریلا اور نیم چڑھا کا مطلب بتائیے؟ کچھ وقت کے لئے غوطہ زن ہوئے اور پھر ارشاد ہوا۔

"اور حرف عطف نے کام خراب کر دیا ورنہ بات صاف تھی کریلا نیم پر چڑھ گیا"

اس سادگی، معصومیت سے طلبہ بھی خوب لطف لیتے اور ذمہ داران مدرسہ بھی۔ مولانا معین الدین اجمیری صدر جمعیتہ علماء ہند دیوبند تشریف لائے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے تمام اساتذہ کو مطلع کیا کہ اسباق جاری رکھیں مولانا اجمیری گشت کریں گے خدا جانے مرحوم کو یہ اطلاع پہونچی یا نہ پہونچی وہ اپنی درسگاہ کو مقفل کر کے چلے گئے ادھر مولانا معین الدین اجمیر روانہ ہو گئے چائے کی مجلس میں مولانا عثمانی نے مزاحاً فرمایا کہ

"مولانا اجمیری فرماتے تھے کہ آپ کے شیخ المنطق کو میرے سامنے پڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی اس پر مولانا غلام رسول صاحب بستر باندھ کر اجمیر روانہ ہونے لگے کہ وہیں اپنا سبق سنا کر آؤں گا غرض یہ کہ حضرت مرحوم لطائف کی پوٹلی تھے۔ دیوبند کی جامع مسجد میں قیام تھا اور آئے دن شہریوں سے جنگ رہتی۔ ہر آویزش میں مدرسہ کے ذمہ داران کی حمایت کرتے۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا کہ

"عید الاضحیٰ کی تعطیلات تھیں اور میں اپنے کمرہ میں مصروف حاشیہ نویسی کہ اچانک مولینا غلام رسول صاحب تشریف لائے اور کھڑے کھڑے فرمایا۔

"اعزاز علی اگر میں مرگیا تو کتنا مجھ کو ایصال ثواب کرو گے۔"

کچھ عرض و معروض کے بعد جیب سے ایک تحریر نکال جس پر اپنے تمام تلامذہ سے ایصال ثواب کا وعدہ دستخطوں کے ساتھ لے رکھا تھا میں نے بھی ایصال ثواب کی مقدار متعین کرتے ہوئے دستخط کر دیئے پھر پوچھا کہ

"حضرت یہ آج آپ نے کیسی مہم شروع کی ہے؟"

فرمایا کہ "میری شہریوں سے آویزش رہتی مولوی حبیب ہمیشہ میرا ساتھ دیتا لیکن اس بار (باقی آگے)

ع مولانا عبد الجمیل افغانی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ سے حدیث کے علاوہ باطنی تعلیم بھی حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ صحیح مسلم، سُنن نسائی، ابن ماجہ شیخ محمد اسحاق کشمیری سے سبقاً سبقاً پڑھا۔ ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ پانچ۵ سال فارسی حاصل کرنے میں صرف ہوئے اور اگلے پانچ۵ سال عربی کی تحصیل میں۔ اسطرح آپ کی کل مدت تعلیم دس۱۰ برس ہے۔

فراغت اور دہلی میں تدریس:۔ علامہ مرحوم شباب ہی میں علوم وکمالات میں یکتائے روزگار ہوگئے اور آپ کی علمی شہرت عوام وخواص میں پہونچ گئی۔ مدرسہ عبد الرب کی تدریس سے متعلق کوئی مستند روایت راقم الحروف تک نہیں پہونچی۔ عموماً یہی مشہور ہے کہ دیوبند سے فارغ ہونے پر آپ اپنے رفیقِ درس مولانا مشیت اللہ صاحب رئیس بجنور کے یہاں مقیم تھے کہ آپ کے ایک رفیق مولوی امین الدین صاحب دہلوی بانی مدرسہ امینیہ سنہری مسجد دہلی جو آپ کے خاص قدرداںعہ اور طالب علمی سے آپ کے علمی امتیاز وتفوق سے واقف تھے بجنور تشریف لائے اور دہلی میں مدرسہ امینیہ کے قیام اور صدر مدرسی کے لئے اصرار کیا جسے آپ نے ردوقدح کے بعد قبول کیا۔ سنہری مسجد موجودہ دہلی میں فوارہ کے بالکل روبرو واقع ہے جسکے زیر سایہ کوتوالی اور اس سے متصل سکھوں کا بڑا گردوارہ ہے۔ یہی وہ مسجد ہے جسمیں نادرشاہ درانی نے آج سے ڈھائی سو سال قبل دہلی کی تباہی اور وہاں کی انسانی آبادی کے قتل عام کا منظر دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے رستاخیزی دور میں ان تین مغل شاہ زادوں کی نعشیں یہیں لٹکائی گئی تھیں جنہیں فرنگی دور کے مشہور سفاک ہڈسن نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ بہرحال ان دونوں حضرات کے معمولی سرمایہ اور دلی کے بعض صاحب خیر لوگوں کے تعاون وامداد سے ۱۳۱۵ھ میں چند طلبہ کو لیکر مسجد میں تعلیم شروع کردی گئی جسکے پہلے مہتمم مولوی امین الدین صاحب اور صدر مدرس علامہ مرحوم منتخب ہوئے بعد میں دو۲ تین۳ مدرس کا اور اضافہ ہوگیا۔ شاہ صاحب دہلی میں طب کی تکمیل کیلئے

ص۳۳ کا بقیہ:۔ کی لڑائی میں حبیب نے میری ترکِ حیات کی یہ میری موت کی علامت ہے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد یہ کہنہ سال، سادہ لوح عالم، ھزارہ کا انسان اور استاذ الاساتذہ ہمیشہ کے لئے گورستانِ قاسمی میں پیوندِ خاک ہوگیا۔ تربت کی خاص علامت بے نشانی ہے۔

عہ مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے سنایا کہ شاہ صاحب کے زمانۂ تدریس دار العلوم دیوبند میں مولوی امین الدین صاحب ایک بار دیوبند آئے تو شاہ صاحب کا جس کمرہ میں قیام تھا وہ کوئی خاص یا دیدہ زیب کمرہ نہیں تھا مولوی امین الدین صاحب نے مولانا اعزاز علی صاحب سے یہ دیکھ کر فرمایا کہ تم لوگوں نے انکو اسطرح رکھ چھوڑا ہے حالانکہ یہ تو دولہا بناکر رکھنے کے قابل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے قلب میں مرحوم کیلئے قدردانی کے کیسے گہرے جذبات تھے۔

طالب علمی کر چکے تھے اور وہاں کے علمی حلقے اسی وقت سے آپ کی استعداد و جامعیت کے معترف تھے چنانچہ اسی دور میں حکیم فتح محمد صاحب مظفر نگر کے مشہور طبیب نے بزمانۂ طالبعلمی مولانا نظیر حسین محدث دہلوی کے مشورہ سے ریاضی و ہیئت کی کچھ کتابیں حضرت شاہ صاحب سے پڑھی تھیں اسکے باوجود مدرسہ امینیہ جس بے سروسامانی میں شروع کیا گیا تھا ان حالات میں خود شاہ صاحب کو اس درسگاہ کی مقبولیت کا واہمہ بھی نہیں تھا ظاہر ہے کہ جس درسگاہ کا آغاز خود صدر مدرس کے دیئے ہوئے تین روپے کے عطیہ سے ہو رہا تھا اسکی ترقی و استحکام کی کون پیشین گوئی کرسکتا تھا خود شاہ صاحب کو اعتراف تھا کہ اس بے یار و مددگار مدرسہ کی شہرت و عظمت بانی مدرسہ کے اخلاص اور للٰہیت کی وجہ سے ہے۔ اسمیں اتنا اور اضافہ کیجئے کہ شاہ صاحب ایسے جامع العلوم صدر مدرس کے علمی تفوق نے بھی مختصر مدت میں اس درسگاہ کو ہندوستان کے نمایاں مدارس میں لا کھڑا کیا۔ راقم الحروف کی نظر سے مدرسۂ امینیہ کی ایک ابتدائی روئداد گزری ہے جسمیں غالباً نواب صاحب جوناگڈھ یا اسی ریاست کے کسی متمول علم دوست سیاح کا معائنہ درج ہے جسمیں شاہ صاحب کے درس میں شرکت کے بعد آپ کے تبحر، جامعیت اور فن حدیث میں غیر معمولی مہارت کا واضح اعتراف ہے۔ مولانا محمد میاں صاحب مرحوم مصنف "علمائے حق" نے لکھا ہے کہ "حضرت شاہ صاحبؒ کا یہاں پر مشاہرہ تین روپے تھا لیکن روئداد میں موصوف کے نام کے ساتھ حسبۃ للہ تدریس کا اضافہ ہے۔ اوّل تو روئداد کے مندرجات ثانیاً اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کا عمومی ذوق اس دوسری روایت ہی کی توثیق کرتا ہے لیکن روئداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھ سال بعد بیس روپیہ ماہوار آپ کی باقاعدہ تنخواہ متعین ہوئی۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ تک شاہ صاحب نے امینیہ میں درس دیا اور پھر اپنی والدۂ مرحومہ کی وفات پر کشمیر کا سفر فرمایا کشمیر پہونچے تو ابنائے وطن کی جہالت، بدعات و محدثات کا استیلاء، قزاقِ دین پیروں کا تسلط، دین سے بیگانگی، ان حالات نے مرحوم کو کشمیر ہی میں قیام اور وطن کی خدمت کے لئے خاص نصب العین کے مطابق کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ ابھی یہ خیالات آپ کے قلب و دماغ ہی میں تھے کہ بارہ مولا کے رئیس خاندان خواجہ عبدالصمد ککرو کے اصرار پر مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ مرحوم نے تین سال اس مدرسہ میں تعلیمی خدمت اور تبلیغی فریضہ کی ادائیگی کا وہ کام کیا جسکے نتائج نہایت خوش آئند تھے۔ قرب و جوار کے علاقے بدعت کی تاریکیوں سے آہستہ آہستہ باہر آرہے تھے اور سنت کی روشنی ان کی جگہ لے رہی تھی۔ آپ کا ایک فارسی مکتوب جو

دہلی کے ایک رفیقِ درس کو لکھا گیا تھا اسمیں فیضِ عام کے مقاصد واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔
"فقیر حقیر نے کشمیر کے مشہور قصبہ بارہ مولا میں علم دین کی اشاعت اور فقہ حنفی کی اعانت کے لئے ایک درسگاہ کی بنیاد ڈالی ہے جہاں فقہ وحدیث کی تعلیم بھی شروع ہوگئی بعض نیک نہاد اس اقدام کی خوبی پر مطلع ہوکر دین کی حمایت اور مدرسہ کی نصرت کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔
گرامی نامہ کا یہ اقتباس فیض عام کا بہترین تعارف کراتا ہے۔ بانی دارالعلوم حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ سے فضلاء دارالعلوم کو قیام مدارس کا جو جذبہ وافر بطور وراثت ملا ہے۔ مدرسہ امینیہ کی تاسیس کے بعد بارہ مولا کا فیض عام اسلاف کی سنت پر گامزنی کا دوسرا مظاہرہ تھا۔

سفرِ حرمین:۔ بارہ مولا کے قیام کے دوران حرمین کی زیارت کی آرزو ہوئی۔ گکرو خاندان کے بعض افراد کا تعاون اس آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ فیض عام کا انتظام بعض مخلص لوگوں کی طرف منتقل کرکے ۱۳۲۳ھ میں سفرحج کے لئے روانہ ہوگئے۔ مکہ مکرمہ میں چند ہفتہ قیام کے بعد مدینہ طیبہ حاضری دی۔ دونوں مقدس مقامات کے انوار وتجلیات سے روح کی پاکیزگی، باطن کا جلا حاصل کیا۔ مدینہ منورہ میں "رسالہ حمیدیہ" کے مصنف شیخ حسن طرابلسی اور اکابر علماء سے آپ کی ملاقاتیں رہیں۔ مکتبہ شیخ الاسلام اور محمودیہ لائبریری کے نوادر خصوصاً حدیث وتفسیر پہ بعض قلمی مخطوطات آپ کے مطالعہ سے گزرے شیخ طرابلسی نے آپ کو حدیث کی اجازت دی اور اپنے تحریری وثیقہ میں امام العصر کی ذکاوت وذہانت، وسعت مطالعہ کی بڑی تعریف کی ہے جہاں آپ کی سندات کا ذکر آئے گا قارئین اس سندِ حدیث کا بھی مطالعہ کریں گے ۱۳۲۳ ہجری میں آپ وطن لوٹ آئے۔ حرمین شریفین سے واپسی پر ۱۳۲۶ھ تک مسلسل فیضِ عام ہی کی خدمت میں وقت گزرا، لیکن کشمیریوں کے عام مزاج اور ابنائے وطن کی طویل ناقدردانی نے مرحوم کو وطن سے دل برداشتہ کردیا۔ اپنے رفیق قدیم مولوی امین الدین صاحب دہلوی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے "حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کا طرز اور انکی بدمعاملگی کا احساس شدید رہا، ایسا احساس مجھے قیامِ ہندوستان میں کبھی نہیں ہوا۔ پھر اگر مخلوق کی جانب احتیاج مخالطت ہوتی تو شاید یہ احساس میرے لئے موذی نہ بنتا مگر تجرد کے باعث یہ احساس بڑھتا جارہا ہے۔

تجرد کا ارادہ:۔ کشمیر میں واپسی پر عزیز واقارب نے ازدواجی زندگی پر زور دیا لیکن

دارالعلوم دیوبند کی قدیم دارالحدیث جس میں امام العصرؒ کے فنِ حدیث نے بہار کا منظر دکھایا۔
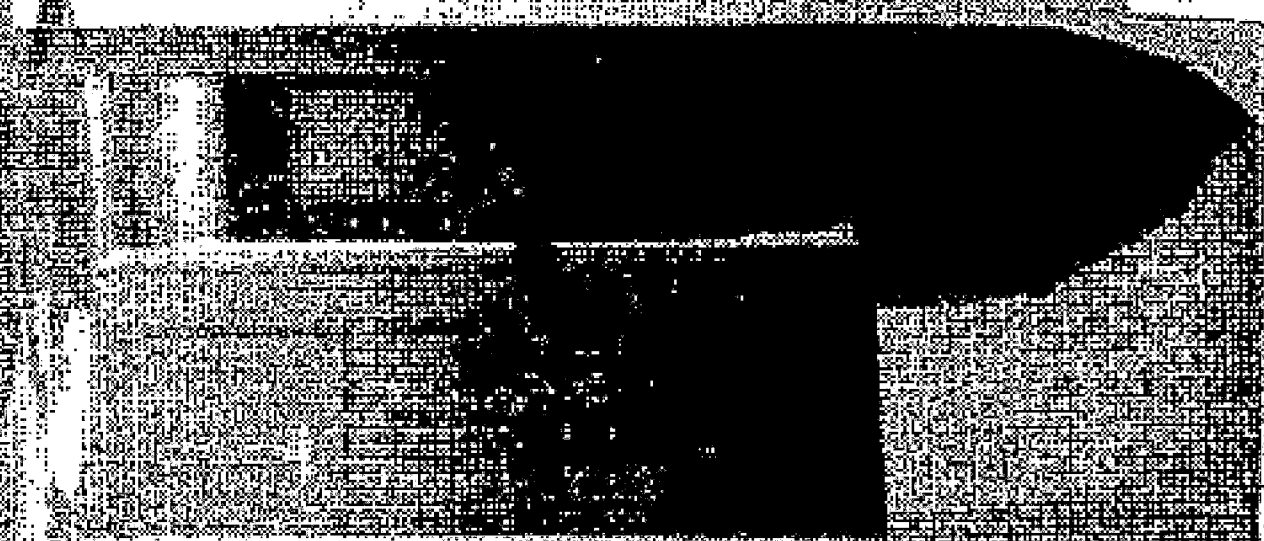
تجرد کا ارادہ فرما چکے تھے اسلئے انکار کر دیا۔ مدینہ طیبہ میں مستقل قیام کی تجویز آپ کے مکنون خاطر تھی اور آپ کو اس ارادہ پر اس درجہ اصرار تھا کہ کوئی تحریک اور مزاحمت ارادۂ ہجرت سے روکنے کے لئے کارآمد نہ ہو سکی۔

دیوبند کا سفر اور ازہر الہند میں تدریس :- جب آپ کشمیر سے ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو دیوبند میں اپنے استاد حضرت شیخ الہند کی زیارت کی تمنا تھی اسلئے دیوبند تشریف لائے اور یہاں حضرت استاد کو بھی اپنے ارادہ کی اطلاع دی۔ استاد مرحوم آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں پر واقف تھے اور یقین رکھتے تھے کہ مستقبل میں دار العلوم کو جس ممتاز صدر مدرس اور یگانہ محدث کی ضرورت ہے یہ شاگرد اس بلند معیار پر پورے اترتے ہیں اسلئے استاد نے اپنے اس سعید شاگرد کو دیوبند قیام کا حکم دیا۔ سعادت مند تلمیذ حکم عدولی کی تاب نہیں رکھتا تھا اس لئے دیوبند کے قیام کو قبول کر لیا۔ شیخ الہند کے یہاں اس زمانہ میں ابوداؤد شریف، بخاری شریف اور ترمذی شریف کے اسباق جاری تھے۔ آپ نے موصوف کو مسلم شریف، نسائی اور ابن ماجہ کے اسباق حوالہ کئے۔ وہ وقت بھی آ گیا جبکہ حضرت شیخ الہند اپنی مشہور تحریک کے سلسلہ میں بعنوانِ ہجرت دیوبند سے روانہ ہوئے۔ اس وقت موصوف نیز اکابر کی رائے سے علامہ مرحوم کو دار العلوم کا صدر مدرس اور شیخ الحدیث منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب کے بعد آپ نے بخاری و ترمذی کا سبق ایک ایسے انقلاب انگیز طریقہ پر جاری کیا جس سے دار العلوم کی تدریس اور تعلیم کی پرانی روایتیں یکسر بدل گئیں۔ آپ کی نابغیت اور جامعیت کی شہرت دور دور پہونچ گئی۔ طالبان حدیث دار العلوم کا رخ کرنے لگے۔ درسِ حدیث میں جس طرز کا آپ نے آغاز کیا اسکی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

نکاح مسنون :- اکابر دار العلوم کو دیوبند میں آپ کے قیام کا اطمینان نہیں تھا اور ہر وقت یہ خدشہ تھا کہ آپ ہجرت نہ کر جائیں اسلئے دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمن[ع]

ع **مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی** :- خانوادۂ عثمانی کے چشم و چراغ مولانا مفتی عزیز الرحمن کے چھوٹے بھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادر اکبر، حضرت مولانا گنگوہی کے خادم خاص، الحاج حضرت عابد حسین صاحب قدس سرہٗ العزیز کے عہد میں دیوبند کا ہنگامہ شروع ہوا تو ایک مہتمم کی ضرورت پیش آئی حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اس دور میں دار العلوم کے سرپرست تھے۔ نیابت اہتمام کے لئے مولانا عثمانی ہی کا انتخاب فرمایا۔ منحنی جسم نان بان بلکہ مرزا پھویا تھے۔ لوگوں کو اس انتخاب پر حیرت ہوئی حضرت گنگوہی سے عرض کیا فرمایا کہ ہمارے اس تنکے کو لیجاؤ۔ یہ امڈنے والے سیلاب کو روکے گا۔ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ وہ آئے اور دیوبند (باقی آگے)

عثمانی جو معاملہ فہمی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی میں اپنی مثال آپ تھے۔ دیوبند میں آپ کے مستقل قیام کے لئے ایک تجویز سامنے لائے جس کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے نکاح کا خیال دل سے نکال دیا تھا اور تجرد کی زندگی آپ کے پیشِ نظر تھی لیکن مولانا عثمانی نے آپ کے بعض اساتذہ کو متوجہ کیا کہ اگر ان کا دیوبند میں قیام منظور ہے تو اسکی مؤثر تدبیر یہی ہوگی کہ نکاح کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ اس تدبیر کی گہرائی وگیرائی پر مطلع ہونے کے بعد آپ کے بعض قابلِ احترام اساتذہ نے نکاح کے لئے مجبور کیا۔ جسطرح احترامِ استاد میں دیوبند کے قیام پر آمادہ ہوگئے تھے پاسِ ادب نے اس نئی تجویز کے قبول کرنے پر بھی آمادہ کر دیا اور مولانا عثمانی ہی کی تجویز کے مطابق گنگوہ کے

صفحہ کا باقی :۔ کے جزء وکل پر چھا گئے۔ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی تدبر کا سرمایہ جیب میں رکھتے دماغ فراست سے لبریز تھا اور قلب شجاعت سے معمور، خود فرماتے تھے کہ دشمن کو مارنا کوئی کمال نہیں بلکہ سینے پر دودھ کا پیالہ رکھ کر سانپ کو پلانا چاہیئے۔ ان کی زعفرانی چائے مشہور تھی جو ایک فنجان پی لیتا عمر بھر کیلئے حلقہ بگوش بن جاتا۔ صبح وشام پورے دار العلوم میں گشت فرماتے ہر دفتر میں پہونچتے اور ہر درسگاہ میں، ہاتھ میں تسبیح جسکے دانے مسلسل گشت کرتے آنکھوں پر چشمہ جو ناک کے آخری حصہ پر پڑا ہوتا چشمہ کے عقب سے جب نظریں اٹھاتے تو طلبہ ہوں یا اساتذہ دشمن ہوں یا دوست وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ انتظامی صلاحیت ایسی کہ جاروب کش اگر کہیں اپنے فرائض میں کوتاہی کرتا تو ہاتھ میں موجود بید سے اسکی مرمت ہوتی اور اہتمام میں پہونچکر اسکو تین روز کا کھانا مل جاتا۔ مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے کہ یہ پٹنے والا جاروب کش بصورت تاخیر دریافت کرتا کہ مہتمم صاحب کب بید لگائیں گے اور کب مجھے کھانا ملے گا۔ مردم سازی کا جوہر نایاب رکھتے۔ علامہ کشمیری، مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابراہیم بلیاوی انھیں کے عہد کے تیار آفتاب وقمر ہیں کسی کو تصنیف وتالیف میں لگاتے کسی سے حاشیہ لکھنے کا کام لیتے کوئی اردو شرح کر رہا ہے تو کوئی کسی مشہور کتاب کے ترجمہ پر مامور ہے۔ قیام دار العلوم کے اہتمام میں مستقل رہتا۔ طلبار کی مجال نہیں تھی کہ دفتر اہتمام کے قریب پہونچ جائیں۔ تاجور نجیب آبادی جو پنجاب میں بابائے اردو تھے دار العلوم سے فارغ ہوکر لاہور پہنچے تو وہاں ادیبوں کے پیشوا بن گئے۔ ایک بار کسی واقف کار نے دیوبند کا تذکرہ کیا بولے کہ آج تک دل ودماغ مولانا حبیب الرحمٰن کے خوف سے لبریز ہیں اب بھی اگر کبھی کھڑاؤں پہنتا ہوں تو اس تصور میں کہ دار العلوم میں ہوں اور یہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رہائش گاہ ہے چاپ نکلنے نہیں دیتا۔ حضرت شاہ صاحب کے عہد کا ہنگامہ مولانا عثمانی کے دور میں ہوا تھا۔ سقوط اشتہا اس قدر کہ چند لقمے بھی نہ اٹھاتے صرف چائے پر گزر ہوتا۔ مقبرۂ قاسمی میں دفن ہیں اور قبر عام طور پر معلوم نہیں اس بے نشانی پر یہ شعر کس قدر برجستہ ہے ؎

جن کے محلوں میں ہزاروں قسم کے فانوس تھے
جھاڑ ان کی قبر پر ہیں اور نشاں کچھ بھی نہیں

اشاعت اسلام کے مصنف اور بعض عربی دواوین پر ان کے ادیبانہ حاشیے علمی یادگار ہیں صرف ایک بیوہ سے شادی کی ان کی وفات کے بعد پھر تاہلی زندگی سے آزاد رہے۔ زندہ تھے تو فخر الھند کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے ختم ہوئے تو ان کا کوئی تذکرہ بھی باقی نہ رہا۔ حالانکہ وہ علماء کے مربی طلبار کے راہنما اور کاروانِ علم کے قافلہ سالار تھے۔

ایک سادات خاندان میں ۱۳۲۶ھ میں آپ کا نکاح مسنون[ع۵] ہوگیا۔

اسمیں شک نہیں کہ مولانا عثمانی مرحوم کا یہ منصوبہ ہر طرح کامیاب رہا اور علامہ مرحوم کو ہجرت اور تجرد کے ارادے کو ختم کرکے دیوبند میں قیام کرنا پڑا۔ پھر آپ نے عمر کا ایک طویل حصہ

ع۵ کتب سیر و سوانح میں مذکور ہے کہ یمن کے محدث و عالم حضرت مَعْمَرؒ کے ساتھ بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ مَعْمَر اپنے علم و فضل کا پشتارہ اٹھائے ہوئے یمن میں اترے طبیعت کا تلون، سیاحت کا شوق، غیر مستقل مزاجی، کمالات علمیہ کی بہار یہاں دکھا کر رختِ سفر باندھنے کا ارادہ کیا تو یمنی چونک اُٹھے، اس علم کے قافلے کو جو صرف معمر کے تن و توش میں موجود تھا مستقل یمن ہی میں روکنے کی تجاویز پر غور ہونے لگا۔ کچھ دانائے روزگار جو اسطرح کے مزاج کے انسانوں کو پابند کرنے کی تدبیر کی قدرت رکھتے ہیں بولے کہ یمنیوں کی نیازمندی، فدائیت کے مظاہرے، زر و جواہر کے انبار معمر کو نہیں روک سکیں گے پھر کیا ہونا چاہیئے۔ سوچ سمجھ کر تدبیر یہ نکالی کہ معمر کو پکڑ دھکڑ کر یہیں شادی کے بندھنوں میں باندھ دیا جائے تیر نشانہ پر بیٹھا رسم شادی انجام پائی تو وہی معمر جنکا نعرہ یہ تھا ؎ رخصت اے زنداں، جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے

مژدہ اے خارِ دشت، تلوا مرا کھجلائے ہے۔

یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کیلئے یمن کے ہو رہے ؎ ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

رختِ سفر کھول دیا اور یمن کے چمنستان علم میں بہار بدوش بن کر رہ گئے۔ صدیوں بعد ہندوستان میں بھی اس تاریخ کو دہرایا گیا۔ عثمانی خاندان کے چشم و چراغ صاحبِ سیاست و کیاست دار العلوم کے نائب رئیس الاہتمام مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تجویز و تدبیر پر شاہ صاحب کو دیوبند میں ہمیشہ رکھنے کی صورت پیدا کرلی گئی اور واقعتہً یہ تدبیر ایسی کارگر ہوئی کہ وادی لولاب کی شاداب بہار دیوبند کے ایک شہر خموشاں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہوگئی۔ پیرجی محمد شریف صاحب جو مولانا عثمانی مرحوم کے خادم خاص اور اس بارگاہ علم و کمال کے باریاب تھے مناسب رشتہ کی تلاش پر مامور ہوئے میرے ماموں حکیم سید محفوظ علی صاحب اس وقت دار العلوم میں طالب علمی کرتے اپنی غربت و فلاکت کی وجہ سے خود دار العلوم سے کھانا خریدنے کی استطاعت نہ تھی دوسری جانب دار العلوم سے ان کی امداد طعام نہ ہوسکی لیکن طلب علم میں اس اولوالعزمی کے مالک تھے کہ طلباء سے بچی کھچی روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے لیتے نمک کے پانی میں تر کرتے اور یہی ان کا طالبعلمانہ آذوقہ تھا، حضرت شاہ صاحب مرحوم کے یہاں جمعہ کے روز طلباء پہونچ جاتے تو بلا امتیاز سب کو چائے پینے کے لئے پیش کی جاتی مسجد دار العلوم کے حوض پر طلباء کے ساتھ شاہ صاحب بھی وضو فرماتے تو بے اختیار حکیم محفوظ علی صاحب کو ایک خاص نظر سے دیکھتے۔ حدیث میں ہے کہ عالم ارواح میں ارواح کا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا یہ مشافہہ جس نوعیت سے ہوا اس دنیا میں محبت و عداوت، میل جول، بعد و نفرت کا اسی انداز میں ظہور ہوگا۔ گویا کہ حضرت شاہ صاحب کا مرحوم حکیم صاحب کے حال زار پر یہ التفات مستقبل میں ایک مستحکم و دبیز رشتہ کی تمہید تھی۔ اپنے خادم خاص مولانا ادریس سکھروڈوی سے گنگوہ کے اس یتیم و غریب سید بچہ کے حالات دریافت فرمائے فلاکت کی دلدوز تفصیل سننے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس یتیم طالب علم کو مدام ہمارے ساتھ ناشتہ کیلئے کہہ دیا جائے حکیم صاحب نوخیز و کم سن ہوجانیکے باوجود فہیم و فطین، عاقبت بیں اور آل کار پر

(باقی آگے)

دارالعلوم میں گزارا اور آپ کی تدریس دارالعلوم کی وقار علمی کی سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ اسی دور میں آپ سے طلبار کے ساتھ فضلار نے بھی استفادہ کیا۔ دور دراز کے علمار اپنی علمی مشکلات کو حل کرنے کے لئے دیوبند آتے اور مرحوم سے استفادہ کیا جاتا۔ امام العصر اس دور میں بھی

صفحہ کا بقیہ:۔ اسی وقت نام نظر رکھنے۔ شاہ صاحب کے رشتہ کی بات چلی تو آپ کی طرف سے شرط یہ تھی کہ سید بچی اور بیوہ ہو۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر از دواجی زندگی میں عمل کرنے کا اہتمام تھا کہ آپ کے حبالۂ عقد میں سب سے پہلی آنے والی بیوی ام المومنین سیدۃ النسار خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بیوہ ہی تھیں۔ خانجہاں پور ضلع مظفر نگر کے امیر کبیر مولانا محمد نبی مرحوم جو حضرت شیخ الہند و حضرت شاہ صاحب دونوں ہی کے شاگرد تھے اور نجیب الطرفین سادات میں سے ان کی ہمشیرہ بیوہ موجود تھیں۔ مولانا عثمانی نے اسی جگہ کا انتخاب فرمایا لیکن جب حضرت شاہ صاحب کو اس خاندان کے تمول و ریاست کا علم ہوا تو شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ والدہ مرحومہ نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ دو ترنجیں ہیں ان پر ایک طوطا بیٹھا ہوا ہے یہ طوطا دونوں ترنجوں کو بوسہ دے رہا ہے بلکہ بچپن ہی میں یہ بھی خواب میں دیکھا کہ میری شادی ایک کہنہ سال آدمی سے ہوئی ہے جس کا حلیہ ان کو ہمیشہ محفوظ رہا۔ فرماتی تھیں کہ حضرت شاہ صاحب کو پہلے لمحہ میں دیکھتے ہی اپنے بچپن کے خواب کی بھر پور تعبیر سامنے آگئی۔ بچپن کی معصومیت و بھولا پن اپنے یہ دونوں خواب میرے نانا کو سنائے جو حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے باعقیدت و بااخلاص مسترشدین میں سے تھے انھوں نے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ سے تعبیر معلوم کی تو فرمایا کہ اس بچی کی شادی کسی بڑے عالم روزگار سے ہوگی وقت گزرتا گیا۔ نانا و نانی دونوں مرحوم ہوگئے چھوٹے بھائی حکیم محفوظ علی دیوبند پڑھنے کے لئے چلے آئے اور یہ یتیم بچی اپنے بڑے بھائی حافظ محمد ظفر مرحوم کی کفالت میں آئیں۔ حافظ جی صرف حفظِ قرآن کئے ہوئے تھے گنگوہ کی ایک مسجد میں امامت کرتے۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مرحوم کے ہم زلف تھے۔ گھر میں غربت اور افلاس کا تسلط تھا حالانکہ میرے نانا بھوپال میں داروغہ جنگلات اور انکے بڑے بھائی وہاں پر تھانیدار تھے دونوں بھائیوں نے بڑے طنطنہ کی زندگی گزاری۔ میری خالہ اور نانا کے بڑے بھائی کی ایک لڑکی جو ابھی حیات ہیں نیز والدہ گنگوہ میں تینوں حافظ صاحب کے ساتھ بود و باش رکھتیں۔ ان ماموں نے اپنی غربت کے باوجود تینوں بہنوں کو بڑے ناز کے ساتھ پالا۔ والدہ بیان کرتی ہیں کہ ہم بچپن میں شرارت کرتے حافظ جی باہر سے آجاتے تو کبھی خود ہی چلا چلا کر رہ جاتے اور بہنوں کی شرارت پر واویلا کرتے کبھی ہاتھ میں موجود لکڑی کو اس چارپائی کی پٹی پر مارتے جس پر یہ تینوں سہمی ہوئی بیٹھی رہتیں لیکن کبھی ان میں سے کسی بہن کو زدوکوب نہیں کیا۔ تینوں کی شادی سے فراغت کے بعد بھوپال منتقل ہوگئے اور وہاں وبائی طاعون میں مبتلا ہوکر بعمر ۸۰ سال پیوندِ خاک ہوئے۔ فرحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ان کی بیوہ بعد میں حکیم سید محفوظ علی صاحب کے نکاح میں آئیں صرف ایک یادگار بچی رابعہ خاتون تھیں جنکی پرورش حکیم سید محفوظ علی صاحب نے کی قصبہ کلانور مشرقی پنجاب میں ایک فاضل دارالعلوم وطبیب مولوی سید عبدالحفیظ صاحب سے رابعہ بہن کی شادی ہوگئی تقسیم پنجاب پر اس خاندان کے اکثر افراد بشمول ہمشیرہ شہید کر دئے گئے غالباً کوئی بچہ اب پاکستان میں موجود ہے۔ انقلاباتِ دہر دیکھئے کہ راقم السطور کو اب اپنی ماموں زاد بہن کے پسماندگان کے لئے غالباً کا مشکوک پیرایہ اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ بہر حال حکیم سید محفوظ علی صاحب کو جب حضرت شاہ صاحب کے رشتہ کا علم ہوا تو پیر جی شریف صاحب کی وساطت سے اپنی ہمشیرہ کے لئے سلسلہ جنبانی کی یہ رشتہ حضرت شاہ صاحب کے لئے منظور خاطر

تدریس و تعلیم کے ساتھ اشاعت دین اور دین کے لئے پیدا شدہ خطرات سے تحفظ کی پوری فکر رکھتے یہی وہ زمانہ ہے جب فتنۂ قادیانیت نے بال و پر نکالے تو اس فتنۂ کبریٰ کی بیخ کنی میں اپنی تمام علمی و عملی توانائیاں صرف کر دیں۔ تلامذہ کو قادیانیت کے خلاف محاذ پر لا کھڑا کیا اور

صفحہ ۴۰ کا بقیہ :- ہوا۔ بھوپال برات گئی بارات میں خاندان قاسمی کے اکثر افراد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی وغیرہ شریک تھے والد ماجد کا اس وقت سن و سال ۴۵ سے متجاوز تھا اور ریش مبارک کا ایک تہائی حصہ سفید ہو چکا تھا بارات پہونچی تو والدہ کے محلہ میں کہرام بپا ہو گیا کہ ۱۲ سال کی معصوم بچی ایک کبیر السن سے بیاہ دی گئی۔ جاہل عورتوں نے یہ داستان بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ والدہ تک بھی پہونچائی جو اس وقت دلہن بنی بنائی نکاح کے لئے بیٹھی ہوئی تھیں بتاتی تھیں کہ اس بے جوڑ شادی کی تفصیلات سن کر میں کانپ اٹھی نکاح کے بعد رخصتی ہوئی تو جھانسی کے اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لئے یہ سب حضرات اترے مولانا محمد ادریس سکھر وڈوی اس وقت جوان رعنا تھے ریل کے زنانہ ڈبہ سے والدہ کی نظر انھیں پر پڑی لطف لے کر بتاتیں کہ اپنے اس خیالی شوہر کو دیکھ کر میں فرحاں و شاداں ہوئی اور بھوپال کی عورتوں کی رنگ آمیز داستان از اول تا آخر میرے تصورات میں غلط نکلی۔ دہلی اسٹیشن پر مسافر خانہ میں بٹھا دیا گیا۔ دیوبند جانے والی گاڑی میں ابھی قدرے تاخیر تھی والدہ اور ان کی بڑی بہن جو دلہن کی رفیقہ تھیں اپنے ایک بکس پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ حکیم سید محفوظ علی دوڑتے ہوئے پہونچے اور بتایا کہ حضرت شاہ صاحب کچھ بات کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں اس غیر متوقع آمد پر دونوں بہنوں کو اچنبھا ہوا اتنے میں حضرت شاہ صاحب پہونچ گئے اور اپنی مخصوص نشست کے ساتھ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرا ہاتھ پیشانی پر دونوں بہنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

"میں ایک مفلوک الحال اور غریب الوطن ہوں۔ شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا مولانا حبیب اور دوسرے اکابر کے اصرار پر مجبوراً یہ صورت اختیار کرنا پڑی میرے پاس دینے لینے کے لئے بھی کچھ نہیں نہ میرا گھر ہے اور نہ گرہستی سے کوئی سروکار، دار العلوم کے ایک حجرہ میں فروکش ہوں"

اللہ اکبر یہ حقیقت آمیز بیان تھا یا دو معصوم لڑکیوں کے لئے صاعقۂ آسمانی، بہن کی تباہی پر اولاً بڑی بہن سراپا بُکا بنیں اور پھر نئی نویلی دلہن وقف گریہ ہو گئیں حضرت شاہ صاحب یہ گفتگو کرنے کے بعد اٹھ آئے بارات دیوبند پہنچی تو دلہن کو مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مکان میں اتارا گیا اگلے روز شاہ صاحب نے مولوی ادریس صاحب کی معرفت جو اثاثۃ البیت اپنی دلہن کے لئے بھیجا اسمیں ایک چٹائی، مٹی کا ایک بدھنا، ایک لوٹا اور مٹی کے دو پیالے تھے۔ کبھی کبھی مدرسہ کے رہائشی کمرہ سے والدہ کے لئے تیار چائے مٹی کے پیالے ہیں، اسکے ساتھ دار العلوم کا ایک آدھا نان بھیجتے گھر پہ آمد و رفت کا یہ عالم تھا کہ کبھی ہفتہ میں کبھی عشرہ میں کبھی پورا ہی مہینہ گزر جاتا۔ خالہ اس صورت حال پر چیں بہ جبیں تھیں اور انھوں نے تفریق کا پورا منصوبہ بنایا تھا لیکن الحمد للہ کہ والدۂ ماجدہ مستقیم رہیں اور اس بھیانک صورت حال نے انھیں مغموم کرنے کے بجائے صبر و ثبات کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ البتہ ابتدا میں ایک بار محلہ کی فرتوت ضعیفہ نے ہمدرد و غمگسار بن کر کہا کہ "حضرت شاہ صاحب کی بے التفاتی کو ختم کرنے کے لئے کسی مؤثر تعویذ کی ضرورت ہے جس کا معاوضہ اس زمانہ میں دس روپے طلب کئے گئے یہ اپنی غربت کی وجہ سے اس حقیر رقم کا بھی انتظام نہ کر سکیں لیکن عورتوں کی عام نفسیات یعنی شوہر کو مائل و متوجہ کرنے کے جذبہ میں اور تو کچھ بن نہ پڑا اپنا چاندی کا ایک

(باقی آگے)

بہت سے مقررین واہلِ تصنیف اس طرح بنا ڈالے کہ وہ قادیانیت کی شہ رگ کے لئے تیز چھری ثابت ہوئے۔ بلاشبہ آج قادیانیت، کفر کے مترادف ایک حقیقت جس قوت سے سمجھی جارہی ہے وہ ان کے مجاہدانہ عزائم کا ایک عکس جمیل ہے جس کی تفصیلات مستقل عنوان کے تحت آتی ہیں۔

دارالعلوم سے ترکِ تعلق:- دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کا وفور علم پورے شباب پر تھا کہ بدقسمتی سے دارالعلوم دیوبند میں ایک شورش برپا ہوئی جس کی تفصیلات دردانگیز ہیں۔ اس فتنہ کا اثر حضرت مرحوم کے قلب پر آخر تک رہا اور شاداب صحت کو ایک گھن لگ گیا۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علم کے اس آفتابِ منیر کو ہنگامۂ دارالعلوم اور فتنۂ قادیانیت نے وقت سے پہلے غروب کردیا۔ اس دور میں آپ کو دیکھنے والے اسکی تصدیق کرینگے کہ غم واندوہ کی ایک آگ آپ کے اندر سلگ رہی تھی جس نے صحت کے ڈھانچے کو

ص۴۱ کا بقیہ:- زیور دیدیا تعویذ آگیا۔ بازو پر باندھ لیا گیا چندہی گھنٹوں کے بعد خلاف توقع ومعمول حضرت شاہ صاحب تشریف لے آئے۔ فرماتی تھیں کہ اس آمد کو تعویذ کا اثر محسوس کرتے ہوئے میں خوشی سے جھوم رہی تھی کہ تدبیر کارگر ہوئی شاہ صاحب تشریف فرما ہوئے اور کسی تمہید کے بغیر فرمایا کہ ارے ہم پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہیں مطالعہ کی کثرت کی بنا پر مفقود الفرصت ہیں تعویذ وغیرہ سے کوئی فائدہ نہیں۔
کہتیں شاہ صاحب یہ فرمارہے تھے اور مجھ پر خجالت سے گھڑوں پانی گرا، پاؤں تلے کی زمین نکل گئی وہ ادھر اُٹھ کر گئے ادھر میں نے تعویذ کھول دیا پھر الحمدللہ بے التفاتی کی کبھی شکایت نہیں ہوئی اور نہ اس طرح کے مخمصوں میں خود کو مبتلا کیا۔ انھوں نے اپنے جذبات وخواہشات کو مرحوم کی خواہشات پر قربان کردیا تھا صرف ایک بار کوئی خاص زینت کی تو شاہ صاحب نے اپنے بھولے بھولے انداز میں فرمایا ارے یہ کیا واہیات ہے؟ پھر اس کے بعد آراستگی وآرائش کی کوئی کوشش نہیں کی۔ والد مرحوم کی وفات کے بعد وہ تیس سال سے متجاوز نہیں تھیں لیکن ان کے لباس کی سادگی، بود وباش کی بے تکلفی اور ترک آرائش عبرت انگیز تھی اسکے باوجود مزاج میں ایک خاص جلال تھا۔ بہت کشادہ دل، جواد مزاج اور دریا دل واقع ہوئیں تھیں۔ محلہ کی غریب عورتوں اور غرباء کا ان کے ارد گرد ہجوم رہتا کھلاکر بیحد خوش ہوتیں۔ بہت سی غریب بچیوں کی شادی کی، غریب نوازی میں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ہمیشہ مقروض رہتیں دنیا سے اُٹھیں تو بارِ قرض پیچھے چھوڑا جسکی ادائیگی کی توفیق وسعادت راقم الحروف کے حصہ میں آئی ان کی بڑی بہن کا عالم شباب میں دہلی میں انتقال ہوگیا۔ جنھوں نے صرف ایک بچہ چھوڑا "حکیم سید اختر حسین" جو اس وقت پشاور میں مطب کرتے ہیں یہ ہمارے رضاعی بھائی بھی ہیں۔ نانا کا بھوپال میں انتقال ہوا۔ نانی "غیرت گنج" کی زمین میں ابدی نیند سوتی ہیں۔ گنگوہ میں آبائی مکان تھا جس کے اب آثار بھی باقی نہیں رہے کچھ اعزاء واقارب شاملی ضلع مظفر نگر، کچھ شیخ پورہ ضلع سہارنپور اور معدودے چند "ساڈھورا" ضلع انبالہ میں تھے۔ ہم پسماندگان کو ان اقارب سے کوئی واقفیت بھی نہیں۔

رحمہم اللہ ورحمہن رحمۃ واسعۃ۔

خاکستر کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں استعفاء دے دیا اور ایک مرتبہ پھر ارادہ فرمایا کہ گوشہ نشین ہو کر امت کی خدمت دوسرے شعبوں میں کی جائے مگر جس علم کی شہرت اقصائے عالم میں پھیل چکی تھی اس سے استفادہ کی محرومی کوئی کب برداشت کر سکتا۔ چنانچہ دیوبند سے علیحدگی کے ساتھ ہی علماء اور اہل مدارس کے وفود آپ کی خدمت میں پہونچے۔ مگر "گجرات" کی زمین اس سعادت کو لے اڑی اور معمولی مشاہرہ پر ضلع سورت کی ایک بستی ڈابھیل کی دینی درسگاہ میں درسِ حدیث کی ذمہ داری کو قبول فرمالیا۔ اس دور میں گجرات کے بعض اکابر نے بشارتیں بھی دیکھے۔ چنانچہ مولانا احمد بزرگ عہ جو "جامعہ اسلامیہ" ڈابھیل کے پاک نہاد مہتمم گذرے ہیں انھوں نے ۱۳۴۶ھ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں خواب دیکھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دہلی میں وفات ہوگئی، اس وحشت اثر خبر سے ایک پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مبارک جنازہ پر ہے جسے ڈابھیل لایا گیا زندگی کے آثار جسد مبارک پر نمایاں ہو رہے ہیں لیکن بیماری کا غلبہ ہے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جسد اطہر کو حجرہ میں منتقل کر دیا جائے اور میں آپ کے بدن مبارک پر حصول برکت کے لئے اپنا ہاتھ پھیروں جسدِ مبارک اٹھایا جاتا ہے تو جتنا اٹھایا جاتا ہے اتنا ہی تندرست اور صحتیاب ہوتا جاتا ہے اگرچہ بعض حصوں کو اٹھانے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ مولانا احمد بزرگ نے اپنا یہ خواب دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عہ صاحب کو لکھ کر بھیجا

عہ مولانا احمد بزرگ:۔ ولی صورت، ولی سیرت، متدین وامین، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم اور احساسِ فرض کے پیکر، سملک جو ڈابھیل کے قریب ایک چھوٹی بستی ہے اسی کے باشندے تھے۔ ثقہ عالم اور صاحب زہد وتقویٰ، حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمہ سے بیعت کی اور حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ سے خلافت حاصل کی روزانہ صبح کو گھر سے مدرسہ آتے تو مدرسہ کی رقوم تھیلی میں ان کے ہاتھ میں ہوتیں واپس ہوتے تو یہ تھیلی بھی رخصت ہوتی راہ میں کسی شریر طالب علم سے سابقہ پڑ جاتا تو اسی سے پیٹ دیتے ان کے میمون عہد میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے وہ ترقی کی جو بعد کے ادوار میں نصیب نہوئی۔ افریقہ کے مسلمان تجار ان پر بڑا اعتماد کرتے تین بچے غالباً پسماندگان میں ہیں۔ مولوی محمد معصوم صاحب جن کا حال ہی میں لندن میں انتقال ہوا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا محمد سعید حال رئیس الجامعہ ڈابھیل و رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند ہیں اور اپنی سلامتی طبع میں منفرد ہیں، تیسرے مولانا رشید بزرگ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بعہدۂ مدرسی کام کر رہے ہیں۔ مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کا ڈابھیل ہی میں انتقال ہوا اور سملک کے قبرستان میں تا صبح حشر مصروف خواب ہیں۔

عہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب:۔ مرحوم دیوبند کے مشہور علمی خاندان کے چشم و چراغ، مولانا حبیب الرحمن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم، زہد و تقویٰ دین و دانش، علم و فضل سادگی و معصومیت کے پیکر زیبا، خدائے تعالےٰ نے کمالات باطنی سے اس فیاضی کے ساتھ سرفراز فرمایا کہ "قطب العالم" کے معزز لقب سے شہرت ہوئی اور خدمت خلق کا وہ جذبہ وافر لے کر چلے کہ محلہ کی عورتوں کا

(باقی آگے)

نے تحریر فرمایا کہ" افسوس کہ علم حدیث ان اطراف سے رخصت ہو
اور تعبیر چاہی مفتی صاحب نے تحریر فرمایا کہ" افسوس کہ علم حدیث ان اطراف سے رخصت ہو
اور اس کی نشأۃ ثانیہ ڈابھیل میں ہو گی"۔ جس وقت یہ خواب دیکھا اس وقت شاہ صاحب دی
سے جدا نہیں ہوئے تھے لیکن دیوبند کا قضیۂ نامرضیہ شباب پر تھا۔ جب آپ کی دیوبند سے علیحد گ
کا اعلان ہوا تو مولانا احمد بزرگ گجرات کا ایک ذی اثر وفد لیکر دیوبند پہونچے اور ڈابھیل کے لئے دعوت

صـ۳۴ کا بقیہ :- باقاعدہ بازار سے سودا سلف لاتے۔ دار العلوم سے رخصت ہوتی تو تمام دوپہر اس مشغ
میں صرف ہوتا کہ گھر گھر پہونچتے اور بازار سے لانے والے سامان کی فہرست معلوم کرتے، سودا لاتے تو عورتیں کہت
کہ مفتی صاحب ہم نے تو زردہ کا رنگ منگایا تھا آپ زرد رنگ لے آئے پھر اسے واپس کرنے بازار جاتے ا
آمد و رفت میں دار العلوم کا دوسرا وقت شروع ہو جاتا اگر کوئی تعویذ مانگتا تو خود اس کے گھر دے آتے اور پھ
دریافت کرنے جاتے کہ مریض کا کیا حال ہے "دل بدست آور کہ حج اکبر ست" پر اس قوت سے عامل تھے
دیوبند سے قریب ایک گاؤں کے غریب مسلمانوں نے حضرت مفتی صاحب کو مدعو کیا۔ اپنے چند تلامذہ لے کر پہو
آج سے ساٹھ ستر سال پہلے کے دیہات، وہ کیا جانیں چائے اور چائے کی تیاری۔ چائے بنائی جسمیں کتنی س
پرانا شیرہ ڈالا گیا یہ سر کے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ مشروب مٹی کے پیالے میں لبالب، نو وارد مہمانوں س
سامنے پیش ہوا نوجوان تلامذہ ایک ایک گھونٹ پی کر رک گئے لیکن مفتی صاحب ہر جرعہ پر "الحمد للہ" "جزاک
بھائی کیا بہترین چائے بنائی ہے ایسی چائے تو آج تک پی نہیں تھی کہتے جاتے اور غٹاغٹ پیتے۔ دیہاتی کھ
نہ سمائے اور مفتی صاحب کی اس داد سے یقین کر بیٹھے کہ چائے نہیں بلکہ خدا کے اس مقدس بندے کو کوث
پلادی ہے۔ سبق میں تقریر بیحد مختصر بلکہ نہ ہونے کے درجہ میں ہوتی۔ ایک شاگرد کا بیان ہے کہ مفتی صاحب
یہاں جلالین کا سبق ہوتا تھا اگر طالب علم کوئی بات پوچھتا تو قاری سے کہتے "حاشیہ پڑھو حاشیہ پڑھو" ح
کبھی گتھی نہ کھلتی تو "جمل وصاوی" جلالین کی شرح سنوا دی جاتی۔ انھیں صاحب کا بیان ہے کہ ا
سبق سے العیاذ باللہ مجھے تو یقین آگیا کہ مفتی صاحب کورے ہیں اپنا یہ تاثر حضرت شاہ صاحب کو جا سنایا ا
الفاظ میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ" ہاں ہاں ایسا نہ کہنا مفتی صاحب کے سامنے تو بیٹھ جانا ہی برکت سے
طلباء کا گروہ طالب علمی میں برکت کا کہاں قائل، جماعت نے تجویز کی کہ "ما اھل لغیر اللہ" والی آیت پ
کو گھیرا جائے۔ طلبہ نے دریافت کیا حسب دستور مفتی صاحب حاشیہ وغیرہ سنوانے لگے۔ طلباء کا
آج اور تھا عاجز ہو کر حضرت مفتی صاحب نے تقریر فرمائی یہ تقریر کیا تھی ان دہبی علوم کی ایک مسلسل
دریافت کرنے سے رازی کا دماغ عاجز اور جن کے سراغ میں زمخشری ماندہ۔ اس روز معلوم ہوا کہ ا
اپنے باطنی کمالات چھپاتے ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کمالات علمی کو
رکھا ہے۔ ان علوم و معارف کے باوصف حضرت شاہ صاحب کی علالت کے دوران چند ماہ کے لئے
بخاری شریف پڑھانے تشریف لے گئے تو پہلے روز کے سبق میں فرمایا کہ" بھائی خدا تعالیٰ مجھے محد
میں اٹھانا چاہتے ہیں ورنہ شاہ صاحبؒ کی زندگی میں حدیث پڑھانے کا کسے حق ہے"۔ اللہ اکبر
مولانا قاری محمد طیب صاحب کے خسر مولانا محمود صاحب رامپوری کا بیان ہے کہ میں بزمانۂ طالب علم
کی مسجد میں رہتا، دیکھا کہ مفتی صاحب کا قیام مسجد کے ایک حجرہ میں ہے اور آپ ہمیشہ پاؤں ک
ملا کر سوتے ہیں کبھی پاؤں دراز نہیں کرتے میں نے عرض کیا کہ "حضرت پاؤں لمبے کر کے سو یا کیجئے

عقب دارِ حدیث برائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل جسمیں امام العصر مرحوم نے پانچ سال درس حدیث دیا۔

دار الحدیث برائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل جہیں امام العصر مرحوم نے پانچ سال درس حدیث دیا۔
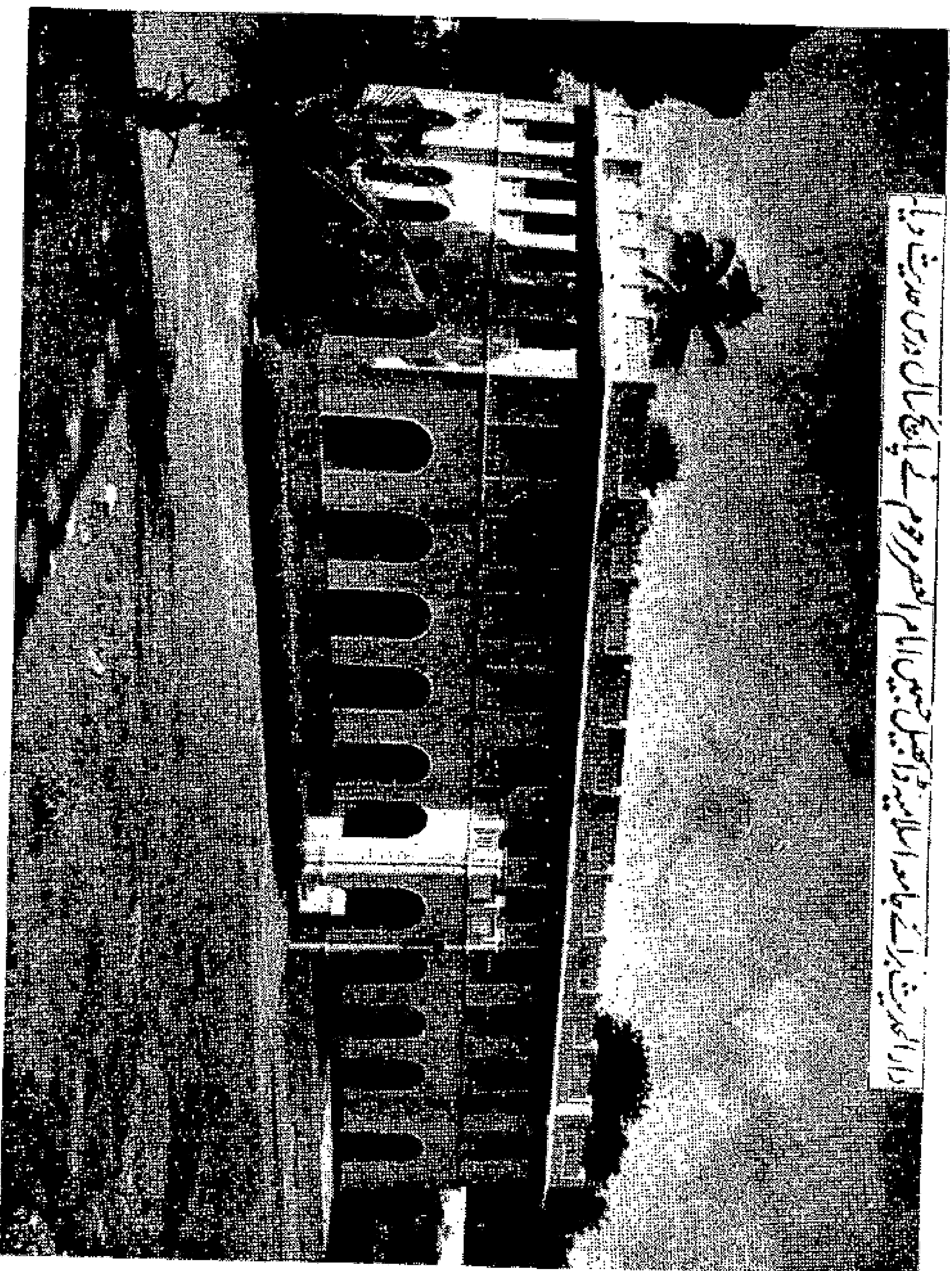
پیش کی مولانا محمد عثمٰن موسیٰ افریقی جو شاہ صاحب کے خصوصی خادم بلکہ فداکار عاشق تھے ڈابھیل کے لئے آمادہ کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوئے چنانچہ ان کے اصرار و خواہش پر ڈابھیل کا قیام منظور فرمالیا ڈابھیل کی غیر مشہور درسگاہ مرحوم کی تشریف آوری کے بعد "جامعہ اسلامیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ علامہ کے دور میں طلباء کی تعداد ایکہزار کے لگ بھگ تھی

ص۴۴ کا بقیہ:- "میاں محمود دنیا آرام کی جگہ نہیں ہے پاؤں پھیلا کر تو قبر ہی میں سوئیں گے۔" مولانا عبد اللہ صاحب سجادہ نشین خانقاہ کندیاں مغربی پاکستان جو حضرت مفتی صاحب کے شاگرد ہونے کے علاوہ آپ ہی سے بیعت تھے سرہند تشریف لائے تو راقم الحروف بھی آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا دوران گفتگو مفتی صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "میاں وہ تو ایک نعش تھی جو زمین پر چل رہی تھی"۔ مطلب یہ تھا کہ مفتی صاحب فنائیت کے ایسے مقام رفیع پر پہونچ چکے تھے کہ انھیں ایک چلتی ہوئی نعش قرار دیا جا سکتا تھا۔ سادگی کا یہ عالم کہ دار العلوم دیوبند کی تحریک میں مولانا احمد رضا بجنوری مفتی صاحب ہی کی مسجد میں رہتے بعض مصالح کی بنا پر انھوں نے عارضی طور پر تحریک سے جدا ہو کر دار العلوم میں دورۂ حدیث پڑھ لیا بلکہ اس زمانے میں مفتی صاحب سے بھی نیاز حاصل نہ کیا تعلیم سے فارغ ہونے پر مفتی صاحب کے یہاں حاضری دی تو طویل غیبت کی بنا پر حضرت کا یہ خیال تھا کہ مولوی احمد رضا دیوبند میں نہیں۔ حاضر ہوئے تو حیرت سے دریافت کیا کہ مولوی احمد رضا تم دیوبند ہی میں تھے عرض کیا کہ ہاں حضرت! کیا دورہ بھی تم نے یہیں پڑھ لیا۔ جی ہاں، ارشاد ہوا "گویا کہ دل سے تم ہمارے ساتھ تھے" عرض کیا گیا بیشک، یہ تھی حضرت مفتی صاحب کی ساری سیاست۔ نقشبندیہ سلسلہ میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دار العلوم سے مجاز تھے دیوبند میں وفات ہوئی اور گورستان قاسمی میں یہ گنجینۂ علم و عمل مدفون ہے۔ مزار پُر انوار پر آج بھی آثارِ ولایت درخشاں و آفتابِ رحمت ضوفشاں ہے۔

عہ الحاج مولانا محمد میاں سملکی:- سملک جو ڈابھیل سے بالکل متصل ایک بستی ہے وہیں کے باشندے تھے خاندانی طور پر زمین و جائداد کے مالک ان کے والد آج سے ایک صدی قبل افریقہ منتقل ہو گئے پھر خدا تعالیٰ نے وہ دولت عطا فرمائی کہ دوکان، فرم، مکانات، فیکٹریاں بلکہ سونے کی کان تک کے مالک رہے مولانا محمد میاں دار العلوم پڑھنے کے لئے آئے اور دو شخصیتوں کے عاشقِ زار بن کر رہ گئے ایک والد مرحوم اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب۔ ان کی غیر معمولی ثروت و دولت کی وجہ سے والد ماجد کو ایک حد تک ان سے بعد تھا ادھر یہ عاشقِ سوختہ جگر، برائے تقریب عمِ محترم مولانا سیف اللہ شاہ صاحب سے تعلق کی پینگیں بڑھائیں چچا ان کے رفیقِ درس اور والد کے ساتھ کمرہ میں رہتے۔ اس تمہید کے بعد والد مرحوم سے قریب ہوئے اور اس قدر قریب کہ دونوں کا تعلق دیدنی تھا افریقہ روانہ ہونے لگے تو مشایعت کے لئے والد نے دہلی تک سفر کیا اسٹیشن پر دونوں ایک دوسرے سے با چشم نم نہیں بلکہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ بغلگیر ہوئے حاجی صاحب افریقہ پہونچے لیکن استاد کی یاد نے بیقرار رکھا اور پھر بعجلت واپس ہندوستان ہو گئے۔ طبیعت عجیب و غریب پائی تھی ایک طرف داد و دہش محیر العقول دوسری جانب کفایت شعاری بخل کی حدود کو جالیتی بُندو دھوبی ان کے کپڑے دھوتا کبھی کچھ مانگتا تو نئے ڈھاکہ کی چکن کا کرتہ چھالٹی کا پائجامہ، چلغوزوں و بادام سے لبریز تھیلیاں بلکہ عید الاضحیٰ پر فربہ بکرا دے ڈالتے کبھی حساب پر اترتے تو ایک ایک کپڑے کی دھلائی پوری کشمکش کے ساتھ دیتے اسٹیشن پر قلی سامان اٹھانے کے لئے لمبی اجرت مانگتا تو بڑے بڑے بستر خود ہی سر پر اٹھا کر ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر چلے جاتے اور اسی وقت چائے مع فواکہات ڈبے کے

تمام ہندوستان سے کھنچ کر طلبا، حدیث ڈابھیل پہونچنے لگے اور آپ کی شہرت علمی کی وجہ سے اس درسگاہ کو وہ مرکزیت حاصل ہوئی کہ "جامعہ" منتخب مدارس میں شمار ہونے لگا۔ ۱۳۴۶ھ سے تا ۱۳۵۱ھ یعنی پانچ سال آپ نے مسلسل حدیث کا درس دیا۔ تدریس کے علاوہ تبلیغ کے فریضہ سے بھی غفلت نہ کی چنانچہ بہت سی بدعات و محدثات جو اہل گجرات کے رگ و ریشہ میں داخل ہو چکے تھے آپ کی جدوجہد سے ختم ہوئے کتنے ہی لوگ تھے جنکے دلوں میں دین اور علمائے دین کی محبت پیدا ہوگئی اور کتنی وہ زندگیاں ہیں جو آپ کی پاکیزہ ہمنشینی سے صفائی باطن کی

صفحہ ۴۵ کا بقیہ:۔ مسافروں کو بھی پلادیتے والد مرحوم کی شدید ڈانٹ ڈپٹ کو لقمہ حلال سمجھ کر بہ بشاشت قلب ہضم کر جاتے۔ میری ہمشیرہ راشدہ خاتون نے بچپن میں گڑیا کی شادی کی تو حاجی صاحب نے رئیسانہ جہیز کی تیاری کی۔ بازار سے کمخواب و اطلس اور بنارس کی مشہور پوت گزوں کپڑا خرید کر لائے، سوء اتفاق کہ معصوم بہن اس جہیز کو لیکر گھر میں داخل ہو رہی تھیں تو والد ماجد عصر کے لئے باہر وضو فرما رہے تھے نظر پڑگئی بچی سے سوال کیا انھوں نے گھبرا کر سب کچھ بتادیا اسی وقت حاجی صاحب کو حکم ہوا کہ

"یہاں سے نکل جائیں یہ صاحب اپنی ثروت سے ہمارا علم خریدنا چاہتے ہیں۔"

مولانا بدر عالم نے مجھ سے فرمایا کہ بارہا ان کی معرفت حضرت شاہ صاحب نے حاجی صاحب کو پیغام پہونچایا کہ آپ ہمارے پاس سے چلے جائیں کہیں لوگوں کا یہ خیال نہ ہو کہ ہم نے آپ کو آپ کے تمول کی وجہ سے اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ والد کی وفات کے بعد انہیں نے ہماری پرورش کی اور بعالم اسباب ہمارے رگوں میں دوڑنے والا خون حاجی صاحب ہی کی دولت سیال ہے۔ گھر میں بیماری ہوتی یا غمی، شادی ہوتی یا کوئی تقریب، علیحدہ سے اسکے اخراجات بھیجتے۔ ہر عید الاضحیٰ پر والد مرحوم کے لئے ایک بکرے کی قربانی کرتے یہ معمول ان کی اولاد نے بھی محفوظ رکھا۔ مجلس علمی ڈابھیل کو قائم ہی کیا تاکہ اس سے اپنے محبوب استاذ کی تصانیف شائع کی جائیں اور بلاشبہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تمام تصانیف کو محفوظ رکھنے کا وہی ذریعہ بنے۔ "آثار السنن" پر آپ کے قلمی حاشیہ کی لندن سے تصویر لی اور اسے بھی محفوظ کر گئے مجھے اور میرے برادر اکبر مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کو خطوط لکھتے تو انمیں توبیخ و تہدید، شفقت آمیز تنبیہ و انتباہ ہوتا بری باتوں پر ڈانٹتے کوئی اچھی خبر پہنچتی تو بڑے بھائی کے انداز میں انعام دیتے۔ خوب یاد ہے کہ میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تو ایک سو چھ روپے کا منی آرڈر بطور انعام ان کی جانب سے موصول ہوا۔ والدہ مرحومہ نے حج کی تمنا ظاہر کی تو دو سوالات قائم کئے اول یہ کہ کیا آپ تمام عبادات کا اہتمام کرتی ہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر حج کا شوق دامنگیر ہے تو خود کتنی رقم پس انداز کی ہے؟ اس کے باوجود فرسٹ کلاس سے ان کے حج کا انتظام کیا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے لئے برادر اکبر نے کسی پریشانی میں سفارش کی تو صاف انکار کر دیا کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر ہو چکے اب ان کی مالی امداد جائز نہیں خود کو دولت پرستی جانب اللہ نگراں باور کرتے غیر مناسب جگہ کسی خرچ کے لئے تیار نہ ہوتے ہم کوئی واقعی مصرف لکھ دیتے تو اسکا تکفل فرماتے ہوئے ہمیں بھی انعام سے سرفراز فرماتے کہ تم نے ایک حقیقی مصرف کی نشاندہی کی۔ وفات ہوئی تو اسی ظلوم و جہول نے خواب میں دیکھا کہ بہشت بریں میں ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہاں میرے بہت سے بینک ہیں۔ ساٹھ اور بہتر کے درمیان ذیابیطس میں

(باقی آگے)

پیکر بنیں کتنے ہی وہ دماغ ہیں جن میں زہد وقناعت کے اثرات جاگزیں ہوئے تسلیم کرنا ہوگا کہ گجرات کی زمین پر خیر و برکت، رشد و ہدایت کی یہ ضیا پاشیاں مرحوم کی مساعی کا کرشمہ ہیں۔

علالت اور سانحۂ وفات:۔ ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں پرانے مرض "بواسیر خونی" کا غلبہ ہوا اسمیں بڑا دخل گجرات کی آب و ہوا کی ناموافقت کو تھا یہی وہ زمانہ ہے کہ مرض آہستہ آہستہ بڑھتا گیا قویٰ پر ضعف غالب آگیا بھوک ختم ہوگئی بیماری کی شدت ہوئی تو آپ ڈابھیل سے رخصت لیکر دیوبند تشریف لے آئے۔ مکان پر علاج و معالجہ جاری رہا دہلی کے مشہور معالج حکیم نابینا صاحب حکیم محمد احمد صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب علاج کرتے رہے۔ خود آپ کے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علی[عہ] صاحب جو تجربہ کار طبیب تھے تن دہی سے تدابیر صحت کر رہے تھے لیکن مرض کا یہ عالم تھا کہ بڑی

ص۴۶ کا بقیہ:۔ مبتلا ہوکر بینائی سے معذور ہوئے پھر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ استاد و شاگرد کی مخلصانہ تعلق کی پوری تاریخ میں یہ بے نظیر شخصیت انشاء اللہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

عہ حکیم سید محفوظ علی صاحب:۔ خاکسار کے ماموں، یعنی حضرت شاہ صاحب مرحوم کے برادر نسبتی گنگوہ کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے۔ دیوبند پڑھنے کے لئے آئے تو یتیمی کا دور شروع ہوچکا تھا بڑی عسرت سے طالب علمی گزاری طلباء سے بچی ہوئی روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے لیتے نمک اور پانی میں تر کرتے اور اسی سے وقت گزارتے حضرت شاہ صاحب سے دورۂ حدیث پڑھا اور اپنے بہنوئی کے ایسے معتقد کہ انکے علاوہ کسی کو عالم و فاضل نہ گردانتے۔ دارالعلوم میں مدرس ہوئے لیکن تدریس سے مستعفی ہوکر شاہ صاحب سے طب کی کچھ کتابیں پڑھیں پھر آپ کی وساطت سے ہندوستان کے مشہور نامور طبیب حکیم عبدالوہاب نابینا دہلوی کی خدمت میں کچھ سال نسخہ نویسی کی دراول (مہاراشٹر) پہونچے تو تدریس کے ساتھ مطب بھی شروع کیا وہاں سے اٹھے تو دیوبند آکر باقاعدہ مطب کا آغاز کیا۔ نباضی، حذاقت اور اپنے فن پر عبور کامل میں بے نظیر تھے۔ جنون، مالیخولیا، امراض باہ کے کامیاب علاج میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اپنے فن سے شغل کا یہ عالم تھا کہ ہمہ وقت اسی کا مطالعہ اور اسی کی تدریس میں مصروف رہتے۔ بہت سے طلباء دارالعلوم نے ان سے طب پڑھی جن کا کامیاب مطب ہے۔ نبض کی بعض اقسام خود ان کی دریافت کردہ تھیں۔ مشہور و قدیم نسخوں میں ردوبدل کر دیتے۔ پرانی ادویہ تیار کرتے اور ان کا نام اسطرح بدلتے کہ وہ ان کے دواخانہ کے سوا کہیں دستیاب نہ ہوتیں۔ مثلاً جوارش شاہی کا نام جوارش ملوکی رکھ چھوڑا۔ بڑے مہمان نواز، غریب دوست، جواد طبع اور سخاوت پیشہ انسان تھے۔ کھانے کے اسقدر شوقین کہ ہانڈی میں گھی کے سوا پانی نہ ڈالا جاتا۔ الوان و اقسام کے کھانے پکاتے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے اگر کوئی ہوشمند مہمان کھانے کی تعریف کرتا تو بار بار کھانے پر طلب فرماتے۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی اور شہر کی عورتوں کا اجتماع ہوتا وہ کھاپی کر رخصت ہوتیں تو مرحوم کیلئے اپنی بیویوں سے گفتگو کا ایک نیا موضوع نکل آتا۔ ہفتوں ایک ایک عورت کا نام لے کر دریافت کرتے کہ اس نے کھانے کے بعد کیا تاثر ظاہر کیا۔ غریبوں کو مفت دوا دے ڈالتے رئیسوں کی جیب کاٹ لیتے لیکن سارا سرمایہ کھانے ہی کی راہ اڑا ڈالا۔ مزاج اسقدر تیز کہ اردو میں انھیں آگ بگولہ ہی کہا جاسکتا ہے شاید ہی محلہ کا کوئی آدمی ہوگا جوان کے دست عتاب کا شکار نہ ہوا ہو۔ دوپہر کو سوتے تو گھر میں کسی بچہ کی مجال نہ تھی کہ آواز

مقدار میں خون اجابت کے ساتھ خارج ہوتا عرصہ سے گریہ وخشیت الٰہی کے آثار آپ پر نمایاں تھے چنانچہ لاہور اور پنجاب کے جلسوں میں یہ بھی فرمایا کہ "بھائی ہماری آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔" ادھر گھر میں فرماتے کہ پیر کے روز مجھے سفر کرنا ہے، کس جگہ جانا ہے؟ اسکا تعین نہ فرماتے۔ والدہ نے خیال کیا کہ شاید کشمیر کا سفر در پیش ہے۔ آخر کار ۲ ر صفر ۱۳۵۲ھ بروز اتوار عصر سے کچھ پہلے قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے خون بڑی مقدار میں جسم سے خارج ہوگیا، عصر کے بعد طلبہ دار العلوم دیوبند کا ایک ہجوم مزاج پرسی کے لئے آیا۔ مولانا قاری محمد طیب[عہ] صاحب

ص۴۶ کا بقیہ:۔ نکالے بلا وجہ بھی غیظ وغضب میں ڈوبے رہتے ہم بچوں نے ایک بار ابتدائی تقریروں کی مشق کی جسمیں تعلیم الاسلام مصنفہ مفتی کفایت اللہ کے کچھ اجزاء سنائے گئے مقررین کا جتھا گھر واپس آیا تو ماموں مرحوم نے ہر ایک کی تواضع پاؤں کے جوتے سے کی اس عجیب وغریب عزت افزائی کی وجہ آج تک معلوم نہ ہو سکی۔ ان کے اسی اشتعال بلکہ سیمابی طبیعت کو سامنے رکھ کر "پارہ قائم النار" کی ان پر پھبتی کسی تھی دار العلوم سے خود مستعفی ہوئے پھر حضرت شاہ صاحب سے استعفےٰ دلوایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے یہاں پہونچے تو انھیں بھی مستعفی کر کے دار العلوم سے نکال لائے۔ خاتمۂ زندگی پر دار العلوم نے شعبۂ طب میں خدمات حاصل کیں چند روز بعد استعفار دے کر گھر جا بیٹھے۔ چار شادیاں کیں اور یقین ہے کہ اگر شرعی اجازت ہوتی تو سلسلۂ نکاح اور بھی دراز ہو سکتا تھا بچوں کی ایک کھیپ اپنے پیچھے چھوڑی یعنی ڈیڑھ درجن کے قریب۔ دس سال ہوتے ہیں کہ مرض فالج میں مبتلا ہو کر جمعہ کے روز بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا عجیب اتفاق کہ بادل گھر کر اٹھا اور ان کی موت پر آنسو بہاتا ہوا نکل گیا حالانکہ میت کے دوش پر آنے سے پہلے آفتاب دوش فلک پر سوار، تیز شعاعوں کے تازیانے جامد زمین پر برسا رہا تھا حضرت شاہ صاحب کے قدموں کے نیچے ابدی خوابگاہ ہے۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

عہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند:۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ۔ بانی دار العلوم کے پوتے، حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کے فرزند اکبر، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید، حضرت حکیم الامت کے خلیفۂ اجل، دار العلوم دیوبند کے مہتمم، اپنے عصر کے بیمثال خطیب اور سحر البیان واعظ، اگر انسانیت، مروت، شرافت، تواضع، فروتنی، مجسم شکل اختیار کر سکتی ہیں تو پھر ان کی تلاش میں زیادہ سرگردانی کی ضرورت نہیں، وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حسین پیکر میں جلوہ افروز ہیں۔ مزاج اسقدر شگفتہ کہ بچوں کے ساتھ ہوں تو "حکایت لطیف" نوجوانوں کو اخلاقی نصائح کرنے پر طبیعت آمادہ ہو تو "اخلاق محسنی" دلچسپ ونصیحت خیز واقعات سنانے پر آئیں تو "گلستاں" منظوم ہدایت کا باب کھلے تو "ہست قرآں در زبان پہلوی" حلم وبردباری کی ان بلند روایات کے حامل کہ خاص اس وصف کی قدر انھوں نے بھی کی جو مدتوں ان سے سوء ظنی میں مبتلا رہے۔ دیوبند کی ایک نمایاں شخصیت نے احقر سے کہا کہ میں نے مہتمم صاحب کو جسقدر برا بھلا کہا اگر اسکا عشر عشیر بھی فلاں صاحب کو کہتا تو وہ مجھے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتے۔ طبیعت ایسی نکتہ آفریں ونکتہ سنج کہ ان کی گفتگو مسلسل نکات کی ایک خوبصورت لڑی، زبان اتنی شیریں واقع ہوئی کہ آج تک لفظوں کی درشتگی تعبیرات کی سختی، اسلوب کا کڑواہٹ انکے زبان کے مٹھاس پر غالب نہ آسکا۔ نصف صدی سے دار العلوم کے قافلہ سالار سینکڑوں کے عملہ پر "رئیس اعلیٰ"۔ اس نصف صدی میں بہت سے

(بقیہ آگے)

مہتمم دارالعلوم بھی عیادت کے لئے تشریف لائے مرض کی شدت اور انتہائی ضعف کے باوجود مہتمم صاحب سے ملاقات کی اور معمول کے مطابق چائے مٹھائی سے تواضع فرمائی بلکہ ممدوح کے بعض علمی سوالات کے جوابات بھی اس وقت پوری بشاشت سے عنایت فرمائے۔ راقم السطور کی عمر اس وقت چار یا ساڑھے چار سال کی تھی اتفاقاً اس دن آماس گلو کا مرض لاحق تھا۔ خوب یاد ہے والدہ مرحومہ نے اشارہ فرمایا کہ والد کی خدمت میں پہنچکر دم کرالوں، خدا تعالیٰ نے آپ کے دم میں خاص تاثیر عنایت کی تھی چنانچہ دم کرایا گیا شفا نصیب ہوئی، ایک یتیم ہونے والے بچے کے لئے شفیق باپ کی شفقت کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ مغرب کی اذان پر مہتمم صاحب اور طلبار قریب ہی کی مسجد میں مغرب ادا کرنے کے لئے گئے آپ نے چارپائی پر مغرب کی نماز ادا فرمائی۔

آخری لمحات:۔ عصر و مغرب کے درمیان بیماری کی شدت بڑھتی رہی بلکہ مغرب کے بعد سے نزع کی کیفیات طاری ہوگئیں لیکن ہوش و حواس کی سلامتی اور مکمل تیقظ کی وجہ سے آنے جانے والوں اور گھر کے کسی فرد بلکہ تجربہ کار و حاذق طبیب کو بھی اس کیفیت پر نزع کا شبہ نہیں ہوا ع چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کی بےچینی بڑھتی جاتی تشنگی کا یہ عالم تھا کہ چند سکنڈ کے وقفہ سے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ایک قریبی عزیز محمد سعیدع مرحوم خدمت

صفحہ ۴۸ کا بقیہ:۔ آئے اور گئے لیکن کسی کا دل ان سے مکدر نہیں اور کسی زبان پر ان کی شکایت نہیں، پچاس سال کے عہد میں انھوں نے دارالعلوم کی عمارت ہی نہیں بڑھائی بلکہ اسکی تعارف کی وسعتیں ان کی زبان کا نتیجہ ان کے قلم کی تراوش اور ان کی مجلس کا فیض ہے۔ اکابر کو "زندہ جاوید" اپنی زبان سے کیا اور تاریخ کے دبیز انبار میں بہت سی مخفی ہستیوں کو اپنے فن سے اجاگر کر ڈالا۔ تدریس پر بیٹھے تو علم ریز ثابت ہوئے۔ اہتمام میں پہنچے تو جچے تلے انتظام کی ایک تاریخ بنا ڈالی۔ عوام ان پر جان چھڑکتے ہیں خواص ان کی مجلس میں باریاب ہیں، تمکنت و وقار انکے جلو میں ہیں خوش بیانی ان کے سامنے دست بستہ، ان کی شہرت اقصائے عالم میں پہنچ گئی اور اب قلم انکے تعارف میں کسی کاوش کا محتاج نہیں لیکن اس تمنا اور دعائیں بھی کیا مضایقہ ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

ع برادرم محمد سعید مرحوم:۔ مرحوم ہمارے خالہ زاد بھائی تھے ان کی والدہ بھوپال میں ایک صاحب سے منسوب تھیں جو مفلوک الحال اور مچھلی کے شکار کے خاص شوقین تھے۔ شب و روز تالاب ندی نہر دریا اور گڑھوں کے نذر ہوتے تین بچے پیدا ہوئے جن میں مرحوم سب سے بڑے۔ مسعود احمد منجھلے اور مقبول احمد سب سے چھوٹے ہیں۔ شوہر کی وفات کے بعد خالہ اپنے معصوم بچوں کو لیکر والدہ مرحومہ کے پاس دیوبند اٹھ آئیں۔ اباجی مرحوم نے ان یتیم بچوں کی پرورش اپنے لئے سعادت دارین باور کی جسطرح اپنی اولاد کے ساتھ (بقیہ)

کی آخری سعادت سے بہرہ اندوز تھے۔ آپ بڑی بیتابی کے ساتھ اٹھتے "بھائی سعید پانی پلاؤ" کے مضطربانہ کلمہ سے پانی طلب فرماتے چند گھونٹ پانی لیتے اسی پانی میں انگلیاں تر فرما کر کبھی چہرہ اور کبھی سینہ پر ملتے۔ حسب معمول "حسبنا اللہ" پڑھتے ہوئے سیدھے لیٹ جاتے۔ بیتابی سے اٹھنا، بیقراری سے لیٹ جانا مسلسل ہوتا۔ یہ رات اپنے منظر کے اعتبار سے بڑی بھیانک تھی شام سے ہی والدہ کے سر میں شدید درد تھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گھر کے ایک گوشہ میں لیٹی ہوئی تھیں معصوم بچے محو خواب اور بڑوں کے دماغ پر نیند کا خمار۔ کسی کو جگایا بھی جاتا تو بیداری و خواب کی کشمکش میں نیند کی فتح ہوتی آخری چند گھڑیاں خالہ زاد بھائی محمد سعید اور ان کی والدہ کے ساتھ ہی گزریں رات کی تاریکی بڑھتی جاتی زندگی کے مشرق پر علم و کمال کا آفتاب جہاں تاب جو نصف صدی سے مصروفِ گردش تھا جس کی روشنی سے علمی کائنات کے ذرے چمک رہے تھے اور جسکی گرمی سے روح گرمیِ حیات پائے ہوئے تھی بڑھ کر موت کے مغرب میں چھپا چاہتا تھا۔ ایک تاریکی رات اپنے ساتھ لائی تھی ایک اندھیرا اس دنیا میں اور پھیلنا چاہتا تھا جس کے لئے ایک مردِ حق آگاہ کی زندگی اس ناسوتی عالم سے بہ سرعت اپنا تعلق توڑ رہی تھی۔ شب کے گیارہ بجے پندرہ منٹ اور بڑھے اس پر آدھ گھنٹہ کا اضافہ ہوا ادھر یہ امیر المؤمنین فی الحدیث موت کے پیہم حملوں سے لاچار ہو کر مصفّٰی و پاکیزہ روح کو قفس عنصری سے آزاد کر رہا تھا۔ میری خالہ کا بیان ہے جنکی زندگی کے ساٹھ اسی سال کی طویل صداقت بیانی ایک شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہے کہ "میں نے گھر میں جلتے ہوئے

صـ۴۹ کا بقیہ:۔ معاملہ تھا حسن سلوک ان یتیموں سے کچھ زائد ہی رہا۔ برادرم محمد سعید نے اباجی کی تمام کوششوں کے باوجود کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن خطاطی میں کمال بہم پہنچایا۔ خوش نویسی، طغرا نویسی، بلاک نویسی میں تام مہارت رکھتے، ساتھ ہی لکھنے کا بھی سلیقہ، لاہور میں خان بہادر محمد تقی مرحوم کے متمول صاحبزادے شیخ محمد اعجاز سے تعلق پیدا ہوا اور انھیں کے سرمایہ سے "اجتماع" نامی ایک مصور جریدہ بڑی آب و تاب سے نکالا۔ سابق شاہِ ایران پر مستقل ایک کتاب لکھ ڈالی۔ عجیب و غریب صفات کے مالک تھے فوٹو کھنچوانے کا خاص شوق تھا اور مختلف پوز سے فوٹو لیتے۔ کبھی بہ لباس مجاہد، کبھی بہ انداز عسکری، کبھی بہ ہیئتِ اہلِ علم، کبھی بہ شکل مسٹر، انقلاب کے خاص مشتاق تھے کہتے تھے کہ انقلاب آئے گا تو ہم غریب ریاست و امارت کے اعلےٰ مراتب پر فائز ہوں گے۔ شجاعت کا بہت اظہار تھا لیکن واقعۃً جبن کے مریض تھے۔ دہلی، سری نگر، کراچی اور لاہور میں عمر گزاری۔ غالباً ساٹھ سال کی عمر میں تاہل زندگی کے بغیر پاکستان ہی میں تہ خاک ہو گئے۔ والد مرحوم کے رفیق سفر تھے اور ان سے متعلقہ روایات کے راوی تھے۔ (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

ان کی والدہ جو سن و سال میں اسّی سے بھی متجاوز ہیں اور عابدہ و زاہدہ، اس عالم آب و گل میں زندگی کی پگڈنڈیوں پر آہستہ خرام بلکہ مخرام کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔

چراغ کو پست کیا تو گھر کا پورا صحن سفید پوش انسانوں سے جنکے سروں پر عربی عمامے تھے لبریز ہوگیا۔" مجھے کبھی اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا اور کبھی اس منظر پر حیرت ہوتی کیا یہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ ہیں؟ لیکن آج تو اندر آنے کی اجازت نہیں کیا یہ بلند پایہ علمار کا گروہ ہے جنھیں ان کی خصوصیت کی بنا پر آنے کی اجازت مل گئی لیکن ان کے منور چہرے، عربی طور وطریق میرے تمام تخیلات کو غلط کر دیتے۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں تمام انسانوں کی جان ہے نہ میری آنکھیں دیکھنے میں غلطی کر رہی تھیں اور نہ صورت واقعہ کے بیان میں کسی مبالغہ سے کام لیا۔ دیوار پر آویزاں گھنٹہ نے اپنی مانوس آواز میں بارہ ۱۲ بجائے حضرت شاہ صاحب ایک ناقابل گفتنی اضطراب کے ساتھ پلنگ پر اٹھ بیٹھے "بھائی مجھے پانی پلادو" کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس کو ہونٹوں تک پہنچایا ابتدا میں حسبنا اللہ اور خاتمہ کلمۂ توحید کے پاکیزہ ورد پر، خود ہی چارپائی پر قبلہ رخ ہوگئے وہ مقدس ہجوم جس نے گھر کے ماحول کو لبریز کر رکھا تھا کوئی چیز ہاتھوں میں تھام کر بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہوا گھر سے باہر جارہا ہے میں نے جھک کر دیکھا تو پیشانی پسینہ آلود تھی اور شاہ صاحب مرحوم ساکت وصامت لیٹے ہوئے تھے۔ دنیا میں اندھیرا چھا گیا روشنی گل ہوگئی علم وکمال کا آفتاب غروب ہوگیا اور رشد وہدایت کا روشن چراغ بجھ گیا۔ یہ ۳ صفر ۱۳۵۲ھ اتوار کا دن ختم ہو کر تین صفر شب پر تھی اور تقریباً نصف شب کے وقت کائنات علم کا یہ سانحۂ عظیم پیش آیا۔

جسد خاکی سپرد خاک :- اس سانحہ کی اطلاع فوراً دیوبند میں پھیل گئی دارالعلوم دیوبند جہاں طلبہ گرمی کی رات میں اپنے کمروں سے باہر مصروف خواب تھے نودرہ کی مشہور عمارت کے سامنے ایک بھیانک پُر درد آواز سُنی گئی "لوگو تم سو رہے ہو امام الحدیث کی وفات ہوگئی" آواز کچھ ایسی زہرہ گداز تھی کہ سونے والے جاگ گئے اور سہمے کے سہمے رہ گئے۔ قاری اصغر علی صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب رح کے خصوصی خادم بیان کرتے کہ اس آواز سے چند منٹ پہلے میں حضرت مدنی رح کے سر میں مالش سے فارغ ہوا تھا وہ زنان خانہ میں تشریف لے گئے ادھر میں اپنے بستر پر دراز ہوا کہ یہ فلک شگاف نعرہ کانوں میں گونجا میں گھبرا کر اٹھا دیکھا کہ اندر سے مولانا مدنی رح برہنہ پا و برہنہ سر باہر تشریف لے آئے مجھ پر خوف کا ایسا غلبہ تھا کہ بے اختیار مولانا کی پناہ میں آگیا کہتے تھے کہ یہ جنات عہ تھے جو حضرت شاہ صاحب رح کی وفات پر ماتم کناں ہیں۔ کچھ طلبار نے اس جسم کو

عہ تعجب ہی کیا ہے اگر کسی عالم ربانی کے اس خاکدان ارضی کو چھوڑنے پر جنات مصروف آہ وبکا ہوں جن تو پھر بھی ایک ذی حس و مکلف مخلوق ہے۔ قرآن مجید نے تو سورۂ دخان میں "فما بکت علیہم السماء والارض وما

دیکھا بھی جس سے یہ خوفناک آواز نکل رہی تھی اسی آواز کو سن کر طلبہ مرحوم کے گھر پر جمع ہونے لگے تمام رات اہلِ شہر، اکابرِ دارالعلوم اور طلبہ کی آمد و رفت جاری رہی۔ اس زمانہ میں دیوبند کے پوسٹ آفس میں رات کے وقت تار دینے کا نظم نہیں تھا بلکہ اوقات شب میں دیوبند کے اسٹیشن سے ٹیلیگرام دیا جاتا، چنانچہ اطراف ملک میں رات کو اسٹیشن سے تار دیئے گئے۔ دہلی، لاہور، امرتسر، لدھیانہ وغیرہ متعلقین کو اس حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ صبح تک دیوبند کے قرب و جوار اور مضافاتی دیہات سے مسلمانوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ رہائشی محلہ انسانوں کا ایک سمندر نظر آتا۔ چاشت کا وقت گذرنے کے بعد غسل کی تیاری ہوئی اور مکان کے ایک حصہ میں جسدِ خاکی منتقل کر دیا گیا۔ دارالعلوم کے بعض حضرات غسل دینے میں شریک ہوئے مولانا عبدالاحد صاحب استاد دارالعلوم دیوبند اور حافظ محمد شریف صاحب پیرجی اس سعادت میں شرکت کر رہے تھے۔ غسل و کفن کے بعد جنازہ گھر میں رکھ دیا گیا۔ دہلی اور پنجاب کے بعض علاقوں سے ٹیلی گرام دیوبند پہنچ چکے تھے جسمیں نماز جنازہ

صاھ کا بقیہ:۔ کانوا منظرین" فرما کر بکا کی نسبت و تعلق زمین و آسمان کے ساتھ بھی کی۔ اگر زمین و آسمان کفار کی تباہی و بربادی پر گریہ کناں نہ ہوئے تو بطور مفہوم مخالف کسی مومن کے سانحہ پر ان کا بکا نصِ قرآن سے ہی ثابت ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ مومن کی موت پر زمین کا وہ حصہ بھی ماتم کرتا ہے جس پر وہ عبادت کرتا اور آسمان کے وہ دروازے بھی جہاں سے اسکے اعمالِ صالحہ اوپر جاتے اور رزق متعین اتر کر نیچے آتا بلکہ قرآن مجید نے خود پتھروں کیلئے قبول اثر ثابت کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اشجار و احجار پہچانتے۔ کنکریوں نے آپ کے دست مبارک میں شہادت نبوت دی۔ اسطوانہ حنانہ آپ کے فراق کو برداشت نہ کر سکا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا۔ کھلے صحرا میں آپ ہی کے حکم پر قضائے حاجت کے وقت درختوں کے جھنڈ اپنی جگہ سے منتقل ہوئے اور پردہ پوش ہو گئے۔ قرب قیامت میں موجود تفاصیل جو حدیث میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت ہی معاندین اسلام کی نشان دہی مسلمانوں کیلئے کرینگے اور اس عہد میں جبکہ تحقیقات و انکشافات کا سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا ہے اشجار و احجار میں احساس کی طاقتوں بلکہ معرفت کی قوتوں کو جدید سائنسداں تسلیم کر رہے ہیں پھر تعجب ہی کیا ہے کہ اگر شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے سانحۂ وفات پر کسی جن نے اس صدمۂ جانکاہ کو محسوس کیا ہو۔ اپنے اکابر سے مسلسل سنا ہے کہ دارالعلوم میں جنات طالب علمی کرتے رہے۔ پاکستان میں مقیم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے کاندھے کا رومال دھلوا کر دارالعلوم کی ایک دیوار پر خشک ہونے کے لئے ڈلوا دیا خشک ہونے پر ایک طالب علم سے اسے اٹھا لانے کی فرمائش کی تو اس نے وہیں سے اپنا ہاتھ جو گزوں پر پھیلا ہوا تھا بڑھا کر رومال اٹھا لیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے برادر نسبتی مولوی محمد مجتبیٰ رام پوری دارالعلوم کے ابتدائی مدرس تھے شباب اور اس کا لاابالی پن۔ کبھی کبھی درسگاہ میں کھڑے ہو کر اور گھوم کر سبق دیتے چابیوں کا گچھا ہاتھ میں ہوتا اسی کو اچھالتے رہتے ایک بار یہی گچھا چھت پر جا پہونچا جہاں سے اتارنا سیڑھی کے بغیر ممکن نہ تھا استاد کی پریشانی دیکھ کر ایک طالب علم نے فی الفور اپنا ہاتھ دراز کیا۔ ہاتھ کئی فٹ لمبا تھا۔ خوف و دہشت کے عالم میں طلبہ کی چیختی ہوئی جماعت کے ساتھ خود استاد بھی چلاتے ہوئے درسگاہ سے فرار کر گئے۔ اس کلیتہً گوئی کا مقصد اتنا ہے کہ ان واقعات کا صرف اس بنا پر انکار نہ کیا جائے کہ عام طور پر یہ مشاہد نہیں۔

میں شرکت کی خصوصی درخواست کے ساتھ اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔ اس زمانہ میں پنجاب اور دہلی سے آنے والی گاڑی کا دیوبند اسٹیشن پر تین بجے کراس ہوتا اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ جنازہ کی نماز چار بجے کے قریب ہو۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کو گھر سے لے جانے کی تیاری ہوئی ہجوم کی بنا پر اور ہر شخص کے اس والہانہ شوق کو دیکھ کر کہ جنازہ کو ہاتھ لگ جائے جنازہ میں بانس کی بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئی تھیں اس اہتمام کے باوجود سینکڑوں کاندھا دینے کی سعادت سے محروم رہے اور کثیر تعداد نے اپنے ہاتھوں میں موجود رومالوں کو جنازہ سے چھوکر یہ آخری سعادت حاصل کی ظہر کی نماز کے بعد امام الحدیث کا جنازہ اسی دارالعلوم کے وسیع ترین صحن میں لاکر رکھ دیا گیا جسکے چمن زار کا یہ ایک شاداب پھول تھا اور جسکی چمن بندی کیلئے اس باغباں نے اپنی حیات مستعار کا نصف حصہ صرف کیا تھا طلبہ کی آنکھوں نے اس پیکر علم کو سبز پوشاک میں ملبوس دارالعلوم کے احاطے اور اسکی روشوں پر مصروف خرام دیکھا تھا یہاں کے در و دیوار نے "قال اللہ وقال الرسول" کے اس شہید کی نواسنجی گوش ہوش سے سنی تھی آج سینکڑوں انسان سفید پوش میت کو اسی دبستان علم کے صحن میں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے امواج سمندر کی سطح ٹھہر گئی ہو یہ منظر کتنا دلدوز اور کتنا بھیانک تھا کہ جب مجمع کی کثرت کی بنا پر نودرہ کی عمارت کو ناکافی سمجھتے ہوئے تحتانی دارالحدیث کے تمام دروازے کھول کر جنازہ اس درسگاہ میں لاکر رکھ دیا گیا جہاں سالہا سال صحیح بخاری کے صحیفہ کو اس کوہِ علم نے طلبہ کو سمجھایا تھا نصف صدی کی اس اندوہناک تاریخ پر انسانوں کا ہجوم نہیں بلکہ در و دیوار بھی آہ و فغاں کر رہے تھے صفیں سیدھی ہوگئیں اور دارالعلوم دیوبند کے ایک زاہد مرتاض میاں اصغر حسین[ع۹] صاحب نماز جنازہ پڑھانے کیلئے

ع۹ دیوبند کا وہ مشہور سادات خاندان جسکے نامی گرامی فرد میاں جی تھے رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی معصومیت وسادگی کا یہ عالم تھا کہ اطفال دبستاں بھی اس پیکرِ معصومیت کو فریب میں لاسکتے تھے۔ سنا ہے کہ میاں جی کے مکتب میں شہر کے بچے پڑھتے مکتب میں کوئی گھڑی گھنٹہ نہیں تھا ایک اینٹ رکھی ہوئی تھی جس پر دھوپ پہونچتی تو چھٹی کردی جاتی۔ شریر بچے جس روز قبل از وقت مکتب بند کرانا چاہتے اسی اینٹ کو اٹھا کر وہاں لے جاکر رکھ دیتے جہاں دھوپ آچکی ہوتی اور کہتے کہ میاں جی اینٹ پر دھوپ آگئی ہے۔ میاں جی فوراً مدرسہ بند کردیتے حالانکہ مکتب کو کھلے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گذرتا اس سادگی پر تقدس اور انوارِ ولایت کا ایسا ہجوم تھا کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھنے کے لئے جن چند خاصان الٰہی کا انتخاب فرمایا ان میں میاں جی منے شاہ صاحب بھی تھے حضرت میاں سید اصغر حسین میاں منے شاہ صاحب کے نواسے بلکہ ان ہی کے زیر تربیت سلوک و تصوف میں مجاز ہیں دارالعلوم دیوبند کے فاضل حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی شاگرد دارالعلوم میں ابوداؤد کا درس دیتے جس قدر سبق مقصود ہوتا اتنے ہی ابوداؤد کے صفحے نکال کر اپنے ساتھ لے آتے تلی بندھی تقریر اور

(باقی آگے)

آگے آئے اللہ اکبر کا بلند کلمہ کچھ اس انداز میں فضا میں گھل کر سامعین کے دلوں تک پہنچا کہ خدائے واحد کی کبریائی اور اسکے مقابلہ میں انسان کی بے بسی محسوس شکل میں سامنے آئی ہجوم کی کثرت میں عارف باللہ کی گلوگیر آواز کو معلوم کرنا دشوار تھا۔ دارالحدیث کی وہ وسیع عمارت جسمیں ایک ہزار کے قریب انسان ہر وقت سما سکتے ہیں بلکہ احاطہ مولسری احاطہ دفتر اور صدر دروازہ سے باہر سامنے والی شاہراہ پر انسانوں کا ایک عظیم مجمع اشکبار آنکھوں اور سوختہ دلوں کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہوا تھا جا بجا مکبر متعین تھے جن کے دلدوز کلمات شدت غم سے حواس باختہ انسانوں کو چونکاتے ۔ آج دیوبند میں ہڑتال تھی۔ ہندو دوکانداروں نے بھی اس ماتمی ہڑتال میں حصہ لیا تھا۔ بوڑھے اور نوجوان شریک نماز تھے، بچے اس حسرت انگیز منظر کے تماشائی، عورتیں مکانوں کی چھتوں پر

صہ ۵۳ کا بقیہ :- نہایت ہی مختصر کلام ہوتا۔ کشیدہ قامت، بیشتر نیلا تہ بند گیروی کرتہ سر پر چہار گوشہ ٹوپی پاؤں میں چپل آنکھوں میں ایک خاص ہیبت جلالت مآب قسم کے بزرگ جن سے نظر ملانا واقعی دشوار تھا۔ ایک بار دیوبند میں ایک مسلمان تھانیدار ڈیوٹی پر آگئے شام کو میاں صاحب کے دولتکدہ پر خصوصی مجلس ہوتی مرحوم کے تعویذات اپنی تاثیر کی وجہ سے بیحد مقبول تھے بلکہ اسکے شواہد موجود ہیں کہ جنات ان کے تابع تھے۔ ضرورتمند اصحاب میاں صاحب سے تعویذ لینے پہونچتے یہ غریب تھانیدار بھی کسی ضرورت سے جا پہونچا۔ ساٹھ سال پہلے کا دور جس میں سر پر ہیٹ کوٹ اور پتلون سرکاری مہیب پوشاک تھی۔ تھانیدار اسی لباس میں پہونچا اور میاں صاحب کے قریب جو کرسی تھی اسے کچھ ہٹا کر بیٹھ گیا مرحوم نے ناگوار انداز میں اس حرکت کو دیکھا اور اپنے خاص لہجہ میں مجمع سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہمیں پاگل سمجھ رہا ہے اور ہم اسے سمجھ رہے ہیں۔ معاً تھانیدار ساٹھ ستر سال پہلے کا تھانیدار مجلس سے باہر کر دیا گیا۔ گھر پہ اگر کوئی پہونچتا تو تازہ اور گرم مٹھائی سے اسکی تواضع فرماتے کمرہ میں داخل ہوتے اور رقاب بھر کر مٹھائی لے آتے۔ خدا جانے ان کا یہ کمرہ دکانِ معرفت تھی یا شیرینی فروش کی کوئی نشستگاہ۔ مزاج میں ظرافت بے پناہ تھی مولانا قاری محمد طیب صاحب ایک بار تشریف لے گئے کشمیر کی خوبانیاں پیش فرمائیں۔ مہتمم صاحب نے اس وقت تک تازی خوبانیاں نوش نہیں فرمائی تھیں میاں صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ اپنے خصوصی لہجہ میں ارشاد ہوا کہ او ہو آپ انہیں نہیں جانتے یہ آڑو کی چھوٹی ہمشیرہ صاحبہ ہیں۔ دنیا اور اس کی الجھنوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے خاتمۂ عمر پہ دارالعلوم سے اپنا تعلق باقی رکھنا چاہا تو تفسیر ابن کثیر کا درس اپنے مکان پر تدریس کے لئے منتخب کیا ہر شریک طالب علم کو دس۱۰ روپیہ ماہوار جیب خاص سے عنایت فرماتے۔ مغرب کے بعد ایک خصوصی نشست ہوتی جسمیں بعض اصحابِ علم بھی شرکت کرتے بدقسمتی سے اس مجلس میں غیبت کا دروازہ کھل گیا جس پر میاں صاحب کو خاص تشویش ہوئی اور ارباب مجلس کو تنبیہ کی چند روزہ حفاظت کے بعد پھر وہی مرغوب غذا۔ حضرت میاں صاحب نے اس سلسلہ کو بند کرنے کے لئے عجیب حکیمانہ انداز اختیار کیا شرکائے مجلس سے ارشاد فرمایا کہ آئندہ عربی میں گفتگو ہوگی، دوسرے روز مجلس جمی تو اہل علم عربی کی ریاضت و تمرین نہ ہونے کی بنا پر کیف حالک؟ طیّب، الحمد للہ۔ سے آگے نہ بڑھ سکے اور اسطرح گناہ بے لذت کا دروازہ بند ہوگیا۔ میاں صاحب صاحبِ کشف اور واقعی عالم ربانی تھے۔ موت غربت کا خاص شوق تھا مرض الوفاۃ میں پورے گھرانہ اور تمام مخلصین کی شدید مخالفت کے باوجود راندیر ضلع سورت گجرات تشریف لے گئے تو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کی اور یہ عالم باعمل گجرات کی زمین میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ۱۲۔

خانقاہ کی وہ قدیم مسجد جو مغلیہ سلطنت کے عظیم فرمانروا اکبر بادشاہ کے دور میں تعمیر ہوئی اور جسے بعد میں حضرت امام العصرؒ نے دوبارہ تعمیر کرایا اسی مسجد میں آپ ہمیشہ نماز ادا کرتے۔

وقف نظارہ تھیں نماز ختم ہوئی اور جنازہ کو اپنے دوش پر لینے کے لئے مضطرب ہجوم میں ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوا یہ امام الحدیث کے پاکیزہ جسم سے اپنے ہاتھ مس کرنے کی آخری سعادت تھی جسے حاصل کرنے کے لئے سب ہی بیقرار تھے۔ جنازہ مدنی گیٹ سے باہر نکلا اور دارالعلوم سے عیدگاہ تک کا وہ فاصلہ جو چند منٹوں میں آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے گھنٹہ سوا گھنٹہ کے طویل وقفہ میں طے ہوا جنازہ قبرستان جاتے ہوئے مرحوم کے رہائشی مکان کے سامنے پہونچا تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ اس گھر کی رونق اجڑ چکی تھی اور جانے والا اپنے ساتھ یہاں کی پوری زندگی لئے جا رہا تھا اب یہ ایک بیوہ کا مسکن اور چند یتیموں کا اجڑا ہوا مکان ہی نہیں بلکہ علم و حکمت کا ایک خرابہ اور کمال علمی و عملی کا تباہ آشیانہ تھا اس محلہ کی غیر مسلم آبادی جس نے بارہا مرحوم کو چلتے پھرتے دیکھا تھا جنکے بوڑھے اور نوجوان بچے اور عورتیں اس فرشتہ صورت انسان کے سامنے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے جھک جاتے، آج جنازہ کو گریاں بریاں رخصتی سلام کر رہے تھے شاہ منزل کے دروازہ پر دو معصوم بچے جو شفقت پدری سے تازہ تازہ محروم ہوئے تھے اپنے باپ کے جنازہ کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے ایک کی عمر چار سے پانچ سال تک اور دوسرا سات و آٹھ سال کی عمر کے درمیان۔ ان دونوں میں سے بڑا اکبر شاہ مرحوم عمر کی چودہ بہاریں دیکھنے کے بعد اپنے شفیق باپ کی آغوش میں جا پہونچا اور یہ سیاہ نامہ والد مرحوم کا منثور مرثیہ لکھنے کیلئے ابھی زندہ ہے۔ مولوی سید حسن رضوی نے جو انور یہ لائبریری کے معتمد اور شاہ صاحب مرحوم کے خصوصی خادم ہیں ان بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور جنازہ کے پیچھے چلے شام کے تین اور چار کے درمیان کا وقت تھا کہ جنازہ عیدگاہ کے صحن میں رکھ دیا گیا قبر تیار ہو چکی تھی لیکن پنجاب، دہلی، بجنور، مرادآباد سے آنے والوں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

آخری آرامگاہ:- مرحوم پھلوں کے شائق تھے دیوبند کے بیر جو اپنی عمدگی و نفاست کی وجہ سے دور دور شہرت رکھتے ہیں عیدگاہ کے قریب کچھ ان کے مشہور باغ تھے بیر کی فصل آتی تو معمولاً بیر کھانے کے لئے ان باغات میں تشریف لے جاتے جہاں آج آپ کا مرقد ہے طلبہ وہیں آپ کے لئے مصلی بچھا دیتے جس پر بیٹھ کر بیر تناول فرماتے بارہا موجود خدام سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی ہمیں یہیں دفن کرنا۔

یہ وصیت اور آپ کی دیرینہ خواہش والدہ مرحومہ تک پہنچ چکی تھی۔ وفات کی صبح میں اپنا ایک طلائی زیور فروخت کر کے مرحومہ نے یہ زمین خرید لی اور نامور شوہر کی وصیت کو پورا کرنے کی

سعادت ان کے حصہ میں آئی یہ قطعاً غلط ہے کہ دار العلوم سے اختلاف کی بنا پر مرحوم کے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علی صاحب نے اکابر دار العلوم کے ساتھ قبرستان قاسمی میں دفن کرنے سے گریز کیا لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ مدفن کے لئے اس زمین کو شاہ صاحب نے کس خصوصیت کی بنا پر انتخاب کیا تھا ہجوم برابر بڑھ رہا تھا اور جن مخصوص حضرات کا انتظار تھا وہ بھی پہنچ چکے تھے جنازہ لحد میں اتارنے کے لئے آگے بڑھایا گیا قرب وجوار میں موجود درختوں پر بھی آدمی چڑھ چکے تھے جس سے بعض تناور درختوں کے تنے ٹوٹ کر گر گرے لیکن بے قابو ہجوم کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں تھا میت قبر پر لا کر رکھی گئی تو ایک طویل القامہ لحیم وشحیم سفید پوش سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹا ہوا مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے آیا اور ایک لمبی جست لگا کر جنازہ تک پہونچ گیا وہ چادر جو میت کے اوپر تھی اسے کھینچ کر اس تیزی سے فرار ہوا کہ ہزاروں انسانوں کا ہجوم اسکے تعاقب میں ناکام رہا چار اور پانچ کے درمیان اس گنجینۂ علوم کو زیر زمیں دفن کر دیا گیا۔ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى۔

حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ جب حضرت ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کی میت لحد میں اتار کر مٹی دی جارہی تھی تو آپ کے ایک نامور شاگرد آگے بڑھے اور فرمایا کہ "هٰكَذَا يَذۡهَبُ الۡعِلۡمُ" تشریح اس ارشاد کی خود ان کی زبانی سنیئے :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا سے علم اٹھ جائے گا۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ علم دنیا سے کیونکر اُٹھے گا لیکن رئیس العلماء ابن عباسؓ کی موت نے بتادیا کہ دنیا سے علم کے اٹھنے کی یہ صورت ہوگی۔ عیدگاہ دیوبند کے قریب ایک گوشہ میں وادی لولاب کے کسی ایک انسان کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ کمال علم اور کمال عمل کی ایک جیتی جاگتی ہستی دفن کر دی گئی یہ تنہا انور شاہ کی وفات نہیں بلکہ چمنستان علم سے فصل بہار کی رخصت، کمال علم کے پھولوں سے بہجت وشادابی کا خاتمہ، حدیث وتفسیر فقہ وادب معانی وبیان منطق وفلسفہ اور ان تمام علوم کا زوال تھا جو مرحوم کی شخصیت میں مبدء فیاض کی عنایت سے جمع ہو گئے تھے گردش لیل ونہار کو رو کیئے اور امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری کی رحلت، حافظ ابن تیمیہ کی موت، ابن حجر عسقلانی کا ارتحال، امام غزالی کا سانحہ، محی الدین بن عربی کی وفات، فخر رازی کا عالم آب وگل سے سفر، ابن رشد اور جاحظ کا دنیا سے پردہ اور کسائی کے چہرہ پر موت کے آثار، یہ سب منظر دیکھنے والوں نے اس وقت دیکھے جب امام العصر کی میت کو زیر زمیں رکھا جارہا تھا۔

یہ دنیا اپنی زندگی کے ان گنت سال گذار چکی اور خدا جانے کہ اس کی عمر ابھی کتنی باقی ہے لیکن علم کی محفلیں انور شاہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتیں اور جبتک اس کائنات میں علم وفن، دین ودانش کے زمزمے بلند رہیں گے یہ فرہادِ کمال بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیس مرحوم کو کریں گے یاد

اخبارات کا ماتم اور دیوبند میں تعزیتی جلسہ: اگلے روز ہندوستان کے مسلم اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ علامہ مرحوم کے سانحۂ وفات کی دلدوز خبر شائع کی۔ ظفر علی خاں مرحوم کے "زمیندار" غلام رسول مہر کا "انقلاب" بجنور کا اخبار "مدینہ" مولینا مظہر علی کا "الاماں" اور دینی علمی رسالے مدتوں اس حادثہ پر ماتم کرتے رہے۔ غیر منقسم ہندوستان کا کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں تعزیتی جلسے کے ساتھ قرآن خوانی نہ ہوئی ہو۔ انجمنوں نے تعزیتی قرار دادیں پاس کیں اور ہزاروں کی تعداد میں قرآن ختم کیے گئے۔ ان جلسوں میں تین جلسے تاریخی شہرت کے مالک ہیں۔ سب سے پہلا جلسہ لاہور کا ہے جسمیں علماء وفضلاء کے ساتھ شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس شعر کے ساتھ تقریر شروع کی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

فرمایا:۔ "اسلام کی آخری پانچ سو[ع۵] سالہ تاریخ مولانا انور شاہ کشمیری کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ایسا بلند پایہ عالم اور فاضل جلیل اب پیدا نہ ہوگا وہ صرف جامع العلوم قسم کی ایک شخصیت ہی کے مالک نہیں تھے بلکہ عصر حاضر کے دینی تقاضوں پر بھی ان کی پوری نظر تھی میں نے جدید فقہ کی تدوین کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا اور اس موضوع پر ان سے گفتگو بھی رہی جس طرز پر فقہ کی تدوین میرے پیش نظر تھی اس کے لئے مناسب شخصیت ان کے سوا عالم اسلام میں کوئی نہ تھی۔ دیوبند سے علیحدگی کے بعد لاہور کے قیام کی تجویزیں نے ان کے سامنے رکھی جسے فی الجملہ مرحوم نے قبول بھی کر لیا تھا لیکن اہل گجرات کے اصرار پر آپ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت کی تکمیل بدقسمتی سے نہیں ہوسکی اب میں مایوس ہوں کہ اس عظیم ترین کام کے لئے کوئی شخصیت موزوں نظر نہیں آتی۔ ملخصاً۔

ع۵ یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ ترکی کے جلاوطن شیخ الاسلام علامہ کوثری مرحوم نے جو اپنی جلاوطنی کا (باقی آگے)

(۲) دوسرا تعزیتی جلسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا ہے جہاں آپ کے جانشین مولانا شبیر احمد[عہ] عثمانی نے علماء، طلباء اور گجرات کے عام باشندوں کو اپنے ان دلدوز کلمات سے بے چین کر دیا۔ فرمایا کہ "آج علم کا آفتاب غروب ہو گیا اور کمالات کا اجالا تاریکیوں کے لپیٹ میں ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کی وفات اسلام کا وہ بڑا حادثہ ہے جسکے نتیجہ میں طلبہ نہیں بلکہ اہل فضل و کمال یتیم ہو گئے طلبہ کے لئے تو الحمد للہ ہم لوگ کافی ہیں لیکن ہماری مشکلات علمی کا حل کرنے والا دنیا سے اٹھ گیا بلاشبہ آپ کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ عام طور پر دنیا آپ کو بے نظیر قوی الحفظ اور وسیع العلم فاضل کی حیثیت سے جانتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آپ کا تعارف ناقص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی شخصیت میں علماء متقدمین کے کمالات اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ کمالات انوری کا ہر پہلو فخر روزگار شخصیتوں کا مکمل عکس نظر آتا ہے اسلئے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اے شبیر! تم نے ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے یا ابن دقیق العید سے تمہاری ملاقات ہوئی یا تم کو سلطان العلماء عزالدین بن عبد السلام کی زیارت کی سعادت نصیب ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان شخصیتوں سے نیاز کا موقعہ ملا زمانہ کی گردشوں کا فرق ہے ورنہ حضرت شاہ صاحب مرحوم اگر قدیم صدیوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو کتب سیر و سوانح میں ان کا ذکر انھیں مذکورہ اشخاص کے پہلو بہ پہلو کیا جاتا۔ تشبیہ و استعارہ کی زبان میں حضرت مرحوم کی زیارت متقدمین علماء کی زیارت اور ان سے شرف ہمکلامی ہے اسلئے میرے نزدیک انکی وفات ابن حجر کا سانحہ ابن دقیق العید کی رحلت اور سلطان العلماء کا دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ ملخصاً۔

صفحہ ۵۷ کا بقیہ :- زمانہ مصر میں گذار رہے تھے اور جنکے گوہر بار قلم نے بارہا اہم علمی موضوعات پر موتیوں کی بارش کی ہے۔ علامہ کشمیری مرحوم کے متعلق اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ حافظ ابن ہمام کے بعد استخراج مسائل میں مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بلفظہ ملخصاً۔

جسوقت کوثری مرحوم کے قلم سے یہ حقیقت تراوش ہو رہی تھی ابن ہمام کی رحلت پر پورے پانچسو سال گذر چکے تھے عالم اسلام کی ان دو نامور شخصیتوں اقبال و کوثری کے تأثرات میں یہ توافق حیرت انگیز ہے۔

عہ مولانا شبیر احمد عثمانی :- عالم اسلام کی ایک نادرۂ کار شخصیت محدث، مفسر، متکلم، سحر البیان، واعظ انشاء پرداز، پاکستان کے معمار، اسکی پارلیمنٹ کے رکن اور اس سلطنت کے پہلے شیخ الاسلام قرار داد اسلامی کے مصنف دیوبند کے عثمانی خاندان کے چشم و چراغ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دار العلوم اور

(باقی آگے)

ڈابھیل کے باشندوں سے سنا ہے کہ مولانا عثمانی کے دردانگیز کلمات نے پورے مجمع کو تصویر غم بنا دیا۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ایک ہفتہ تک بند رہا اور صبح و شام ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا رہا۔

تیسرا تعزیتی جلسہ وفات سے اگلے دن صبح کو دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث کی وسیع عمارت میں ہوا جس میں تمام اکابر دارالعلوم دیوبند خصوصاً مولانا حسین احمد صاحب مرحوم نے تعزیتی تقریر فرمائی، تعزیتی جلسہ شروع ہوا تو طلباء دارالعلوم بیقراری سے رو رہے تھے۔

صفحہ ۵۸ کا بقیہ:۔ مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن کے برادر خورد حضرت شیخ الہند کے ارشد تلمیذ بلکہ انکی تحریک استخلاص
وطن کے رکن، بولنے پر آتے تو مجمع پر اسطرح چھا جاتے کہ سامعین کے ذہنوں کو جس رخ پر چاہیں ڈال دیں۔ حلقۂ درس
میں گل افشانی گفتار موسم بہار کا حسین منظر تھی لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو شرح مسلم فتح الملہم کی تصنیف لطیف
ان کی تحقیقی کاوشوں کا شاہکار ہے۔ اپنے استاد مرحوم حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر حواشی درج فرمائے تو
پورے تفسیری ذخیرہ کا لب لباب اور کتبخانہ تفسیر سے بے نیاز کر دینے والا سرمایۂ علم ہے جسکا فارسی ترجمہ
افغانستان میں ہوا اور مزین و مطلی عکس ہانگ کانگ سے شائع کیا گیا جمعیۃ العلماء کی صدارت کی اس سے جدا ہو کر
جمعیۃ العلمائے اسلام بنا ڈالی اور اس پلیٹ فارم سے پاکستان کے تخیل کو ایک واقعہ کر دکھایا۔ نواب زادہ
لیاقت علی خاں سابق وزیر اعظم پاکستان کا غیر منقسم ہندوستان میں مولوی محمد احمد کاظمی سے الیکشنی مقابلہ ہوا
تو عطاء اللہ شاہ کی خطابت، حبیب الرحمٰن کی پکار، حسین احمد کی شجاعت، جواہرلال کی دوڑ دھوپ بلکہ پورے
قوم پرور حلقہ کی حمایت اور انڈین نیشنل کانگریس کی امداد کاظمی صاحب کو حاصل تھی لیکن علامہ عثمانی آندھی کی
طرح اٹھے اور اپنے طوفانی دورے سے لیاقت علی خاں کی ڈگمگاتی کشتی کو نہ صرف ساحل پر پہنچایا بلکہ ارباب نظر
کا فیصلہ ہے کہ لیاقت علی کی اس الیکشن میں کامیابی پاکستان کے حق میں دوررس نتائج کی حامل بن گئی۔ دارالعلوم
میں تدریس کے بعد صدارت اہتمام پر آئے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحب کے بعد مسند صدارت
پر جلوہ افروز ہوئے۔ حاضر جواب اس بلا کے تھے کہ مخاطب کو دو لفظی گرفت میں الجھا دیتے تلون غیر مستقل مزاجی
انھیں اس منصب عالی پر جانے سے روکتی رہی جسکے وہ واقعی مستحق تھے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن انکے
شاگرد تھے ایک موقعہ پر ان پر عتاب ہوا مجاہد ملت نے چند مہینوں کا وقفہ درمیان میں ڈال کر در دولت پر
حاضری دی۔ علامہ مرحوم مسند پر جلوہ فرما تھے شاگردانہ سعادت کے ساتھ ان کے پاؤں تھام لئے بس پھر کیا تھا سینہ
بے کینہ صاف ہوگیا چند منٹ کے بعد مجاہد ملت اُٹھ آئے تو ہر آنے جانے والے سے انکی تعریف میں رطب اللسان
ہوگئے۔ بھوپال کا الیکشنی سفر فرمایا تو وہاں سے آکر روئیداد سفر اس تفصیل سے بیان کی کہ شب کا وقت میں اپنے
کمپارٹمنٹ میں مصروف آرام لیکن جانشین شیخ الہند کے زندہ باد کے نعروں نے مجھے بیدار کر دیا قدرت کلام اس درجہ حاصل تھی کہ
معمولی بات کو بھی رازی کا فلسفہ بوعلی سینا کی موشگافی غزالی کا کلام بنا دیتے حال ہی میں پاکستان سے انکی تقریر بخاری کی
پہلی جلد آئی جو ان کے کمالات علمی کا آئینہ ہے۔ بڑے خوبیوں کے انسان بلند صفات کے مالک اور عالی روایات کے
حامل تھے بہاولپور میں تعلیمی کانفرنس کی صدارت کیلئے پہونچے تو واقفین کا بیان ہے کہ درون پردہ سازشوں سے موت
کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دے گئے اسطرح علم کا ایک خزانہ اور کمالات علمی کا گنج گرانمایہ پاکستان کے دارالسلطنت کراچی میں
ناقدر شناس طبقہ کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے پیوند خاک ہوگیا۔ ؏ حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی رحؒ:۔ امام المسلمین امیر المومنین

مولانا مدنی رحمہ نے اشکبار طلبہ سے فرمایا کہ اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں بڑے بڑے حادثے اور اہم شخصیتوں کی وفات کا حادثہ پیش آیا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور

صفحہ ۵۹ کا بقیہ :- فی الحدیث پیکرِ شجاعت مجسمہ عبادت قافلہ زہد و قناعت فرنگی اقتدار کے لئے موت کا سناٹا غیر ملکی استبداد کے لئے قیامت کبریٰ جسکا دن قال اللہ وقال الرسول سے معروف، اوائل شب مہمانوں کی خدمت میں، انتہار شب بحضور رب العالمین، سپیدۂ سحری انھیں مصروف بکاپاتا آفتاب کی کرنیں طلوع کیلئے بیتاب ہوتیں تو وہ خانہ خدا میں سجدہ ریز، جمعیۃ العلماء ہند کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، ہندوستان کی متعدد جیلیں اس وجود مقدس سے نکلے ہوئے کلمۂ ہُو وحق کی امین، مہمان نوازی میں اسوۂ ابراہیمؑ پر مستقیم، اعلاء کلمۃ الحق میں جلال فاروقی کے مظہر، اصلاً وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، مدتوں سکونت واقامت مدینہ منورہ رہی، اس زمین پاک سے عربی طور و طریق اور اخلاق نبوی کے حامل بن کر چلے تو ظلمت کدۂ ہند میں نور سنت کی ضوفگنی انکے عصر میں ان ہی کے حصہ میں آئی، فرنگی اقتدار سے نفرت و وحشت اکابر نے ان کے آتشدان سینہ میں منتقل کی پھر وہ خود ہی فرنگیوں کے خلاف کوہ آتش فشاں بن گئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب وہ شباب سے نکل کر شیب میں داخل ہوئے تو یورپ کے اقتدار کا آفتاب نیمروز ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اسطرح وہ ان خوش بخت لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی جہد کی کامیابی اپنی زندگی ہی میں دیکھ ڈالی۔ سیاسی جد وجہد میں اسقدر بے لوث کہ حکومت کے اعزاز و خطابات جن کے لئے نہ جانے کتنے مچلتے ہیں تڑپتے ہیں کوششیں کرتے ہیں لیکن "پدم بھوشن" کا سرکاری خطاب دست بستہ ان کے یہاں حاضر ہوا تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا حکام وقت نے حکومت کی عزت کا واسطہ دیا تو رات بھر یہ اعزاز آستانۂ مدنی پر رہا اور صبح کی پو پھٹنے کے ساتھ ہی بارگاہ علم و عمل سے اسے واپسی کا حکم ملا آزاد ہندوستان میں کسی وزیر کی کوٹھی کے چکر تو کیا کبھی منسٹر سے ملاقات کی کوشش تو درکنار صرف ایک بار دارالعلوم کی ایک اہم ضرورت پر وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی کوٹھی پر تشریف لے گئے کار سے اترے نہیں جواہر لال خود دوڑ کر پہونچے اور بہ ہزار منت و سماجت اس عجیب و غریب انسان کو کوٹھی میں لیجانے یا ایک چائے کی پیالی کی تواضع سے محروم رہے یہ تھا ان کا کردار اور یہ تھیں ان کی بلند روایات، شب وروز کے تھکا دینے والے اسفار کے باوجود دارالعلوم کا حقِ درس ادا فرماتے۔ جس وقت دیوبند وارد ہوتے اسی وقت درسگاہ میں پہونچ جاتے۔ ایام رخصت کا ہمیشہ معاوضہ وضع کرایا۔ آخر عمر میں ایک بار مدراس تشریف لے گئے عوام نے مزید قیام پر مجبور کیا انکار فرما دیا۔ ایک امیر کبیر نے دارالعلوم کے لئے کوٹھی وقف کرنے کی پیشکش کی بشرطیکہ مدت قیام میں کچھ اضافہ ہو اس پر بستره کھول دیا۔ دیوبند لوٹے تو حضرت مہتمم صاحب اور مجلس شوریٰ نے ان زائد ایام کا معاوضہ دینا چاہا جسمیں حضرت دارالعلوم ہی کی ایک منفعت کے لئے قیام فرما ہوئے تھے لیکن ان کے استغناء، للہیت نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔ کمالات باطنی کا ایسا اخفا کیا کہ عمر بھر لوگوں نے صرف ایک سیاسی لیڈر سمجھا، آزاد ہندوستان میں کچھ کھلے تو پچاس ہزار انسانوں سے زائد نے دست حق پرست پر بیعت کی اور ایک جماعت کو مجاز خلافت کیا۔

بعمر چوراسی برس گوناگوں امراض میں مبتلا ہو کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ مقبرۂ قاسمی میں اپنے محبوب استاد امام حضرت شیخ الہند کے آغوش میں خواب راحت کے لطف لیتے ہیں۔

اللّٰھم برد مضجعھما و نور مرقدھما۔

خلفائے راشدین کی رحلت اسلام پر ایک ہائلہ عظیم تھا لیکن اس وقت بھی صبر سے کام لیا گیا آپ بھی صبر سے کام لیں۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کی وفات سے علماء، وطلبہ یتیم ہوگئے فضل وکمال تبحر علمی، وسعت معلومات اور قوت حافظہ میں آپ کی نظیر نہیں تھی میں نے ہندوستان اور عالم اسلامی کے نامور علماء کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی ہے لیکن علامہ کشمیری مرحوم کی نظیر کہیں نہیں پائی. جلسۂ تعزیت کے اختتام پر ایک صاحب نے فارسی کے تعزیتی اشعار پڑھے تو آپ پر رقت طاری ہوگئی، دار العلوم دیوبند میں تین روز مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہی۔ دہلی میں جمعیتہ العلمائے ہند کی جانب سے ایک جلسۂ تعزیت ہوا جسمیں مولانا مفتی کفایت اللہ عہ صاحب اور مولانا احمد سعید مرحوم نے اس روح فرسا واقعہ پر غم انگیز تقریریں کیں۔ غرض یہ کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں تعزیتی اجلاس، تعزیتی قرار دادیں اور قرآن خوانی کا سلسلہ تین مہینہ تک جاری رہا۔

عہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب :۔ وطن مالوف شاہ جہاں پور جو یوپی کا ایک مشہور شہر ہے مختلف جگہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے دار العلوم دیوبند پہونچے۔ حضرت شیخ الہند سے حدیث پڑھنے کی سعادت حاصل کی دیوبند سے فراغت پر مدرسہ امینیہ کی صدارت سنبھالی اور حضرت شیخ الہند کے منصوبہ کے مطابق جمعیتہ العلماء کی بنیاد ڈالی جسکے خود مدتوں صدر رہے مفتی صاحب متوسط القامت تھے گٹھا ہوا بدن سر پر گول ٹوپی سفید ڈاڑھی اور سفید ہی بھویں ہمیشہ شیروانی جسم پر، پاؤں میں اعلیٰ قسم کی گرگابی، موت کے پیہم حملوں کے باوجود اور مرض بھی کینسر جیسا موذی لیکن مرحوم کے جسم وجثہ میں کوئی اضمحلال پیدا نہ ہوا تھا کپڑا سیتے، خود اپنے جوتے کی مرمت کر لیتے۔ سر پر جو ٹوپی ہوتی اسے بن لیتے۔ نہایت خوشنویس دہلی کے زمانہ قیام میں یہ ظلوم وجہول انکی نگرانی و تربیت میں رہا ہے۔ پینسٹھ ۶۵ سال سے ان کے پاس ایک اسٹوو تھا جسے جب دیکھئے معلوم ہوتا کہ ابھی بازار سے لایا گیا ہے پانوں کی ڈبیہ و بٹوا ہاتھ میں لیکن کیا مجال کہ کہیں داغ ودھبہ نظر آئے۔ مدرسہ امینیہ کے اہتمام ہی میں بستر لگا رہتا اتنا مکلف کہ اسکو دیکھتے ہی نیند آئے۔ میں خرچ کی فہرست بنا کر دیتا تو ایک ایک پیسہ پر مناقشہ فرماتے۔ بھلا میں پندرہ ۱۵ سال کا نوخیز اس عالی دماغ مدبر کو کیا جواب دیتا۔ تدبر بیدار مغزی مومنانہ فراست ذکاوت وذہانت اور معاملہ فہمی میں ایسے بے نظیر کہ حضرت شیخ الہند رح نے خاص وصیت فرمائی کہ انکو ہمیشہ جمعیتہ العلمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی میں رکھا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا وہ عہد شباب جبکہ اس کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری موجودہ وقت کے وزراء اعلیٰ سے بھی زیادہ ممتاز تھی۔ مرحوم کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے بلایا جاتا پھر وہ بھی نازک موڑ پر ایسی رہنمائی فرماتے کہ وہی آنجہانی گاندھی جی کا آخری فیصلہ ہوتا۔ تجویز اسقدر چست لکھتے کہ کوئی قانون داں اس پر حرف گیری نہ کر سکتا کئی بار جیل تشریف لے گئے جسکا آزاد ہندوستان میں کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ایک بار ان کو اپنی تحریک میں ڈکٹیٹر بنایا۔ مرحوم مفتی صاحب نے دہلی میں کئی میل لمبا جلوس نکالا اور ٹھیک گھنٹہ گھر پر گھوڑ سوار پولیس کی بیدیں اور لاٹھیاں اپنے سر پر لیں لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا۔ حدیث میں جامع اور مدلل و دل تقریر فرماتے صرف مفتی نہیں بلکہ فقیہ تھے۔ بعمر چھیاسی ۸۶ سال شکم کے کینسر میں مبتلا ہوگئے جسکا حملہ جگر تک پہنچ گیا اور یہ موذی مرض جان ہی لیکر ٹلا۔ دلی کے ایک گورستان میں مصروف خواب ہیں۔ اھ۔

افریقہ، حجاز، یمن، ٹرکی، بخارا، چین و ترکستان و افغانستان وغیرہ سے بھی تعزیتی خطوط اور تار آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو جواہر لال نہرو کے والد نے بھی تعزیتی تار دیا۔ کشمیر کے ہندو مہاراجہ جو حضرت شاہ صاحب کا بڑا معتقد تھا اس نے بھی تعزیتی پیغام بھیجا اہل علم اور دانشوروں کے ساتھ کائنات علم کے اس حادثہ پر شعراء نے بھی الم انگیز مرثیے اور تاریخ وفات کہیں جو غیر منقسم ہندوستان کے اخبارات اور دینی مجلات میں مسلسل شائع ہوتی رہیں ان میں سے بعض پیشِ خدمت ہیں۔

مرثیے اور تاریخہائے وفات

قطعۂ تاریخِ وفات از جانب منظور حسن ایم اے ایم، او ایل بر وفات حضرت استاذ الاساتذہ فخر المحدثین مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث ملت ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء۔

کر رہی ہے آج دنیا ماتم شیخ الحدیث	اے قلم تو بھی حدیث صدمۂ جانکاہ لکھ
محفل حنفیہ کا جا تا رہا صدر الصدور	سرپرست العدل کا رخصت ہوا واللہ لکھ
کہہ اسے استاد کامل حامی شرع متین	علم و عرفاں کا اسے لاریب مہر و ماہ لکھ
چشم گریاں سے جو خوں ٹپکا اسی کو مر تسم	سینۂ سوزاں سے جو رہ رہ کے اٹھی آہ لکھ
لے عدد العدل کے منظور اور سال وصال	جامع المعقول والمنقول انور شاہ لکھ
۱۳۵	۱۷ ۱۲

یہ قطعۂ تاریخ العدل[عہ] کی اشاعت ۱۴ صفر ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا پھر العدل ہی میں ۲۶ صفر ۱۳۵۲ھ کو انھیں منظور صاحب کا دوسرا قطعہ تاریخ وفات اشاعت پذیر ہوا جو حسب ذیل ہے۔

ہو گیا قلب حزیں وقف مصیبت الغیاث	آسماں ٹوٹا ہوئی برپا قیامت الغیاث
آہ وہ گنج فیوض و مخزن علم و عمل	حامیِ دیں ماحیِ شرک و ضلالت الغیاث
جسکے دم سے تھا معزز ہند میں درس حدیث	چل بسا وہ مقتدای ملک و ملت الغیاث
چھپ گیا شرع متیں کا ماہ کامل الحفیظ	آج میں لکھوں اسکی تاریخ رحلت الغیاث
ہو گیا منظور بیدل نیز بیدل ہو گئے	علم و عرفاں اور ارشاد و ہدایت الغیاث
۲۹۶	۱۱۰ ۳۲۱ ۲۰۶ ۴۱۹

عہ العدل مولانا احمد علی صاحب فاضل دیوبند کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک دینی جریدہ تھا جسکا مقصد قادیانیوں کے مشہور اخبار الفضل کے ہفوات کی تردید اور قادیانی نبوت کا استیصال و بیخ کنی تھا ردِ قادیانیت سے شدید دلچسپی کی بنا پر حضرت شاہ صاحب مرحوم العدل کے سرپرست اعلیٰ تھے۔

العدل کی اسی اشاعت میں مولانا محمد صاحب[ع] لائل پوری انوری مرحوم کا لکھا ہوا مرثیہ موجود ہے۔

رفت از ما فخر ملت قطب وقت و شیخ قوم	حامل دین نبی ہم حامل حسنات رفت
عالم اسرار وحی و طائر عرش آشیاں	حافظ علم حدیث و کامل برکات رفت
سید علماء و صدر اولیاء و اتقیاء	سایۂ لطف خدا ہم رحمت مہداۃ رفت
رفت از ما کوہ تمکیں صادق و فخر زماں	حامی دین ہدیٰ ہم ماحی بدعات رفت
یادگار سلف بود و حجۃ للخلف بود	وائے ناکامی کہ از ما آیت از آیات رفت
مرشد و استاد ما و ملجأ و ماوائے ما	آہ محمد انور شاہ صاحب الحسنات رفت

نیز مولانا محمد حسن مہتمم مدرسہ زینت الاسلام مہندر گڑھ کی تاریخ وفات۔

سال رحلتش چناں بگفت حسن	رفت وائے محمد انور شاہ
	۱۳۵۲

عہ مولانا محمد انوری لائل پوری :- مرحوم مشرقی پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ کے باشندہ تھے دارالعلوم دیوبند اپنے والد مرحوم کے ہمراہ تعلیم کے لئے حاضر ہوئے تو حضرت شیخ الہند کے مکان پر فوراً حاضری دی۔ گرمی کا زمانہ دوپہر کا وقت حضرت مرحوم کے ارد گرد معتقدین کا ہجوم جن میں ایک صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دستی پنکھا جھل رہے تھے اور حضرت کے آرام و راحت کے خیال سے بڑھتے ہوئے ہجوم سے بہ آواز نرم کہتے۔ بھائی ذرا دور رہئے حضرت کو تکلیف ہوگی یہ پنکھا کرنیوالے دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رئیس العلماء حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ تھے بقول مولانا انوری لائلپوری حضرت شاہ صاحب کی یہ سب سے پہلی زیارت تھی اور معصومیت کی گڑھی گڑھائی تصویر پہلے ہی لمحہ میں مولانا انوری کے قلب مشتاق میں جاگزیں ہوگئی۔ دورۂ حدیث مرحوم نے حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھا اور اپنے استاد کے عاشق زار ثابت ہوئے، بیعت کا بھی تعلق ان ہی مرحوم استاد سے تھا بعد میں خلافت حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی فراغت کے بعد لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ میں مدتوں تعلیم دیتے رہے۔ مقدمہ بھاگلپور میں مسلمان لڑکی کی جانب سے شاہ صاحب نے انھیں کو وکیل بنایا تھا۔ شاہ صاحب سے متعلق ایک مستقل سوانح آئینہ کمالات انوری کے نام سے شائع کی۔ خانوادۂ انوری سے تعلق اور قلبی روابط کا یہ عالم تھا کہ برادر اکبر نے جب دیوبند سے انور نامی ہفتہ وار جریدہ شائع کیا تو مرحوم اسکے سب سے بڑے معاون تھے اور خاکسار کی ادارت میں شائع ہونے والا "نقش" حضرت مرحوم کے الطاف و عنایات سے تین سال تک شائع ہوتا رہا خود خریدار بہم پہونچاتے پاکستان سے ترسیل رقم کے ذرائع مہیا کرتے والدہ مرحومہ کے لئے حج کا انتظام فرمایا اور خاکسار کے رہائشی مکان کی تعمیر میں مدد فرمائی۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور پاکستان منتقل ہوگئے اور مدرسہ انوریہ کا افتتاح کیا۔ ۱۹۶۴ء میں یہ ظلوم وجہول ایک ہفتہ کے قریب لائلپور میں ان کا مہمان رہا اعلیٰ میزبانی وضیافت کے ساتھ کل پاکستان میں مسافرت کے اخراجات مرحوم ہی نے کئے۔ کھانے

(باقی آگے)

ایک مختصر اور جامع تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے استاد جناب قاری محمد یامین صاحب نے شیخ العارفین سے نکالی دیوبند کے مشہور شاعر انور صابری نے حضرت شاہ صاحب سے متعلق بہت سے اشعار کہے جن میں سے ایک رباعی یہ ہے۔

جو مراحل علم کے طے کر چکی تاریخ دیں　　ان کا آئینہ دماغ و قلب انور شاہ تھا
نبض فطرت کے تغیر پر تھا اسکا دستِ فکر　　حق پرست و حق شناس و مردِ حق آگاہ تھا

اس صدمۂ جانکاہ کو جو تیرہویں صدی میں ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک حادثہ فاجعہ تھا اسکے الم انگیز اثرات جب دور و بعید کے لوگوں نے محسوس کئے تو دانشوروں کی وہ مجلس جو مرحوم ہی کی تربیت دادہ تھی اور جسکے علمی و ذہنی تشکیل میں صاحب سوانح کا فضل و کمال اخلاص وللہیت خوبی صفات و حسن شمائل بڑے کارگر اور مؤثر تھے ظاہر ہے کہ ان کے دل و دماغ انکے شب و روز ان کی خلوت و جلوت اس حسرت آیات وفات پر کس طرح سکون آشنا رہتے چنانچہ صف تلامذہ میں بے قراری و بے تابی نالہ و شیون اور غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ کسی نے نثر میں لکھا تو کسی نے اپنے تاثرات کو مرثیہ میں قلمبند کیا ان مراثی سے کچھ منتخب مرثیے جو عربی زبان میں ہیں قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد ادریسؒ[عہ] صاحب کاندھلوی مصنف "تعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح" نے جو مرثیہ لکھا جسکا ہر مصرعہ زخمی قلب و جگر کی قاش ہے۔ ارشاد ہے۔

سلام علی حفظ الکتاب وسنۃ　　وحفظ وضبط بعد شیخ مبجل
ادید بہ نور الھدایۃ انورا　　کبدر مبین فی دجی اللیل الالیل　الخ

صـ۶۳ کا بقیہ:۔ پر بیٹھتے تو شروع سے آخر تک اپنے استاد کا ذکر فرماتے خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ لائلپور کا بڑا حلقہ انکے سلسلۂ بیعت و ارشاد میں شریک تھا چند سال گذرتے ہیں کہ ہشتر سال کے قریب عمر پاکر دار فانی سے رحلت فرمائی لوگوں کا بیان ہے کہ لائلپور کی پوری تاریخ میں جسقدر ہجوم ان کے جنازے میں تھا کسی اور کے جنازہ میں دیکھا نہیں گیا۔ ولی صورت و سیرت نیک طبیعت و نیک نہاد علم دوست فضل پرور شخصیت کے مالک تھے۔ غالباً تین لڑکے پسماندگان میں ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے سمدھی تھے آپ کی ایک صاحبزادی رئیس الاحرار کے صاحبزادے مولوی محمد انیس الرحمٰن مظاہری کے نکاح میں تھیں جو اب خود بھی مرحوم ہو چکے۔ اللھم نور مرقدھما وبرد مضجعھما۔

عہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی:۔ قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر اپنی مردم خیزی میں شہرۂ آفاق

(باقی آگے)

دوسرا مرثیہ جناب مولانا میرک شاہ صاحب[ع] اندرابی کا ہے جسکے یہ اشعار قابل ذکر ہیں۔

سقے اللہ رمسا فیہ بدر منور   اضاءت بہ الافاق اذا کان یظہر   الخ

صلا کا بقیہ:۔ ہے اس زمیں سے جو بھی اٹھا آفتاب علم وحسن عمل کا بدر منیر بنکر اٹھا بقول میر تقی میر ؎

دلّی کے گلی کوچے نہ تھے تصویر مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم اصلاً اسی قصبہ کے باشندہ ہیں آپ کے والد مرحوم جنھوں نے حدیث میں صرف مشکوٰۃ شریف پڑھی تھی پختگی علم اور ثاقب فہم کے مالک تھے اپنے لخت جگر کی ایسی تربیت کی کہ وہ افق علم کے ایک روشن سیارہ بن گئے۔ فراغت مظاہر علوم سے حاصل کی اور پھر دیوبند مکرر دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے تشریف لائے گئے حضرت شاہ صاحب سے حدیث پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی جسکے نتیجہ میں زر خالص کندن ثابت ہوا یہیں معین المدرس قرار دیئے گئے۔ ترجمۂ قرآن شروع کیا تو اسکی دھاک بٹھا دی صبح کو بعد فجر نو درہ کی عمارت مستفیدین سے بھر جاتی جس میں منتہی طلبہ کے ساتھ وار دین وصادرین بھی ذوق وشوق سے شرکت کرتے اور آخر اسی ترجمہ کی مقبولیت نے انھیں شیخ التفسیر بنا دیا صورت پر بھولا پن سیرت میں معصومیت اداؤں میں دلبودگی گفتگو میں علم وتحقیق مطالعہ کے اس قدر شوقین کہ ہر وقت دارالعلوم کے کتب خانہ پر مسلط رہتے دارالعلوم میں داخلی فتنہ بعہد حضرت شاہ صاحب شروع ہوا تو رازداروں کا بیان ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم نے تنہائی میں بلا کر فرمایا مولوی صاحب امتحان کا وقت ہے آپ کے استاد شاہ صاحب کی حمایت یا پھر ہماری نصرت۔ بڑی سادگی سے جواب عنایت فرمایا کہ میں بہت کمزور دل واقع ہوا ہوں امتحان کے قابل نہیں۔ خود استعفا دیا اور ریاست حیدر آباد جا پہونچے جہاں ان کا علم وفضل چمکا اور ان کا دین ودانش بہار بدوش بن گیا۔ آخر عمر میں شیخ التفسیر بنا کر پھر دارالعلوم لائے گئے مؤطا امام مالک اور امہات کتب تفسیر زیر درس رہیں طلبہ ان پر جان چھڑکتے اور مستفیدین حلقہ بگوش بن جاتے۔ علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جب کانگریس کی تحریک شباب پر تھی اور ہر کانگریسی جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا ریل کی لائنیں توڑی جا رہی تھیں بجلی کے تار کاٹے جا رہے تھے دھڑا دھڑ فائرنگ ہو رہی تھی اور پورا ہندوستان تحریک کے جھولے میں جھول رہا تھا وہ اچانک اپنے استاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے در دولت پر تشریف لائے۔ علامہ مرحوم اس وقت اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے یہ سلام کر کے بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ حضرت سنا ہے ملک میں کوئی تحریک چل رہی ہے۔ علامہ نے اخبار ان کی جانب بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ لیجئے مطالعہ کیجئے۔ مولانا نے اخبار کے صفحات گنے جو آٹھ تھے فرمایا کہ اگر کتاب کے آٹھ صفحات کا مطالعہ ہو تو کتنا فائدہ ہوگا یہ کہہ کر یہ جا وہ جا۔ علامہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک بار خاکسار اور برادر اکبر مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر بازار جا رہے تھے مولانا ادریس صاحب رہائشی مکان سے نکلے اور تیز قدم اٹھاتے مدنی مسجد میں گھسے چلے جاتے تھے ہم دونوں نے جھک کر سلام کیا بڑے بھائی نے دریافت کیا کہ حضرت خیر تو ہے۔ ارشاد ہوا والدہ صاحبہ اور اہلیہ میں کچھ تیز گفتگو ہو رہی ہے مسجد میں جا کر تالیف قلب کی دعا کروں گا۔ خاکسار اور اس کے خانوادے کو گاہے گاہے در دولت پر مدعو فرماتے ایک مرتبہ دستر خوان پہ کھانا چنا جا رہا تھا چھوٹی بچی گھر میں سے نکل آئی بچوں کی عادت کے مطابق اس نے پیسے طلب کئے تو مولانا نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا اسکا کچھ حاصل نہیں (باقی ص۶۶ پر)

ع جناب مولانا میرک شاہ صاحب:۔ حالات زندگی زیادہ معلوم نہیں غالباً ایک دو بار ہی زیارت کا موقعہ ملا کشمیر وطن تھا دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور حضرت شاہ صاحب کے خصوصی تلامذہ میں تھے۔
(باقی آگے)

مولانا محمد یوسف صاحب کامل پوری نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کی ابتدا ریہ ہے۔

خطب المّ فاسبل اجفانی　　　والناثبات مثیرة اشجانی

اس کے علاوہ مولانا محمد یامین صاحب استاد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری نے بھی دو مرثیے لکھے۔

صفحہ ۶۵ کا بقیہ :- حیدرآباد کے ایک صاحب جو بی،اے پاس اور ملکے سے دماغی خلل کے مریض تھے حضرت علامہ عثمانی کے یہاں وارد ہوئے اور اپنی غیر ارادی حرکات سے علامہ کو خوب خوب مکدر کیا مثلاً رمضان المبارک کا مہینہ شب میں علامہ نے سحر میں اٹھنے کے لئے الارم لگایا یہ صاحب اٹھے اور الارم کو قبل وقت ہی جام کر دیا۔ صبح کو کان پکڑی ہوئی تو ان صاحب کا عذر یہ تھا کہ ہمارے محبوب علامہ عثمانی کے آرام میں خلل آتا۔ علامہ کے یہاں سے راندۂ درگاہ ہوئے تو اپنی تمام حماقتوں کے ساتھ مولانا ادریس صاحب کے یہاں جا دھمکے۔ ایک بار میں اور بھائی دولت کدہ پر حاضر ہوئے تو مولانا ادریس صاحب نے فرمایا ہم تو مجھتے ہی دیوانے یہ ایک اور دیوانے آگئے خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ پھر ان کو چائے بنانے کا حکم ہوا تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد لائے جو سر کے بالوں سے زیادہ سیاہ اور ایلوے سے زیادہ کڑوی تھی۔ مرحوم قیام پاکستان کے زبردست موید تھے اور ان کے تخیل میں یہ نئی نویلی قائم ہونے والی سلطنت خلافت راشدہ کا عکس جمیل تھی اسلئے جب پاکستان وجود میں آیا تو ہندوستان سے اٹھے اور لاہور جا پہونچے مدرسہ اشرفیہ کے صدر مدرس ہوئے قریب ہی کی کسی مسجد میں ترجمہ قرآن فرماتے اور خواص وعوام پر اپنے علم کی گہری چھاپ ڈال کر گذشتہ سال راہی ملک بقا ہوئے عمر غالباً ستر پچھتر کے درمیان ہوئی۔

عہ جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری :- عجیب بات ہے کہ اس کائنات میں بعض علوم و معارف، دین و دانش کے لئے کچھ خاص زبانیں اختیار کی جاتی ہیں شمس تبریز کی عرفانی حقیقتوں کیلئے ترجمان کی حیثیت سے مولائے روم کا وجود ضروری ہوا حافظ ابن تیمیہ کے معارف ابن قیم کے بغیر کائنات علم میں اشاعت پذیر نہ ہو سکے۔ ابن ہمام کا تفقہ اور ان کی فقہی بصیرت ان کے نامور شاگرد قاسم بن قطلوبغا ہی سے روشناس ہوئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی دیدہ وری اور حدیثی مہارت حافظ سخاوی کے وجود سے مستند ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رح کو ایک ایسی زبان کی ضرورت پیش آئی جو ان کے سینہ میں مستور گنجینۂ علم و معرفت کو عالم آشکارا کرے تو قدرت نے حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کی زبان کو ان کا پیغامبر بنا دیا۔ علامہ کشمیری مرحوم جن کے علم کا بحر بیکراں تلاطم پذیر ہوتا تو ساحل کی گرفت ان کے قدم روکنے سے درماندہ تھی لیکن اس علم و عمل کے بلند منار کو بھی اپنے فیضان کے لئے وسائط کی حسب دستور ضرورت پیش آئی۔ یوں تو ان کی بارگاہ علم کا ہر باریاب ان کی عبقریت کا ترجمان ہے لیکن مولانا سید یوسف بنوری اس دیدہ زیب ہار کے درمیانی موتی اور مرصع غزل کے بیت الغزل ہیں وہ بنور کے اس خانوادہ کے فرد فرید ہیں۔ جس گھرانے نے سرہند کے آفتاب نے ضیا پاشیاں کیں یعنی حضرت سید آدم بنوری علیہ الرحمۃ شیخ احمد سرہندی مجدد ہزارۂ دوم کے ان تیار کردہ افراد میں سے ہیں جنھوں نے اپنے آتشیں نفوس سے کائنات روحانی میں ایسی سوز و تپش پیدا کی جس کی لو صبح قیامت ہی کو افسردگی سے آشنا ہوگی۔ مولانا بنوری ابھی نوخیز تھے کہ علم کی تشنگی انھیں وطن کے مرغزار سے دیوبند کے رواں دواں علم کے سرچشمہ تک لے آئی یہ وہ وقت تھا کہ علامہ کشمیری دار العلوم سے یکسوئی اختیار کر کے خانہ نشین تھے۔ بنوری نوجوان نے

(باقی آگے)

اہل اللہ کی وفات عام انسانوں کی موت نہیں ہے بلکہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "عالِم کی موت عالَم کی موت ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ کسی عالم ربانی کے سانحہ پر انسان ہی ماتم نہیں کرتے بلکہ حدیث سے ثابت ہے کہ زمین و آسمان بھی اسکی موت پر اشکبار ہوتے ہیں۔ حدیث ہی میں تو ہے کہ اہل علم کیلئے کائنات کا ذرہ ذرہ دعاگو رہتا ہے تاآنکہ سمندر کی تہ میں مصروف گردش مچھلیاں بھی۔

ص کا بقیہ :- باسلوب مقامات حریری ایک درخواست حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ جوہر شناس استاد نے نگارشات کے عقب میں درخشاں آفتاب کو طلوع کے لئے تیار پایا۔ پہلا جملہ یہ ارشاد ہوا... مولوی صاحب آپ بہت دیر میں تشریف لائے ہیں اب ناتواں ہو چکا ہوں۔ خیر آپکو اپنے سے ملحق کئے لیتا ہوں اور یہیں سے الحاق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہ الفاظ دیگر کہکشاں قریب قمر آئی اور ایک زندۂ جاوید شخصیت نظام شمسی سے وابستہ ہو گئی۔ پھر اس سعید شاگرد نے دامن استاد کو اس مضبوطی سے تھاما کہ استاد کی وفات پر نصف صدی ہونے کو آتی ہے مگر عقیدت و وابستگی مضمحل تو کیا ہوتی وارفتگی کی منزل میں جا پہونچی۔ بنوری حسن و جمال کا پیکر زیبا، شرافت و نجابت کی تصویر، علم و کمال کا مرقع، دین و دانش کا تمثال ہے، نسلاً سید، وطناً پٹھان، کبھی اس نسبت کی شعاعیں، کبھی اس انتساب کی گرمی، مسجد الحرام میں راقم السطور کے ساتھ ہمنشین تھے ایک بدقسمت یمنی پیچھے سے پھلانگتا ہوا بے ہنگم انداز میں گزرا۔ مولانا نے تادیب کی اور معاً چشم پرنم کے ساتھ اسکے پاؤں جا پکڑے۔ کراچی میں مدرسہ کا آغاز کیا۔ ایک روز طلبہ نان شبینہ سے بھی محتاج، مولانا کراچی کی آبادی میں دریوزہ گری کرتے پھرے۔ روٹیوں کا ڈھیر سر پر لاد کر لائے اور طلبہ کے سامنے پٹک مارا۔ اپنے استاد کے بعد ڈابھیل میں صدر مدرسی تک پہنچے۔ سلطنت پاکستان وجود میں آئی تو "ٹنڈو اللہ یار" کے مدرسہ کو زینت بخشی۔ وہاں سے اٹھے تو مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ درسگاہ اب پاکستان کی ایک مثالی درسگاہ ہے۔ جوشِ عمل اس قدر پرشباب کہ قادیانیت کے تعاقب میں نکلے تو پاکستان کے سب سے بڑے انسان سے استعفا کا مطالبہ کر ڈالا۔ مدرسہ اس آن بان سے قائم ہے کہ زکوٰۃ لینے کے لئے تیار نہیں۔ صرف عطیات پر یہ کاروانِ علم مصروف رفتار ہے۔ لاتعداد حج کئے اور خدا جانے ابھی کتنی بار یہ سعادت ان کے لئے مقدر ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں کی انتظامیہ کے ممبر، رابطہ عالم اسلامی کے رکن رکین۔ سرحدی انسان ہونے کے باوجود شاہکار اردو لکھنے پر قادر۔ کوئی مذاکرۂ علمی کسی جگہ پر ہو وہ اس کے مندوب خصوصی رہتے ہیں۔ درس میں بیٹھتے ہیں تو تحقیقات کا انبار ان کے جلو میں ہوتا ہے زبان کھولتے ہیں تو موتیوں کی بارش ہوتی ہے۔ تقریر کی روانی گرفت سے باہر ہے۔ مہمان نواز، بذلہ سنج اور علمی انسان ہیں جن کی خلوت ہو یا جلوت، درس میں ہوں یا درس سے باہر لیکن انکی طغیانی تموج پذیر رہتی ہے۔

یہ تذکرۂ یوسفی جو قرآن کی داستانِ یوسف کی طرح طویل ہو گیا قارئین کے سامنے اس معذرت کے ساتھ پیش ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور۔ اھ

وجہ اسکی یہ ہے کہ اہل اللہ کے فیوض سے کائنات کی ہر چیز فائدہ اٹھاتی ہے۔ آفتاب نکلتا ہے تو اسکی ضوفشانی کیلئے کوئی مخصوص علاقہ نہیں۔ اسی طرح جب وہ غروب کرتا ہے تو تاریکی سب جگہ چھا جاتی ہے تو اہل اللہ اور علماء کے وجود سے پوری دنیا روشن و منور اور ان کی موت پر پوری دنیا تاریک اور ظلمت ہر طرف محیط۔ خدا تعالیٰ اہل اللہ کی وفات سے پہلے اس پیش آنے والے حادثہ کی اطلاع بھی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی علالت کا آخری دور گذر رہا تھا تو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے صاحبزادے نے جو اس وقت دار العلوم میں طالب علمی کرتے تھے خواب میں دیکھا کہ آفتاب ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ مغرب کی نماز حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ کی مسجد میں ادا کی۔ بعد نماز ان صاحبزادے نے اپنا یہ خواب حضرت موصوف کو سنایا۔ سُن کر فرمایا کہ بھائی کسی بہت بڑے عالم کی وفات ہوگی اور ممکن ہے کہ میری ہی ہو۔

اس خواب کے چند روز بعد ہی مرحوم کا سانحۂ وفات پیش آگیا۔ بلاشبہ آپ اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ایک درخشاں آفتاب تھے اور آپ کا حادثہ آفتاب علم کا ٹوٹ کر گرنا تھا۔ وفات کے بعد متعدد لوگوں نے ایسے خواب دیکھے جو آپ کی مغفرت کاملہ اور نجات کی جانب مشیر ہیں۔ مولوی عبد الواحد صاحب نے ایک رات یہ خواب دیکھا کہ ایک جنازہ ہے اور اس کے پیچھے اتنا بڑا ہجوم جسے شمار کرنا بھی ممکن نہیں۔ مخلوق جنازے کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور ہجوم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں بھی اسی ہجوم میں شریک ہو گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کسکا جنازہ ہے؟ بتایا گیا کہ یہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ ہے جسے لوگ تبرک اور حصول برکت کے لئے کاندھا دینے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ میں نے ہجوم سے کہا کہ ذرا ٹھہرو ٹھہرو۔ میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی زیارت کرنا چاہتا ہوں میری بیقراری پر جنازۂ مبارک زمین پر رکھ دیا گیا اور ہجوم نعش مبارک کے قریب سمٹنے لگا۔ میں نے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی تو وہ بعینہ چہرہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔

اس کے علاوہ مولانا حکیم عبد الرشید صاحب[ع] محمود نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ حضرت مرحوم سبز پوشاک میں ہیں اور بے ریش و بروت۔

ع حکیم عبد الرشید صاحب مدظلہ:۔ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے پوتے، دار العلوم دیوبند کے فاضل، حاذق طبیب، اور گوشہ نشین دانشور ہیں۔ لباس و پوشاک نفیس، گفتگو نستعلیق۔ انکی اردو عرب کے صحرا سے اس طرح گذری کہ اردو برائے نام اور عربی کا غلبۂ تمام، حافظہ بے نظیر، مضامین مستحضر، بولنے پر آتے [illegible]

حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس خواب کو دیکھ کر مجھے حیرانی و تشویش ہوئی۔ غالباً حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کو خواب لکھ بھیجا تو حضرت نے تحریر فرمایا کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی نجات و مغفرت اور اہل بہشت میں سے ہونے کی بشارت ہے۔ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اہل جنت جُرْدٌ مُرْدٌ یعنی بے ریش و بروت ہوں گے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ بہشت بریں کی لذتوں اور وہاں کی راحتوں سے استفادہ کے لئے شبابی عہد کو لوٹا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ از کار رفتہ بوڑھے کسی آرام دہ ماحول سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ شبابی دور میں نہ صرف یہ کہ قویٰ برسرکار ہوتے ہیں بلکہ اس زمانے کی امنگیں انسان کو ہر نعمت سے صحیح استفادہ کا بھرپور موقعہ بھی دیتی ہے تو یہ خدائے تعالیٰ کی مزید نعمت ہے کہ بہشت سے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے قویٰ بھی مناسب عنایت فرمائے۔

صفحہ کا بقیہ: ۔ ہیں تو بے تکان بولے چلے جاتے ہیں۔ ناز میں پلے ہوئے، نیازمندی سے بہت دور۔ مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ "نازک مزاجی لازم صاحبزادگیست" مرزا مرحوم کے اس قول کی تصدیق حکیم صاحب کو دیکھ کر کرنا پڑتی ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ بیوی اور خادم کسی کے معتقد نہیں ہوتے۔ خاکسار کی جانب سے اسمیں صاحبزادوں کا بھی اضافہ کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حکیم صاحب کو حضرت شاہ صاحب مرحوم سے بے پناہ عقیدت ہے۔ خاکسار سے فرمایا کہ میں جب دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحب کو ارادۃً پہروں دیکھتا اور یہ سوچتا کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار و گفتار آپ کی نشست و برخاست قعود و قیام، لباس و پوشاک، انداز کلام و گفتگو اس طرح ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں حکیم صاحب کا یہ تأثر بڑا توثیقی سرٹیفکٹ ہے۔ حکیم صاحب علم دوست، صاحب مطالعہ اور وسعت معلومات کے خزانہ ہیں۔ بد قسمتی سے ایک زمانہ میں جماعتِ اسلامی سے متأثر رہے اور اس کے کاروبار میں عملی حصہ بھی لیا۔ پھر نسبت حضرت گنگوہی نے اس قعر ضلالت سے ہاتھ پکڑ کر نکالا تو عالم بیزاری میں جماعت اسلامی سے متعلق اپنے تأثرات "مکتوبات ثلاثہ" کی شکل میں پیش فرمائے جسمیں تحریک کے ان جلی خفی مکروہ خد و خال کو نمایاں کیا جو عام لوگوں کی نظروں میں نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب ان مضبوط تعقبات کا کوئی معقول و سنجیدہ جواب نہ دے سکے تو "حکیم گل بنفشہ نویس" و "معروف بہ الشافی" کی جلی کٹی سنا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیا۔ ایک بار حکیم صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے دینی ماحول میں یہ بہت بڑا اعزاز ہے لیکن موصوف کی بے نیازیاں، صرف ایک بار شوریٰ میں شرکت فرمائی پھر مستعفی ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ عمومی مشغلہ مطالعہ ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مطب کرتے ہیں اور روزمرہ کے اخراجات پورے ہونے پر مطب سے اٹھ کر بحر علم و تحقیق کے دریا میں غواصی انکا محبوب شغل ہے۔

عافاہ اللہ تعالیٰ من الکروب والآفات
فی الدنیا والآخرۃ

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "نبوت ختم ہو چکی اب کسی طرح کا بھی کوئی نبی آنے والا نہیں نہ ظلی نہ بروزی، نہ حقیقی اور نہ تابع، جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ دجال اکبر ہے البتہ مبشرات ابھی باقی ہیں۔ مبشرات وہ رؤیائے صادقہ ہیں اور ان اجزاء میں سے ہیں جن سے نبوت کی ترکیب ہے۔ مبشرات کا مطلب یہ ہے کہ خوش آیند و خوشگوار خواب جو انسان اپنے متعلق خود دیکھے یا کسی دوسرے کے لئے دیکھے۔ اہل اللہ کی وفات پر ظاہر میں بھی بہت سے ایسے واقعات و علامات رونما ہوتے ہیں جو ان کی نجات و مغفرت کے خفی و جلی اشارات ہوتے ہیں۔

صاحبِ سوانح کی وفات پر بہت سے خواب دیکھے گئے۔ خاکسار نے صرف ڈیڑھ ہی خواب ذکر کئے ہیں۔

مزار اور لوحِ مزار:۔ عرض کر چکا ہوں کہ آپ کو عیدگاہ دیوبند سے متصل ایک قطعہ زمین میں دفن کیا گیا۔ اس زمین پر آپ کی سب سے پہلی قبر تھی لیکن بہت جلد آپکی بڑی صاحبزادی عابدہ خاتون وفات پاکر وہیں دفن ہوئیں۔ دیوبند میں آپ کے چند خصوصی معتقدین بھی اسی مقبرہ میں دفن ہیں۔ مجھ سے بڑا بھائی محمد اکبر شاہ مرحوم تیرہ[۱۳] چودہ[۱۴] سال کی عمر میں غریق رحمت ہو کر اپنے نامی گرامی والد کے قدموں کے نیچے سوتا ہے۔ آپ کے برادر نسبتی حکیم محفوظ علی صاحب، والدہ مرحومہ اور راقم الحروف کی پہلی اہلیہ سنجیدہ خاتون بائیں جانب دفن ہیں۔ پورے خاندان کے بڑے چھوٹے اور معصوم بچے بیس[۲۰] پچیس[۲۵] کی تعداد میں ان سب کی قبریں والد مرحوم کے ساتھ ہیں۔ مزار کی داہنی جانب اس ظلوم وجہول نے ان تمناؤں کے ساتھ خالی رکھی ہے کہ رحمتِ حق ایک سراپا عصیان کو اسی مطہر زمین کا پیوند خاک بنائے والامر بید اللہ۔

وفات کے چند روز بعد مولانا حفظ الرحمان[ع] مرحوم دہلی سے لوحِ مزار تیار کرا کر لائے جسکا

ع **مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم:۔** قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور آبائی وطن، دارالسلطنت دہلی اقامتی زمین، ابتدائی تعلیم سیوہارہ و شاہی میں حاصل کی۔ وہاں سے اٹھے اور ازہر الہند دارالعلوم دیوبند پہنچ حضرت شاہ صاحب مرحوم سے دورۂ حدیث پڑھا اور ایک سے زائد بار۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، گھنی ڈاڑھی جسکی تراش وخراش نہایت ہی مہذب تھی۔ سفید بھویں جنھیں تجربات اور مشاہدات کی طوالت نے قبل از وقت رنگ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سر پر سفید و ریشم سے زیادہ نرم بال، ہمیشہ کلاہ قلپاقی سر پر رہتی۔ جامہ زیب تنگ مہری کا پائجامہ، چست شیروانی، خداداد محبوبیت کا پیکر، زبان قینچی کی طرح چلتی جس سے حریف کے دلائل بسہولت کاٹ دیتے۔ جہاں پہونچتے میر مجلس ہوتے۔ جس کارواں میں شریک ہوتے تو اس کے امیر بن جاتے۔ ابتداء میں دارالعلوم میں معین المدرس رہے پھر مدرس بنا دیئے گئے۔ یہاں سے مدراس پہونچے تو اہل حدیث سے بالمقابل مناظرہ کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہوئے۔ "حفظ الرحمان لمذہب النعمان" اسی زمانہ کی یادگار ہے

مدفنِ علم و دانش یعنی مقبرۂ حضرت امام العصرؒ۔
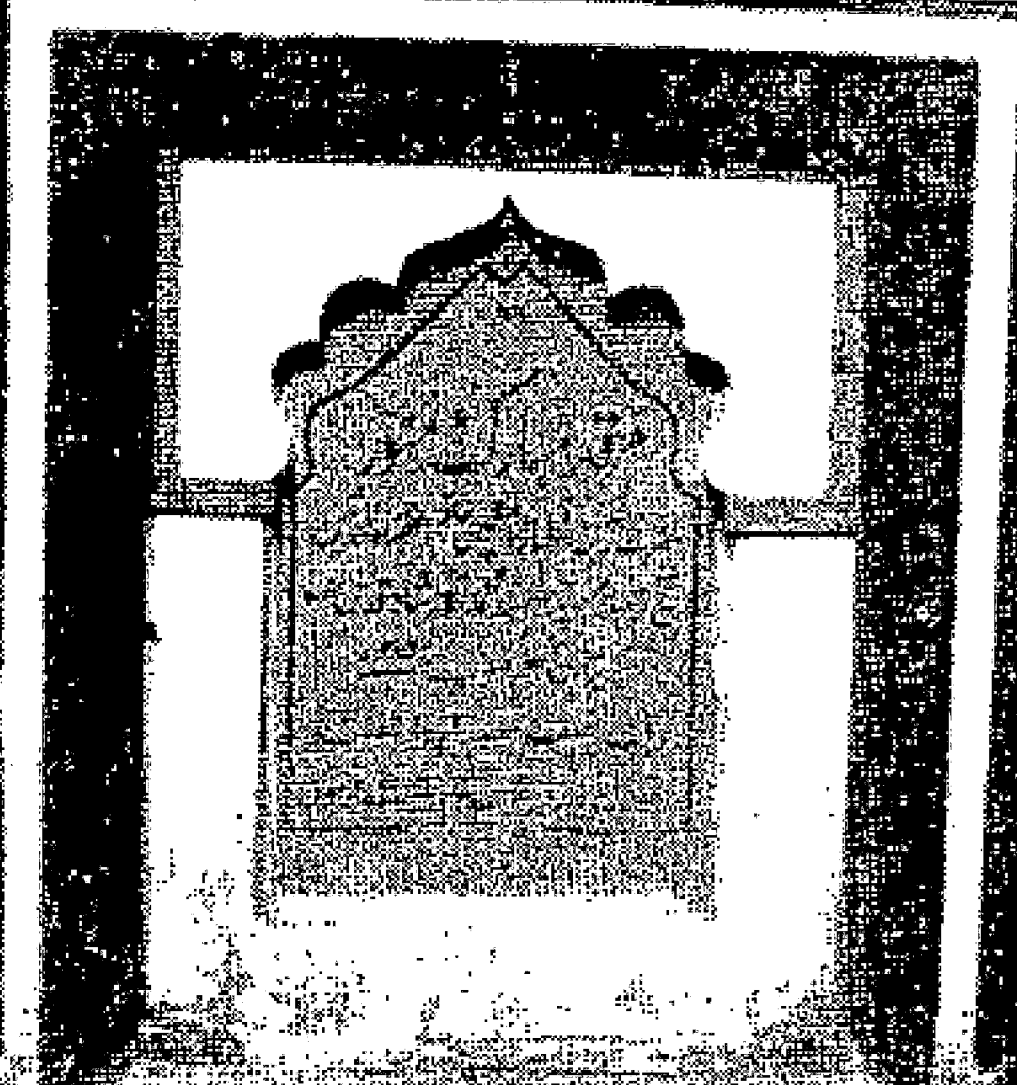
مضمون مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا اور کتابت مشہور خطاط محمد یوسف دہلوی کی ہے۔ لوح مزار کا مضمون بھی ایک فاضل روزگار کے قلم کی تراوش ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

"مرقد مبارک و منور حضرت رئیس الحکماء والمتکلمین، خاتم الفقہاء والمحدثین، شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ کہ بتاریخ ۲ صفر ۱۳۵۲ھ بوقت نصف شب از دار الفنا بسوئے دار البقا رحلت فرمود۔"

اس لوح مزار کے ساتھ مسنون خام قبر، عیدگاہ کے دامن میں زیارت گاہ خاص و عام اور مرجع اہل علم و کمال ہے۔ مرحوم کی عمر کل ساٹھ سال کی ہوئی۔

حجرہ کی تعمیر:۔ جیسا کہ عرض کیا کہ مزار عیدگاہ کے متصل ہے یہ دیوبند کی آبادی سے باہر کا علاقہ ہے۔ مقبرہ کے قریب اکثر آدمی اپنے جانور چرانے کے لئے لیجاتے جو حدود مقبرہ میں بھی داخل ہوتے۔ آپ کے مخلص شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی ثم افریقی نے صرف خاص سے مزار پر ایک حجرہ کی تعمیر کی اور مقبرہ کے وسط میں پانی کے لئے دستی پمپ لگوایا۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کسی شخص کو آباد کیا جائے جو قبرستان کی حفاظت کرے۔

حجرہ کی شکستہ عمارت اب بھی موجود ہے۔ یہ وضاحت اسلئے ضروری ہے کہ عام شہرت یہ ہے کہ علامہ مرحوم اسی حجرہ میں مطالعہ فرماتے تھے۔ حجرے سے متعلق جو تفصیل پیش کی گئی اس سے معلوم ہوگا کہ یہ صحیح نہیں۔ حجرہ کی تعمیر تو آپ کی وفات کے بعد ہوئی۔

صؔ کا بقیہ:۔ دار العلوم میں اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا اور یہ بھنک مرحوم کے کانوں تک پہونچی تو بستر باندھ کر دیوبند آگئے پھر تحریک میں اس زور و شور سے حصہ لیا کہ اپنی گرمی عمل و گرمی گفتار سے آگ لگا دی۔ ڈابھیل گئے اور چند سال مدرسی کی۔ گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا تو مدرسہ کی قیل و قال سے دامن جھاڑ کر جیل خانہ کے مہمان بن گئے۔ جیل اس شان سے جاتے کہ "ندوۃ المصنفین" کے دفتر میں قلم تسوید "قصص القرآن" میں مصروف ہے۔ اچانک دوش پہونچی۔ مولانا نے وارنٹ وصول کیا۔ پولیس کی گاڑی میں سوار ہوتے اور یک لخت روانگی، نہ گھر کا فکر نہ اہل و عیال کا ملال نہ کسی سے جدائی کا غم اور نہ اندیشۂ فردا۔ غلام ہندوستان میں انگریز سے لڑتے رہے۔ ملک آزاد ہوا تو ان کے لئے ایک نیا محاذ جنگ کھل گیا۔ یہ فرقہ پرستی کے خلاف جہاد تھا یتیم بچے، بیوہ عورتیں، تڑپتی ہوئی لاشیں، اجڑے ہوئے مکان، برباد بستیاں انھیں کو آواز دیتیں اور وہ اس مردانہ ہمت سے کام کرتے جسکی تاریخ بے مثال ہے یہی ان کا وہ عہد تھا جس کے لئے ایک باخدا انسان حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوری مرحوم نے تمنا کی تھی کہ "مولانا حفظ الرحمٰن میری عمر بھر کی عبادت لیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد

(باقی آگے)

اولاد و احفاد اور فقیر غیور کی میراث:۔ ۱۳۳۶ھ کے اواخر آپ کی شادی سادات گنگوہ کی ایک یتیم لڑکی سے ہوئی جس کا پس منظر آپ پچھلے صفحات میں پڑھ آئے۔ ۱۳۳۶ھ تا ۱۳۵۲ھ پندرہ سال کے عرصہ میں مرحوم کے یہاں کل پانچ بچے پیدا ہوئے جن میں سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی عابدہ خاتون جن کی شادی بجنور کے رئیس اور صاحب عزت خاندان کے چشم و چراغ مولانا شفیق الرحمٰن صاحب سے ہوئی۔ پہلی ہی زچگی میں ماہ رمضان میں چوبیس اور پچیس سال کی عمر کے درمیان میں ان کی وفات ہوگئی۔ اپنے پیچھے اپنی کوئی یادگار بھی نہیں چھوڑی۔ برادر اکبر مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر ۱۳۳۹ھ میں تولد پذیر ہوتے۔ اس وقت رسالہ "دارالعلوم" کے مدیر اور ہندوستان کے مشہور قلم کار ہیں۔ ذکاوت و ذہانت وراثتاً حصہ میں آئی۔ مختلف اوقات میں تین شادیاں ہوئیں۔ اہل و عیال کے ساتھ کچھ بچوں کے نانا بھی ہیں۔

لڑکیوں میں راشدہ خاتون ہیں جنکی عمر پچاس کے قریب ہے اور مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری مؤلف "انوار الباری" کے نکاح میں ہیں۔ متعدد لڑکے اور لڑکیاں آپ کی اولاد میں ہیں۔

محمد اکبر شاہ مرحوم اولاد میں آپ کے لئے سب سے زیادہ محبوب تھے۔ بچپن ہی سے معصومیت کا پیکر حفظ و ذکار کا تابندہ ستارہ، سعادت آثار، دارالعلوم کے شعبۂ فارسی میں تعلیم کے دوران ہر استاذ کے لئے عزیز اور محبوب اپنی جماعت میں ہمیشہ نمبر اول رہے۔ ایسے

صلا کا بقیہ:۔ جو ملت کی خدمت کی ہے وہ مجھے دیں تو میں سمجھوں گا کہ اس سودے میں نفع تمام مجھ ہی کو رہا۔ جرءت و بیباکی، بلند حوصلگی و حق کا نعرہ واشگاف ان ہی کے حصہ میں آیا تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے رکن رہے؛ واقعی پارلیمنٹ کو ہلا ہلا ڈالا۔ اتنے پرجوش مقرر کہ بنگال، تاملناڈ، کیرالا وغیرہ کے اردو ناشناس اراکین بھی ان اردو تقریر کو محویت سے سنتے۔ سیاست و فراست، سوجھ بوجھ میں اس قدر کامل کہ بڑے بڑے بیرسٹر بھی ان کے سامنے زبان کھولنے سے کتراتے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی شباب پر پہنچی تو بعمر ۵۸ اٹھاون سال کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ملت کو بے سہارا چھوڑا اور عالم باقی میں جا پہونچے۔ مرنے کے بعد بھی خوش نصیبی کا یہ کہ دہلی میں جس گورستان میں دفن ہیں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ اور ان کے مزار کے درمیان چند ہی گز کا فاصلہ ہے۔ لوح مزار پر کسی ظالم نے یہ شعر لکھا جو واقعی ان کی پوری زندگی کا ترجمان ہے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم میر
اب جو ہیں خاک انتہا یہ ہے

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

رہائشی کمرہ کا اندرونی حصہ

خوشنویس کہ اساتذہ نے ان کی لکھی ہوئی تحریریں یادگار کے طور پر اپنے پاس محفوظ کیں۔شباب کے اوائل میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ورم جگر میں مبتلا ہو کر قصبہ بڑوت ضلع میرٹھ میں جہاں بسلسلۂ علاج مقیم تھے عالم جاودانی کی جانب رخصت ہوئے نعش دیوبند لائی گئی اور والد مرحوم کے قدموں کے نیچے ابدی آرام گاہ پائی۔آپ کی پانچویں اولاد یہ نامہ سیاہ وسیاہ بخت محمد انظر شاہ ہے۔اس وقت عمر اڑتالیس سال کے قریب ہے اور دارالعلوم دیوبند میں خدمتِ تدریس پر مامور، صاحبِ اہل وعیال، معاصی کی کثرت کے باوجود رحمتِ حق کا امیدوار، کسی اور کے بارے میں توعرض کرنے کی ہمت نہیں لیکن اپنے حق میں بلاشائبہ تکلف وتصنع واشگاف اعلان ہے کہ یہ وجود چند نیک ناموں کے لئے ایک رسواکن زندگی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔نصف صدی گزرنے کے باوجود کسی بڑی تنبیہ کا منتظر یا پھر غفلت کوش زندگی خدائے تعالےٰ کی رحمتوں پر پورا بھروسہ کئے ہوئے ہے یہ ایک مختصر تفصیل ہے آپ کی اولاد واحفاد کی ——— رہا آپ کے ترکہ کا سوال تو جس فقیر غیور نے سالہا سال دارالعلوم میں حسبۃً للہ درس دینے کے بعد بیوی بچوں کی ضرورت کے پیشِ نظر قلیل مشاہرہ قبول کیا تو طلباء وعلماء کے ہجوم میں اشکبار آنکھوں کے ساتھ اس اعلان کے ساتھ کہ

"بھائی مجھ سے زیادہ بدقسمت کوئی شخص نہیں جو اپنے علم کو فروخت کر رہا ہے"

ظاہر ہے کہ اس کے گھر میں تموّل اور آسودگی کی بہار کہاں، کب، اور کس نے دیکھی ہوگی جس نے زندگی کا بڑا حصہ دیوبند میں مولانا محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم کے عاریت پر دئے ہوئے مکان میں بسر کیا اور پھر ایک طویل وقت کرایہ کے مکانوں میں منتقل ہوتا رہا۔زندگی کے آخری ایّام میں محلہ خانقاہ دیوبند میں ایک رہائشی مکان ایک عزیز شاگرد کی توجہ سے میسّر آیا، اسکے متروکہ مال کی فہرست نہ قابل ذکر ہے اور نہ تاریخ میں محفوظ کرنے کی کوئی چیز ——— چند لفظوں میں اس سارے اثاثہ البیت کی تفصیل یہ ہے:-

کھادی کی ایک واسکٹ جو کرتے کے نیچے زیبِ تن تھی وفات کے بعد اسمیں سے چاندی کے کُل ڈیڑھ روپے نکلے جو اس وقت کا رائج سکّہ تھا، کپڑوں کی ایک بُقچی جسمیں ہمیشہ استعمال کے کپڑے رہتے تین سو روپے کے نوٹ جنکے ساتھ تحریر تھی کہ یہ تحریکِ کشمیر کی امانت ہے والدہ مرحومہ نے اس امانت کو بکمالِ دیانت پنجاب میں تحریک کے ذمہ داروں کے پاس پہونچادیا۔متروکہ چند جوڑے

جن کا بڑا حصہ تبرک میں چلا گیا اب مستعمل ایک جوڑا خاکسار کے پاس تبرک اور امانت کے طور پر محفوظ ہے۔ ہاں قیمتی کتابوں کی فہرست بڑی لمبی ہے جنہیں نادر، نایاب، مخطوطات کی کثرت تھی اور یہی انکا اصل اثاثہ تھا جو وفات کے بعد مجلس علمی سملک ضلع سورت کو منتقل کر دیا گیا، اللہ اللہ خیر سلاً، وارثِ انبیاء علیہم السلام کا یہ ترکہ "لا نورث درھما" کا مکمل آئینہ دار ہے۔ تجہیز، تکفین اور تدفین کے تمام انتظامات والدہ محترمہ نے اپنے پاس سے اپنا زیور فروخت کرکے کئے۔ نہ زمین، نہ جائداد اور نہ بچوں کی پرورش کے لئے کوئی انتظام، پنجاب کے معتقدین اور مخلص شاگردوں نے ایک بڑی رقم کو جمع کرنے اور کچھ جائداد خرید کر اہل وعیال کے لئے گذر اوقات کا منصوبہ بنایا جسے ڈاکٹر اقبال نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ

"شاہ صاحبؒ ایسے فقیر غیّور کی روح کو اس طرح کے اقدامات
سے تکلیف نہ پہونچائی جائے۔"

بعض مخلص حیدرآباد کی ریاست سے کچھ وظیفہ کی تدبیر کرتے تھے لیکن یہ منصوبہ بھی تکمیل کو نہ پہونچا، اہل وعیال کی بے سروسامانی پر اسی فدا کار شاگرد نے توجہ کی جسکی جاں نثاری کی فہرست بڑی طویل ہے یعنی مولانا محمد ابن موسیٰ میاں سملکی نے ماہانہ ایک رقم کا انتظام کیا جو والدہ مرحومہ کی وفات تک مسلسل جاری رہا۔ اسی شخص کی فیاضیاں حضرت مرحوم کے اہل وعیال کی رگوں کا خون ہیں خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے فقیر غیّور کی غیرت کی لاج رکھی کہ اہل وعیال کو تنگی و ترشی تو پیش آئی لیکن فقر وفاقہ کی کشمکش سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ زندگی جس انداز سے گذری وہ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کے لئے باعثِ رشک تھی۔

حُسنِ صُورت:۔ علمی وجاہت کے ساتھ اگر حسنِ صورت کی دولت میسّر آئے تو یہ خدائے تعالےٰ کا بڑا انعام بڑا فضل اور بڑی رحمت ہے۔ حسنِ سیرت کی دولتِ بے بہا سے انبیاء علیہم السلام کو سرفراز کیا گیا اور ان کی حیاۃ طیّبہ کا یہ پہلو خاص طور پر ہمیشہ مؤثر رہا خدا تعالےٰ نے حسنِ صورت کی یہ دولت مرحوم کو بخوبی عنایت فرمائی تھی، اپنے خد وخال اور شکل وصورت کے اعتبار سے دلکشی اور دلربائی کی انداز وادائیں، سپید وسرخ رنگ، متناسب اعضاء، گداز جسم، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، نرم ونازک ہونٹ، برجی نماسر، جس پر ریشم سے زیادہ نرم بال، ستواں ناک، بڑے بڑے کان، قدرتی طور پر سرمگیں آنکھیں، گنجان ڈاڑھی جس نے پورے چہرے کو گھیر رکھا تھا، چوڑا چکلا سینہ، ہاتھ لانبے، لیکن ہتھیلیاں چھوٹی پرگوشت، رفتار سبک، اور آنحضور

محلّہ خانقاہ دیوبند میں حضرت امام العصرؒ کے رہائشی کمرہ کا بیرونی حصہ۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کا نمونہ، چلتے تو قدموں کی چاپ محسوس نہ ہوتی۔ اس حسین اور پرکشش جسم پر جب موسم سرما میں سبز عمامہ زیب سر اور سبز قبا زیب بدن کرتے تو ایک فرشتہ انسانوں کی اس دنیا میں چلتا پھرتا نظر آتا، عام لباس سپید اور سر پر کشمیری ٹوپی ہوتی، مرض کے غلبہ کے باوجود خوبی و رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مرض الوفات میں خون کا بڑا حصہ خارج ہو چکا تھا لیکن جب غسل دے کر کفن پہنایا گیا تو دونوں رخسار گلاب کے پھول نظر آتے۔ ہزاروں انسانوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مغفور و مرحوم ہونے کی اسے ایک علامت قرار دی، حسن و جمال، تناسب اعضاء، متوازن قد و قامت، پرنورِ علم اور نورِ ایمان مستزاد تھا، معصومیت، دلنوازی اور دلربائی ایک قدرتی اضافہ، یہ حسن اور کشش اس بلا کی مؤثر تھی کہ بعض غیر مسلم دیکھ کر بے اختیار ایمان لے آئے۔ مولانا محمد انوری لائلپوری اپنی تالیف "کمالات انوری" میں رقمطراز ہیں کہ

"ایک بار صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے آپ وزیر آباد کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں تشریف رکھتے تھے۔ تلامذہ اور معتقدین کا ہجوم ارد گرد جمع تھا۔ وزیر آباد ریلوے اسٹیشن کا ہندو اسٹیشن ماسٹر ہاتھ میں بڑا لیمپ لئے ہوئے ادھر سے گذرا۔ حضرت مرحوم پر نظر پڑی تو رک گیا اور غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا کہ جس مذہب کا یہ عالم ہے وہ مذہب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مرحوم ہی کے ہاتھ پر کفر سے توبہ کی اور ایمان کی دولت سے سرفراز ہوا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ پنجاب میں ہی پیش آیا جب آپ کی منور صورت دیکھ کر ایک غیر مسلم کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔"

مولانا محمد علی مونگیری المغفور کی دعوت پر جب آپ مونگیر قادیانیت کی تردید کے لئے تشریف لے گئے اور چند روز اجتماع میں آپ کے مسلسل بیان ہوئے تو علاقہ کا ایک بڑا ہندو سادھو پابندی سے ان اجتماعات میں شرکت کرتا۔ آخری دن اسکی زبان پر یہ کلمات بے اختیار تھے کہ

"یہ شخص اپنے چہرہ سے اسلام کی دعوت دیتا ہے۔"

دار العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کہتے تھے کہ ایک بار جمعہ کے روز سردی کے زمانہ میں حضرت شاہ صاحب سبز پوشاک میں ملبوس دار العلوم سے جامع مسجد کے لئے روانہ ہوئے میری نظریں آپ پر پڑیں تو اپنے بارے میں خود اندیشہ ہوا کہ

"کہیں شاہ صاحب کو نظر نہ لگ جائے۔"

"حیات انور" میں مولانا منظور صاحب نعمانی نے لکھا ہے کہ

”میں اور میرے ساتھ طلبار کی ایک بڑی تعداد درسِ حدیث میں شاہ صاحب سے علمی استفادہ کے ساتھ ان کے حسن و جمال سے بھی اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے۔“

اس حسن اور غیر معمولی جاذبیت پر تقویٰ، آثارِ ولایت کا ترجمان تھا۔ مظفر نگر کے مشہور طبیب حکیم فتح محمد صاحب جو علاقہ کے ایک نہایت تجربہ کار حکیم اور خاندانی رئیس تھے ان کا بیان ہے کہ ”میں بھر پور شباب میں جبکہ میرا جمال و رعنائی عروج پر تھی دلّی طب پڑھنے کے لئے گیا حکیم اجمل خان صاحب کے والد سے بعض کتابیں پڑھنے کا پروگرام تھا ملاقات ہوئی تو حکیم صاحب نے عربی میں میری قابلیت واستعداد کے متعلق کچھ سوالات کئے، ہیئت میں مزید کچھ کتابیں پڑھنے کے لئے حکم فرمایا اور یہ بھی کہ مولانا نذیر احمد صاحب محدث دہلوی سے پڑھو۔ میں محدّث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف نے اپنی کبرسنی کا عذر کرتے ہوئے بتایا کہ دہلی میں ایک نووارد عالم مولانا انور شاہ کشمیری سنہری مسجد میں پڑھاتے ہیں یہاں ان کتابوں کا درس صرف وہی دے سکیں گے۔ میں سنہری مسجد میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے میری درخواست پر کچھ وقت عنایت فرمایا سبق کیلئے حاضر ہوتا تو آپ نظریں نیچے کئے ہوئے پڑھاتے دو تین سال کے عرصہ میں میری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی کہ حضرت شاہ صاحب نظر اٹھا کر مجھے دیکھیں مرض الوفات میں مولانا مفتی عتیق الرحمان[ع] صاحب حضرت شاہ صاحب کی نبض دکھانے کے لئے دیوبند لے گئے۔ میں اس تصور کے ساتھ حاضر ہوا کہ چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا آپ نے مجھے کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اب پہچانتے

[ع] **مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہٗ**:۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مرحوم کے صاحبزادے، مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادرزادے، علامہ کشمیری مرحوم کے ارشد تلمیذ، دارالعلوم میں ”معین المدرسی“ سے پُرشعور زندگی کا آغاز کیا۔ دیوبند سے ”ڈابھیل“ پہونچے پھر کلکتہ۔ کلکتہ سے ”دہلی“ میں آکر ”ندوۃ المصنفین“ قائم کیا۔ اپنے خاص سلیقہ قرینہ، بالغ شعور، بھرپور تندہی سے اس ادارہ کی وہ حیثیت دی کہ دیوبند اس پر فخر کر سکتا ہے۔ انشار پرداز بھی ہیں اور غالباً شاعر بھی، مفتی بھی ہیں اور مقرر بھی، باشعور سیاست داں بھی ہیں اور مفکر بھی، باصلاحیت منتظم بھی ہیں اور مدبر بھی، شریفانہ مزاج، بلند روایات کے حامل، ملنسار اور متواضع، عمر ستر سے متجاوز ہے اور اب بڑھاپا دھیرے دھیرے انکی توانائیوں پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ شیروانی چشمہ، سردی ہو یا گرمی، سر پر کلاہِ قلپاقی انکے لوازمات میں سے ہیں جسکے بغیر انہیں پہچانا ہی نہیں جا سکتا۔

کا کیا سوال ؟ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حاضری پر آپ نے میرا نام، سکونت
اور دلی میں پڑھنے کی تفصیلات سنائیں، متحیر ہو کر میں نے عرض کیا کہ "حضرت
آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ فرمایا کہ آواز سے آپکو پہچان لیا"۔
مشہور عارف باللہ مولانا عبدالقادر[عہ] صاحب رائپوری جنھوں نے دلی کے قیام کے زمانہ میں
والد مرحوم سے میبذی، ملاحسن اور ترمذی وغیرہ پڑھیں فرماتے ہیں کہ
"دلی آنے سے پہلے میں ایک غیر مقلد عالم سے پڑھتا تھا عدم تقلید کے موضوع
پر انکی تقریریں سننے کے بعد میرا ذہن بھی تقلید سے بیزار ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اسی
زمانہ میں دہلی پہونچا اور حضرت شاہ صاحب مرحوم سے ترمذی وغیرہ پڑھنے کا موقعہ ملا"

عہ عارف باللہ مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری۔ سلسلۂ چشت کی وہ شاخ جو حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمہ کے فیضِ آثار سلوک و معرفت سے "خانقاہ رائپور" کی شکل میں سامنے آئی۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ العزیز کے ارشد خلفاء میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف اپنے شیخ کے جانشین بلکہ گلشن رحیمی کے واقعی باغباں تھے۔ کشیدہ قامت، گٹھا ہوا بدن، پُر نور چہرہ، گھنی ڈاڑھی، سر پر چہار گوشہ ٹوپی، یہ حضرت کا نورانی و منور حلیہ تھا۔ نہایت معصوم، بھولے بھالے اور سادہ بزرگ تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ سے حدیث و فلسفۂ قدیم پڑھا تھا فرماتے تھے کہ
"حنفیت کی جانب رجوع حضرت شاہ صاحب ہی کے تدریس سے نصیب ہوا۔"
ابتدائے ملازمت میں کچھ وقت مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے یہاں بھی گزرا اور ایک عجیب و غریب واقعہ پر وہاں سے علیحدگی اختیار فرمائی جسکی تفصیل یہ ہے کہ "موصوف کی موجودگی میں مولوی احمد رضا صاحب سے ایک شخص فتویٰ لینے آیا جسے مولوی صاحب نے فتویٰ غلط بتایا مستفتی کے جانیکے بعد حضرت رائپوری نے بریلوی صاحب کو توجہ دلائی کہ آپنے فتویٰ غلط بتایا ہے مسئلہ تو یہ ہے بریلوی صاحب نے اعتراف کیا کہ صحیح مسئلہ یہی ہے مگر صحیح مسئلہ مستفتی کو ناگوار گذرتا اور ہماری اس سے دنیاوی ضرورتیں وابستہ ہیں اسلئے اسے صحیح مسئلہ نہیں بتایا گیا۔" یہ بنیاد مابین جدائی کی ہوگئی۔
مرشدِ حق کی تلاش میں نکلے تو غلام احمد قادیانی کے یہاں بھی جا پہونچے لیکن خدا کا شکر ہے کہ خود غلام احمد قادیانی نے "یاھادی" کا وظیفہ بتا دیا اور کہا کہ اسے پڑھیئے اگر پھر بھی قلب میری طرف متوجہ ہو تو بیعت کی جائیگی۔ ہادیٔ حق نے ہدایت فرمائی اور حضرت شاہ عبدالرحیم کی جانب رہنمائی کی جنکے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوئے تو پھر کامل ہی ہو کر اٹھے۔ یہ خاکسار کئی بار حضرت کے یہاں حاضر ہوا بلکہ آپ کی خصوصی عنایات سے سرفراز ہے۔ مولانا منظور صاحب نعمانی، مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اکابر امت حضرت سے وابستہ اور آپکے مجاز ہیں۔ پاکستان وجود میں آیا تو بیشتر وہاں تشریف لے جاتے۔ اس تمنا کے باوجود کہ رائپور میں اپنے شیخ و مرشد کے آغوش میں جگہ پائیں، وطن کی کشش پاکستان لے پہونچی اور یہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا میت کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا جسمیں طرفین کا اختلاف امت کیلئے ایک المیہ ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

تقلید اور چاروں فقہوں میں فقہ حنفی کی گہرائی و گیرائی اس طرح دلنشیں ہوگئی کہ پھر کبھی میری حنفیت میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ یہ شاہ صاحب مرحوم کی بھر پور جوانی کا زمانہ تھا اور حُسن و رعنائی کا یہ عالم کہ مدتوں آپ کے دیدار کے باوجود دیکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی اس زمانہ میں "مدرسہ امینیہ" سنہری مسجد میں تھا۔ آپ مہینوں مسجد سے باہر نہ نکلتے تھے اور اگر کبھی ضرورت کیلئے باہر نکلنا ہوتا تو چہرہ پر رومال اس طرح ڈال لیتے کہ سوائے راستہ کے گرد وپیش کے کوئی چیز نظر نہ آتی یہ اہتمام اسلئے تھا کہ کسی غیر محرم عورت پر نظر نہ پڑ جائے۔"

راقم الحروف نے اپنی والدہ سے سنا ہے کہ شادی کے بعد حضرت والد کا قیام دار العلوم کے ایک کمرہ میں تھا اور والدہ مولانا محمد طیب صاحب کے رہائشی مکان سے ملحق ایک مکان میں جو مہتمم صاحب کی ملکیت تھا قیام فرما تھیں مرحوم بھی مکان پر تشریف لاتے تو دستور یہ تھا کہ دستک دیتے اور اجازت کے بعد اندر تشریف لاتے۔ اتفاقاً ایک روز مہتمم صاحب کی والدہ ہمارے گھر میں تشریف رکھتی تھیں مرحوم تشریف لائے اور زنان خانہ میں آنے کی اجازت چاہی، والدہ کو سہو ہوا اور اجنبیہ کی موجودگی کا خیال دل سے نکل گیا، اندر آنے کی اجازت دی مرحوم نے زنان خانہ میں قدم رکھا تو ان اجنبیہ پر نظر پڑنے کے ساتھ ہی استغفار پڑھتے ہوئے اُلٹے پاؤں باہر لوٹ گئے۔ اس اتفاقی حادثہ کی تکلیف جو کچھ آپ کو ہوئی وہ ایک مدت کے لئے والدہ مرحومہ سے ناراضگی کی شکل اختیار کر گئی بلکہ آپنے سبق میں طلباء کے سامنے غمگین لہجہ میں فرمایا کہ

"بھائی بالغ ہونے کے بعد کل بلا ارادہ مولانا طیب صاحب کی والدہ پر نظر پڑ گئی جسکی تکلیف سوہانِ روح کی طرح محسوس کرتا ہوں۔"

پھر یہ تکلیف اور اذیت آپ ہمیشہ محسوس کرتے رہے اور غیر محرم سے متعلق نظر کی ممانعت پر جب حدیث زیرِ درس آتی تو ایک تاثر کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر فرماتے خدا تعالیٰ کا اہل تقویٰ کیساتھ عجیب معاملہ ہے کہ اسکی مخفی قوت، انکی عفت، پارسائی اور تقویٰ کی محافظ ہوتی ہے کہ جن سعید لوگوں نے لقمۂ حرام سے اپنے کام و دہن کو محفوظ رکھا بلا ارادہ بھی کوئی حرام چیز ان کے معدہ تک نہیں پہونچی۔ آپکے نامور شاگرد مولانا بدرِ عالم[ع] میرٹھی ثم مہاجر مدنی کا بیان ہے کہ

ع مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی :۔ نیرنگی ہائے قدرت کہ نوحؑ کے یہاں کنعان، آزر کے یہاں ابراہیمؑ وجود پذیر ہوئے اور عجیب و غریب روایات بطور یادگار و سرمایۂ عبرت اپنے پیچھے چھوڑیں (باقی آگے)

"ایک بار آپ دیوبند سے سفر فرما رہے تھے اور رفیقِ سفر کی حیثیت سے میں آپ کیساتھ تھا ریل کے جس ڈبہ میں سوار ہوئے اسمیں بڑی خوش پوشاک وخوش رو عورتیں بھی تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ جب گاڑی میں تشریف رکھتے تو اپنے منوّر چہرہ کی وجہ سے مرکزِ نگاہ بن جاتے۔ یہ عورتیں برابر آپکو دیکھتی رہیں اور آپ حسبِ دستور کتاب کے مطالعہ میں مستغرق رہے۔ دونوں عورتوں کے ساتھ ایک بڑا پاندان تھا انھوں نے پان لگایا اور طشتری میں رکھ کر مجھے دیا کہ ان بزرگ کے لئے پیش کر دوں، دونوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ ان سے پان لینے اور شاہ صاحب کو پیش کرنے کے سوا میرے لئے کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔ میں نے طشتری آپ کے سامنے کر دی استغراقِ مطالعہ میں آپ نے بھی بے تکلف پان منھ میں رکھ لیا، ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ آپ پر امتلاء کی کیفیت

صـ۷۸ کا بقیہ:۔ مشہور ہندی شاعر "اقبال" کو فخر تھا اور اسی فخر نے ان سے کہلایا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسمیں یہ اور اضافہ کیجئے کہ پورا گھرانہ مغربی تعلیم سے آراستہ، کوئی کلکٹر، کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی تھانیدار، لیکن "مخرج الحیّ من المیّت" نے انہیں "اموات" میں ایک جیتی جاگتی ہستی بھی پیدا کر ڈالی، دنیا سے چلے اور دین تک جا پہونچے، فرنگیت کا دامن غبارے جھاڑا اور پھر زمزم سے ہمیشہ کے لئے اسے دھو ڈالا اور ایسا نچوڑا کہ فرنگیت کے آثار تک باقی نہ رہے، زہد وتقویٰ کی دھوپ میں اسے سکھایا، جسم زیبا پر لیا تو اسکی زیبائی میں اور اضافہ ہوا سُرخ وسپید چہرہ، منوّر آنکھیں، اسپر تابدار چشمہ، سر پر بالعموم رومال، نزاکت میں نانا شاہ، نفاست میں واجد علی، حدتِ مزاج ایسی کہ ڈگری کبھی کم ہی نہ ہوتی۔ مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی اور پھر دار العلوم میں حدیث دوبارہ پڑھنے کے لئے تشریف لائے یہیں مدرّس ہوئے اپنے استاذ الامام الکشمیری کے ایسے گرویدہ کہ تاحیات ان سے جدائی اختیار نہ کی وہ ڈابھیل چلے تو یہ بھی روانہ ہوگئے۔ ڈابھیل میں مدرسی اور طالب علمی کو ملا ڈالا یعنی استاذ کے درسِ بخاری میں اپنے ہی شاگردوں کے ساتھ بے تکلف صف نشین ہو جاتے اور سالہا سال کی علمی کاوش فیض الباری "تقریر بخاری" افادات شیخ انور" کے نام سے کائناتِ علم کو دے ڈالی۔ ڈابھیل میں عہدۂ صدر مدرسی تک پہونچے پھر وہاں سے آئے اور دہلی میں "ندوۃ المصنفین" سے وابستہ ہوگئے۔ "ترجمان السنۃ" حدیث کی اردو میں معرکۃ الآراء تشریحات ان ہی کے علم ریز قلم کی یادگار ہیں۔ پاکستان بنا تو "ٹنڈو الٰہ یار" کے مدرسہ میں کچھ وقت گزارا اور پھر سعید روح سرزمین قدس یعنی مدینہ منورہ زادھا اللّٰہ شرفاً جا پہونچی، اب جنۃ البقیع میں زید وبکر کے آغوش میں نہیں بلکہ اجلّۂ صحابہ کے ساتھ قیامت کی نیند سوتے ہیں۔ خاتمۂ عمر پر بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور افریقہ تک ان کا فیض جا پہونچا۔ قاری اسحاق صاحب میرٹھی خلیفۂ ارشد مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ نے نقشبندی طریقہ میں مجاز تھے۔

طاری ہوگئی اور مسلسل متلی شروع ہوگئی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ غالباً تمباکو مقدار سے بڑھ گیا جس سے امتلا کی شدت ہے دوسرا پان کھول کر دیکھا تو تمباکو کی مقدار آپ کی معمولاً مقدار سے بھی کم تھی پھر شبہ ہوا کہ کوئی قے آور چیز تو پان میں نہیں دیدی گئی لیکن موجود دوسرے پان کو خوب دیکھنے کے بعد یہ بدگمانی بھی جاتی رہی۔ میرٹھ کے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ دونوں عورتوں کا تعلق طوائفوں سے تھا اب معلوم ہوا کہ اس پاکیزہ باطن انسان کا دل حرام کسب کے پان کو بھی گوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ اکبر مردانِ خدا کے ساتھ خدائے حفیظ وحافظ کا یہ حفاظتی معاملہ۔عہ"

حُسنِ سیرت:۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا کمال ان صفات وفضائل کا دلآویز گلدستہ ہوتا ہے جنہیں سے کچھ اخلاقی خوبیاں ہیں اور کچھ اسلامی شمائل وخصائل، صورت کے حُسن اور زیبائی سے زیادہ انہیں کمالات کا اجتماع انسان کی زندگی میں مطلوب ومقصود ہے۔ خدائے تعالےٰ کے فضل ورحمت سے جسکو یہ دولت میسّر آگئی وہ دین ودنیا میں کامیاب زندگی کا مالک ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلام نے مکارم اخلاق پر کس قدر زور دیا ہے۔ فداہ ابی وامی محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل وتعلیم ہی قرار دیا۔ امت کے وہ نمایاں افراد جو کائنات میں سیرتِ نبوی کی متحرک تصویریں تھیں۔ اخلاق وعادات کی خوبیوں کا مرقع رہیں دیکھنے والوں کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ علامہ مرحوم کو خدائے تعالےٰ نے من موہن بنانے کے ساتھ

عہ مشہور چشتی بزرگ شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہ العزیز سے متعلق انکے سوانحی تذکروں میں یہ روایت نظر سے گذری کہ اجودھن کے زمانہ قیام میں جب آپکی خدمت میں سلطان الاولیا نظام الدین دہلوی اور مخدوم علاءالدین صابر کلیری مقیم تھے تو ایک بار مسلسل فاقوں کی نقاہت، شیخ فرید پر دیکھ کر دونوں جاں نثار مریدوں نے معمولی کھانے کا انتظام کیا۔ پیلو کے پھلوں سے حریرہ تیار کیا گیا ایک ہندو دوکاندار سے نمک قرض لیکر حریرہ میں ڈالا اسی فقیرانہ کھانے سے لبریز ایک پیالہ جب شیخ کی خدمت میں پیش کیا اور وہ چمچہ بھر کر ہونٹوں تک لے گئے فرمایا کہ "بُو آرہی ہے" ہر دو مرید نے عرض کیا کہ نمک قرض لے کر استعمال کیا گیا ہے۔ با صفا شیخ نے تنبیہ کی کہ یہ توکل کے خلاف ہے فقیر بھوک سے مرجائے تو کوئی حرج نہیں لیکن قرض کی چیز استعمال کرنا کیسے مناسب ہوگا اور وہ روایت عام طور پر معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو گوشت کے اسی ٹکڑے نے اطلاع دی تھی جس میں زہر ملا گیا تھا، پس پاکیزہ باطن لوگوں کے احوال کو اپنے حالات پر قیاس کر کے قبول نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں۔

پسندیدہ اخلاق سے بھی نوازا تھا۔ موضوع کی تکمیل کے لئے ایک مختصر تفصیل آپ کی عادات و اخلاق کی بھی پیشِ خدمت ہے اس فہرست میں اُنہیں مکارمِ اخلاق کا ذکر مناسب ہوگا جو ایمانی اوصاف کہلانے کے مستحق ہیں۔ خورد و نوش، لباس و پوشاک سب چیزیں بے تکلف سنّت کے ڈھانچے میں ڈھل گئی تھیں بلکہ بعض دیدہ ور لوگوں کا بیان ہے کہ بہت سی وہ سنّتیں جن کا علم خال خال علماء ہی کو ہے آپ کے عمل کو دیکھ کر آپ سے سیکھی جاتیں، چنانچہ مولانا قاری محمد طیّب صاحب نے لکھا ہے کہ

"بہت سی سنّتوں کی اصل کیفیت ہم حضرت شاہ صاحب مرحوم کو دیکھکر سیکھتے تھے، رفتار مسنون انداز کی تھی، زمین پر نہایت ہی سبک قدم رکھتے جس وقت چلتے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کا منظر دکھائی دیتا جسکی کیفیت شمائل کی عام کتابوں میں صحابہ نے "کانّما ینحطّ الی صبب" (گویا کہ اوپر سے نیچے کو اتر رہے ہیں) کے ساتھ بیان کی ہے۔"

مولانا اعزاز علی صاحبؒ فرماتے تھے کہ

"میں میرٹھ میں پڑھتا تھا شاہ صاحب کا نام سنا تھا لیکن آپکی زیارت کا ابتک موقعہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میرٹھ میں اعلان ہوا کہ آپ کسی غیر مقلد عالم سے مناظرہ کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ مناظرہ محلہ کی ایک مسجد میں جمعہ کے بعد ہونے والا تھا۔ میں بھی اپنے چند ساتھی طلباء کے ساتھ مسجد میں پہونچ گیا تھوڑی دیر کے بعد مجمع پیچھے پیچھے اور حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے دور اور قریب سے دیکھا تو رفتار "کانّما ینحطّ الی صبب" کی مظہر تھی۔"

علم النفس کے ماہرین کہتے ہیں کہ انسان کی چال جس کسی سے ملتی جلتی ہوگی اسی کے اخلاق و عادات پر طبیعت ڈھل جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں چال ڈھال پر بھی ہدایت کا ایک عنوان اختیار کیا۔ ارشاد ہے:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (اللہ کے بندے جب چلتے ہیں تو چلتے ہیں عاجزی سے۔

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا

لا تمش علی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا۔

یہ متواضعانہ رفتار جو خدائے تعالےٰ کو محبوب ہے انبیار علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اہل اللہ کی طبعی رفتار ہے۔ نشست عموماً دو زانو بیٹھنے کی تھی کھانا بھی اسی ہیئت پر نوش فرماتے۔ مولانا محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"جب کھانا سامنے آتا تو تواضع کی ایک خاص کیفیت آپ پر طاری ہوتی اور ہر لقمہ کے بعد الحمد للہ پڑھتے رہتے کھانے سے فراغت کے بعد دونوں ہاتھوں کو تلووں پر ملنے کا مسنون اہتمام علمار میں آپ ہی کے یہاں دیکھا۔"

خدائے تعالےٰ کی ان نعمتوں کو جو کھانے پینے کی صورت میں مہیا ہوتیں قدر اور شکر کی نظر سے دیکھتے۔ ابتدار میں سالہاسال مولانا طیب صاحب کے مکان پر کھانا نوش فرمایا یہ وہ وقت تھا جبکہ دارالعلوم سے آپ کا کوئی مشاہرہ نہیں تھا بلکہ مہتمم صاحب کے یہاں دونوں وقت کا کھانا آپ کی تدریس کا معاوضہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مہتمم صاحب کے یہاں کا کھانا خاص مکلف ہوتا۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی اہلیہ جو دیوبند کے عُرف عام میں "دادی بُو" کے نام سے مشہور تھیں آپ پر خاص شفقت رکھتی تھیں مرحومہ نے ایک بار یہ پیغام پہونچایا کہ

"حضرت سالہاسال آپ کو یہاں کھانا کھاتے ہوئے گذر گئے اور جو کھانا عام طور پر تیار کیا جاتا ہے وہی آپ کو بھیج دیا جاتا ہے کبھی آپ کے لئے کسی خاص کھانے کا انتظام نہیں کیا گیا جی چاہتا ہے کہ آپ اپنی مرغوب غذا بیان فرمائیں تاکہ وہی آپ کے لئے تیار کر دی جائے۔"

اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

"جتنا مکلف کھانا آپ کے یہاں مل رہا ہے اس کے بعد کس کھانے کی تمنا کروں مجھے تو اندیشہ ہے کہ جنت میں ملنے والی غذائیں کہیں آپ ہی کے گھر سے نہ چکائی جا رہی ہوں۔"

مولانا رائے پوری مرحوم جنکی دلی کے زمانہ طالب علمی کے واقعات آپ خاکسار ہی سے سُن چکے ہیں فرماتے کہ

"جس زمانہ میں شاہ صاحب دلی میں قیام پذیر تھے بہت معمولی غذا کھانے کے عادی تھے غالباً ایک دو آنہ ہی میں روزانہ غذا ہو جاتی تھی۔"

اسکے باوجود اگر بہترین غذا میسر آتی تو اس سے بھی کوئی تکلف نہ تھا۔ مرغ اور طیور کے

گوشت کے خاص دلدادہ تھے اپنے بعض تلامذہ سے طیور کے گوشت کی فرمائش بھی کرتے۔ آخری زمانہ میں جب خونی بواسیر کا غلبہ تھا تو بھی مرغ استعمال فرماتے اگر کوئی ٹوکتا تو خاص جواب یہ تھا کہ "طبیعت بہترین حاکم ہے۔"

جسکا مطلب یہی تھا کہ اگر طبیعت کسی خاص چیز کو چاہتی ہے تو اسکے استعمال میں طبی نقطۂ نظر سے بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پھلوں کے بیحد شوقین تھے۔ ہندوستانی پھلوں میں آم سے خاص رغبت تھی، عمدہ قسم کے آم بڑی مقدار میں اٹھاتے بلکہ رنگہار رنگ کے کھانوں کے مقابل پھلوں کو ترجیح تھی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی[ع] کی تقریب نکاح میں شرکت کے لئے اکبر آباد تشریف لے گئے۔ مولانا موصوف کے والد نے مضافات اکبر آباد کے نامور باورچی فراہم کئے تھے جنکا کام یہ تھا کہ الوان واقسام کے کھانے تیار کریں۔ اس زمانہ میں خربوزہ کی فصل چل رہی تھی اکبر آباد کے خربوزے خوش ذائقہ

ع وطن بچھراؤں ضلع مراد آباد، لیکن ہمیشہ اپنے ساتھ "اکبر آبادی" لکھتے ہیں۔ دیوبند پہونچے اور شاہ صاحب سے حدیث کا استفادہ کیا۔ طالبعلمی میں جودتِ طبع اور فکر ثاقب سے آراستہ تھے۔ ہنگامۂ دیوبند کے بعد جو کاروان علم وفضل بجانب "گجرات" متحرک ہوا یہ بھی اسمیں شریک ہوگئے۔ چند سال کی تدریس کے بعد اضافۂ مشاہرہ پر مہتمم مدرسہ ڈابھیل سے اختلاف ہوا اور مولانا نے انگریزی پڑھنے کا تہیہ کرلیا۔ وداعی ملاقات میں حضرت شاہ صاحب سے "جائیے مولوی صاحب خدا آپکو ایم، اے کرے اور مناصب جلیلہ پر سرفراز فرمائے۔" کی دعائیں لیتے آئے۔ غالباً دہلی اور لاہور میں انگریزی تعلیم ایم، اے تک حاصل کی "اورینٹل کالج" "سینٹ اسٹیفن کالج" "مدرسۂ عالیہ کلکتہ"، علیگڈھ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی سربراہی مدتوں کی۔ اب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کے انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کا دور گزار رہے ہیں۔ مجلۂ "برہان" کے مدیر بہت سی کتابوں کے مصنف صاحبِ طرز ادیب، کئی غیر ملکی سفر کر چکے، دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین، عمر ساٹھ سال سے متجاوز لیکن سرو قامت، گٹھا ہوا بدن جسپر زیبائی آج بھی موجود ہے۔ بقول مولانا کے "گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے باوجود عقائد میں استحکام" فکر مستقیم، دیوبندیت میں رسوخ، اپنے اساتذہ کے معتقد تمام، لیکن اس کے باوجود وارستہ مزاجی عجیب قسم کی، دیوبند تشریف لائیں گے آپ کسی مسئلہ پر ان سے تائید حاصل کرنا چاہیں آپ کی خواہش وآرزو کو آپ سے زیادہ مدلل کر ڈالیں گے۔ آپ ان کی فرودگاہ سے اٹھیں گے تو اس یقین کے ساتھ کہ مولانا نہ صرف مؤید بلکہ اس سے آگے وکیل مدعی ہیں لیکن مسئلہ جب مجلس میں چھڑے گا تو یا خاموش ہوجائیں گے یا مخالف ہی بول آئیں گے بعد میں شکایتاً کچھ عرض کیجئے تو شکوہ سنجیاں ایک قہقہہ میں اڑا ڈالیں گے فرمائیں گے۔

"میاں ہمارا تو ایسا ہی معاملہ ہے وقت پر جو کچھ خیال

آجاتا ہے کہہ ڈالتے ہیں۔"

یہ ہیں ——— مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ہوتے ہیں۔آپنے پہونچتے ہی فرمائش کی کہ میرے لئے ایک جھابے میں خربوزے رکھدئے جائیں اور ساتھ ہی ایک چھری۔ تاکہ جب رغبت ہو تو میں بے تکلف خربوزہ کھاسکوں۔ آپ کی فرمائش پر یہ انتظام کر دیا گیا۔

ذیلاً آپ کے خورد و نوش کی مختصر تفصیل قلم پر آگئی ورنہ مضمون تو اتباعِ سنت کا چل رہا تھا، زباں پر آیتِ قرآنی "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ" ورد کی حیثیت سے جاری تھی ہر چند جلوں پر باواز بلند یہ آیت پڑھتے اسکے ساتھ "اللہ اعلیٰ واجل" کا کلمہ بھی بار بار زبان پر آتا۔

زھد و قناعت:۔ مرحوم کی زندگی میں زہد و قناعت رسمًا نہیں بلکہ واقعیت کے ساتھ موجود تھی شروع سے لیکر آخر تک ان ہی دو وصف پر زندگی قائم رہی والدہ فرماتی تھیں کہ

"جس وقت شادی ہوئی تو شاہ صاحب مرحوم کی داڑھی میں سفید بال آچکے تھے۔ بارات علماء دیوبند خصوصًا مولانا حافظ احمد[عہ] صاحب مہتمم دارالعلوم

عہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ:۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ کے فرزند، دارالعلوم ہی سے فارغ اور اسی ادارہ کے صدر مہتمم، چوڑا چکلا جسم، رنگ سرخ سفید، گھنی ڈاڑھی، وجاہت ان کی قدم لیتی تھی، دماغ کے پادشاہ، دل کے فقیر، ناز کی گود میں پلے ہوئے جنکے لئے خدام کی نیاز مندیاں دست بستہ حاضر رہتیں، بھولے اسقدر کہ سکوں میں بھی فرق نہ کر پاتے۔ کفِ دست پر رکھ کر دریافت فرماتے یہ کونسا سکہ ہے۔ حدت مزاج اس قدر کہ بڑوں کے پتے ان کے سامنے آتے ہوئے پانی ہوتے، لباس فاخرہ انتہائی نفاست پسند، پلنگ پر سفید چادر بار بار بدلی جاتی، ریاست حیدر آباد میں بعہدۂ صدر قاضی منتخب ہوئے اس زمانہ میں چودہ سو روپیہ مشاہرہ تھا جو آج کے دس ہزار کے مساوی ہیں۔ دیوبند سے حیدر آباد کا سفر ہوتا تو اعلیٰ درجہ کی سیٹ ریزرو کرائی جاتی قرآن اور مسجد کے احترام میں منفرد تھے۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے سنا کہ دارالعلوم کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا فرمائی، نوافل سے فراغت پر گھر تشریف لے چلے تو ایک طالب علم کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھا جسکے پاؤں بجانب قبلہ تھے حافظ صاحب تے وہیں دستی تنبیہ فرمائی اور معًا امدادِ طعام بھی مدرسہ سے بند کر دی گئی۔ اس وقت دارالعلوم کا کاروبار وسیع نہیں تھا۔ اِدھر بندش طعام کا حکم جاری ہوتا اُدھر اسکے اثرات سامنے آجاتے۔ دو روز کے بعد کسی ضرورت سے حافظ صاحب گشت کے لئے نکلے تو یہ طالب علم اپنے کمرے میں چھپا ہوا درخت کے پتے کھا رہا تھا دریافت کرنے پر بتایا کہ حضرت نے امداد بند فرمادی مرحوم پر گریہ طاری ہو گیا اور بہت دیر تک خود اور وہ طالبعلم مصروفِ بکار رہے۔ طالب علم کی خوش قسمتی کہ اسی وقت آستانۂ عالی سے کھانا جاری ہوا۔ اگر کسی طالب علم کی وفات ہوتی تو اس کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر تعزیت لیتے اور جب تک اسکی تکفین و تدفین نہ ہو جاتی گھر واپس تشریف نہ لاتے گویا کہ طلباء کے ساتھ اولاد کا سا معاملہ تھا۔ گفتگو بہ لہجہ تجوید و قرأت ہوتی، حیدر آباد

(باقی آگے)

دیوبند کی سرگرمی میں بھوپال پہونچی تو گھر کی عورتوں میں دولہا کی زندگی کا یہ مختلف پہلو چہ میگوئیوں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ راقم الحروف کے ماموں حکیم سید محفوظ علی صاحب جو اس زمانہ میں دار العلوم کے ایک طالب علم اور اس نکاح کے خصوصی محرک تھے۔ خاندان کی عورتوں میں کافی مطعون ہو رہے تھے بارات بھوپال سے دیوبند کے لئے واپس ہوئی تو خالہ مرحومہ والدہ کے ہمراہ دیوبند آتی تھیں دہلی کے اسٹیشن پر دیوبند کی گاڑی کے لئے انتظار چند گھنٹے کرنا تھا۔ اس وقفہ میں شاہ صاحب کا پیغام خالہ کے پاس تشریف آوری کا پہونچا مسافرخانہ میں تشریف لاکر سب سے پہلے جو گفتگو فرمائی وہ یہ تھی کہ

"میں ایک مفلوک الحال اور غریب الوطن ہوں تاہل زندگی کا کوئی ارادہ نہیں تھا
حضرت استاذ (شیخ الہند) اور ہر دو مہتمم صاحبان کے حکم پر یہ صورت اختیار کی ہے
گھریلو زندگی اور عائلی نظم و انتظام کے لئے میرے پاس کچھ موجود نہیں ہے"

ایک زاہد پاکباز کے اس صاف صاف بیان پر والدہ پر کیا گذری ہوگی۔ والدہ سے معلوم ہوا کہ خالہ تہی دستی کی یہ داستان سنکر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں، دیوبند پہونچنے کے بعد اس فقیر منش انسان نے اثاثۃ البیت کے طور پر جو چیزیں ہم پہونچائیں انکی فہرست والدہ کے حوالہ سے سنیئے:۔

"مٹی کا ایک بدھنا، مٹی کے ایک دو پیالے اور ایک چٹائی"

ایک مدت تک والدہ کے کھانے کا نظم بھی مولانا طیب صاحب ہی کے مکان سے ہوتا رہا البتہ صبح کے ناشتہ میں کبھی کبھی چائے اور مدرسہ کا نان حضرت والد بھیجتے، بڑی بہن کی پیدائش کے بعد جب یہ مکان ناکافی ہوا تو شہر میں ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گئے، دنیا طلبی گھر گرہستی بلکہ اولاد کیلئے مستقبل کا کوئی فکر آپکے زاہدانہ مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔ مولانا بدر عالم راوی ہیں:۔

ایک مرتبہ ڈابھیل کے زمانہ قیام میں میں نے عرض کیا کہ آپ صاحب
اہل و عیال ہیں اگر بخاری شریف کی کوئی شرح یا قرآن مجید کی تفسیر تصنیف فرمائیں
تو آپ کے علوم کی حفاظت کے ساتھ آئندہ بچوں کے لئے بھی ان تصانیف سے
کچھ انتظام ممکن ہے۔ اس گذارش پر آپ کا جواب یہ تھا کہ
"عمر بھر حدیث بیچ کر گذر اوقات کی مولوی صاحب کیا آپ یہ چاہتے ہیں

صفحہ ۸۴ کا بقیہ:۔ دکن سے دیوبند تشریف لاتے تھے کہ ریل ہی میں وفات پائی۔ نظام حیدرآباد کی خصوصی فرمائش پر جسدِ خاکی حیدرآباد واپس لے جایا گیا اور خطہ صالحین میں دفن ہوئے۔ عمر مبارک غالباً ستر و چھتر کے درمیان تھی۔

کہ میرے بعد بھی میرا علم فروخت ہوتا رہے۔"

اور یہ کہہ کر دیر تک اشکبار رہے۔ دنیا میں ہمیشہ آپ کا مقصود چند وہ لقمے رہے جن سے آپکا اور آپکی وساطت سے آپکے اہل وعیال کا پیٹ بھر سکے۔ مولانا حبیب الرحمٰن[ع] لدھیانوی کہتے تھے کہ جب دیوبند کا فتنہ شروع ہوا اور پُرآشوب حالات میں آپنے طویل رخصت پر کشمیر جانے کا فیصلہ کیا اس وقت دیوبند میں عام شہرت تھی کہ آپ دار العلوم سے مستعفی ہو جائیں گے۔ جس روز آپ دیوبند سے کشمیر کے لئے روانہ ہو رہے تھے میں دیوبند سے سہارنپور تک سفر میں آپکا شریک تھا اور بہت دیر تک عرض کرتا رہا کہ دار العلوم سے استعفےٰ نہ دیں لیکن وہ حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر اپنے استعفےٰ کا فیصلہ قطعی سمجھتے تھے آپ کشمیر روانہ ہوگئے اور میں لدھیانہ سے گرفتار کر کے ملتان جیل بھیج دیا گیا یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند اور احرار کے تمام لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے، غالباً کشمیر میں ڈیڑھ ماہ قیام کے بعد جب آپ دیوبند واپس ہوئے تو ملتان جیل میں مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے میں نے جیل میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کیا کہ اب آپ کیا کر رہے ہیں فرمایا کہ

"ٹکڑہ جوڑنے کی سوچتا ہوں"

بلاشبہ ڈھاکہ، کلکتہ کے ایک ہزار ماہانہ مشاہرہ کو نظر انداز کر کے ڈابھیل میں پچھتر روپے کے معمولی مشاہرہ کو قبول کرنا ٹکڑہ مہیا کرنے کا وہ معمولی منصوبہ تھا جو ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہا دار العلوم دیوبند میں درسِ حدیث کے دوران جب علوم اور کمالات کا دفتر آپ کی زبان سے کھلتا اور آپ محسوس کرتے کہ طلباء پر ایک غیر معمولی تاثر ہے تو ٹھیک اس وقت میں طلباء

ع مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی:- اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس نے سب سے پہلے آزادیٔ ہند کیلئے تحریک کا باقاعدہ فتوے لیکر شائع کیا اور جس خانوادہ کے مورثِ اعلےٰ نے دہلی پہونچکر استخلاصِ وطن کی ۱۸۵۷ء والی جنگ میں شرکت کی۔ یہ خانوادہ اپنی ابتداء سے اولوالعزمی، بلند حوصلگی، شجاعت پیشگی اور ایثار پسندی کے لئے مشہور رہا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن دار العلوم دیوبند پہونچے اور حضرت علامہ کشمیری کے مخصوص حلقے میں شریک ہوگئے۔ یہ پاکیزہ تعلق کبھی مضمحل تو کیا ہوتا بلکہ ہمیشہ اسمیں استحکام اور مضبوطی پیدا ہوتی رہی والد مرحوم خود فرماتے تھے کہ مجھے ہندوستان میں دو ہی خاندان وفادار نصیب ہوئے جنمیں سے ایک مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کا تھا۔ خاکسار حال ہی میں موصوف پر ایک طویل مقالہ "نفیس الاحرار در حدیث دیگراں" میں لکھ چکا ہے یہ تالیف مرحوم سے متعلق انکے لختِ جگر مولانا عزیز الرحمان لدھیانوی نے ترتیب دی تھی جو خود بھی سن ۱۹۶۰ء کے اواخر میں ایک ہی جست میں دنیا سے اٹھے اور اپنے شفیق والدین کی آغوشِ شفقت میں جا پہونچے۔

سے خطاب فرماتے۔

"جاہلین تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں۔ میرے کام کی نوعیت منیرؒ کے کام سے زیادہ نہیں وہ بھی چکی چلا کر چونا پیستا ہے اور میں بھی تدقیق کا کام انجام دے رہا ہوں"

پھر ایک غم آگیں لہجہ میں ارشاد ہوتا:۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے بس ایک چائے کی پیالی اور اس کے ساتھ دو بسکٹ کاش کہ دین کی کوئی مخلصانہ خدمت کا موقعہ میسّر آتا"

ڈابھیل میں جب علالت بڑھ گئی اور اطبّاء کے مشورہ پر آپ بغرض علاج و آرام دیوبند تشریف لے آئے تو زمانۂ رخصت کی تنخواہ ڈابھیل کے مہتمم صاحب نے ڈاک کے ذریعہ آپکی خدمت میں روانہ کی جسے اس جواب کے ساتھ واپس کر دیا گیا کہ

"جب مدرسہ کی میں نے کوئی خدمت نہیں کی تو اس مشاہرہ کا مجھے کوئی حق نہیں"

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رنگون میں مقیم ہندوستانیوں کے اصرار پر جنہیں اکثریت گجراتیوں کی تھی آپ نے رنگون کا سفر کیا اور پندرہ روز سے زائد قیام فرما کر وعظ و نصیحت اور تبلیغ و تذکیر کا اہم کام انجام دینے کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے لئے ایک خطیر رقم وصول کی جو جامعہ اسلامیہ کی براہِ راست ایک نمایاں خدمت تھی وہاں سے واپسی پر جامعہ کا پیش کردہ مشاہرہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ

"میں اس زمانہ میں رخصت پر رہا اس مشاہرہ کو لینے کا کوئی شرعی جواز نہیں"

جامعہ کے بزرگ صورت و سیرت مہتمم مولانا احمد بزرگ نے مشاہرہ لینے پر اصرار کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ نے درسگاہ کے لئے تحصیلِ زر کی خدمت انجام دی ہے اس لئے آپ مشاہرہ قبول فرما کر ہمیں ممنون فرمائیں۔ فرمایا کہ

عہ دار العلوم کے ابتدائی زمانہ میں منیر الدین ایک مقامی باشندہ، بوڑھا اور مفلوک الحال، دار العلوم کی اس دستی چکی پر مزدور کی حیثیت سے مامور تھا جس پر سرخی اور چونا دار العلوم کی عمارتوں کے لئے پیس کر تیار کیا جاتا۔ اپنی بلند پایہ علمی خدمات کا صرف اس وجہ سے کہ ان پر ایک معمولی معاوضہ وصول کیا جا رہا تھا مرحوم کی نظر میں وہی حیثیت تھی جو منیر الدین کے اجرتی کام کی۔

"یہ کام حسبۃً للہ تھا اس کا کوئی معاوضہ نہیں۔"

دینی درسگاہوں کے ذمہ دار کارکنوں کے لئے جو اپنے ذاتی اسفار کو بھی مدرسہ کا سفر بنا کر بے تکلف گرانقدر مشاہرہ وصول کرتے ہیں یہ واقعہ عبرت انگیز ہے۔ کاش کہ جن اہم مناصب پر وہ فائز ہیں ان کے حقوق ادا کرنے کا دینی و اخلاقی احساس ان میں پیدا ہو۔ اسی رنگون کے سفر کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مولانا بدرِ عالم سے سنا ہے کہ جب آپ واپس ڈابھیل تشریف لائے تو مدرسہ کے ہر استاد کو ایک معقول رقم کے ساتھ ان ہدایا میں بھی شریک کیا جو رنگون سے آپ کو پیش کئے گئے تھے۔ مدینہ منورہ کی وہ صبح راقم الحروف کو بھولتی نہیں جب حرمِ اقدس کے جوار میں یہ نیم جاں مہاجر (مولانا بدرِ عالمؒ) واردین و صادرین کے ہجوم میں اپنے استاذ کی کتاب زندگی کے اوراق الٹتا ہوا اس واقعہ کو دہرا رہا تھا تو اس کا عبرت پذیر دل اچانک آنکھوں کی راہ سے بہنے لگا وہ ایک خاص جذبہ کے ساتھ بسترِ مرگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور فضا میں انگشتِ شہادت کو حرکت دیتے ہوئے نعرہ زن ہوا کہ

"دُنیا حضرت شاہ صاحب کے علم سے متأثر ہے کوئی انکے وسعتِ مطالعہ کا قائل، کسی پر ان کی بے نظیر قوتِ حافظہ کا اثر، اور کوئی ان کی تبحّرِ علمی کا معتقد، یہ سب کچھ ہے لیکن میرا دل و دماغ ان کی زندگی کے اس خاص رُخ سے متأثر ہے علماءِ وقت میں ان اجاگر پہلوؤں کی مثال نہیں ملتی۔"

اسی زہد و قناعت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آپ کا سامانِ زندگی ہمیشہ صندوق اور بکس سے بھی بے نیاز رہا ایک معمولی رومال میں چند جوڑے، کشمیر کی دو چار ٹوپیاں اور کچھ آپ کے مسوّدات' یہ کل کائنات اس علامہ جلیل کی تھی جسکی جلالتِ علمی کے چرچوں سے ایک دنیا گونج رہی تھی۔

خوُدداری:- زہد و قناعت کے شجرِ طوبیٰ کے بہترین برگ و بار، خودداری، استغنار، توکل اور بے نیازی ہیں۔ جس شخص کی سرشت میں زاہدانہ رنگ و بو کی آمیزش ہو وہ ان اوصاف سے یقیناً سرفراز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ انتہائی متواضع انسان کج کلاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا چنانچہ اس سلسلہ کی روایت ہے کہ جب آپ مولوی فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ رئیس حیدر آباد کی دعوت پر کچھ دن کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے اور ایڈوکیٹ صاحب نے مولانا ادریس صاحب کاندھلوی سے عربی کی تکمیل کی تو بخاری شریف کی ابتداء کے لئے شاہ صاحب کو حیدر آباد کی دعوت دی تھی وہاں کے قیام میں علامہ کی خسروئے دکن سے ملاقات ہوئی، اس

زمانہ میں دیوبند سے "مہاجر" کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا جو دار العلوم سے علیحدہ ہونے والی اصلاح پسند جماعت کا ترجمان و آرگن تھا اس اخبار میں نظامِ حیدر آباد اور آپ کی ملاقات کی خبر اس جلی سرخی کے ساتھ شائع کی جارہی تھی کہ

"بارگاہِ خسروی میں علامۂ جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کی باریابی"۔

اخبار چھپا نہیں تھا کہ کسی طرح آپ کو اس عنوان کی اطلاع ہوگئی۔ اخبار کے منتظمین کو بلاکر خفگی کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ

"ہر چند کہ میں ایک فقیر بے نوا ہوں مگر اتنا گیا گذرا ہوا بھی نہیں کہ اس طرح کے عنوانات کو برداشت کروں کیسی بارگاہِ خسروی؟ اور کہاں کی باریابی؟ صرف اتنا لکھیے "نظامِ حیدر آباد سے انور شاہ کی ملاقات"

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد کے قیام میں سر اکبر حیدری دکن نے کسی خاص شرط کے تحت آپ سے ملاقات چاہی تو آپ نے انکار کردیا وقت کا وہ مؤرخ جسکا نکتہ چیں قلم ان ہزار ہا ہزار علماء کی داستان سناتے ہوئے طلب دنیا کے واقعات خاص طور پر اچھالتا ہے کاش کہ اسکی نظر سے اقلیمِ علم کے ان بے نواؤں کے واقعات بھی گذریں جنھوں نے اپنی خودداری کے کچھ روشن آثار تاریخ کے لئے چھوڑ دئے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی وہی مجلس جسکے حوالہ سے کچھ تأثرات مولانا بدرِ عالم کے آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں اس سلسلہ کی ایک اور کڑی نظرِ قارئین ہے جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ علماء کی خودداری کسی تموّل اور ریاست کو خاطر میں نہیں لاتی، وہی مولانا محمد میاں سملکی جنھیں والد مرحوم کی زندگی میں عقیدتمندانہ نیاز کا خاص مقام حاصل ہے اور جو اپنی ماضی میں ایک بڑے مالدار باپ کے بیٹے اور اپنی تعمیر کردہ زندگی میں فرموں، ملوں کے مالک اور افریقہ میں سونے کی کان کے ٹھیکیدار رہے ہیں۔ دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب اپنی عقیدت کی بنا پر علامہ کی انھوں نے طویل رفاقت اختیار کی تو مولانا بدرِ عالم کا بیان ہے کہ میری وساطت سے حضرت شاہ صاحب نے مولانا سملکی کو یہ پیغام پہونچایا کہ

"ان صاحب سے کہہ دیجئے کہ ہمارے پاس سے رخصت ہوجائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تعلق کو عام لوگ انکے تموّل کا نتیجہ گردان لیں"۔

مولانا موصوف کہتے تھے کہ مولانا محمد میاں سملکی نے زبانی گذارشات کے ساتھ بارہا تحریراً بھی درخواست کی کہ مجھے بیعت کرلیا جائے لیکن یہ غیور مرشد جسکے حلقۂ ارادت میں غریب اور

مفلس لوگ داخل تھے۔ مولانا محمد میاں سملکی کو ان کے تموّل کی وجہ سے مسترشدین کے زمرے میں لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بالآخر مجبور ہو کر مولانا سملکی نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب سے بیعت کی۔ عہ

خودداری کا یہ غلبہ اس قوت کے ساتھ آپ میں ابھر آیا تھا کہ معمولی شبہ کی بناء پر بھی بعض لوگوں کے معاملات آپ کے لئے شدید گرانی کا باعث بنتے۔ والدہ مرحومہ سے بارہا سنا کہ مولانا محمد میاں سملکی جب دیوبند میں پڑھتے تو میری ہمشیرہ راشدہ خاتون جن کی عمر اس زمانہ میں سات آٹھ سال کی تھی اور بچیوں کے عام دستور کے مطابق اپنی گڑیا کے تقریب شادی کے انتظامات میں مصروف تھیں مولانا سملکی نے بازار سے کچھ بیش قیمت کپڑوں کے ٹکڑے گڑیا کے لئے خرید کر دیئے۔ عصر کا وقت تھا حضرت والد اس وقت معمولاً اپنے مخصوص کمرہ سے باہر وضو کے لئے تشریف لائے۔ آپ وضو کر رہے تھے کہ ہمشیرہ کپڑوں کا یہ تحفہ لئے ہوئے سامنے سے گذریں اشارہ سے بلا کر تحقیق حال کی اور معصوم بچی سے پوری کیفیت سننے کے بعد شدید غصہ کا اظہار فرمایا۔ الفاظ کچھ یہ تھے کہ

"یہ صاحب کیا اپنی دولت سے ہمارا علم خریدنا چاہتے ہیں۔"

بات کچھ بڑی نہیں تھی مجھے یقین ہے کہ عقید تمند شاگرد کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا مگر مرحوم جس غیر معمولی خودداری کی دولت سے سرفراز تھے اس کی اشتعالک کے لئے یہ شبہ بھی کافی تھا۔ علماءِ روزگار کی تاریخِ خودی و خودداری کے اس طرح کے واقعات سے مزیّن ہے۔ روٹی کے چند سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کرنے والے یہ بے نیاز بادشاہانِ تخت و تاج کی سطوت و شوکت سے بھی مرعوب نہ ہوئے۔ تاریخ ہی ہمیں یہ واقعہ سناتی ہے کہ سفیان ثوری اور امیر المؤمنین

عہ دیوبند ہی کے ایک بزرگ اور سابق محدث دار العلوم دیوبند مولانا اصغر میاں صاحب مرحوم کا یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے کہ آپ گجرات کے مشہور قصبہ "راندھیر" میں کسی صاحبِ دولت کے یہاں فروکش تھے۔ اس دولتمند کو میاں صاحب سے ایک عقیدت پیدا ہو گئی اور والہانہ انداز میں بیعت ہونے کی درخواست کی تو میاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا "ہو بیعت بھی ہو گی"۔ مجلس ختم ہو گئی۔ صاحب خانہ کسی ضرورت سے اٹھ کر گھر چلے گئے واپس آ کر عجیب منظر دیکھا کہ میاں صاحب اپنا بستر لپیٹ رہے ہیں۔ میزبان نے گھبرا کر پوچھا کہ حضرت کیا ارادہ ہے؟ فرمایا کہ بس اب یہاں سے جا رہے ہیں تم تو مہمانی کا معاوضہ مرید ہونے کی صورت میں وصول کرنے کے درپے ہو۔ اس غریب نے بمنت و سماجت میاں صاحب کو روکنا چاہا لیکن سب کوششیں ناکام رہیں اور آپ اسی قصبہ میں دوسری جگہ جا ٹھہرے۔ بیعت و ارشاد کے مقدس کام کو کاروباری حیثیت سے اختیار کرنے والے جو سادہ لوح مسلمانوں کو گھیر گھیر کر مریدوں کے زمرے میں داخل کرتے ہیں وہ ان واقعات کو اگر افسانہ سمجھیں تو بلاشبہ مجبور ہیں۔

فی الحدیث شعبہ کے مشہور شاگرد قبیصہ بن عقبہ بھی ہیں. امام ذہبی نے اپنے تذکرہ میں بڑے وقیع الفاظ میں ان کا ذکر سناتے ہوئے جن سوانحی خاکوں سے ان کی کتاب زندگی کو آرائش دی ہے انہیں ایک یہ بھی ہے کہ ـــــ دلف نامی امیر وکبیر اپنے خدم وحشم کے ساتھ ایک بار قبیصہ کے مکان پر ملاقات کے لئے حاضر ہوئے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ عالم ربانی دلف کا نام سنتے ہی نیازمندانہ باہر دوڑ پڑے گا لیکن کافی دیر گذرنے کے بعد جب قبیصہ باہر نہ آئے تو لوگوں نے قریب جاکر عرض کیا ابن الملک الجبل علی بابک وانت لا تخرج :- کیا بات ہے کہ حاکم کا بیٹا دروازے پر ملاقات کا متمنی کھڑا ہوا ہے اور آپ باہر نہیں آتے.

قبیصہ نے سُنی ان سُنی کر دی مگر جب لوگوں نے کافی شور کیا تو قبیصہ اس شان سے باہر نکلے کہ پھٹی پرانی چادر میں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا اور یہ دلف کو دکھا کر اعلان کر رہے تھے من رضی من الدنیا بھذا ما یصنع یا بن ملک الجبل :- جس نے اس سوکھے روکھے ٹکڑے پر قناعت کر لی اسے شہزادہ کی کیا پرواہ- (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۴۰)

واقعہ یہی ہے کہ جن علماء کی گردنیں اقتدار کے سامنے خم نہ ہوسکیں یہ وہی تھے جنھوں نے دنیا کے قلیل حصہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قناعت کی پس اس امت کا اخیر جو اگلوں کی روایات وشان سے خالی نہیں اس میں بھی علماءِ حق کی قناعت پیشگی کی روایات موجود ہیں. شاہ صاحب کے تذکرہ میں آپ کے پسندیدہ وصف خودداری کی تفصیل میں جو کچھ ابتک لکھتا رہا ہوں اسے پڑھکر یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ آپ اس خودداری کے رکھ رکھاؤ میں کسی تعلق کی بھی رعایت نہ کرتے. اگر ان تفصیلات سے قارئین یہی تاثر لیتے ہیں تو واقعات کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہونچنا صحیح نہ ہوگا روابط وتعلق کی رعایت جس طرح آپ کے یہاں موجود تھی اسکا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جسکے راوی آپکے برادر خورد مولانا سیف اللہ شاہ صاحب ہیں کہتے تھے کہ

"ایک بار عید الاضحیٰ کے بالکل قریب مرحوم کشمیر تشریف لائے. مکان پہونچنے سے پہلے اپنے پرانے وخصوصی متعلقین ککرو خاندان کے ساتھ وقت گزارا. ادھر گھر سے کچھ عزیز واقارب پہونچ گئے جن کی خواہش تھی کہ آپ عید گھر کریں. دوسری جانب ککرو خاندان کا اصرار تھا کہ عید "بارہ مولہ" میں ہونا چاہیئے. عید سے دو روز پہلے "بارہ مولہ" کے قریب ایک گاؤں کے کچھ عقیدتمند آئے اور اپنی بستی میں چلنے پر اصرار کیا عید بالکل قریب تھی اس لئے آپ نے جانیسے

انکار فرمایا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ ایک رات کے قیام کے بعد صبح ہی "بارہ مولہ" واپس ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی بار بار کی اس یقین دہانی پر دل شکنی سے بچنے کے لئے بارہ مولہ سے اس گاؤں کی جانب روانہ ہوئے اور اگلی صبح کو وعدہ کے مطابق جب واپسی کا ارادہ فرمایا تو جیسا کہ عوام کی عادت ہے گاؤں کی آبادی نے نہ صرف پروگرام کو لیت و لعل میں ڈالا بلکہ اچھی خاصی مزاحمت پر آمادہ ہوگئے آپ نے فرمایا کہ بھائی میں بارہ مولا میں عید کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں تم لوگوں نے مجھکو یقین دلایا تھا کہ پروگرام کے تحت واپسی ہوگی اب یہ مزاحمت کیسی ہے؟ اس پر ایک دیہاتی نے ذرا تلخ ہو کر کہا کہ آپ ہم غریبوں کی دعوت کو نظر انداز کر کے بارہ مولہ کے رؤسا، کی دعوت کو ترجیح دے رہے ہیں۔"

مولانا سیف اللہ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس پر برہم ہوئے اور فرمایا کہ "خدا کے بندے میں پرانے تعلقات کو چھوڑتا نہیں اور نئے مراسم کی تلاش نہیں کرتا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف آپ میں خودداری کا وہ بے مثال جوہر تھا کہ آپ حیدرآباد کے رئیس اعظم کو بھی ملاقات سے روک دیں تو دوسری جانب تعلقات کی یہ رعایت بھی تھی۔

تواضع:۔ خودداری اور کبر و غرور میں باہمی فاصلے اس قدر مختصر ہیں کہ انسانی زندگی کا یہ کمال (خودداری) کبر و غرور کے نقص کے ساتھ بڑی تیزی سے مل جاتا ہے۔ وہ سعید زندگی اس بوقلموں عالم میں بہت کم نظر آئے گی جسکی خودداری تکبر و نخوت کی پرچھائیوں سے صاف اور بے داغ ہو۔ فریب نفس کے کتنے وہ مریض ہیں جو رذائل کی راہوں کے مسافر لیکن خود کو خودداری کے انسانی جوہر سے متصف گردان رہے ہیں نفس کی یہ وہی کمزوری ہے جس پر صدیوں بھی انسان کو اطلاع نہیں ہوتی۔

ع کہ خبث نفس نگردد بسالہا معلوم

کہنا یہ ہے کہ مرحوم میں جہاں خودی و خودداری کا وصف تھا اسکے ساتھ تواضع و فروتنی بھی موجود تھی۔ رفتار و گفتار، نشست و برخاست میں اس وصف کا ظہور تھا۔ غالباً آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ کھانے کے وقت میں جیسے ہی دسترخوان آپ کے سامنے آتا آپ سراپا تواضع بن جاتے۔ چال میں بھی تواضع، کتاب، اساتذہ اور حد تو یہ ہے کہ طلباء کے ساتھ بھی متواضعانہ طرز عمل تھا۔ مولانا محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ بارہا حضرت سے سنا کہ

"میں نے سات سال کی عمر کے بعد دین کی کسی کتاب کو بغیر وضو کے ہاتھ نہیں لگایا اور مطالعہ کے دوران کبھی کتاب کو اپنے تابع نہیں کیا۔ اگر کتاب میرے سامنے رکھی ہوئی ہے اور حاشیہ دوسری جانب ہے تو ایسی کبھی نوبت نہیں آئی کہ حاشیہ کی جانب کو گھما کر اپنے سامنے کر لیا بلکہ اٹھکر اس جانب جا بیٹھا ہوں جدھر حاشیہ ہوتا۔"

کتاب کے ادب اور اس کے ساتھ تواضع کی یہ برکت تھی کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو علم کی دولت سے مالا مال فرمایا اور اپنے اساتذہ کے احترام اور ان کے روبرو تواضع و انکسار اس درجہ غالب رہتا کہ مولانا اعزاز علی[ع] صاحب فرماتے تھے کہ

"جب حضرت شیخ الہند کے روبرو شاہ صاحب ہوتے تو اسقدر جھک جاتے

ع مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ:- استاذ الکل، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے وہ نامی گرامی استاذ جنکی ۴۷ سالہ زندگی کے ساتھ خدمتِ علم کی ایسی طویل تاریخ وابستہ ہے جسکی نظیر متاخرین علماء میں کیا نہیں بلکہ نایاب ہے فنا فی اللہ فنا فی الرسول، فنا فی الشیخ کے مراتب تو مشہور ہیں لیکن مرحوم "فنا فی العلم" تھے۔ ان کا علمی انہماک، دارالعلوم کی خدمت، طلباء کے ساتھ شفقت، امانت و دیانت، تقویٰ و تورع بے نظیر تھا۔ نصف صدی کے قریب دارالعلوم دیوبند کی اس طرح خدمت کی کہ سب کچھ دارالعلوم کو دیا یعنی اپنا شباب، اپنی قوتِ عمل، اپنے شب و روز، اپنا علم اور اپنا حسنِ عمل حضرت علامہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی رح کے جملہ تلامذہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے شاگرد ہیں۔ ترجمان دارالعلوم کی ایڈیٹری، دارالافتار کی خدمت، اہتمام میں مسند نشینی، نظامتِ تعلیمات، نیابت صدر مدرسی خدا جانے کتنے خدمت کے شعبے تھے جنھیں وہ مثالی طور پر انجام دیتے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت شاہ صاحب کے خصوصی مستفیدین میں سے تھے اس استفادہ کی قیمت بھی انھوں نے اسطرح ادا کی کہ راقم السطور کی بخت و پڑ میں ان کی بہترین صناعی و معماری کو تمامتر دخل ہے۔ ۷۰ سال کی عمر میں بمرض "وجع الفواد" داعئ اجل کو لبیک کہا اور ایک مقدس زندگی اندرون زمین کے تیرہ و تار ماحول کو حسن و کردار کی روشنی و نور پہونچانے کے لئے تاابد منتقل ہوگئی۔ راقم الحروف ہی کے قلم سے تذکرۃ الاعزاز" اور مولوی عبدالاحد صاحب مونگیری کے قلم سے کردار اعزاز" اور مرحوم کے بھتیجے سابق استاذ دارالعلوم مولوی افتخار علی صاحب کی "سوانح اعزاز" وہ سوانحی خاکے ہیں جنہیں اک فنا فی العلم، خادم علم و خادم دین کی زندگی پڑھی جا سکتی ہے۔ پسماندگان میں علاوہ صاحبزادی کے جناب قاری احمد میاں صاحب جو دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ قرأت کے استاذ ہیں۔ مولوی رشید احمد صاحب پاکستان کے کسی مدرسہ میں تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں فرزند اصغر مولوی حامد میاں صاحب دارالعلوم دیوبند کے استاذِ عربی ہیں خدائے تعالیٰ ان صاحبزادگان کو اپنے جلیل باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کہ آپ کے گرنے کا اندیشہ ہوتا۔"

مولانا مشیت اللہ صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم محبوب الرحمٰن صاحب فاضلِ دیوبند کا بیان ہے کہ

"میں جب دیوبند پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آپکے رہائشی کمرہ میں میرا قیام تھا حضرت کو پان کی عادت تھی ایک روز میں نے پان لگا کر پیش کیا آپ نے منہ میں رکھا ہی تھا کہ مجھے سامنے سے حضرت شیخ الہند تشریف لاتے ہوئے نظر آئے جو کسی ضرورت سے اپنے شاگرد کے پاس تشریف لا رہے تھے۔ شاہ صاحب کو حضرت کے آنے کی اطلاع کی گئی میں اُس اضطراب کو بھول نہیں سکتا جو اس وقت شاہ صاحب پر اپنے استاذ کی آمد اور منہ سے پان نکالنے کی عجلت کی صورت میں طاری تھا تیزی کے ساتھ اپنے منہ کو صاف کیا اور کمرے کے دروازہ پر ایک سراپا انکسار خادم کی حیثیت سے اپنے آقا کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔"

اگر استاذ اور استاذ بھی حضرت شیخ الہند جیسا اس احترام کا واقعی مستحق تھا تو لائق شاگرد کو بھی تواضع زیبا تھی۔ حیرت تو اس پر ہے کہ طلباء دین کے لئے بھی آپ کے مزاج پر انکسار غالب رہتا بلکہ کسی طالب علم پر کوئی ایسی تنقید جس سے اسکی حیثیتِ عرفی پامال ہو سننے کے لئے آپ تیار نہ تھے۔

مولانا سیّد احمد مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند جو حیدرآباد میں پروفیسر رہے اور اب دیوبند میں ایک بڑے تجارتی کتب خانہ کے مالک ہیں آپ کا بیان کیا ہوا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ

"جس سال ہماری بخاری و ترمذی حضرت شاہ صاحب کے یہاں زیرِ درس تھیں دار العلوم دیوبند میں ایک عجیب مجہول شخصیت طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئی یہ شخصیت پنجاب کی تھی میلے کچیلے کپڑے، پھٹا پرانا لباس۔ یہ طالب علم صرف درس میں نظر آتا باقی تمام اوقات مطالعہ میں گذارتا عصر سے تا مغرب اکثر طلباء تفریح کے لئے نکل جاتے مگر یہ کبھی تفریح میں نظر نہیں آیا۔ محنتی اور شوقین طلباء بھی کبھی اپنی ضرورت کے لئے بازار جاتے لیکن اسے دیوبند کے بازار میں نہیں دیکھا گیا حد تو یہ ہے کہ دار العلوم میں اجتماعات یا وقتی ہنگامی جلسوں میں بھی اسکی صورت نظر نہ پڑتی۔ میلے کچیلے کپڑے جن پر جوئیں گشت کرتی رہتیں

طلباء اسکے قریب بیٹھنے یا اپنے قریب بٹھانے سے گریز کرتے اسکا معمول تھا کہ کھانے کے اوقات میں مٹی کا ایک پیالہ لئے ہوئے مطبخ آتا۔ کھانا لینے کے بعد وہیں بیٹھکر کھالیتا۔ اسی پیالہ کو لئے ہوئے مولسری کے کنویں پر پہونچتا پیالہ کنگھال کر اسی میں پانی پیتا اور پھر بدستور داخلِ حجرہ، ایک آدھ مرتبہ اسکے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ایک بوریا اور ایک اینٹ جس سے یہ تکیہ کا کام لیتا' اسکے سوا کمرہ میں کوئی چیز نہیں تھی میں اور میرے رفیقِ درس مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک روز خلافِ معمول اس طالب علم کو دیکھا کہ اپنی مخصوص نشست چھوڑ کر ہمارے ساتھ سامنے والی نشست پر آبیٹھا۔ پھٹا پرانا لباس اس پر چلتی ہوئی جوئیں، اپنی کوفت سے زیادہ یہ احساس تکلیف کا باعث بن رہا تھا کہ حضرت استاذ کو بھی اذیت ہوگی۔ حضرت شاہ صاحب تشریف لاچکے تھے آپؒ کی تقریر روانی کے ساتھ جاری تھی حافظ ابن تیمیہ، ابن حجر عسقلانی' ابن ہمام، بدرالدین عینی وغیرہ کے حوالے، بلند پایہ تحقیقات اور اس پر ردّو قدح کے دوران حضرت استاذ کی مسکراہٹ، میں نے یہ سمجھکر کہ آپ کی تمامتر توجہ اس وقت متعلقہ مسئلہ کی جانب ہے۔ نہایت ہی خفی لہجہ میں اس طالب علم سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی اتنے غلیظ ہوکر یہاں آبیٹھے ہو۔ میں مطمئن تھا کہ میری آواز حضرت کے کان تک نہیں پہونچی ہوگی گردن اٹھاکر دیکھا تو شاہ صاحب کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور تقریر کا انبساط بھی رخصت ہوچکا تھا۔ سبق قبل از وقت ختم کیا اور درسگاہ سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے اشارے سے بلایا۔ جب میں قیامگاہ پر پہونچا تو محسوس ہوا کہ آپ شدید ناگواری میں ہیں فرمایا کہ "مولوی صاحب آپ بہت نظیف ہیں کہ ایک غریب طالب علم کی آپنے دل شکنی فرمائی یہ تواضع کے قطعاً خلاف اور کبر کی علامت ہے۔ آپکو کیا معلوم جس طالب علم کو آپنے سخت وسست کہا وہ عرصہ کے بعد واحد طالب علم ہے جو میری تقریر کو مکمل سمجھ رہا ہے جائیے اس سے معافی مانگئے۔"

حضرت استاذ کے اس حکم کی تعمیل کی گئی لیکن یہ شبہ باقی رہا کہ حضرت نے اس طالب علم کے متعلق ایسے وقیع کلمات کس لئے استعمال کئے ایک روز امتحان کی غرض سے اس طالب علم

کے کمرہ میں پہونچکر ایک اہم روایت کے متعلق سوال کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انکی زبان سے شاہ صاحب کی تقریر اسطرح سُنی کہ الفاظ کی بھی تبدیلی نہیں تھی۔ یہی تواضع اور فروتنی جو آپکا خصوصی مزاج تھا اسکے تقاضے کچھ اس طرح آپ پر غالب آگئے تھے کہ نام و نمود اور شہرت پسندی کے جذبات سے آپ کی زندگی خالی تھی۔ مولانا احمد رضا صاحب بجنوری کا بیان ہے کہ

"جب مجلسِ علمی ڈابھیل میں قائم ہوئی اور اکابر علمار کی نایاب تصانیف کی طباعت کا مقصد سامنے آیا تو حضرت شاہ صاحب کی بعض تالیفات طباعت کے لئے منتخب کی گئیں جن کے سرورق پر حسب دستور تعظیمی القاب کے اضافے کئے گئے حضرت نے اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ صرف "محمد انور شاہ الکشمیری" لکھئے یا زیادہ سے زیادہ "الاستاذ محمد انور شاہ الکشمیری" لکھئے چنانچہ آپ کی تمام وہ مطبوعات جنھیں مجلس علمی نے شائع کیا ہے اسی نام و عنوان کے ساتھ شائع کی گئیں۔"

کشمیر کا ایک سفر جسمیں آپ کے متعدد رفقار ہمراہ تھے۔ مولانا یوسف بنوری بھی آپکی معیت میں یہ سفر کر رہے تھے۔ اس وقت کشمیر کے علمار میں طلاق کا ایک مسئلہ اختلاف کا باعث بنا ہوا تھا کچھ علمار کی رائے تھی کہ طلاق واقع ہوگئی اور بعض کی رائے تھی کہ طلاق واقع نہیں ہوئی یہ مسئلہ فریقین نے موصوف کے سامنے رکھا اور ہر دو نے اپنے دلائل بھی پیش کئے موصوف نے مولانا یوسف بنوری کو مامور فرمایا کہ فتویٰ کا جواب لکھیں آپ خود مسئلہ بیان فرماتے اور مولانا بنوری اسے قلمبند کرتے جاتے مولانا بنوری نے خاتمہ پر یہ الفاظ تحریر فرمائے کہ

"ھذا اما اجاب البحر الذاخر الحبر الکامل مولانا محمد انور شاہ"

آپ نے قلم لیا اور ان تعظیمی القاب کو کاٹ دیا فرمایا

"آپ کو صرف محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے کوئی تعظیمی القاب نام کے ساتھ آئندہ استعمال نہ کیجئے۔"

بلکہ کبھی آپ کی یہ تواضع ایسی صورت اختیار کرلیتی کہ تلامذہ اور عقیدتمندوں کو بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا۔ جس وقت آپ نے بھاولپور کا سفر ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کیا جس کی تفصیلات انشار اللہ پیش کی جائیں گی۔ اس سفر میں دیوبند اور پنجاب کے بعض مشہور علمار آپکے ساتھ تھے۔ پہونچنے کے بعد قرب و جوار سے تلامذہ اور معتقد ملاقات کے لئے بھاولپور پہونچ گئے

جمعہ کے روز جامع مسجد میں اپنی پہلی تقریر میں فرمایا کہ

"میں ڈابھیل کے سفر کے لئے پابہ رکاب تھا اسی دوران جامعہ عباسیہ کے شیخ کا تار ملا کہ اس مقدمہ میں تیری شہادت مطلوب ہے میں نے سوچا کہ میں ایک بے عمل شخص ہوں جسکا دامن زادِ آخرت سے خالی ہے شاید مجھ روسیاہ کی نجات کے لئے یہی چیز کار آمد ہو کہ" میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین کی حمایت کے لئے آیا ہوں اور ختم نبوت کی جانبداری میرے لئے ذریعہ نجات بن جائے۔"

یہ الفاظ کچھ اس انداز سے آپ کی زبان پر آئے کہ مجمع پر گریہ طاری ہوگیا۔ آپ کے خصوصی شاگرد مولانا عبد الحنان [عہ] ہزاروی معاً کھڑے ہوگئے بولے کہ

"لوگو اگر حضرت شاہ صاحب کی بھی نجات نہوئی تو پھر کس کی ہوگی جنکا زہد وتقویٰ للٰہیت اور ولایت ہر شبہ سے بالاتر ہے۔"

موصوف نے جب اپنی عقیدت کا اظہار ان جملوں سے کیا تو آپنے انکو بہ جبر بٹھا دیا اور مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"یہ صاحب ہماری تعریف میں مبالغہ کرتے ہیں حالانکہ ہم پر یہ بات کھل گئی کہ گلی کا کتا بھی ہم سے بہتر ہے اگر ہم ختمِ نبوت کی حفاظت نہ کرسکیں۔"

مجمع نے ایک شیخِ وقت کی زبان سے یہ متواضعانہ کلمات سُنے تو آہ وبکا کی آوازیں صحن مسجد سے اٹھنے لگیں زندگی کے آخری ایام میں جب آپ کو معلوم ہوا کہ فتنۂ قادیانیت کشمیر میں داخل ہو چکا اور وہاں کے مسلمان اپنی غربت کی وجہ سے اس دجل وفریب کا شکار ہورہے ہیں تو آپنے کشمیریوں کی رعایت سے فارسی زبان میں ایک مفصل رسالہ "خاتم النبیین" کے نام سے تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ اپنے موضوع پر ایک نادر تالیف ہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ اسے اپنے مصارف سے شائع فرماکر کشمیر میں مفت تقسیم فرمائیں لیکن موت نے اسکی مہلت نہیں دی

عہ مولانا عبد الحنان ہزاروی:۔ ہزارہ کے باشندہ، فاضلِ دار العلوم، حضرت شاہ صاحب کے شاگرد، لاہور کی "مسجد آسٹریلیا" میں خطیب، ایک زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے نائب ناظم رہے، نہایت وجیہ، فربہ اندام، گھنی ڈاڑھی، آنکھوں پر چشمہ جو ان کی وجاہت میں اضافہ کرتا۔ ایک پُرجوش مقرر تھے۔ تقسیم ہند پر پاکستان چلے گئے، دینی وسیاسی خدمات انجام دیتے ہوئے وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

جس شب میں آپ کی وفات ہوئی اس دن شام کو مولانا محمد طیب صاحب آپ کی مزاج پرسی کیلئے آئے تو "خاتم النبیین" کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"مولوی صاحب میرے پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں میں دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہوں شاید یہ تالیف میرے لئے ذریعہ نجات بن جائے"

بہرحال جو پاکیزہ زندگی ساٹھ سال کی قلیل مہلت لے کر اس دنیا میں آئی اور جسکا ہر رخ و گوشہ خوفِ خدا، خوفِ آخرت، خشیت اور تقویٰ کے مقدس انوار سے منور تھا اور جسے خدائے تعالیٰ نے وسعتِ علم کے اس امتیاز سے نوازا تھا جو اس امت کے مخصوص ہی لوگوں کے حصہ میں آیا۔ وہ بہت آسانی سے کبر و غرور یا تواضع نما کبر میں مبتلا ہو سکتی تھی مگر یہ بھی ایک خدائے تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ زندگی تواضع سے لبریز اور فروتنی کے واقعی جذبات سے ہمیشہ معمور رہی۔

حق کا واشگاف اعلان:- خدائے تعالےٰ کا بندوں کے ساتھ عجیب معاملہ ہے کہ بعض اوقات کسی انسان کی زندگی ایسی متضاد صفات کا مجموعہ اور مرقع نظر آتی ہے کہ دیکھنے والے حیرت میں پڑ جاتے ہیں جو ذرا سی بے اعتدالی کبر و غرور کی شکل اختیار کر جاتی ہے کچھ ایسا ہی حال تواضع و فروتنی کے وصف کا بھی ہے بعض اشخاص پر ہضم نفس کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب، حدود شکنی، عدل و انصاف کی پامالی، حق و صداقت کے رسوائی کے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کا ہضم نفس انھیں اظہارِ حق کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن کچھ وہ ہیں جو اپنی شخصی و انفرادی زندگی میں مسکنت پسندی کا پیکر ہونے کے باوجود باطل کا غلبہ برداشت نہیں کرتے اور خدائے تعالےٰ انھیں ایسی عزیمت عطا فرماتا ہے کہ منکر کو بقوت مٹانے اور معروف کو اسی قوت کے ساتھ قائم کرنے کا خاص جذبہ ان کا امتیاز ہوتا ہے۔ اس امت کا طویل دامن ان گوناگوں اوصاف کی شخصیتوں سے لبریز ہے۔ وہی مولانا انور شاہ جنکی مسکنت اور کسر نفس کے کچھ واقعات آپ سن چکے ہیں۔ خدائے تعالےٰ نے آپ کو حق کے واشگاف اعلان کی بھی قوت و حوصلہ عطا فرمایا تھا اس باب میں "رخصت" پر عمل کرنے کی گنجائش یا "جواز" کا آپ سہارا نہ لیتے۔ اس پر چند واقعات پیش ہیں تاکہ صاحبِ سوانح کی زندگی کا یہ رُخ بھی سامنے آئے۔ دار العلوم کا داخلی قضیہ جسمیں حضرت مرحوم کو اپنے اس مادر علمی سے علیحدہ ہونا پڑا۔ پوری تحریک اپنی ابتداء سے انتہا تک آپ کی حق پسندی و حق پژوہی کی ایک مکمل داستان ہے۔ دار العلوم اپنی ایک سو تیرہ سالہ طویل عمر کے بعد دنیائے اسلام کی ممتاز و مشہور یونیورسٹی آج ہی نہیں بلکہ خدائے تعالےٰ

کا کچھ ایسا فضل رہا کہ یہ عظیم درسگاہ اپنے قیام کے پہلے دن سے ایک خصوصیت اور امتیاز لئے ہوئے ہے پھر روز و شب کی گردشوں نے اسکی خصوصیات کو مضبوط تر کر دیا چنانچہ کم از کم ہندوستان کے عربی مدارس میں اسکی مثال و نظیر نہیں ملتی۔ بدعات و محدثات کے مقابلہ میں دیوبند کا مستقل مکتبۂ فکر ہر دینی فتنہ کے بالمقابل دیوبندی افکار و نظریات کا اعلان، یہاں کے اہل علم کی خداداد صلاحیتوں کی شہرت، تقریر و تحریر مناظرہ اور استخلاص وطن کے لئے دیوبند کی مجاہدانہ کوششیں ان امتیازات نے ذہنوں پر دیوبند کے اثرات کا جو نقش قائم کر دیا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آج اگر علم معتبر ہے تو دیوبند کا، فتویٰ لائق اعتبار ہے تو دارالعلوم کا۔ غرضیکہ دینی و فقہی، حدیثی و تفسیری کاوشوں میں دیوبند کی فوقیت و برتری کا انکار ممکن نہیں۔ یہ وسعت تو دیوبند کے عوامی اثرات کی ہے۔ خود اندرون مدرسہ پندرہ سو طلبا اور ڈھائی سو، تین سو کے عملہ پر طویل و عریض اقتدار کم از کم اسکی نظیر ہندوستان کی دینی درسگاہوں میں ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ داخلی و خارجی بے پناہ اثرات جو دیوبند کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں ان سے شخصی و اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے ہزار ہا دل ہزار ہا دماغ بے چین اور ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں اور پھر یہاں کی صدارت تو وہ جلیل عہدہ ہے جو اپنی سابق تاریخ میں کسی منفرد شخصیت ہی کو مل سکتا تھا۔ کہنا یہ ہے کہ مرحوم نے قیامِ حق کے لئے دارالعلوم دیوبند ہی نہیں بلکہ اس کی صدارت کو خیر باد کہا تھا۔ اگر سطور بالا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کی گئیں تو اس اقدام میں عزیمت کی وہ روح کارفرما نظر آئے گی جو اسلام کے ابتدائی عہد میں خود شناس اور مردانِ حق کا شعار رہا ہے جس صدر مدرسی کے لئے اہل علم ہی نہیں بلکہ کہنے دیجئے کہ بعض خصوصی حضرات بھی ہزار ہا جتن کر رہے تھے شاہ صاحب کا اس سے دامن جھاڑ کر اٹھ جانا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ بھلا نہیں سکتی آپکو اس کا پورا حق ہے کہ مرحوم کی رائے سے اختلاف کریں اور اس تحریک کو از اول تا آخر غلط قرار دیں لیکن مرحوم کی نیت اور ان کی بلند حوصلگی ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔ مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ اس غریب الدیار شخص نے اپنی رائے و دانست میں زندگی کا جو ایک خاص نقشہ جمایا تھا یعنی وہی ہجرت اور ازدواجی تعلقات سے علیحدگی لیکن اس منصوبہ کو اساتذہ کی حکم کی تعمیل میں یکسر ختم کر دیا تھا اور جسکی رگ رگ میں احسان شناسی کے پاکیزہ جذبات ودیعت کیے گئے تھے اس حق گو کا اعلان کوئی معمولی بات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صورتحال پر ایک بار پھر غور کر لیجئے کہ ایک جانب دارالعلوم کے بے پناہ عوامی اثرات، دوسری طرف اندرونِ

دارالعلوم، وسیع اقتدار، تیسرے رُخ پر اساتذہ کا ہجوم، محسنوں کا جم غفیر، پھر کچھ واقعات سے متأثر ہوکر دارالعلوم سے علیحدگی کی گہرائی وگیرائی کو مؤرخ کا قلم نظرانداز کرنے پر قادر نہیں۔ معلوم ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری چند سال فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے وقف رہے اس زمانہ میں قادیانیت کے خلاف جو محاذ آپنے بنایا تھا وہ آپ کے اعلاء کلمۃ اللہ اور قیامِ حق کے اُن گہرے جذبات اور ولولوں کا ایک مظاہرہ تھا جو آپ کے دل ودماغ میں خدائے تعالےٰ نے ودیعت کئے تھے کبھی کبھی اس قیام حق کی مرحوم کی جانب سے ایسی صورتیں بھی منظرِ عام پر آئیں جنکا بظاہر واقعات کے سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہ ہوتا چنانچہ مولانا حفظ الرحمان سے یہ واقعہ سنا کہ

> ”کلکتہ میں جمیعۃ العلمائے ہند کا اجلاس ہورہا تھا ورکنگ کمیٹی ایک اہم ریزولیشن پر غور کررہی تھی ریزولیشن یہ تھا کہ جمیعۃ العلماء کی ممبری مسلمانوں کے کس کس فرقہ کے لئے مناسب ہوسکتی ہے۔ جمیعۃ العلماء کا نیا خون نوجوانوں کی تازہ قیادت خصوصی طور پر اس ریزولیشن سے دلچسپی لے رہی تھی ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے ساتھ سینکڑوں مندوبین بھی شریکِ بحث تھے جیسے ہی ریزولیشن غور وفکر کے لئے پیش ہوا حضرت شاہ صاحب اچانک کھڑے ہوگئے فرمایا کہ ”بھائی پہلے یہ طے کردو کہ قادیانی کافر ہیں یا مسلمان“۔ اس بظاہر بے جوڑ سوال پر وہ نوجوان حیرت زدہ رہ گئے جن کے کانوں میں حضرت کے وفورِ علم کی مسلسل داستانیں پہونچی تھیں نوجوانوں کے استعجاب پر مولانا عزیر گل نے (رفیقِ خاص ومعتمد حضرت شیخ الہند) فرمایا کہ ”بھائی حضرت شاہ صاحب کا مطالبہ قطعاً معقول ہے کیونکہ مسئلہ جمیعۃ العلماء کی رکنیت اور اسلامی فرقوں کے لئے اسکے دروازے کھولنے کا ہے اس لئے پہلے ہی مرحلہ پر قادیانیوں کے لئے بات صاف کرنی پڑے گی کہ آیا وہ کافر ہیں یا مسلمان؟ اگر ان کے کفر وارتداد پر آپ سب متفق ہیں تو پھر جمیعۃ العلماء کی رکنیت سے وہ محروم ہیں اور اگر آپ انھیں مسلمان سمجھتے ہیں تو پھر انہیں رکنیت سے روکنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے اس مطالبہ کا یہ مقصد ہے جسے آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔“

اس واقعہ سے معلوم ہوگا کہ وہ اپنی صداقت پسندی میں کسی وقتی مصلحت کے عادی

نہیں تھے۔ ہندوستان میں ایک وہ وقت بھی گزرا ہے کہ بعض علماء نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی ابتری کا علاج اپنی دانست میں یہی سمجھا کہ غیر مسلم قوموں کی طرح انہیں سود لینے کا مجاز کر دیا جائے یہ حضرات کہتے کہ مسلمانوں کی اقتصادیات اس وقت تک ٹھیک نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ وہ دوسری قوموں کی طرح سودی کاروبار سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس پُر جوش تحریک میں یہاں تک غُلو کیا گیا کہ ایک صاحب نے "سود مند" نامی رسالہ ہی نکالنا شروع کر دیا۔ ٹھیک اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب "انجمن خدام الدین" لاہور کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے ایک خصوصی مجلس میں "ظفر علی خاں" مدیر اخبار "زمیندار" جو موصوف کے بڑے معتقد تھے، لیکن "سود مند" کی تحریک سے متأثر تھے انھوں نے آپ سے ہندوستان میں جواز سود کے متعلق دریافت کیا آپ نے مسئلہ کی تمام تفصیلات، ہندوستان کی شرعی حیثیت اور اس ملک میں سود کی حرمت پر ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ظفر علی خاں کی خواہش کے خلاف تھی اس لئے وہ بار بار مختلف پہلوؤں سے سوال کرتے۔ مقصد یہ تھا کہ شاہ صاحبؒ جواز سود کی حد تک کھینچ کر آجائیں حضرت ممدوح ظفر علی خاں کی اس کوشش کو بھانپ گئے اور اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا "ہم مسئلہ کو کشف کر چکے ہیں اب جسکو جہنم میں جانا ہو چلا جائے ہماری گردن کو اس مقصد کے لئے پل نہ بنائے"۔

اس مجلس میں لاہور ہی نہیں پنجاب کے علماء وفضلاء شریک تھے۔ ظفر علی ایسے عقیدت کیش کے لئے آپ کا یہ اعلانِ حق سنکر سب دنگ رہ گئے۔ حق کہنے کا یہ جذبہ اس قوت کے ساتھ آپ پر غالب تھا کہ کسی مصلحت کو بھی خاطر میں نہ لاتے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے پاس ایک مسلمان حلوائی کی دوکان تھی جس کے یہاں سے عام طور پر طلباء چیزیں خریدتے اس غریب کی عادت تھی کہ اگر طلباء کچھ سامان قرض خریدتے تو ادائیگی کے وقت یہ مطلوبہ رقم بڑھا کر بیان کرتا۔ ایک بار ایک سرحدی طالب علم بھی اس کی اس مذموم عادت کا شکار ہو گیا سرحد کا یہ نوجوان طالب علم جسمیں وطنی اور قومی غضب واشتعال کی حرارت موجود تھی اس صورتحال کو برداشت نہ کر سکا۔ بات بڑھ گئی اور زدوکوب تک نوبت پہونچ گئی اس کشمکش کے نتیجہ میں طلباء ایک جانب ہو گئے اور دوکاندار کی حمایت میں اہل شہر نے جتھابندی کر لی۔ دوکاندار شہریوں کے ایک جمِّ غفیر کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں شکایت لے کر پہونچا اپنی مظلومیت کی لمبی چوڑی داستان سنائی، اہل شہر نے اسکی بھرپور تائید کی حُسن اتفاق کہ اس وقت آستانۂ استاذ پر مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ شہر کی محاذ آرائی، ان کا ہجوم اور اپنی بات پر اصرار۔ غالباً ان سب

چیزوں کے نتیجہ میں اس وقت سکوت ہی مصلحت سمجھا گیا۔ لیکن شاہ صاحبؒ برداشت نہ فرما سکے اور اسی ہجوم کے سامنے فرمایا کہ

"تم لوگ طلبار کو ذلیل سمجھتے ہو۔ مہمانانِ رسولؐ کی کوئی عزت تمہاری نظر میں نہیں اس لئے تم طلبار کے ساتھ بے انصافی کے عادی ہو گئے ہو"

آپ کے اس اعلان پر مجلس غرق حیرت ہو گئی۔ اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ ہے دارالعلوم دیوبند کے ایک صاحبزادے نے ایک بار طلبار کے اجلاس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمات کہہ دئے اس سے مولانا تھانویؒ کے معتقدین کو خصوصی اور سب کو عموماً تکلیف پہونچی لیکن کوئی شخص ان صاحبزادے کو تنبیہ کی جرأت نہ کر سکا مرحوم کو جب اس کا علم ہوا تو مجمع عام میں ان صاحبزادے کو بلا کر شدید تنبیہ کی اور فرمایا کہ

"تم کس منہ سے مولانا پر اعتراض کرتے ہو جس شخص کی تعلیم و تربیت سے ہزار ہا زندگیاں دُھل گئیں اور جو دین کی اتنی بے پناہ خدمت انجام دے رہا ہے ان پر تمہارے یہ بے سروپا اعتراضات تمہاری بدنصیبی کی علامت ہیں"

حضرت تھانوی جو دیوبند کے ماحول اور نازک مزاج صاحبزادوں پر نکیر کی اہمیت پر خوب مطلع تھے شاہ صاحب کی اس صداقت پسندی پر متأثر ہوئے اور بارہا اس کا اپنی مجلس میں ذکر فرمایا۔

صاف بیانی یا سادہ لوحی:۔ جو شخص حق پسند ہوگا اسکی باتیں یقیناً تصنع سے خالی اور بناوٹ سے بہت دور ہوں گی اسکے جو کچھ دل میں ہوگا وہی اسکی زبان پر ہوگا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو جو حق پسند طبیعت عنایت کی تھی اسکے نتیجہ میں گفتگو نہایت ہی صاف اور سادہ لوحی کا مظہر ہوتی۔ نفاق یا دورخی نہ آپکے عمل میں تھی اور نہ آپکے قول میں۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ مولانا محمد طیب صاحب کے زبانی سننے کے قابل ہے "جمعیۃ العلمار ہند" کی صدارت کے لیے ایک مرتبہ دیوبند اور غیر دیوبند کی کشمکش ہو گئی انتخاب مراد آباد میں ہونے والا تھا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب نے مولانا حبیب الرحمان عثمانی کو صورتحال کی نزاکت کی اطلاع دیتے ہوئے خواہش کی کہ جمعیۃ العلمار ہند کے تمام ممبران جو دارالعلوم دیوبند میں ہیں آپ کی رفاقت میں مراد آباد پہونچ جائیں۔ والد مرحوم سفر سے طبعاً بیزار رہتے اور کسی شدید مجبوری میں آپ کا سفر ہوتا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کے اصرار پر مراد آباد تشریف لے گئے مراد آباد کے علمار اور وہاں کے مقامی قدردان آپکی آمد

سے بہت خوش ہوئے ایک دعوت میں جہاں مخالف اور موافق سب ہی مدعو تھے مراد آباد کے کسی
ذمہ دار نے عرض کیا کہ
"حضرت آپ کے آنے سے بیحد مسرت ہوئی، آپ تو کہیں آنے جانیکے
عادی نہیں اس لئے ہمیں آپ کا تشریف لانا بہت غنیمت محسوس ہو رہا ہے۔"
اس پر بڑی سادگی سے فرمایا کہ
"جی ہاں ہمیں سفر سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور کہیں آنے جانے کی
عادت نہیں لیکن مولانا حبیب نے ہمیں بتایا کہ مبتدعین جمعیۃ پر غلبہ کی کوشش
کر رہے ہیں اس لئے ہم نے مراد آباد کا سفر کیا۔"
لُطف کی بات یہ ہے کہ خود مبتدعین اس وقت آپ کے سامنے تھے لیکن آپ کی سادگی
اسطرح کی موجودگی کا خیال نہیں کرتی تھی۔

اساتذہ کا احترام:۔ ترقی یافتہ اس زمانہ میں استاذ اور شاگرد کے درمیان اس رشتۂ اخلاص وعقیدت کو سمجھنا و سمجھانا کس قدر مشکل ہے جو آج سے نصف صدی پہلے انقیاد واطاعت اور ادب واحترام کے روح افزا منظر دیکھنے میں آتے۔ یہ تعلق حصولِ علم کی سنگلاخ وادیوں کا سفر نرم اور سبک بنا دیتا نتیجہ میں علم وعمل میں برکات کا ایک باب کھلتا۔ انگریزی تہذیب وتمدّن اور جدید تعلیم کا نظام جب تعفن بدوش ہندوستان میں داخل ہوا تو صدیوں کی یہ روایات الٹ کر رہ گئیں پہلے طلبار استاذ کی طرف سے ایک لفظ کا بھی افادہ اپنے حق میں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے، اب طلبار سکون کے ساتھ درس ہیٹھ کر سن لیں استاذ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، ماضی کا استاذ تخت نشین ہوتا اور طلبار کی جماعت بوریا نشین۔ اب کالجوں میں پروفیسر کھڑا ہوا ہے اور پڑھنے والے کرسیوں پر۔ گذشتہ دور نے یہ تخیل پیدا کیا تھا کہ استاذ کے زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ کی بھی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی اور اس وقت ٹیوشن کی معمولی فیس استاذ کے پورے علم کو خرید سکتی ہے۔ روایات کے اس انقلاب نے علم کی کائنات کو تہ وبالا کر دیا مگر اس دور کو دیکھ کر گذشتہ پچاس۵۰ سالہ عہد اور اس سے پہلے کی مسلسل تاریخی کڑیوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہ کیجئے جو زمانہ گذر چکا اس میں سعادتمندوں کا یہ اعلان تھا

"جس نے مجھے ایک حرف سکھایا میں اسکا ہمیشہ کیلئے غلام بن گیا۔"

مولانا انور شاہ کشمیری اس مبارک عہد کے پیداوار تھے جب شاگردی رشتہ غلامی کا دوسرا نام تھا حد تو یہ ہے کہ آپ نے فضل وکمال اور شہرت وامتیاز کے اس زمانہ میں بھی جبکہ آپ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہونچا ہوا تھا اپنے اساتذہ کے احترام اور عقیدت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا. مولانا محمد انوری لائلپوری کا بیان ہے کہ

"حضرت شاہ صاحب دارالعلوم کے صدر مدرس تھے جو اس علمی درسگاہ کا سب سے بڑا عہدہ ہے. حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا کی اسارت کے بعد دیوبند واپس ہوئے میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ دارالعلوم میں داخلہ کے لئے دیوبند پہونچا، حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت کا ابتک موقعہ نہیں ملا تھا لیکن آپ کی علمی عظمت کا احساس آپ کے سینکڑوں تلامذہ سے سنکر دل و دماغ پر غالب تھا۔ دیوبند پہونچنے کے بعد میرے والد مجھے لیکر آستانۂ شیخ الہند پر پہونچے، گرمی کا زمانہ تھا اور ظہر کی نماز ہو چکی تھی. حضرت کی مردانہ نشست گاہ میں ایک ہجوم حضرت کو چہار طرف سے گھیرے ہوئے بیٹھا تھا چھت میں لٹکے ہوئے پنکھے کو ایک صاحب کھینچ رہے تھے جنکا پرانوار چہرہ اسپر معصومیت ونورانیت، شکوہ علم اور جلالت علمی کی ملی جلی کیفیات دعوتِ نظارہ دیتیں، یہ صاحب پنکھا کھینچتے ہوئے چپکے چپکے لوگوں سے کہتے ذرا ہٹکر بیٹھئے کہیں حضرت کو تکلیف نہ ہو۔ والد نے میرے کان میں چپکے سے کہا کہ یہ پنکھا کرنے والے حضرت مولانا انور شاہ دارالعلوم کے صدر مدرس ہیں یہ سُنکر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس ذاتِ گرامی کی علمی شہرتوں سے عالم گونج رہا ہے اور جسکے خود اپنے شاگرد اس مجلس میں موجود ہیں کس عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنے استاذ کی خدمت میں مصروف ہے۔"

اللہ اللہ جس نامور کے بے پایاں فضل وکمال کی شہرت سنکر دنیا کھنچی چلی آتی تھی اسے اپنے استاذ کی ایک معمولی خدمت بجالانے میں نہ کوئی حجاب تھا اور نہ کوئی عار، مجھ ہی سے غالباً آپ سن چکے ہیں کہ اپنے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے بارہا سنا کہ

"شاہ صاحب جب حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے آتے تو احتراماً اتنے جھک جاتے کہ ہمیں آپ کے گرنے کا اندیشہ ہوتا۔"

اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ وہ ہے جو دیوبند کے ایک مشہور طبیب اور شیخ الہند کے ایک خاص شاگرد حکیم صفت احمد صاحب؏ سے سننے میں آیا۔ جسکی تفصیل خود حکیم صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ

"مالٹا سے تشریف لانے کے بعد دوپہر کو معمولاً میری حاضری شیخ الہند کے یہاں ہوتی حضرت اس وقت کچھ آرام فرماتے اور میں آپ کا بدن دابتا۔ ایک روز حضرت چادر اوڑھے ہوئے استراحت فرما رہے تھے اور میں حسب دستور بدن دبا رہا تھا کہ اچانک شاہ صاحبؒ تشریف لائے آنے کو تو آگئے لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں بڑی تشویش میں مبتلا ہو گئے کچھ لمحات ایسے گذرے کہ اپنے سانس کو اسطرح روکے رہے جیسا کہ آپ زندہ ہی نہوں یہ ساری کوشش اس لئے تھی کہ حضرت استاذ کو کسی تیسرے کی موجودگی کا احساس ہو کر آرام میں خلل نہ آئے۔"

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خدائے تعالٰے سعید شاگردوں کی فطرت کس انداز پر ڈھالتے ہیں۔ عقیدت و احترام کی یہ ساری سنتیں اس وقت اور بھی حیرت انگیز معلوم ہوں گی جب آپ کے پیشِ نظر یہ بھی ہو کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنے تلامذہ میں اس مایہ ناز شاگرد کے وفورِ علم کے سب سے زیادہ قائل تھے بلکہ بات اسی حد تک نہیں تھی معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہے کہ اکثر علمی مسائل میں خاص طریقہ یہ تھا کہ اپنے اس شاگرد کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا۔

؏ بوٹا سا قد، سفید ڈاڑھی، شرعی لباس، ہاتھ میں ایک چھڑی، سادگی، بھولا پن اور معصومیت کا سراپا تھے عزیز اور رشتہ داروں کی ہی خبرگیری نہیں بلکہ عام غربا کی بھی دیکھ بھال اسطرح کرتے کہ گھر والوں کی دارو گیر کے خوف سے چھپا چھپا کر چیزیں ضرورتمندوں کو پہونچاتے۔ مدت العمر اولادیں سے کسی کو جدا ہونے نہیں دیا۔ اگر کوئی چلا گیا تو اس کے پیچھے خود بھی روانہ ہو جاتے نسخہ عجیب و غریب ہوتا گن گن کر دوائیاں لکھی جاتیں۔ کسی مرض سے متعلق طب میں موجود تمام ہی دوائیاں نسخہ میں لکھ دیتے۔ خدائے تعالٰے نے انکی نیک نیتی کا ثمرہ دست شفا کی صورت میں عنایت کیا۔ تجبیر اور حرارت کے خاص نبض شناس تھے۔ معصوم بچے توتلی زبان میں جاکر صرف اتنا کہتے

"اجی حکیم صاحب تمہیں ہمارے گھر بلایا ہے۔"

حکیم صاحب چھڑی اٹھا کر انکے ساتھ ہو لیتے۔ فرحمہ اللہ تعالٰی رحمۃ واسعۃ۔

"بھائی شاہ صاحب فلاں حدیث کے متعلق یہ توجیہ ذہن میں آتی ہے
مگر اس لئے ظاہر نہیں کرتا کہ کوئی حوالہ موجود نہیں ہے ماشاء اللہ آپ کا مطالعہ
بہت وسیع ہے کیا متقدمین میں سے کسی نے یہ بات لکھی ہے جو میرے ذہن
میں آئی ہے۔"

اور یہ جلیل شاگرد گردن جھکاتے ہوئے عرض کرتا کہ

"ہاں حضرت فلاں عالم کی اس حدیث سے متعلق یہی رائے فلاں
کتاب میں موجود ہے۔"

جس خصوصیت اور امتیاز سے اپنے اس شاگرد کو خود استاذ کی جانب سے سرفراز کیا جا رہا تھا کبر اور غرور میں ڈھکیل دینے کے لئے یہ سب کچھ کافی تھا لیکن ایک سعادت اطوار شاگرد کے عقیدتمندانہ اور شاگردانہ طرز عمل میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ والدہ سے بارہا سنا کہ

شاہ صاحب کا وقار، سنجیدگی، ضبط و تحمل دیدنی تھا لیکن جس روز
حضرت شیخ الہند رحمہ کی وفات ہوئی تو حضرت کے دفن کے بعد شاہ صاحب گھر
واپس ہوئے تو اس سانحہ پر آپ کی بیقراری و اضطراب کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔"

اور خیر یہ تو آپ کا معاملہ شیخ الہند سے تھا جو سب سے بڑے استاذ بلکہ استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ کی نیازمندی و شاگردانہ سعادت تمام ہی اساتذہ کے ساتھ اسی نوعیت کی تھی۔ مولانا منفعت علی[عہ] صاحب دیوبندی جو دار العلوم کے استاذ تھے، سنا گیا ایک دنیادار طرز ہی کی شخصیت کے مالک تھے۔ جس زمانہ میں والد مرحوم دہلی میں "مدرسہ امینیہ" کے صدر مدرس تھے

عہ مولانا منفعت علی دیوبندی:۔ دار العلوم دیوبند کے استاذ، معقولات میں اچھی دسترس رکھتے میبذی پر مطبوعہ حاشیہ انھیں کے قلم کا ہے۔ صاحب جائداد تھے اسلئے آئے دن عدالتوں میں مقدمے چلتے رہتے ظاہر ہے کہ مقدمہ بازی کے ذیل میں بہت سی ناگفتنی چیزیں اختیار کرنا پڑتی ہیں اسی لئے مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دار العلوم و قار دار العلوم کے پیش نظر انھیں مدرسہ سے علیحدہ کر دینا چاہتے تھے لیکن اس وقت کے دستور کے مطابق دار العلوم کے سرپرست حضرت گنگوہی رح کی اجازت ضروری تھی۔ ادھر حضرت مرحوم کو مولانا کی دلچسپیوں کا تفصیلی علم نہیں تھا مولانا حبیب الرحمٰن (جنکا تدبر اس طرح کے موقعوں پر عجیب وغریب شکل اختیار کرتا) نے دیوبند سے تا گنگوہ شکایت کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا۔ سنا ہے کہ ایک روز حضرت گنگوہی نے مولانا منفعت علی کی شکایت سن کر غصہ سے فرمایا کہ "یہ منفعت علی ہیں یا مضرت علی"۔ پس یہ ارشاد مولانا کی معزولی کا پیش خیمہ بن گیا۔ دار العلوم دیوبند سے علیحدہ کر دیئے گئے اور زندگی کا آخری حصہ دہلی میں گذارا۔ برّد اللہ مضجعہ۔

اور آپ کا عُسرو تنگدستی عروج پر تھا. مولانا منفعت علی کسی ضرورت سے دہلی گئے اور انہیں کے پاس "سنہری مسجد" میں فروکش ہوئے. جب دیوبند واپس ہونے لگے تو دہلی کے اسٹیشن تک مشایعت مروّت کا تقاضا تھا مگر شاگرد کے پاس سواری کے لئے چند پیسے بھی نہیں تھے مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے کہ

"استاذ کو ایکہ پر سوار کر دیا اور شاہ صاحب پیچھے دوڑتے تھے."

آج کے اس زمانہ میں یہ روایتیں افسانہ ہی کیوں نہ معلوم ہوں لیکن تاریخ کے جھرونکوں سے جنھوں نے استاذ اور شاگرد کے درمیان شفقت وعقیدت کے پرانے منظر جھانک کر دیکھے ہیں وہ ان واقعات کو واقعات ہی کا درجہ دیں گے اور یہ معاملات تو ایسے حالات میں پیش آئے کہ عقیدت کے دامن پہ تلخی وبدمزگی کی کوئی پرچھائیں پڑنے نہ پائی تھیں، دارالعلوم دیوبند کے داخلی قضیہ کے دوران مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے براہِ راست یہ روایت میں نے سنی کہ شاہ صاحب ہنگامہ کے شبابی اوقات میں دیوبند سے کشمیر روانہ ہوئے اور کشمیر میں طویل قیام کے بعد جب دیوبند واپسی ہوئی تو مولانا حافظ احمد صاحب ابن حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی نے تعلقات میں پیدا شدہ فاصلہ کو سمیٹنے کی ایک نئی صورت نکالی. حافظ صاحب حضرت شاہ صاحبؒ کے استاذ بھی تھے. جس روز شاہ صاحبؒ کشمیر سے دیوبند پہونچے تو حافظ صاحب تنہا رہائشی مکان پر پہونچ گئے شاہ صاحب حافظ صاحب کو تشریف لاتے ہوئے دیکھکر حیرت زدہ رہ گئے، حافظ صاحب نے کھڑے کھڑے فرمایا کہ

"شاہ صاحب آپ پر میرا کچھ حق ہے یا نہیں؟"

شاگرد سروقد کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ

"حضرت اگر آپ میری چمڑی کو جوتہ بنا کر پاؤں میں پہن لیں تو بھی آپکا حق ادا نہیں ہوسکتا."

استاذ کا منور چہرہ ایک سعادتمند شاگرد کا جواب سنکر مسرتوں سے جگمگا گیا. حکم ہوا اگر یہ بات ہے تو ابھی دارالعلوم تشریف لے چلئے، بلا چوں وچرا اس حکم کی تعمیل کی گئی. اس سلسلہ کا یہ واقعہ بھی عبرت انگیز ہوگا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی آپ کے باقاعدہ اور رسمی استاذ نہیں تھے لیکن شاہ صاحبؒ کا ان کے ساتھ معاملہ شاگردانہ ہی شکل لئے ہوئے تھا چنانچہ جب دارالعلوم کا قضیہ ایک مکمل اسٹرائک کی شکل اختیار کر گیا تو کسی طالب علم نے ایک قلمی پوسٹر

جسمیں مہتمم دار العلوم پر ناروا تنقید کی گئی تھی دار العلوم میں چسپاں کیا۔ مولانا ادریس صاحب گھروڈی جو آپ کے خاص خادم تھے ان کی روایت ہے کہ "فجر کی نماز کے وقت میں مولسری کے کنویں پر پانی لینے گیا تو یہ پوسٹر وہاں نظر پڑا۔ میں پوسٹر کو اتار کر شاہ صاحب کی خدمت میں لایا آپ نے پڑھا تو بیحد مکدر ہوئے اور فجر کی نماز دار العلوم میں ادا فرما کر طلبا ر کو خطاب فرمایا اس خطاب میں خصوصی ارشاد یہ بھی ہوا کہ

"مولانا حبیب میرے استاذ نہیں، لیکن میں انہیں استاذ کی طرح مانتا ہوں جو شخص میرا احترام کرتا ہے اسے ممدوح کا بھی احترام کرنا چاہیئے"۔

والدہ کی روایت یہ ہے کہ

"اساتذہ کے اہل وعیال میں سے اگر کوئی ہمارے گھر آتا تو ان کے ادب واحترام میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتے"

خدائے تعالےٰ نے اس حُسنِ اخلاص حُسنِ نیت، حُسنِ عمل کا ثمرہ اس طرح عنایت فرمایا کہ بلاشبہ آپکے تلامذہ کو آپکے ساتھ جو تعلق اور عقیدت ہے دورِ حاضر میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ گویا کہ خدمت سے مخدومیت تک پہونچنے کا مشہور مقولہ آپ کی زندگی میں اپنی تمام سچائیوں کے ساتھ جلوہ نما رہا۔

کتاب کا احترام:۔ اساتذہ کے احترام کے ساتھ آپ کی سعید طبیعت کتاب کا بھی بھرپور احترام کرتی۔ ایک مرتبہ خود فرمایا کہ

"میں نے سات سال کی عمر کے بعد دین کی کسی کتاب کو وضو ر کے بغیر ہاتھ نہیں لگایا"۔

بلکہ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ

"کتاب کو مطالعہ میں کبھی اپنے تابع نہیں کیا جس نشست پر بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں اگر حاشیہ دوسری جانب ہوتا ہے تو کتاب کو گردش دیکر حاشیہ اپنے سامنے کرنے کی کوشش نہیں کی کتاب کی ہیئت بدلے بغیر خود اپنی نشست بدل کر حاشیہ کی جانب آبیٹھتا ہوں"۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ کتاب کے احترام کے سلسلہ میں یہ اہتمام پچھلوں میں تو در کنار اگلوں میں بھی خال خال شخصیتیں اس سعادت سے سرفراز نظر آئیں گی۔ دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے

لیکن اپنے ثمرات و برکات کے اعتبار سے بعید و قبیح، عرض کرنے کو تو یوں جی چاہتا ہے کہ جن فیروز بخت لوگوں کو خدائے تعالیٰ اپنے خصوصی انعام سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں ان کی طبیعتیں اسی طرح کے حسین رخوں پر ڈال دی جاتی ہیں اور وہ تیرہ بخت جو اساتذہ کی بے احترامی، درسگاہوں کی بے وقاری کے مظاہرے قدم قدم پر کر رہے ہیں۔ ان کا یہ سارا عمل بدقسمتی کا ایک جلی عنوان ہے۔

احترامِ شخصیت:۔ کتاب کے احترام کے ساتھ علمی شخصیت کا احترام بھی آپ کے دل و دماغ پر اس درجہ غالب تھا کہ درس میں کسی پر ناروا تنقید گوارا نہیں تھی۔ اگر کسی شخصیت کا تذکرہ یا اسکی کسی رائے کی تردید پیشِ نظر ہوتی تو ادب و احترام کے پہلو چھوٹنے نہ پاتے۔ خود ایک مرتبہ درس میں فرمایا کہ

> "جب میں نے بخاری کا درس شروع کیا تو "فتح الباری" کے مطالعہ کے درمیان محسوس ہوا کہ حافظ ابن حجرؒ نے حنفیت کو سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے اور رجال احناف پر ان کی زیادتیاں حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ کے تعاقب کے لئے میں پوری طرح چاق و چوبند تھا لیکن یہ خیال دامن گیر رہا کہ ابن حجرؒ پر تنقید یا ان کے عصبیت کا جواب میرے لئے جائز بھی ہے یا نہیں۔ بڑے عرصہ تک اسی کشمکش میں مبتلا رہنے کے باوجود میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضر ہوا اور مراقب ہو کر اپنی اس الجھن پر غور کرتا رہا۔ اس وقت میرے قلب میں آیا کہ مجھے ابن حجرؒ کی زیادتیوں کا جواب دینا چاہئے، یہ میری طرف سے دفع ہوگا متشددانہ تنقید کی ابتدا حافظ نے خود کی ہے۔"

ہمارے اس دور میں جبکہ تنقید سے زیادہ طعن و تشنیع لوگوں کا عام مزاج بن گیا ہے بلکہ زبان درازی سے خود علماء کی مجلسیں اور محفلیں بھی محفوظ نہیں۔ اس طرح کے واقعات حیرت انگیز ہیں۔ اپنے استاد مولانا اعزاز علی صاحب المغفور سے سنا ہوا یہ واقعہ آج بھی چونکا دینے کے لئے کافی ہے جس زمانہ میں وہ فقہ کی مشہور کتاب "کنز الدقائق" کے حاشیہ کی تسوید میں مشغول تھے اور روزانہ یہ حاشیہ شاہ صاحب کی نظر سے گذرتا۔ ایک دن "مصنف کنز" پر لکھے ہوئے مخالفانہ حاشیہ کو شاہ صاحب نے جب قلمزد کر دیا تو مولانا اعزاز علی نے معذرت کے لب و لہجہ میں عرض کیا کہ "یہ میری تنقید نہیں بلکہ ابن نجیم کی رائے تھی جسے میں نے صرف نقل کیا ہے آنے والے الفاظ جو اس وقت شاہ صاحب کی زبان سے تراوش ہوئے ادب و احترام کی کائنات میں سنگ میل سے کم نہیں فرمایا کہ

"مولوی صاحب ابن نجیم کو کنز پر اعتراض کا حق حاصل ہے لیکن آپ کو تو
اسے نقل کا بھی حق نہیں۔"

ماضی کے ان روشن واقعات کو لکھنے کے بعد سوچتا ہوں کہ ذہنی انقلاب کیلئے
انکی افادیت تو قطعاً مشکوک ہے ان پر یقین بھی کتنے کریں گے ؟۔

طلباء پر شفقت :۔ اخلاص فی العلم کا ایک بڑا تقاضہ اپنے تلامذہ کے ساتھ لطف وعنایت
اور شفقت ورحمت کا معاملہ بھی ہے۔ تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ نعمان بن ثابت
الکوفی الشہیر بابی حنیفۃ رحمہ اللہ کے عالی قدر استاد سے انہیں کے صاحبزادے نے طویل جدائی
پر یہ سوال کیا تھا کہ

"سفر میں آپ کو سب سے زیادہ کون یاد آیا۔"

فرزند کے لئے اپنے اس سوال کا متوقع جواب یہی تھا کہ جواب میں باپ کی زبان پر میرا ہی
نام آئے گا لیکن توقع کے خلاف باپ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے فخر روزگار شاگرد
ابو حنیفہ کا نام لیا اور تاریخ ہی نے یہ سنایا ہے کہ مشہور کتاب "شمس بازغہ" کے مصنف جب
جوانا مرگ ہوئے تو اس جانکاہ صدمہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کا شفیق استاد غالباً چالیس ہی
دن کے الٹ پھیر میں اپنے شاگرد کے ساتھ جا ملا۔ اس زمانہ میں جب استاذ اور شاگرد کے
درمیان اخلاص کے یہ رشتے ٹوٹ چکے نہ اُدھر سے شفقت رہی اور نہ اِدھر سے ادب واحترام، تو
یہ وثائق اگر کہانیاں قرار دیکر ناقابل قبول قرار دیئے جائیں تو کیا تعجب ہے لیکن اس زمین پر جو
واقعات پیش آچکے اور جنھیں تاریخ نے محفوظ کر لیا ان کی سچائی و واقعیت کسی شخص کے تسلیم
کرنے نکرنے پر موقوف نہیں بہر حال کہنا تو یہ تھا کہ شاہ صاحب کو اپنے تلامذہ سے غیر معمولی
تعلق اور گہرا اُنس تھا اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ آپ درس کے حد تک ہی طلباء سے متعلق نہ رہتے بلکہ
انکی علمی وذہنی تربیت بدستور جاری رہتی جو تلامذہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر مامور تھے
ان کے لئے اجازت تھی کہ جب چاہیں استفادہ کریں۔ استفادہ کے اوقات تہجد کے بعد سے
شروع ہوتے اور شب کو گیارہ بارہ بجے تک اسکا سلسلہ رہتا۔ ان تلامذہ سے تصنیف وتالیف کا
کام لیا جاتا۔ اسلام کی جانب سے دفاع کے لئے انھیں تیار کیا جاتا، چنانچہ دارالعلوم کا وہ زریں
دور جسمیں عالم وفاضل، مصنف ومقرر، ادیب وانشاء پرداز پیدا ہوئے حضرت شاہ صاحب کا
دور صدارت ہے بہت سے تلامذہ وہ بھی تھے جو ملک کی درسگاہوں میں پورے سال درس دیتے

اور اپنے اشکالات وعلمی الجھنوں کو جمع کرکے تعطیلات میں دیوبند پہونچتے کئی کئی روز ٹھہر کر یہ علمی الجھنیں دور کی جاتیں اسکے ساتھ اپنے شاگردوں کے شاندار مستقبل کے آرزومند رہتے باصلاحیت طلباء کو ممتاز عہدوں اور منصب پر پہونچانے کی کوشش کی جاتی اگر تلامذہ ملاقات کے لئے دیوبند آتے اور ان کی خاطر تواضع میں کوتاہی محسوس ہوتی تو معذرت فرماتے، مولانا محمد انوری لائل پوری جو ممتاز شاگرد تھے لدھیانہ سے برابر آپ سے ملاقات کے لئے دیوبند آتے رہتے۔ آخر علالت میں موصوف دیوبند آئے تو شاہ صاحب کو محسوس ہوا کہ شاید میزبانی ممکن رعایتوں کے ساتھ نہیں ہوسکی اس لئے چلتے وقت ان سے فرمایا کہ

"مولوی صاحب علیل ہوں آپ کا تفقد احوال نہیں ہوسکا معاف فرمانا۔"

بلکہ شاگردوں کی دلجوئی میں بڑی سے بڑی تکلیف خندہ پیشانی سے گوارا فرماتے اسپر کبھی کوئی شکایت نہ کی جاتی. مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی تقریب شادی میں شرکت کے لئے اکبرآباد تشریف لے گئے۔ گرمی کا زمانہ اور اطراف اکبرآباد کی چلچلاتی دھوپ خدا جانے کیسا بات پیش آئی کہ سواری کا معقول انتظام نہ ہوسکا بڑا فاصلہ آپ کو پیدل طے کرنا پڑا۔ یہ زحمت جو آپنے اٹھائی اس کی وجہ سے سب ہی میزبان خصوصاً مولانا اکبرآبادی بہت محجوب وشرمندہ تھے جب آپ ان کی بیٹھک میں فروکش ہوئے تو کچھ وقفہ کے بعد عزیز شاگرد شربت کا گلاس لیکر حاضر ہوا آپنے انھیں دیکھکر ایک خاص ادا کے ساتھ فرمایا کہ

"الا یا ایہا الساقی ادِر کاساً وناولہا۔"

گلاس ہاتھ میں لیکر دو چار جرعوں کے بعد مسکراتے ہوئے فرمایا کہ

"اور مولوی صاحب ــــ ع عشق آساں بود اول وے افتاد مشکلہا۔"

یہی مولانا اکبرآبادی ڈابھیل میں آپ کے ساتھ مدرس تھے. مشاہرہ میں اضافہ کی درخواست جب جامعہ کے مہتمم کی طرف سے نامنظور کردی گئی تو موصوف نے نہ صرف ڈابھیل کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا بلکہ علماء کی اس ارزانی وبے قدری سے محفوظ رہنے کے لئے انگریزی تعلیم کا ایک منصوبہ بنالیا۔ یہ کارروائی شاہ صاحب کے علم کے بغیر اور بڑی عجلت کے ساتھ پیش آئی. جب مولانا اکبرآبادی رخصتی ملاقات کے لئے پہونچے تو آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ

"مجھے آپ نے کوئی اطلاع نہیں دی ورنہ میں آپ کے اضافۂ تنخواہ کی پوری کوشش کرتا۔"

پھر عزیز شاگرد کی جدائی پر اشکبار آنکھوں کے ساتھ فرمایا کہ

"اچھا مولوی صاحب جائیے خدائے تعالیٰ آپ کو ایم، اے[ع۹] کرے اور مناصب جلیلہ عنایت فرمائے۔"

یہ دو تین واقعات اسلئے پیش کئے گئے کہ آپ کو اپنے تلامذہ کے ساتھ جو دلی تعلق تھا اور ان کی ذہنی و علمی تعمیر میں جس دلسوزی کے ساتھ آپ حصہ لیتے اس کے کچھ اجلے رُخ سامنے آجائیں ورنہ آپ کی زندگی اسطرح کے واقعات سے لبریز ہے جس کی تفصیل پیش نظر نہیں۔

علمی انہماک:۔ مرحوم کی زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز وصف آپکا علمی انہماک ہے۔ اس گوشہ میں آپ کے حیرت انگیز واقعات ان پرانی شخصیتوں سے ملتے جلتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اسی راہ میں صرف کی۔ چند ہی گھنٹے آپ کے اس انہماک و شغف سے فارغ رہتے ورنہ آپ کا ایک ایک لمحہ علمی عقدوں کے سلجھانے میں مصروف رہتا۔ مولانا ادریس صاحب نے انھیں سے نقل کیا ہے کہ

"میں ہر وقت فکرِ علم میں مستغرق رہتا ہوں بجز ان اوقات کے جب نیند کا شدید غلبہ ہو۔"

اس مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ نہ جاننے والے لوگ اگر بعض اوقات آپ کی عجیب وغریب باتوں کو دیکھتے تو خدا جانے کیا سمجھتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف تشریف لے گئے ہیں اور درمیان ہی سے مسکراتے ہوئے واپس ہو جاتے کمرہ میں پہونچکر کتاب یا اپنی کشکول اٹھاتے اور لکھنے کے لئے بیٹھ جاتے۔ جاننے والے سمجھ لیتے کہ کوئی علمی انکشاف ہوا ہے جسے تحریر کرنے کے لئے واپس ہوئے ہیں۔ ڈابھیل کے سلیمان کوٹھری والا جو آپ کے خصوصی معتقد اور مجلس میں عقیدت سے شرکت کرنے والے تھے انکا بیان ہے کہ

"ایک بار میں نے حضرت شاہ صاحب کو تین مرتبہ بیت الخلاء کے ارادے سے نکلتے ہوئے اور پھر واپس کمرہ میں آتے ہوئے دیکھا۔"

مجھے اس پر حیرت ہوئی تو مولانا ادریس سگھروڈوی نے بتایا کہ ہر وقت فکرِ علم میں رہتے ہیں۔

ع۹ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ مولانا اکبرآبادی کی باقاعدہ انگریزی تعلیم ایم، اے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ متعدد نمایاں اور جلیل مناصب پر کام کرنے کے ساتھ بہت سے اُن طلبار کے شفیق مربی بھی ہیں جو انکی نگرانی میں آئے دن اہم علمی موضوع پر تحقیق و ریسرچ کرتے رہتے ہیں لیکن اسکے باوجود ضابطہ کی حد تک بہرحال ایم، اے ہی ہیں۔

اس آمد و رفت میں طبیعت مسائل کی طرف متوجہ ہے کچھ انکشافات ہوتے ہیں تو ان کو لکھنے کے لئے واپس ہو جاتے ہیں. والدہ کہتی تھیں کہ

"کبھی ایسا ہوا کہ خود ہی بیٹھے بیٹھے مسکراتے، کتاب اٹھاتے اور لکھتے۔"

اس علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ کوئی ایسا مشغلہ جو ان کی شغل میں حائل ہو پسند نہ فرماتے۔ اس زمانہ میں اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں کے امتحانی پرچے آتے لیکن جوابی کاپیاں دیکھنے سے انھیں بڑا تکدّر و انقباض ہوتا فرماتے کہ

"بڑا بے حظ مشغلہ ہے۔"

اپنے شاگرد اور تلانذہ کو بھی علم ہی میں مشغول دیکھنا پسند فرماتے. مولانا فخر الدین صاحب[عـ] شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے فرمایا کہ

"میرا جس سال دورہ تھا حضرت کے کمرہ سے متصل ہی میرا کمرہ تھا

عـ علماء روزگار کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن، نامور شخصیتوں کا مرجع، علوم و فنون کا مرکز، اے خوش نصیب دار العلوم مبدأ فیاض نے تجھے کن کن گوہر و لآلی سے نوازا اور کیسے کیسے آبدار و تابدار موتیوں سے تیرا دامن لبریز ہے، تو صبح چمن ہے کہ بادِ نسیم تیری روشوں پر مصروفِ خرام، تو ایسا سدا بہار گلشن ہے کہ تیرے پھولوں کا منہ دھلانے کے لئے شبنم بلندیوں سے اترتی ہے یہ زبان استعارہ و تشبیہ کی ہے ورنہ تیرے لئے سب کچھ وہ فخر روزگار شخصیتیں ہیں جن کی نظیر اب چشمِ فلک دیکھ نہ سکے گی انھیں میں تیری ماضی قریب کے مسند آرار حدیث و زینت بخش تختِ علم و فن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ بھی تھے۔ ہاپوڑ کی سرزمین نے اپنے بطن سے اس قیمتی موتی کو اچھالا اور دہلی پہونچا دیا. طفولیت مرحلۂ علم و کمال میں تربیت کے ادوار سے گذری جس میں پیہم مصائب اور تابڑ توڑ مشکلات رفیقِ سفر رہیں۔ دہلی نے اس گوہر آبدار کو اس مرکزِ ثقل کی طرف پہونچایا جسے خود دہلی کی تخریب نے تعمیر کیا تھا یہاں یہ جوانِ رعنا حضرت شیخ الہند رہ اور حضرت العلام مولانا انور شاہ الکشمیری قدس سرہما العزیز کی کیمیا اثر نظر کا مرکز بنا، بدءِ فطرت سے جن صلاحیتوں کو لیکر چلے تھے انکے اجاگر ہونے کا وقت آیا. فراغت حاصل کی اور یہیں مدرسی کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن سوءِ تقدیر کہ ایک علامہ سے معاصرانہ چشمک چل پڑی مولانا حبیب الرحمان عثمانی نے اپنے تدبّر سے کام لیکر "مدرسہ شاہی مراد آباد" کی صدارتِ تدریس پر روانہ کر دیا. نصف صدی کے قریب اس درسگاہ کو آب و تاب دیتے رہے۔ درمیان میں ایک بار دار العلوم کی مسندِ صدارت پر چند ماہ کے لئے تشریف لائے اور پھر مراد آباد لوٹ گئے مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب کئے گئے اور جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا دمِ واپسیں بر سرِ راہ تھا تو نظرِ انتخاب اسی

(باقی آگے)

اسلئے آپ نماز کے لئے تشریف لیجاتے ہوئے گاہے گاہے میرے کمرہ پر کجاتے
ایک بار میں فتح الباری شرح بخاری کا مطالعہ کر رہا تھا دریافت فرمایا کہ روزانہ
کتنے صفحات کا مطالعہ کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ صفحات کا مطالعہ
معمولاً جاری ہے، ارشاد ہوا کہ

"بہت کم مقدار ہے میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں بیس ۲۰ روز میں
فتح الباری کی تیرہ ۱۳ جلدیں مکمل دیکھ ڈالی تھیں۔"

جب کبھی سفر ہوتا ملاقاتیوں سے بھی فرماتے کہ

"اچھا بھائی کسی کو کچھ پوچھنا ہو تو پوچھو۔"

آپکا یہ شغل موت تک جاری رہا جس شب میں وفات ہوئی ہے اس روز بھی مطالعہ کیلئے
کتابیں سامنے تھیں دار العلوم کے اساتذہ استفادہ کرتے خصوصاً مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے
سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ خود ان کا بیان ہے کہ

"عربی کی پہلی کتاب سے آخری کتاب تک اور اسکے علاوہ بہت سی
متعلقہ وغیر متعلقہ کتابیں میں نے حضرت شاہ صاحب سے حل کیں۔"

بعض اساتذہ خصوصی فنون کی کتابیں آپ سے پڑھتے۔ مولانا اعزاز علی صاحبؒ فرماتے
کہ مفتی محمد سہولؒ [7] صاحب بھاگلپوری نے ہیئت کی بعض کتابیں آپ سے باقاعدہ پڑھیں غرضکہ

صـ۱۱۳ کا بقیہ:- وجودِ زیبا پر جاری۔ شیخ الحدیث بنا کر لائے گئے اور چند سال کے بعد صدارتِ تدریس کے عہدہ پر فائز ہوئے وہ کیا آئے کہ خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی وہ اٹھے تو علمی بہاریں بھی ان کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔ حدیث ان کا فن تھا بخاری شریف ان کی مخصوص کتاب تھی، قال اللہ وقال الرسول ان کا شغل تھا، نزاکتِ مزاج ان کا وصف تھا، نفاست پسندی ان کا امتیاز تھا، زاہد پاکباز، عالم ربانی، قلب روشن، روح مزکی، نہایت صاف گو، معاملات میں بڑے بے غل وغش، واہمہ کے مریض، علالت اور ناتوانی کا ہر وقت ورد، علیل ہوں مریض ہوں ناتواں ہوں، ان کا کلمۂ طیبہ بات بات پر بگڑنا، بگڑنے کے بعد سنورنا، غصہ میں لگاوٹ، بزرگوں کے معتقد، صاحبزادوں کے لئے سعادتِ اطوار، طلباء کے ہمدرد، کسی طالبعلم کو کوئی تکلیف پہونچے تو یہ رونے کے لئے تیار، اب کہاں ملیں گی ایسی شخصیتیں اور کس چراغ کو ہاتھ میں لے کر تلاش کیا جائے ان خزینوں کو، بعمر چوراسی ۸۴ سال جس مراد آباد میں افقِ علم پر ابھر کر آئے تھے اسی افق میں قیامت تک کے لئے روپوش ہوگئے۔ وسطِ شہر میں قبر کا مطلع نمایاں ہے لیکن آفتاب علم غائب از نظر۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

آپ کے اوقات علمی مسائل کے حل اور افادہ کے لئے وقف تھے۔

علمی جامعیت:۔ شب و روز اس علمی انہماک کی وجہ سے آپ ایک جامع الفنون شخصیت کے مالک ہو گئے۔ نہ صرف متداول علوم بلکہ عصری علوم پر بھی وسیع نظر رکھتے۔ رمل و نجوم، طب، تاریخ و جغرافیہ، معاشیات، قدیم فلسفہ اور جدید سائنس ان تمام علوم و فنون پر واقف کارانہ نظر تھی۔ فرماتے تھے کہ

"شیخ بوعلی سینا کو ارسطو کا فلسفہ کل ایک واسطہ سے پہونچا ہے جبکہ میں نے اسے تین واسطوں سے حاصل کیا ہے۔"

کبھی تحدیثِ نعمت کے طور پر "انا اعلم بالی سینا" فرما کر شیخ الرئیس کے فکر و نظر پر تنقید ہوتی۔ تبحر کا یہ عالم تھا کہ متقدمین کے علوم پر انکی نظر ناقدانہ تھی۔ حافظ ابن تیمیہ سے غیر معمولی تأثر کے باوجود حنفیہ کے خلاف انکی عصبیت ہی پر نہیں بلکہ بعض ان کی فنی کمزوریوں پر اطلاع تھی فرماتے کہ نحو و صرف اور منطق میں حافظ کمزور ہیں۔ ان مباحث میں حافظ کی لغزشوں پر طلباء کو متنبہ کیا جاتا۔ ابن حجر عسقلانی کی اُن دانستہ فروگذاشتوں پر پوری نظر تھی جو انھوں نے احناف کو نقصان پہونچانے کے لئے کی ہیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ حافظ کے بعض واقعی تسامحات بھی پیشِ نظر تھے اسی طرح حافظ بدر الدین عینی کی اس دفاعی جدوجہد سے قطعاً مطمئن نہیں تھے جو انھوں نے حافظ عسقلانی کے مقابلہ میں کیں بلکہ ان کی علمی کوششوں میں جھول پر واقفیت رکھتے اور درس میں طلباء کو اس کی اطلاع دیتے۔ عصر حاضر میں ہمارے موجودہ اہلِ فتویٰ کا پورا مدار شامی کے بیان کردہ مسائل پر ہے لیکن ان کو شامی کے تفقہ پر چنداں اعتماد نہ تھا۔ ابن نجیم صاحبِ بحر الرائق کے تفقہ کو وقیع انداز میں سراہتے ہوئے فرماتے کہ

"ابن نجیم فقیہ النفس ہیں۔"

فقیہ النفس کی اصطلاح ان کی ایک مخصوص اصطلاح تھی اور غالباً متقدمین میں صرف دو شخصیتوں کے لئے اسے اختیار فرمایا تھا۔ ایک ابن نجیم دوسرے علامہ سہیلی صاحب روض الانف۔ متاخرین میں حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ کے علوم و کمالات سے تأثر تھا کبھی کبھی فرماتے کہ

"بخاری شریف کا حق حافظ ابن حجر کی شرح کے بعد ادا ہو گیا لیکن تفسیر کا حق امت کے ذمہ باقی ہے۔ اگر شاہ عبد العزیز کی تفسیر پوری ہوتی تو امت کی جانب سے قرآن مجید کی تفسیر کا حق بھی ادا ہو جاتا۔"

شاہ صاحب کے تفقہ پر بھی اعتماد تھا مسائل وحوادث میں انکے فتاویٰ پر اعتماد رکھتے، وسعتِ علم کا یہ عالم تھا کہ بعض علمی انکشافات ان کی اپنی مخصوص تحقیق تھی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی معرکۃ الآراتصنیف "فتح الملہم" میں تواتر کی چہارگانہ تقسیم کے متعلق شاہ صاحب کی نادر تحقیق کو وسعتِ حوصلہ کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔

جفرو رمل:- جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو علوم وفنون پر وسیع نظر عطا فرمائی تھی۔ اسکے ثبوت میں آپکے خصوصی شاگرد مولانا کریم بخش صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کا بیان ہے کہ "میں نے رمل ونجوم کی بعض کتابیں حضرت شاہ صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔" رمل ونجوم میں جو کچھ آپ کو مہارت حاصل تھی اسکا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے جسکے راوی مولانا ادریس صاحب سکھروڈھوی ہیں کہ

"پنجاب کے ایک بزرگ کا حلقہ کافی وسیع تھا جفرو رمل کے ماہر تھے۔ ایک بار آپ کی خدمت میں سفر کر کے پہونچے اور چند روز رہ کر باقاعدہ اس فن پر آپ سے استفادہ کیا بعد میں انھوں نے بیان کیا کہ مجھے اسکی امید تک نہ تھی کہ طبقۂ علماء میں اس فن کے رموز واسرار کا ایسا شناسا بھی موجود ہوگا۔"

فنِ طب:- آپ کی رائے تھی کہ طبِ نبوی جو احادیث کا ایک خاص باب ہے اسے اس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا تاوقتیکہ طب کو مکمل حاصل نہ کیا جائے اسلئے دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے دہلی میں حکیم واصل خان صاحب سے فن طب کی تحصیل کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی درسی تقریروں میں جہاں کوئی مسئلہ طب سے متعلق آجاتا ہے اس پر پوری حذاقت سے کلام فرماتے ہیں۔ ایک بار دیوبند میں شفاء الملک حکیم رضی الدین صاحب تشریف لائے ان کے اعزاز میں دارالعلوم کی جانب سے ایک استقبالیہ جلسہ ہوا جسمیں شاہ صاحب نے برجستہ فن طب بلکہ قدیم وجدید اصول علاج پر دو گھنٹہ تک مفصل تقریر فرمائی حکیم صاحب اس پرمغز تقریر کو سُن کر بیحد متاثر ہوئے[ع]۔ طب کی بیشتر کتابیں اپنے برادرِ نسبتی حکیم سید محفوظ علی صاحب،

ع جس زمانہ میں آپ دہلی میں طب کی تکمیل فرمارہے تھے مولانا عبیداللہ سندھی آپکے شریکِ درس تھے۔ سندھی مرحوم کی ذکاوت وذہانت حلقۂ علماء میں ہمیشہ سے تسلیم رہی خود شاہ صاحب آپ کی ذکاوت، جودتِ طبع کے بڑے معترف تھے مولانا سندھی درس میں اشکالات کرنے کی عادت رکھتے جبکہ شاہ صاحب ہمیشہ

(باقی آگے)

مولانا صدیق صاحب نجیب آبادی اور مولانا ادریس صاحب سکھروڈوی کو پڑھائیں۔ع۵ سائنس جدید کی کتابوں کا مخصوص طلبار کو درس دیا. مطالعہ کے شغف اور علمی انہماک کی بنا پر عصری علوم پر بھی بصیرت تھی چنانچہ ایک بار بھوپال کے سفر میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اسلامی نظریات سے نئی تحقیقات کے تصادم کا آپ کے سامنے ذکر کیا آپ نے نئی تحقیقات ہی کی روشنی میں مدلل جوابات دیئے جس پر یہ نوجوان بیحد متاثر ہوئے. تنوع، جامعیت اور عصری علوم سے براہِ راست واقفیت کی بنا پر آپ کے خیالات میں بھی بڑی وسعت تھی چنانچہ ایک بار آپ سے پوچھا گیا کہ فلسفۂ قدیم اسلام سے زیادہ قریب ہے یا جدید سائنس؟ فرمایا کہ

"سائنس جدید اقرب الی الاسلام ہے۔"

ص۱۱۶ کا بقیہ :- خاموش رہتے دلّی کے درس کا یہ لطیفہ خود مرحوم ہی کا بیان کیا ہوا ہے کہ

"میں نے پوری مدت میں ایک روز استاذ کے سامنے ایک اشکال رکھا حکیم صاحب نے درس کے اختتام پر باصرار تمام مجھ سے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کو اس فن کے پڑھنے کی ضرورت نہیں خدا تعالےٰ نے آپ کو وہبی ملکہ عنایت فرمایا ہے اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آپ کو رسمًا سند دینے کو تیار ہوں مگر میں نے حکیم صاحب کے اس اصرار کے باوجود فن کی باقاعدہ تکمیل کی۔

ع۵ اس سلسلہ کا یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ ہمارے اطراف میں کچے چنوں کو بھون کر کھانے کا رواج ہے رات کے اوقات میں بھوننے کا اہتمام بچے کرتے ہیں اور بعد میں بڑے بھی اسمیں شریک ہو جاتے ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ "منہ لگا غلام اور منہ لگا چنا چھوٹتا نہیں" غلط نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اتنا پُرلطف شغل ہے جسکے تے نشست گھنٹوں کی بھی مکدر نہیں کرتی مجلس کا تتمہ ٹھیک آم خوری کی مجلس کی طرح سیاہی کو بے تکلف ساتھیوں کے چہرہ پر ملنا رگڑنا ہے. سنانے کی بات یہ ہے کہ ایک بار ہم سب بچے مکان کے صحن میں بھنے ہوئے چنے کی مجلس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ والد مرحوم جنھیں اس زمانہ میں بواسیر کا شدید دورہ لاحق تھا اپنے کمرہ سے عشاء کی وضو کرنے کے لئے باہر تشریف لائے سیدھے آکر ہمارے قریب بیٹھ گئے اور چنوں کی فرمائش کی. بچوں نے چینی کی طشتری میں چنے نکال کر دیئے آپ انھیں تناول فرما رہے تھے کہ ماموں حکیم محفوظ علی صاحب مزاج پُرسی کے لئے اچانک آگئے. عرض کیا کہ حضرت بواسیر کی شدت میں آپ چنے استعمال فرما رہے ہیں یہ تو بیحد مضر ہے فرمایا کہ

"مولوی صاحب فلاں کتاب کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ فلاں صورت میں اگر بواسیر کا عارضہ ہو تو چنا مضر نہیں۔"

حکیم صاحب نے نشان زدہ کتاب سے مراجعت کی تو آپ کی اس بے نظیر علمی وسعت کے معترف ہوگئے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ نئی تحقیقات سے اسلام کو سمجھنے میں جس قدر مدد ملتی ہے اسکے پیش نظر آپ کا یہ ارشاد صرف توسع پر مبنی نہیں بلکہ اسمیں اصابت رائے کی پوری روشنی بھی موجود ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ معراج کو سمجھنے کے لئے کس قدر مونشگافیاں کرنا پڑتی تھیں مگر عصر حاضر میں جب انسان ایک کرہ سے دوسرے کرہ میں بے تکلف سفر کر رہا ہے تو معراج کو سمجھنا اور سمجھانا لاینحل مسئلہ نہیں رہا۔ اعمال کے وزن کی اطلاع جو حدیث و قرآن میں مسلسل ملتی رہی "مقیاس الحرارۃ" (تھرمامیٹر) کی موجودگی میں بقائمی ہوش وحواس وزن اعمال کا انکار کون کرسکتا ہے اقوال کی حفاظت کے لئے موجودہ وقت کا ٹیپ ریکارڈ ایک بہترین ثبوت ہے لیکن یہ بھی سانحہ کچھ کم درد انگیز نہیں کہ علمار علوم عصری سے ناواقفیت کی بنا پر اسلام کی مضبوط اور مؤثر ترجمانی سے محروم ہیں۔ غزالی اور رازی نے اپنے عہد کے غیر اسلامی علوم سے واقفیت بہم پہونچا کر اسلام کی جو خدمت انجام دی وہ کس سے پوشیدہ ہے وہ بھی ثقہ علمائے اسلام ہی تھے جنکی علمی جستجو و کاوش انھیں ان علوم تک بھی لے گئی جو اسلام سے دور اور قریب کا کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ امیر خسروؒ کو تو جانے دیجئے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مشہور تالیف "ماثر الکرام" سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند ہمت علمار کی علمی کمند سے موسیقی بھی بچکر نہ نکل سکی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی المغفور کی کتاب "ہزار سال پہلے" سے سکاکی صاحب مفتاح کی مہارت شعبدہ بازیوں میں بھی کھل کر سامنے آتی ہے کاش کہ ہمارا یہ عقیم دور نہ سہی غزالی و رازی چند "انورشاہ" ہی پیدا کرتا جو نئے انکشافات و اکتشافات سے اسلام کو ایک تسلیم شدہ حقیقت بناتے آپ نے تلامذہ کو انگریزی پڑھنے کے لئے بارہا متوجہ کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے "نظام تعلیم و تربیت" میں اسکا ذکر کیا ہے [عہ]۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ کا ایک بڑا حصہ عربی علوم سے فراغت کے بعد انگریزی علوم حاصل کرنے میں لگ گیا اور یہ جماعت آج اسلام کی وقیع خدمت انجام دے رہی ہے۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک شاگرد نے عربی میں ایک مقالہ لکھکر اصلاح

عہ آہ! کہ اب تو مولانا گیلانی بھی عرصہ ہوا کہ مرحوم ہو چکے جس زمانہ میں یہ بے بضاعت ان سے قلمی اصلاح لیتا تو آزاد ہندوستان میں ایک مکتوب میں مجھے انگریزی پڑھنے کی توجہ دلاتے ہوئے انکے حقیقت رقم قلم پر یہ مضمون بھی وارد ہوا کہ

"اب تو ہندوستان میں اسلام کے خدام کو نہ صرف انگریزی بلکہ ہندی و سنسکرت بھی جاننے کی ضرورت پیش آگئی۔"

لیکن اس فرزانہ کی بات پر مخاطب دیوانہ بھی عمل نہ کر سکا۔ دوسروں کو تو کیا کہیے۔

کے لئے آپ کے سامنے پیش کیا تو یہ کہتے ہوئے اسے واپس کر دیا۔

"مولوی صاحب اگر ہندوستان میں اسلام کی خدمت کرنا ہے تو اردو میں لکھیئے اردو میں پڑھیئے۔"

اردو میں لکھیئے اردو میں پڑھیئے یہ صدا ایک دردمند دل سے جو نکل رہی تھی صدا بصحرا نہ رہی بلکہ آپ کے مشہور تلامذہ کی وہ جماعت جو اس وقت انشار ونگارش کے بہترین ثبوت بہم پہونچا رہے ہیں شاہ صاحب کے نعروں کی صدائے بازگشت ہے دلّی میں "ندوۃ المصنفین" کا قیام اور اس سے دین و اسلام کی وقیع خدمات مرحوم کے خوابوں کی تعمیر ہے۔ بہرحال آپ کی جامعیت وعلمی تنوّع پر کچھ عرض کیا جا رہا تھا اس ذیل میں مولانا شبیّر احمد عثمانی کا وہ واقعہ بھی سُنانے کے قابل ہے کہ جس زمانہ میں موصوف قرآن مجید پر "فوائد" تحریر فرما رہے تھے تو حضرت داوٗد علیہ السّلام کے واقعہ میں جسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ الخ (پ۲۳ سورہ ص رکوع ۱۱) ترجمہ:- اور پہونچی ہے تجھکو خبر دعویٰ والوں کی جب دیوار کود کر آئے عبادت خانہ میں، جب اچانک داخل ہوئے داؤد پر تو وہ گھبرائے ان سے، بولے مت گھبرا۔

یہ قرآن مجید کے ان اہم مقامات میں ہے جس کی تفسیر وشرح میں مفسرین کا کافی اختلاف ہے مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ

"آیات متعلقہ کی تفسیر میں تمام ہی رطب ویابس کا مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت مطمئن نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسی دلنشیں توجیہ جو واقعہ کا بے تکلف پس منظر بن سکے میسّر آئی مجبور ہو کر حضرت شاہ صاحب سے اشکال اور اس کا حل چاہا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے کن کن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تفسیری کتابوں کی تفصیل بتانے پر فرمایا کہ حدیث کی فلاں کتاب اور فلاں صفحہ کا مطالعہ کیجیے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ان آیات کی تفسیر ہے۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت مجھے اسکا صحیح اندازہ ہوا کہ علّامہ کے علوم کس قدر وسیع اور کن کن نادر چیزوں پر آپ کی نظر ہے۔ یہاں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ دیوبند کے قیام

کے زمانہ میں مولانا عثمانی کو حضرت شاہ صاحب سے قرب و اخلاص کے بجائے قدرے بیگانگی تھی۔ معاصرت کی بنا پر ان کے علوم و کمالات کا واقعی اندازہ بھی نہ تھا۔ ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں ہمنشینی و یکجائی کے بعد آپ کے کمالات کا اعتراف و اقرار فرمایا اور اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ پھر مولانا عثمانی نے اپنے شایانِ شان آپ سے استفادہ کیا "فتح الملہم" میں ایک موقعہ پر شاہ صاحب کے غیر معمولی کمالات کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کے حقیقت نگار قلم سے یہ تاریخی الفاظ بھی تراوش ہوئے۔

لم تر العیون مثلہ ولم یر ھو مثلہ فی الزمان نہ آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود اپنے دور میں انھیں کوئی اپنی نظیر مل سکی۔

تمام علوم و فنون پر یکساں واقفیت کی بناء پر اہل علم آپ کی تحقیق کو آخری بات سمجھتے، مشہور محدّث میاں اصغر حسینؒ فرماتے کہ

> "جب کوئی اشکال پیش آتا ہے تو میں حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں پھر آپ کے جواب کو آخری اور قطعی تحقیقی باور کرتا ہوں اور اگر آپ کبھی جواب دینے سے انکار فرماتے ہیں تو یقین کرتا ہوں کہ کم از کم موجودہ کتابی ذخیرہ میں اس سلسلہ کی کوئی بات موجود نہ ہوگی۔"

ایک مشہور محدّث کا یہ اعتماد مرحوم کی علمی وسعتوں کا صحیح اعتراف ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ علمی وسعت اور متنوّع کمالات میں جمود و عصبیّت کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ تلامذہ کو عصری علوم خود پڑھاتے بھی رہے اور نئی تحقیقات کے مطالعہ کی جانب ہمیشہ متوجہ بھی رکھا جس زمانہ میں طنطاوی کی تفسیر "الجواہر" شائع ہو رہی تھی اس کا مطبوعہ ہر جزء فوراً حاصل کرتے اور مطالعہ فرماتے۔ ایک مجلس میں طنطاوی کی کوششوں کو سراہا لیکن ساتھ ہی تفسیر کے یابسی حصہ کی نشاندہی کرتے ہوئے مطالعہ میں استقامت کی بھی تلقین فرمائی۔[ع]

ع مولانا سیّد احمد رضا صاحب مؤلف "انوار الباری" کا بیان ہے کہ "الجواھر" میں بہت سی تفسیری مواقع پر تصاویر سے جو مدد لی گئی اور خود تصویر کے جواز و اباحت پر طنطاوی کے علاوہ مصر کے علماء نے جن دلائل کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے حضرت شاہ صاحبؒ کو سب کچھ سنانے کے بعد فوٹو کے جواز کے سلسلہ میں آپ کی رائے دریافت کی فرمایا کہ "بھائی ہمارے اکابر نے اسکو پسند نہیں کیا۔"

بلکہ مصری مؤلفین ہی کی اتباع میں مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے "ترجمان القرآن" میں ذو القرنین کا عکسی فوٹو بھی شامل کیا تو شاہ صاحب نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو فوٹو کے عدم جواز پر لکھنے کی

(باقی آگے)

مولانا حبیب الرحمان شیروانی جس زمانہ میں حیدر آباد میں صدر الصدور کے عہدہ پر تھے آپ نے انھیں نادر اور قدیم کتابوں کی طباعت کے لئے آمادہ کیا شیروانی مرحوم کی نگرانی میں جو کتابیں شائع ہوتیں انھیں وہ فوراً بھیجتے یوں بھی مولانا شیروانی کو آپ کے علوم پر ایسا اعتماد تھا کہ اکثر و بیشتر مشکلات و مسائل میں استفادہ کرتے۔ ایک بار دیوبند تشریف آوری کے موقعہ پر سورۂ والنجم کے بارے میں اپنے خصوصی اشکالات ذکر کئے شاہ صاحب نے ایک مبسوط تقریر فرمائی جو تمام اشکالات اور ان کے حل پر حاوی تھی جسے سنکر مولانا شیروانی بیحد مطمئن ہوئے، فرماتے کہ یہ تقریر و تفسیر ابتک نظر سے نہ گذری تھی بلکہ شاہ صاحب کے خصوصی تلامذہ و متعلقین کو متوجہ کیا کہ آپ کی مجالس کے حقائق و معارف کو بھی قلمبند کیا جائے۔ مگر افسوس اس اہم ضرورت کی طرف توجہ نہیں کی گئی تلامذہ صرف درسی تقریروں کے جمع و تالیف میں متوجہ رہے۔ اگر یہ ملفوظات قلمبند ہوتے تو آج نایاب تحقیقات کا ایک دفتر ہوتا بلکہ آپ کی اس مراسلت کو بھی محفوظ نہیں کیا گیا جو مشاہیر کے نام ان کے علمی سوالات کے جواب میں ہوئی۔ خود ڈاکٹر اقبال کو زمان و مکان کے دقیق مباحث کے حل میں آپ نے طویل مکتوب لکھے ہیں ان مکاتیب کو کبھی کبھی درس میں سناتے اور اقبال کی اس جودتِ طبع کی تعریف فرماتے کہ وہ ان مضامین کو بخوبی سمجھتے ہیں حال ہی میں سندھ کے ایک نامی گرامی عالم کے نام ڈاکٹر اقبال کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا ہے اسمیں مرحوم نے ایک مکتوب میں اسکا اظہار کیا ہے کہ میں نے فلسفہ زمان و مکاں پر مولانا انور شاہ سے طویل استفادہ کیا ہے مگر افسوس کہ اس علمی مراسلت کی نہ کوئی نقل ہمارے پاس اور نہ بظاہر مرحوم کے ورثار کے پاس اس مراسلت کے ضائع ہونے سے جو نقصان ہوا وہ ظاہر ہے طلب و جستجو نے آپ کو جن نایاب علمی کاوشوں تک پہونچایا اسکا اقرار مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک طویل مقالہ میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کے درس میں نہ صرف نادر علوم سے واقفیت ہوتی۔

صنا۱۲۰ کا بقیہ:- ہدایت فرمائی۔ مفتی صاحب کا یہ طویل مضمون "التصویر لاحکام التصویر" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گیا ہے۔ مولانا احمد رضا کو تصویر کے بارے میں جو آپنے جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی تحقیقات میں رطبی و یابسی دونوں حصوں پر آپ کی منصفانہ نظر تھی محض تنور کے شوق میں نہ ہر یابس کو آپ قبول کرتے اور نہ جمود و تعطل کی سمیت سے متأثر ہوکر ہر رطب کو ٹھکراتے آپ کی امالی فیض الباری میں جو بخاری شریف کی املائی تقریر ہے لباس پر گفتگو کے ذیل میں کوٹ اور پتلون کے جواز تک کا سراغ ملتا ہے خود فرماتے تھے کہ فقہار کے اقوال میں اس قول کو زیادہ پسند کرتا ہوں جو شرعی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے عصر حاضر کے رجحانات سے بھی موافقت کر سکتا ہو لیکن ان تمام وسعتوں کے باوجود ہر مرحلہ میں شریعت کے صحیح و حقیقی تقاضوں کی تکمیل کا دامن آپ سے نہیں چھوٹتا تھا۔

بلکہ کانوں میں اُن نایاب کتابوں کا نام بھی پڑتا جنکی دید وشنید سے عام علما ناواقف ہیں۔ اس ذیل میں موصوف نے کتاب سیبویہ پر ابن عصفور کے حواشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کے درس میں بکثرت ابن عصفور کے حوالے سننے میں آئے جبکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد اس کتاب کا تذکرہ کسی عالم سے نہیں سُنا۔ آپ کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ نقول اور حوالوں کے وقت بیشتر مخطوطات ونوادرات ہی کا ذکر فرماتے، فرماتے کہ عام کتابوں کے ذکر سے کیا فائدہ ان تک تو رسائی ممکن ہے غرضیکہ قدیم وجدید علوم میں آپ کی واقفیت یکساں تھیں۔ ایک مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ میں نے انگریزی بھی پڑھی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس زبان کو کلیۃً بھول گیا ہوں؏ اپنے معاصر علماء میں امتیاز یہ تھا کہ آپ کا علم محدود نہیں تھا بلکہ ایک جامع الفنون شخصیت کے مالک تھے اور ہر علم پر نہ صرف نظر بلکہ ایسی بصیرت تھی کہ اُس کی روح پر واقف اور مطلع تھے۔ استفادہ کرنے والے دانشوروں کا بیان ہے کہ آپ سے جب کبھی قدیم وجدید علوم میں کسی فن سے متعلق کچھ دریافت کیا گیا تو شافی جواب اسطرح عنایت فرماتے کہ سننے والوں کو محسوس ہوتا کہ یہی آپ کا مخصوص فن ہے اور ساری عمر اسی پُرپیچ وادی میں گذاری ہے۔ حدیث وقرآن سے شب وروز اشتغال وانہماک کے باوجود فلسفہ اور منطق کے مسائل پر کبھی گفتگو ہوتی تو نہ صرف فنون کے غوامض پر سیر حاصل بحث فرماتے بلکہ اساطین فن پر تنقید بھی ہوتی اس سے آگے ان فنون کے مسلّمات کے کھوکھلے پن پر تبصرہ ہوتا، درس میں جب کبھی مناطقہ کا ذکر آتا تو علیہم ما علیہم کے توبیخی کلمات زبان پر بے تکلف آجاتے۔ اعمال ایمان میں داخل ہیں یا ایمان سے خارج۔ اس مشہور خلافیہ میں جن لوگوں نے ترکِ عمل پر

؏ مولانا اعزاز علی صاحب سے سنا ہوا یہ لطیفہ بے اختیار یاد آگیا کہ ایک بار ہندوستان کی کسی مشہور لائبریری کی سوختگی کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمان عثمانی جو ہفتہ میں ایک بار دارالعلوم کے تمام اساتذہ کو چائے پر معمولاً مدعو کرتے۔ اس مجلس میں اس ذخیرے کی افسوسناک تباہی کا ذکر آیا حاضرین میں سے ہر فرد نے رنج وغم کا اظہار کیا ٹھیک اسی وقت مولانا عثمانی بولے کہ بھائی اگر خدانخواستہ دارالعلوم کے کتب خانہ کو آگ لگ گئی تو کم از کم مجھے کوئی پریشانی اور فکر نہ ہوگا۔ مجلس نے حیرت کے ساتھ یہ بات سنی اسکی وجہ پوچھنے پر فرمایا کہ شاہ صاحب ہمارے کتب خانہ کا مطالعہ کر چکے ہیں اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم شاہ صاحب سے لکھوالیں گے۔ یہ سنکر شاہ صاحب نے فرمایا کہ "حضرت آپ حضرات مجھے قوی الحفظ سمجھتے ہیں حالانکہ میرے حافظہ کا یہ عالم ہے کہ میں نے انگریزی پڑھی تھی لیکن اب بجز دو لفظوں کے سب بھول گیا ہوں۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ دو لفظ کونسے ہیں۔ فرمایا کہ ایک (Come) دوسرا (Finish)

ایمان سے محرومی کا مسلک اختیار کیا ہے اور اپنے عقیدے پر مناطقہ کے اس مسلمہ قانون سے کام لیا کہ جزء کے ارتفاع سے کل بھی مرتفع ہوجاتا ہے بالفاظِ دیگر عمل کو جزء ٹھہراتے ہوئے اسکے ترک سے کل یعنی ایمان کے ارتفاع کا فیصلہ کیا، مسکراتے ہوئے فرماتے کہ ان مناطقہ کو اتنی بات نہ سوجھی کہ درخت ایک کل ہے۔ شاخیں، پتے، ریشے، کونپلیں اور تنا۔ یہ سب اسکے اجزاء۔ بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پتوں کے نہ ہونے سے درخت معدوم ہوجائے گا اور اسی طرح انسان کل ہے۔ اسکے ہاتھ، پاؤں، انگلیاں، ناک، ناخن، اور بال یہ سب اجزاء ہیں کیا ان میں سے کسی ایک کا ارتفاع کل، یعنی انسان کے ارتفاع کو لازم ہے؟ فرماتے کہ مناطقہ کی ادھوری باتوں کی طرح ان کا یہ قانون بھی ناقص ہے بلاشبہ بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کا عدم کل کے معدومی کا پیش خیمہ ہے لیکن تمام ہی اجزاء کو ایک حیثیت دینا صحیح نہیں ہے ہاں اب اس پر گفتگو ہوگی کہ عمل کس قسم کا جزء ہے۔ اس تحقیق کی تفصیل نہیں کرنا بلکہ صرف اتنا بتانا تھا کہ کسی بھی فن سے متعلقہ مسلمات کو انھوں نے کسی مرعوب ذہن سے قبول نہیں کیا تھا بلکہ کھرے کھوٹے کی تمیز و صلاحیت رکھتے تھے۔ قدیم و جدید ذخیرے کے مسلسل مطالعہ کے بعد ان کا آخری مرحلہ یہ تھا کہ بعض مصنفین کی تمام ہی تالیفات دیکھنے کے بعد فرماتے کہ کوئی نئی بات ہاتھ نہیں لگی۔ فرمایا کہ

> "اگر مطالعہ میں ایک بھی بات نئی معلوم ہوتی ہے تو میں اپنی محنت و کاوش کو بارآور سمجھتا ہوں۔"

ایک مجلس میں شیخ عبدالحق محدث الدہلوی کے متعلق فرمایا کہ

> "میں نے ان کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تالیفات کا مطالعہ کیا مگر مجھے انکے یہاں صرف ایک نئی بات معلوم ہوئی۔"

آپ کا یہ ارشاد شیخ دہلوی کی کوئی تنقیص نہیں۔ شیخ کے "لمعات" اور "اشعۃ اللمعات" شروح مشکوٰۃ کی بڑی تعریف فرماتے۔ ہاں وسعتِ علم، تبحر اور جامعیت کی بنا پر اتنا کچھ پڑھ چکے اور دیکھ چکے تھے کہ نئی چیزیں بہت کم انکے ہاتھ آتیں۔ حضرت مرحوم کی یہ خصوصیت اور علوم و فنون پر کامل بصیرت مشہور ہے اس لئے اس عنوان پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

بے نظیر حافظہ:۔ ان کی دوسری ممتاز خصوصیت جسکی بنا پر اقران و معاصر علماء میں خصوصی شہرت کے مالک ہیں بے نظیر حافظہ ہے بلکہ حفظ اور یادداشت میں آپ کی شہرت ایسی ہوئی کہ بقول مولانا ادریس صاحب کاندھلوی "لفظ انور شاہ کی دلالتِ اوّلی قوتِ حافظہ پر ہے۔"

تدوینِ حدیث سے پہلے احادیث کے طول وطویل دفتر کو محفوظ رکھنے کے بارہ میں منکرینِ حدیث کی جانب سے جو مشاغبہ جاری ہے ایک اہم ترین ان کا اشکال یہ بھی ہے کہ کتابی شکل میں محفوظ ہونے سے قبل ان لاکھوں احادیث کو کس طرح محفوظ رکھا گیا، فریب کے اس تار و پود کو بکھیرنے کے لئے اہلِ تحقیق نے جو کچھ لکھا اور جتنا لکھا وہ تو خاصہ کی چیز ہے اور بجائے خود شافی وکافی. عربوں کے خداداد حافظہ کے تاریخی واقعات کے ساتھ محدثین کی حیرت انگیز یادداشت کے قصے تدوین حدیث کا شاہ کار ہیں. سیدنا الامام بخاریؒ اور ان کے بے مثل قوت حافظہ کے تذکروں کے ساتھ امام ترمذیؒ کا وہ واقعہ بھی مشہور ہے جسمیں ان کی یادداشت اور روایت حدیث کے باب میں بے پناہ احتیاط کا ثبوت ملتا ہے وہی واقعہ کہ اپنی عمر کے آخری دور میں جب امام موصوف بینائی سے محروم ہورہے تھے تو دورانِ سفر اچانک امام نے ایک جگہ سے گذرتے ہوئے سواری پر اپنے سر کو جھکا لیا جب انکو بتایا گیا کہ یہاں کوئی درخت نہیں جسمیں الجھنے کا اندیشہ ہو. امام نے رواں دواں سواری کی لگام یک لخت کھینچکر فرمایا کہ "اب اس وقت تک سواری یہاں سے آگے نہیں بڑھے گی تاوقتیکہ درخت کی موجودگی کی شہادت نہ مل جائے۔" اور یہ بھی فرمایا کہ "اگر درخت یہاں موجود نہیں تھا تو آئندہ کے لئے روایتِ حدیث ترک کر دوں گا۔" کسی سیئی الحفظ کے لئے روایتِ حدیث جائز نہیں، قریب کی بستی سے جب یہ شہادت فراہم ہوگئی کہ کچھ زمانہ پہلے یہاں واقعۃً درخت موجود تھا جسکی شاخوں سے سوار الجھتا اور اسی لئے اس درخت کو کاٹ دیا گیا تو امام نے مطمئن ہوکر سواری کو آگے بڑھایا، اللہ اکبر جس مقدس طائفہ نے راستہ کے نشانات اور چیزوں تک کو اپنے دماغ کے خزانے میں محفوظ کر لیا کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث میں وہ کسی بے احتیاطی کے مرتکب ہوں، درانحالیکہ حدیث انھیں دنیا ومافیہا سے زیادہ عزیز اور ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا لیکن اسکو کیا کہیے کہ دین کے اہم ترین جزء حدیث سے پیچھا چھڑانے کے لئے بدقسمتی سے جو جماعت مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ان وثائق کی حیثیت ان کے یہاں اساطیر الاولین سے زیادہ نہیں. لیکن ظاہر ہے کہ اُفقِ عالم پر طلوع پذیر آفتاب کے وجود سے انکار کوئی حیثیت نہیں رکھتا. بہرحال میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ شاہ صاحب کے غیر معمولی حافظہ کو دیکھکر اہل علم میں مشہور ہے کہ اگر اس آخری دور میں بے مثل یادداشت کا ایک انسان خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے تو محدثین کی حفظ و یادداشت کے واقعات ہمارے لئے ناقابلِ اعتبار رہتے گویا کہ خدائے تعالیٰ نے تیرھویں صدی میں گذشتہ صدی کے اکابرِ محدثین کی پاکیزہ زندگیوں کو قابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے اپنی کامل قدرت کا ایک نمونہ

مولانا انور شاہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا عہ عرض کرنے کو تو یہی جی چاہتا ہے کہ دین کی حفاظت وصیانت کے لئے خدائے تعالیٰ جو موقعہ بموقعہ مناسب شخصیتیں پیدا فرماتا رہتا ہے کیا عجب ہے کہ مقصود علوم کی حفاظت کے لئے بھی مناسب افراد ورجال اٹھائے جاتے ہوں اور مطلوبہ صلاحیتوں سے انھیں آراستہ کیا جاتا ہو، پس چھوٹا منہ اور بڑی بات مولانا انور شاہ کو اس تیرھویں صدی میں حدیث کی حجت کے لئے پیدا کیا گیا، آپ سے متعلق دانشوروں کے حلقہ میں یہ تأثر کہ آپ کو دیکھکر پچھلے محدثین کے حافظہ سے متعلق واقعات قابل قبول بن گئے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ ایک حقیقت ہے جو زبان خلق پر بقوت آگئی، اگرچہ یہ خصوصیات اور فضائل موہبت الٰہی ہیں لیکن خدا تعالےٰ ہی ان عطیات کی حفاظت کا سامان بھی پیدا فرماتا ہے مطلب یہ ہے کہ وہی "الشافعی الامام" کا قطعہ جسمیں اپنے استاذ وکیع سے سوء حفظ کی شکایت کرتے ہوئے کسی مناسب علاج کی درخواست کی تھی، دیدہ ور وکیع نے علم کو خدا کا نور قرار دیتے ہوئے گناہوں سے محفوظ رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے کا جو مشورہ دیا تھا یہ واقعہ ہے کہ اگر علوم کا نور ہونا سمجھ میں آجائے تو ذنوب وخطایا سے حفاظت انسان کا طبعی تقاضہ ہو شاہ صاحب نے جس تقویٰ، خشیت، انابت اور عبدیت کے ساتھ زندگی گزاری اسکے بعد خدا تعالیٰ کے اس موہبت عظمےٰ یعنی حافظہ کی حفاظت ایک حقیقت ہے خود ایک بار طلبار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

"میں جس قدر طالب علمی کے زمانہ میں اہتمامِ تقویٰ کرتا اب اتنا اہتمام نہیں ہے۔"

عمر کے جس مرحلہ میں آپ یہ خطاب فرما رہے تھے طالبعلمانہ زندگی میں طلبار کو اہتمامِ تقویٰ کے لئے مستعد کرنے کا ایک عنوان تھا ورنہ لاریب آپ اپنی پوری زندگی میں رسمی نہیں حقیقی

عہ صرف اگلوں کی بعض خصوصیات مرئی شکل میں آپ کی صورت میں نظر نہ آئیں بلکہ اپنی پاکیزہ صفات کے اعتبار سے آپ کی زندگی "سابقین الاولین" کا بھی ایک پرتو تھی، حسب روایت مولانا احمد رضا صاحب آپکی وفات کے بعد جب مولانا عطار اللہ شاہ بخاری ڈابھیل وارد ہوئے تو طلبار کے اس اصرار پر کہ حضرت شاہ صاحب سے متعلق کوئی تقریر فرمائیں، سُنا ہے کہ خصوصی اجتماع میں بخاری یہ کہکر کہ "میاں حضرت شاہ صاحب کے اوصاف اور فضائل کے بارے میں مجھ سے کیا سُننا چاہتے ہو، مختصر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ صحابہ کا معصوم کارواں چلا جا رہا تھا یہ حضرت ان میں سے پیچھے رہ گئے تھے۔" خود بھی دھاڑیں مار مار کر روئے اور اہل جلسہ کو بھی خوب رلایا، ڈھلی ڈھلائی معصومیت جس طرح آپ کے وجود میں منتقل ہوگئی تھی اس کے پیش نظر بخاری کا یہ تبصرہ بڑا جاندار اور وقیع ہے۔

تقویٰ پر پوری طرح گامزن رہے عمر کا آخری دور جب بواسیر کے موذی مرض نے آپ کے جسم سے سارا ہی خون نکال کر باہر رکھ دیا تھا اور چند در چند بیماریاں غالب تھیں تو بھی خدا تعالیٰ کا شکر ہے آپ کی یادداشت میں کوئی فتور پیدا نہیں ہوا تھا اس موقعہ پر خاتم المحدثین حضرت شاہ عبد العزیز المغفور کی وہ بات بے اختیار یاد آتی ہے جو آپ کے جامع ملفوظات نے ہمکو سنائی، کہ ایک دن موصوف سے جب پوچھا گیا کہ گوناگوں بیماریوں، آفات وحوادث کے باوجود آپ کی یادداشت وحافظہ میں کوئی فتور نہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ

"جی ہاں یہ علم حدیث کے اشتغال کی برکت ہے"۔ [عہ]

نظر سے کہیں یہ بھی گزرا ہے کہ ابن عباسؓ کے نامور شاگرد "عکرمہ" نے فرمایا تھا کہ جو لوگ قرآن کی تعلیم وتعلّم میں مشغول رہیں گے وہ انشاء اللہ کبھی سٹھیا نہیں سکتے (خرف) پس قرآن وحدیث کے ہمہ وقتی شغل کے بعد اگر مرحوم حافظہ پر اثر انداز آفات سے محفوظ رہے تو کہنا چاہیئے کہ یہ قرآن وحدیث ہی کا ایک اعجاز ہے۔ آپ کا وہ دور جو حضرت شیخ الہندؒ کی درسگاہ میں طالبعلمی کا گذرا۔ استاد کے سامنے ادب واحترام کی ایسی حسین روایات کا مرقع تھا کہ کبھی استاذ سے براہ راست سوال بھی نہیں کیا۔ درسی رفقاء کا بیان ہے کہ اگر کبھی کوئی اشکال حل طلب ہوتا تو براہِ راست پیش کرنے کے بجائے کسی طالبعلم ہی سے اسکو استاذ تک پہونچاتے۔ اسلئے اس دور میں فطری ذکاوت وذہانت اور حافظہ کی جلوہ آفرینیاں نہونی چاہئے تھیں مگر بالغ النظر استاذ کی مردم شناسی کی صلاحیت اب بھی معطل نہ رہی۔ خدا جانے کس طرح آپ نے اس تابناک مستقبل کو بھانپ لیا جو اس بے نام ونشان شاگرد میں پرورش پا رہا تھا۔ میں جہاں تک جانتا ہوں آپ کے حافظہ کے یہ بے مثال جوہر سب سے پہلے میرٹھ کے ایک مناظرے میں منظرِ عام پر آئے۔ مولانا اعزاز علی صاحب کی روایت یہ ہے کہ میں میرٹھ میں درس نظامی کے پڑھنے میں مشغول تھا کہ اچانک ایک روز شہر میں اعلان ہوا کہ فلاں غیر مقلد عالم سے (جنھوں نے اپنے مسلک کی پُر قوت ترجمانی سے اہل تقلید

عہ عصر حاضر میں اسکا چشم دید مظہر حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کا وجودِ گرامی تھا ہڈیوں اور چمڑوں کا مرکب یہ انسان سالہا سال ہوئے لحمی توانائی وفربہی سے قطعاً محروم اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جسکی رگ رگ میں علالت وناتوانی کے بھیانک اثرات پہونچ چکے تھے۔ اس ناتواں انسان سے بلند آواز میں چار چار گھنٹہ حدیث کی مفصل تقریر سننے والے اسطرح سنتے کہ اس جوش وخروش کو دیکھکر ناتوانی اور بیماری کے تمام خیالات پریشان ہوجاتیں بلاشبہ یہ حدیث کی برکت اور اس پاکیزہ علم کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

کے قلوب لرزا دیئے تھے) مناظرہ کرنے کے لئے مولانا انور شاہ دہلی سے آرہے ہیں۔ میرٹھ کے پرانے اہل علم جو ابتک شاہ صاحب کے نام ونشان سے ناواقف تھے یہ اعلان سنکر سراسیمہ ہو گئے، اندیشہ تھا کہ ایک منجھے منجھائے مناظر کے مقابلہ میں غیر معروف شخصیت کا چلا آنا احناف کی عبرت انگیز رسوائی کا موجب نہو۔ جمعہ کے بعد متعین مسجد میں طلبار، علمار، اور عوام کا بے پناہ ہجوم اس فیصلہ کن مناظرہ کو دیکھنے کے لئے دور دور سے سمٹ آیا۔ اچانک ایک جانب سے چند آدمیوں کے ساتھ ایک نوجوان آتا ہوا دکھائی دیا معلوم ہوا کہ یہی مولانا انور شاہ ہیں جو مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس ہیں بوڑھے، تجربہ کار، کہن سال، سرد، گرم، چشیدہ مناظر کے مقابلہ میں اس نوجوان کو دیکھ کر دل دہل گئے۔ مناظرہ شروع ہوا تو مولانا انور شاہ نے حریف کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

"آپ المحدیث ہیں اور حافظ حدیث ہونے کے دعویدار، اگر یہ سچ ہے تو بخاری شریف کے کچھ صفحات آپ مجھکو سنا دیجئے۔"

مناظر عالم نے لوٹ کر کہا کہ "آپ ہی کچھ صفحات سنائیں"

مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے کہ اس نوجوان نے کھڑے کھڑے "باب کیف کان بدأ الوحی علے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" سے بسم اللہ پڑھکر جو ابتدا کی تو بخاری شریف کے پچیس تیس صفحے مسلسل پڑھنے کے بعد سراپا حیرت مجمع میں حریف سے یہ پوچھنے لگے کہ جو کچھ پڑھ چکا ہوں کافی ہے یا اور پڑھوں۔ حریف کی تلاش کی تو نہ جانے وہ کدھر سے نکل چکے تھے، میرٹھ سے نکل کر اس مناظرہ کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی اور یہ پہلا دن تھا کہ شاہ صاحب کے بے نظیر حافظہ پر لوگوں کو اطلاع ہوئی، پھر قوت حافظہ کی یہی شہرت علمی حلقوں سے نکلکر عوام وخواص تک پہونچ چکی ہے۔

ضخیم اور کئی کئی جلدوں میں پھیلی ہوئی کتابوں کا ایک بار مطالعہ کر لینا آپ کے لئے کافی ہوتا اور پھر جب چاہتے دماغ میں محفوظ اس ذخیرے سے کام لیتے، مولانا حبیب الرحمان عثمانی نے آپ کے حافظہ کے بارے میں کتنی سچی بات کہی تھی کہ

"شاہ صاحب کا دماغ تو ایک کتب خانہ ہے جس علم کی جس وقت کوئی کتاب اپنے دماغ کے کتب خانہ سے اٹھانا چاہتے ہیں بے تکلف اٹھا لیتے ہیں۔"

مولانا یوسف بنوری جو اپنی خصوصیات علمی میں ہند اور پاکستان کے علمی حلقوں میں مرحوم کے اس وقت صحیح جانشین ہیں انھوں نے اپنی اس سوانح میں جو حضرت شاہ صاحب سے

متعلق عربی زبان میں لکھی ہے۔ایک موقعہ پر رقمطراز ہیں کہ

"شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں "فتح القدیر" کا مطالعہ فرمایا اور پھر ۱۳۴۷ھ میں درس بخاری شریف میں تحدیث نعمت کے طور پر طلباء کے سامنے فرمایا کہ چھبیس (۲۶) سال ہوگئے "فتح القدیر" کا مطالعہ کیا تھا اسکے بعد مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آئی جو کچھ بیان کروں گا اگر مراجعت کروگے تو تفاوت کم پاؤ گے۔"

مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ جو آپ کے خواجہ تاش اور معاصر علماء میں سے تھے آخر عمر میں جب آپ مسلسل بیماریوں کے حملے سے نیم جان ہو رہے تھے ایک روز ان سے فرمایا کہ اس وقت بھی میرا یہ حال ہے کہ

"جس کتاب کا سرسری طور پر بھی مطالعہ کرلیتا ہوں پندرہ (۱۵) سال تک بقید صفحات اسکے مضامین محفوظ رہ جاتے ہیں۔"

اس غیر معمولی یادداشت کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی شخص آپ کو کسی وقت کسی کتاب کے حوالہ یا کسی مضمون کی نقل میں دھوکہ نہیں دے سکتا تھا چنانچہ بھاولپور کا مشہور مقدمہ جسمیں قادیانیت کے خلاف کئی روز آپ نے مسلسل بیان دیا۔ایک روز اس مفصل تقریر پہ جو آپ نے ختم نبوت کو ثابت کرنے کے لئے تواتر سے متعلق فرمائی جس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا دین متواتر ہے اور تواتر کا انکار کرنے والا مرتد و کافر ہے۔اس ذیل میں اپنی اجتہادی تحقیق تواتر کی چہارگانہ تقسیم، انکی تعریف اور مثالوں سے تشریح و تفصیل کی۔جلال الدین شمس قادیانی نے آپ کو مخاطب فرما کر کہا کہ آپ تواتر کے منکر کو کافر کہتے ہیں حالانکہ "بحر العلوم" نے "فواتح الرحموت" شرح مسلم الثبوت میں امام فخر رازی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تواتر معنوی کے منکر ہیں۔اس پر شاہ صاحب نے جج سے فرمایا "آپ ان سے یہ کتاب اور حوالہ طلب کیجئے میرے پاس اس وقت یہ کتاب موجود نہیں"۔

جلال الدین شمس کتاب ہاتھ میں لے کر ورق گردانی کرنے لگا تو آپ پُرجوش انداز میں کھڑے ہوگئے اور کتاب اسکے ہاتھ سے چھین لی اور جج سے فرمایا کہ

"یہ صاحب ہمیں دھوکہ دینا چاہتے ہیں لیکن میں طالب علم ہوں دو چار کتابیں دیکھی ہیں ان سے مُفحم (خاموش) نہیں ہوں گا۔تینتیس (۳۳) سال ہوئے میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔بحر العلوم نے یہ نہیں لکھا کہ "رازی" تواتر معنوی کا انکار

دارالعلوم دیوبند میں حضرت امام العصرؒ کا رہائشی کمرہ

کرتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ امام رازی حدیث "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" کے متواتر معنوی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔"عہ

یہ کہتے ہوئے آپ نے "فواتح الرحموت" کی عبارت بھی سنائی۔ جلال الدین شمس اپنی اس صریح غلط بیانی پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے جس زمانہ میں ہندوستان میں "امیرِ شریعت" کے انتخاب کا مسئلہ شباب پر تھا تو حسبِ دستور مخالف اور موافق علماءِ اسلام کی تصریحات و بیانات کو اپنے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہے تھے علماءِ دیوبند کا اس مسئلہ میں ایک خاص نظریہ تھا اور بہت آشکارا، ٹھیک اس زمانہ میں گورکھپور کے ایک عالم مولانا سبحان اللہ خاں صاحب ایک تحریر لیکر دیوبند آئے اسمیں ائمہ احناف میں سے ایک مسلمہ شخصیت کا ایک ایسا قول بھی استدلال میں پیش کیا گیا تھا جس سے اکابرِ دیوبند کے نظریات کی تغلیط ہوتی، مولوی سبحان اللہ خان نے یہ تحریر مولانا حبیب الرحمان عثمانی کے سامنے پیش کی موصوف نے اسی وقت اکابرِ دار العلوم کو اپنی خصوصی نشست گاہ پر جمع فرمایا، مشکل یہ تھی کہ نقل کردہ عبارت کو اگر قبول کیا جائے تو وہ اکابر کے نظریہ کے خلاف تھی، تردید کی صورت میں ایک مسلمہ امام کی تحقیق کا انکار ہوتا۔ اسی حیص و بیص میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام اکابر شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچیں، آپ کے رہائشی کمرہ پر جو دار العلوم کے احاطہ میں تھا تمام اساتذہ اور مولانا حبیب الرحمان تشریف لائے، آپ اس وقت قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے تھے واپسی پر یہ تحریر اور اپنی اُلجھن کا ذکر کیا۔ آپ نے تحریر کو لیا اور ایک نظر ڈال کر فرمایا کہ "حوالے کے نقل میں جعل و تصرف کیا گیا ہے فلاں کتاب سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے اور یہ کل تین سطریں ہیں، درمیان سے ایک سطر حذف کر دی گئی۔"

عہ اہل اللہ اپنے کشف و کرامات کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے خصوصاً جس سلوک و تصوف کی عرفانی کیفیات اکابرِ دیوبند کے حصہ میں آئیں انمیں تو اخفاء ایک لازمہ بن گیا۔ بہت سے اکابر جو معرفت حق کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز تھے اپنی دوسری خصوصیات میں مشہور ہوئے اور انکی زندگی کا عرفانی پہلو عام نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہا۔ کہنا یہ ہے کہ شاہ صاحب تصوف و سلوک کی کائنات کے ایک ممتاز فرد تھے۔ جسکی تفصیلات انشاء اللہ نظرِ قارئین کی جائینگی، مگر آپ کی علمی شہرت ان تمام خصوصیات کیلئے پردہ بن گئی۔ مولانا محمد انوری لائلپوری کی روایت ہے کہ اسی روز عدالت کے احاطہ میں حضرت شاہ صاحب نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ "جلال اب بھی ایمان لے آ" اگر چاہتا ہے تو فلاں کو اسی وقت جہنم میں دیکھ سکتا ہے "جلال سناٹے میں آگیا" لیکن وائے محرومی کہ پھر بھی نورِ ایمان سے محروم رہا۔

نشاندادہ کتاب منگائی گئی اور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ فی الواقع عبارت میں تصرّف سے کام لیا گیا تھا جیسے ہی ساقط کردہ سطر کو سامنے لایا گیا تو یہ تحقیق اکابرِ دیوبند کے نظریات کے قطعاً مطابق تھی۔ خدا جانے کسطرح مولوی سبحان اللہ خاں کو اسکا علم ہوگیا اور وہ پُراسرار طریقہ سے دیوبند سے نکل گئے۔ حدیث و قرآن جو آپکے خصوصی علوم و فنون تھے۔ انکے علاوہ باقی فنون میں بھی وسیع النظری اور یادداشت کا یہی عالم تھا فتاویٰ میں باوجودیکہ آپ نے خود فرمایا کہ "میں بارہ سال کی عمر میں اپنے وطن کشمیر میں فتویٰ دینے لگا تھا تاہم فتویٰ دینے سے آپ احتیاط کی بنا پر گریز فرماتے۔ دفتری نورالحق جو مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم کے نواسہ اور آپ کی مجلس کے خصوصی باریاب تھے ان سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ میرٹھ سے کوئی صاحب واسکٹ لیکر دیوبند پہونچے جسکے ریشمی ہوتے نہ ہونے میں اختلاف تھا وہ سیدھے آپ کی خدمت میں آئے اور آپ کے سامنے پیش کرکے فتویٰ طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی مولانا مفتی عزیز الرحمان کے پاس لیجاؤ یہ مشغلہ میرا نہیں ہے اسلئے میں احتیاطاً اسمیں دخل نہیں دیتا، مگر اسکے باوجود ضرورت سے کسی فتویٰ پر کچھ تحریر فرمادیتے۔ آپ کے سوانح نگار مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کشمیر کے سفر میں ڈو فریق جو کسی مسئلہ میں اُلجھ رہے تھے اور دونوں نے اختلافی مسئلہ میں فتویٰ ترتیب دے کر بعض کتابوں سے تائیدی عبارتیں بھی نقل کی تھیں ان میں سے ایک جماعت نے "فتاویٰ عمادیہ" نامی قلمی کتاب کا حوالہ دیکر اپنے بیان کو مدلل کیا جب یہ فتویٰ آپکے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ

> "میں نے دارالعلوم کے کتب خانہ میں "فتاوی عمادیہ" کے غیر مطبوعہ نسخہ کا مکمل مطالعہ کیا ہے اسمیں یہ عبارت قطعاً نہیں یہ تدلیس و کھلی تحریف ہے"۔

اس گرفت پر اہل علم کی یہ جماعت متحیر ہو کر رہ گئی۔ کون سی چیز یا کوئی خاص تحقیق کس کتاب میں موجود ہے یہ آپ کو ہر وقت مستحضر رہتا۔ اس میں آپ ایک ایسی خصوصیت کے مالک تھے جسکی نظیر مشکل ہے۔ مولانا منظور نعمانی [ع] کا بیان ہے کہ مجھے ایک بار کسی ضرورت کے تحت یہ معلوم کرنا تھا کہ

ع مولانا منظور نعمانی:۔ ذہین و فطین، ذکی و مستعد، مبلغ، مناظر، "الفرقان" کے رئیس التحریر، علامہ کشمیری کے تلمیذ رشید، وطن سنبھل ضلع مراد آباد، امروہہ میں مدرّسی کی، ایک زمانہ میں بریلویوں کا تعاقب کامیاب کیا، بلکہ یہ ہمت مردانہ کہ "بریلی" سے جاکر "الفرقان" نکال ڈالا، طبیعت بڑی سیمابی، ساٹھ سال عمر کے کہاں کہاں اور یہ کس کس طرح گذرے۔ یہ ایک طویل اور عبرت انگیز داستان ہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور سادہ نگار

(باقی آگے)

قرآن حکیم میں سرقہ سے متعلق آیات کون سے "سن" میں نازل ہوئیں پہلے میں نے اپنی دسترس کے مطابق تفسیر کا کافی ذخیرہ چھان ڈالا۔ اور جب مفید مطلب چیز نہیں ملی تو حضرت سے دریافت کیا آپ نے معاً فرمایا کہ درمنثور کا فلاں موقعہ دیکھ لو۔ سیوطی نے ان آیات کا سن نزول بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ تلاش کے بعد نشاندادہ مقام پر مطلوبہ تحقیق حاصل ہوگئی، تاریخ سے آپکو ایسی گہری واقفیت تھی کہ اس فن کی بھی تمام تفصیلات مستحضر رہتیں، اسماء الرجال بلکہ دوسرے مصنفین کے بھی تذکرے اور ان کی سوانح محفوظ تھیں۔ مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے جس زمانہ میں وہ فقہ کی بعض درسی کتابوں پر حاشیہ تحریر کر رہے تھے "کاکی" کے بعض اقوال نظر سے گذرے، سیر وسوانح کی کتابیں "کاکی" کے تذکرے سے خاموش تھیں مولانا نے شاہ صاحب سے دریافت کیا تو آپ نے برجستہ "کاکی" کے حالات وسوانح تفصیل سے بیان فرمائے۔ اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کا ہے جس زمانہ میں وہ مشاہیر کا تذکرہ ترتیب دے رہے تھے تو ابوالحسن کذّاب اور اسکی کذب بیانیوں کے واقعات معلوم کرنا تھے۔ شاہ صاحب سے ان کے مرض الوفات میں دریافت فرمایا تو آپ نے ابوالحسن کذّاب کا مفصل تذکرہ بقید سنین بیان کر ڈالا اور فرمایا کہ چالیس سال پہلے ابوالحسن سے متعلق ایک کتاب مطالعہ سے گذری تھی اس وقت آپکے سوال پر وہی محفوظ چیزیں ذکر کرتا ہوں۔ ایک خاص عادت یہ بھی تھی کہ درس میں جن کتابوں کا تذکرہ آتا مصنفین کے اسماء وحالات تفصیل سے ذکر کرتے اس سے طلباء کو معلومات کا بیش بہا خزانہ حاصل ہوتا۔ غرضیکہ سیر وسوانح اور تاریخ سے متعلق بھی آپ کا مطالعہ عمیق اور ژرف نگاہی پر مبنی تھا۔ یہی نہیں بلکہ آپکو یہ بھی محفوظ رہتا کہ کس سال درس میں کیا چیز بیان کی گئی تھی۔ مولانا نعمانی ہی کے ایک واقعہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں وہ امروہہ میں تدریس کا کام کر رہے تھے ترمذی کی ایک عبارت پر ایک اشکال پیش آیا، شروح وحواشی میں اس الجھن کا کوئی جواب نہ تھا اور نہ حدیث کی دوسری کتابوں میں کوئی چیز مل سکی۔ دیوبند حاضری کے موقعہ پر میں نے شاہ صاحب سے ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا کہ

"مولوی صاحب آپ کو یاد نہیں رہا جس سال آپ دورہ میں تھے میں نے

صفحہ ۱۳۰ کا بقیہ:۔ انشاء پرداز ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ سے مجاز، دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور رابطۂ عالمِ اسلامی کے بھی ممتاز اراکین میں شریک ہیں، تقریر دلچسپ، گفتگو مؤثر، منطقی استدلال، معقول پیرایۂ بیان، مخاطب کو بہت تیزی سے متأثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اب "لکھنؤ" میں سالہا سال سے مقیم ہیں اور تصنیفی وتالیفی مشغلہ ہے۔

درس میں تمام طلباء کو توجہ دلائی تھی کہ ترمذی میں یہاں یہ عبارت غلط چھپ گئی ہے صحیح عبارت یہ ہے۔"

جیسے ہی آپ نے وہ صحیح عبارت ذکر فرمائی اشکال ختم ہوگیا۔ واقعہ کا حاصل یہی نکلا کہ اگر کسی وقت آپ کوئی خاص تحقیق بیان فرماتے تو نہ صرف وہ تحقیق بلکہ اسکے بیان کرنے کی تاریخ و سن بھی آپ کو محفوظ رہتا، اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر المدرسین مولانا ابراہیم صاحب کا ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ مولانا کی معقولات میں مسلمہ شخصیت تھی۔ آپ خیرآباد کی مشہور معقول درسگاہ کے ممتاز فرد تھے۔ کہتے تھے کہ دارالعلوم کے کتب خانہ میں قلمی ذخیرہ میں منطق کی ایک اہم اور نایاب کتاب ملنے پر میں نے اس کا مطالعہ کیا ایک جگہ پر مجھے اشکال پیش آیا بڑی کدو کاوش کے باوجود حل کرنے سے عاجز رہا۔ مجبور ہو کر شاہ صاحب سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ

"عبارت غلط لکھی گئی ہے ریاست ٹونک کے کتبخانہ کے مخطوطات میں میں نے مطالعہ کیا تھا۔ صحیح عبارت یہ ہے۔"

صحیح عبارت کے سامنے آتے ہی سارا خلجان دور ہوگیا، دینیات کے مسلسل انہماک و شغل کے باوجود یہ محض حافظہ کی کرشمہ کاری تھی کہ منطق جیسے فن کی بھی جو چیز ایک بار آپ کی نظر سے گذر گئی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کے دماغ کے خزانہ میں محفوظ ہوگئی۔

شعر و شاعری سے آپ کو طبعی مناسبت تھی۔ درس میں بعض اوقات نامانوس و غریب الفاظ کی تحقیق اور قدیم شعراء کے یہاں ان کے استعمال کا ثبوت یا کسی اور مناسبت سے جب آپ پر انشاد یا شعر خوانی کا جذبہ طاری ہوتا تو ایک ہی مجلس میں پچاسوں اشعار بے تکلف سنا دیتے، مولانا مناظر احسن گیلانی جو آپ کے نامور تلمیذ ہیں اور آپ کے درس کے اس انداز سے پوری طرح باخبر۔ ان کا محتاط اندازہ ہے کہ شاہ صاحب کو جو اشعار محفوظ تھے ان کی تعداد ہزاروں سے کم نہ ہوگی، غیر معمولی قوتِ حافظہ کا یہ بھی کرشمہ تھا کہ درس میں جب کسی مضمون کے حوالہ کی ضرورت پیش آتی تو متعلقہ کتاب کو ہاتھ میں تھامتے اور حسبنا اللہ پڑھتے ہوئے کتاب کھولی جاتی تو انگلی اسی عبارت پر پڑتی جس کا حوالہ پیش کرنا مقصود ہوتا اسطرح خدا تعالیٰ نے حفاظتِ حدیث کے اس قدیم دستور کی ایک تصویر جو احادیث کے محفوظ رکھنے کے لئے تدبیر کے طور پر اختیار کی گئی تھی مرحوم کی شکل صورت میں پچھلوں کو دکھا دی تا کہ خیر القرون کی وہ نادرہ کار شخصیتیں جنکے منور سینے اس پاکیزہ

سرمایہ کے امین تھے۔ انکے حیرت انگیز حافظہ کی مولانا انورشاہ کو دیکھ کر تصدیق کی جاسکے۔ اور ایک لطیف و حکیم ہستی نے اس سرمایہ کی صیانت کے لئے جو لطیف تدبیر اختیار کی پچھلوں کو اس پر اطمینان ہو۔ عہ

وسعتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ:۔ مرحوم کی ایک عادت یہ تھی کہ جس فن کی کتاب ہاتھ لگ جاتی اسکا پورا مطالعہ کئے بغیر نہ چھوڑتے اگرچہ آپ کا خصوصی ذوق و رجحان دینیات کی طرف تھا لیکن مطالعہ کے شغف اور انہماک کی وجہ سے ہر فن کی کتاب نظر سے گذری تھی، ایک زمانہ میں اردو مطالعہ سے مکمل اجتناب فرمایا، خیال یہ تھا کہ اردو کی کتابوں میں کوئی علمی چیز نہیں ہوتی، درس میں بھی عموماً ان خیالات کا اظہار کرتے۔ اسی لئے عام طلباء بھی اردو میں مطالعہ کرنے سے بیزار رہتے خود فرمایا کہ

"میں نے اپنے علمی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے خط و کتابت کی زبان بھی فارسی ہی رکھی۔"

لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اردو سے آپ کی یہ بدگمانی ختم ہوگئی جسکی تفصیل مولوی محمد احمد صاحب برادر نسبتی مولانا حسین احمد صاحب سے جو ایک زمانہ میں آپکی خدمت کی سعادت سے سرفراز رہے سُننے میں آئی کسی ضرورت سے آپ ان کے کمرہ پر تشریف لے گئے تو وہاں مولانا تھانوی کی تفسیر "بیان القرآن" کے کچھ اجزاء دیکھے اسی وقت تفسیر کا مطالعہ فرمایا اور ظہر سے تا عصر اُن اجزاء کو دیکھ ڈالا، اگلے دن درس میں فرمایا کہ "میں ابتک اردو سے بہت بدگمان اور اس زبان میں مطالعہ

عہ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے اور قرآن مجید کا ایک اعجاز کہ اس غیر معمولی حافظہ کے باوجود جبکہ آپ کو عام کتابوں کے صفحات کے صفحات ازبر تھے اور ہزارہا ہزار احادیث آپ کی یادداشت کی خزانہ میں ہمہ وقت مستحضر لیکن قرآن مجید سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کے باوجود اسے آپ حفظ نہ کرسکے، حالانکہ آپ کے معاصر علماء میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فراغت کے بعد مختصر مدت ہی میں حفظ کرلیا تھا۔ ایک بار درس میں خود ہی فرمایا کہ

"میں جب قرآن مجید کھول کر بیٹھتا ہوں تو اسکے علوم و معارف کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہوں حد تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آخری دن جب یہ محسوس کرتا ہوں کہ نزولِ قرآن کے اس مقدس مہینہ میں ایک قرآن حکیم ختم کرنے کی سعادت سے بھی محرومی ہورہی ہے تو فکر و تدبر کے اپنے خاص طریقہ کو چھوڑ کر جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

بے پناہ قوی الحفظ ہونے کے باوجود قرآن کریم کا حافظ نہ ہونا اسے لطیفہ غیبی کے سوا اور کیا کہیے۔

کرنے سے پرہیز کرتا تھا لیکن مولانا تھانوی کی تفسیر کے دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی اور معلوم ہوا کہ اردو میں بھی علمی سرمایہ موجود ہے اتنی چست تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی۔ع۵ غرضیکہ آپ ہمہ وقت مطالعہ ہی میں مشغول رہتے۔ طبعیات، الہیات، سلوک وتصوف، نجوم، رمل، جفر، قیافہ، علم ہندسہ، ریاضی، ریاضی کی باقی شاخیں، علم مناظرہ، علم بلاغت، علوم عربیہ اور دینیات، حد تو یہ ہے کہ ذوقِ علمی نے آپ کو عبرانی زبان پر بھی توجہ دلائی تھی۔ کھوٹہ ضلع جموں میں ایک مرتبہ ایک عیسائی پادری سے گفتگو کے دوران ان کی مذہبی کتابوں کا جس سرعت کے ساتھ آپ نے حوالہ دیا پادری اس پر حیران رہ گیا، علوم عربیہ میں کتاب سیبویہ جو نحو کی ایک اہم کتاب ہے فرماتے تھے کہ میں نے اس کتاب کا کئی بار مطالعہ کیا اور اس کی بعض نادر شرحیں بھی نظر سے گذریں، یہ بھی فرمایا کہ علوم عربیہ میں اس سے زیادہ دشوار کتاب کوئی نہیں۔ فلسفہ میں ابو سینار کی "شفا" "نجات" "تعلیقات" "اشارات" کا مطالعہ فرمایا۔ "اشارات" کی شرح جو امام رازی و حکیم طوسی نے لکھی ہیں، آپ کے مطالعہ سے گذری تھیں "حاکم" کی شرح بھی زیر نظر رہی۔ باقر داماد کی "قبسات" "افق المبین" کا بھی مطالعہ کیا۔ صدر شیرازی کی "اسفار اربعہ" مطالعہ میں تھی اور صدر شیرازی کی فلسفہ و تصوف میں مہارت کو تسلیم فرماتے تھے۔ بستانی و فرید وجدی کی "دائرۃ المعارف" پوری طرح محفوظ تھی۔ سائنس جدید کی کتابیں جو اس وقت انگریزی و فرانسیسی سے عربی میں منتقل ہو رہی تھیں ان کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے فرماتے اور طلبار کو بھی ترغیب دیتے۔ حافظ ابن تیمیہ و ابن قیم کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تالیفات مستحضر تھیں۔ ابن تیمیہ کی جلالت علمی کو تسلیم کرنے کے باوجود بعض انکی خامیاں نظر میں رکھتے اور فرماتے کہ

> "معقولات میں حافظ کے یہاں اگرچہ نقول کی کثرت ہے مگر خود حاذق نہیں ان کی عربیت پر بھی چنداں بھروسہ نہیں تھا حافظ کے تشدد اور سیف زبانی پر یہ جملہ آپ کی زبان پر آتا"
>
> "اپنی گنتے ہیں دوسرے کی سنتے نہیں"

حافظ ابن حجر عسقلانی کی تمام تصانیف نظر میں تھیں اور ان کی "فتح الباری" شرح بخاری

ع۵ مولانا تھانوی مرحوم کے جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے جب یہ کلمات حضرت تھانوی کو معلوم ہوئے تو آپ بیحد مسرور ہوئے اور فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب ایسے زبردست عالم کی تعریف کے بعد مجھے کسی تعریف و ستائش کا انتظار باقی نہیں رہا۔

کے تو بڑے مداح تھے۔ اسرار و حکم کے موضوع پر شیخ محی الدین بن عربی کے معترف تھے، درس میں تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے کہ

"اسرار و حکم کے موضوع پر میں خود سب سے زیادہ واقفیت و آگہی رکھتا ہوں بجز شیخ اکبر کے کہ وہ اسمیں اپنی نظیر نہیں رکھتے"۔

شیخ کی فتوحات مکیہ کا بار بار مطالعہ فرمایا تھا، شیخ کے بعض تفردات پر ان کے بعض ہوا خواہوں نے جو الحاق کا شوشہ چھوڑا ہے۔ درس میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے تبسمانہ انداز میں فرماتے کہ

"شیخ کی تصانیف کے مسلسل مطالعہ کے بعد میں انکے ذوق و اسلوب پر مطلع ہو گیا ہوں اسلئے اعلان کرتا ہوں ـــــ شیخ کے تفردات ان کی اپنی چیزیں ہیں یہ الحاق نہیں"۔

اور رہا حدیث و فقہ، تفسیر بلکہ تمام دینیات پر تو آپ کی نظر کی وسعتیں تسلیم ہی ہیں خود ایک مرتبہ درس میں فرمایا کہ

"میں نے بخاری شریف کا مکمل مطالعہ بارہ دفعہ کیا ہے"۔

یہ مطالعہ اس سے علیحدہ ہے جو شروح و حواشی کے ذیل میں کیا گیا۔ حدیث کے موضوع پر مطبوعات کے علاوہ نوادر بھی مطالعہ میں تھے مطالعہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ فرماتے چنانچہ ابن ہمام کی شرح "فتح القدیر" جو آٹھ جلدوں اور ہزار ہا صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اسکا مطالعہ کل بیس ۲۰ روز میں آپنے فرمایا اور چھبیس ۲۶ سال کے بعد آپنے فرمایا کہ

"ایک بار مطالعہ کے بعد پھر مطالعہ کی ضرورت پیش نہیں آئی"۔

جس زمانہ میں اس طویل کتاب کا مطالعہ فرمارہے تھے اسکی تلخیص بھی ساتھ ساتھ جاری تھی، اسی طرح "مسند امام احمد بن حنبل" کا دو سو ۲۰۰ صفحہ روزانہ کے اوسط سے مطالعہ کیا اور اس بصیرت و غور و فکر کے ساتھ کہ اس طویل و ضخیم مجموعہ احادیث سے احناف کے دلائل منتخب کرتے چلے گئے، گویا کہ بے پناہ قوتِ حافظہ کے ساتھ سرعت مطالعہ کی خصوصیت بھی رکھتے اس طرح آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مطالعہ اور پھر علم کی اشاعت میں گذر گیا۔

وحشتِ سفر:- مرحوم علم و کمال کے ایک جویا، فضل و دانش کے طالب اور تحقیقات و علمی کاوش کے واقعی حریص تھے۔ اس طرز کے لوگوں کے لئے عزلت پسندی و گوشہ گیری لازمۂ فطرت بھی ہے اور علمی پرواز کیلئے ایک ضروری چیز بھی۔ عہدِ طفولیت میں طلب علم کیلئے خاکِ وطن

کو چھوڑا۔ ہزارہ و پنجاب کی راہوں سے دیوبند منزلِ مقصود تھی اس علمی رحلت کے بعد زیارتِ حرمین زادہما اللہ شرفاً کی کشش حجاز بھی لے پہونچی۔ یہ سفر بھی آپ کی ایک علمی رحلت تھی۔ حرمین شریفین کا سفر غالباً دو بار ہوا ہے اگرچہ مولانا یوسف بنوری نے "نفحۃ العنبر" میں ایک ہی مرتبہ سفر کا تذکرہ فرمایا۔ حجاز سے مصر، طرابلس، شام اور ترکی کا سفر مشکوک ہے نہ خود مرحوم نے اس سفر کے بارے میں کچھ لکھا اور نہ کوئی ابتک معتبر سراغ مل سکا، البتہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے اپنے مقالہ متعلقہ ممدوح میں مصر کے سفر کا تذکرہ اس تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

"جس شب میں حضرت کی وفات پیش آئی اسی کی شام میں بعد عصر عیادت کے لئے دولتکدہ پر حاضر ہوا۔ اس وقت میں مشاہیرِ عالم پر اپنی تصنیف مرتب کر رہا تھا اور ابوالحسن کذاب سے متعلق حالات کا تجسس پیشِ نظر تھا اسکا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ممدوح کی یہ رات اس عالمِ آب و گل کی آخری رات ہے جیساکہ مستفیدین کا دستور تھا کہ ان کا آخری ماخذ و مرجع حضرت ہی کی ذاتِ گرامی تھی میں نے ابوالحسن کذّاب کے متعلق سوال کیا تو آپنے کچھ کتابوں کے نام لئے کہ "مولوی صاحب ان کتب کی طرف مراجعت کیجئے ابوالحسن کے حالات آپکو مل جائیں گے، میں نے عرض کیا کہ حضرت ان متعدد کتابوں کا میں مطالعہ کیسے کرسکتا ہوں آپ ہی کچھ مختصر حالات اور اسکی صفتِ کذب بیانی کے کچھ واقعات ارشاد فرمائیں جنھیں میں آپ ہی کے حوالہ سے درجِ کتاب کروں گا۔ فرمایا مولوی صاحب آپنے بھی کمال کر دیا۔ صفت کذب کون سی ایسی مستحسن صفت ہے جسکا مصنفین و مؤرخین تذکرہ کریں۔ یہ ارشاد فرماکر ابوالحسن کذاب کے حالات، تاریخ ولادت، اہم حوادث سیر و سوانح، اسکی کذب بیانیاں بلکہ موت کے وقت بھی کذب بیانی کا دلچسپ قصہ بقید سنین اس تفصیل سے سنایا کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید حضرت نے قریبی مدت میں اس کذاب کا کوئی مفصل تذکرہ مطالعہ فرمایا ہے چنانچہ میں نے استعجاباً دریافت کیا کہ کیا حضرتؒ نے ماضی قریب ہی میں ابوالحسن سے متعلق کوئی کتاب مطالعہ فرمائی ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں مولوی صاحب چالیس سال قبل جب میں مصر گیا تھا تو خدیو مصر کے کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے گیا اتفاقاً ابوالحسن کا تذکرہ نظر سے گذرا۔ اس وقت آپ کے

سوال پر وہی مطالعہ مستحضر ہوگیا۔" (ملخصاً تجیات انور)

اس روایت سے جو خود مرحوم کے حوالہ سے درج ہوئی آپ کا سفر مصر ثابت ہے لیکن عام درسگاہوں میں انکی قوتِ حفظ کے ثبوت کے لئے جو یہ داستان شہرت پذیر ہے کہ آپنے مصر میں "نور الایضاح" کا مطالعہ کیا اور پھر اسے ہندوستان آکر محفوظ کیا صحیح نہیں، اسلئے کہ نور الایضاح زمانۂ دراز سے درس نظامی میں شریک ہے بلکہ ہندوستان بہت پہلے سے اسکی شرح "مراقی الفلاح" اور "طحطاوی" سے واقف تھا۔ خاکسار نے ایک موقعہ پر آپ کے مشہور شاگرد مولانا محمد انوری لائلپوری سے اسی روایت کی صحت کے بارے میں استفسار کیا تھا تو انھوں نے تصویب کی لیکن متجسس طبیعت نے درس نظامی کا جائزہ قدیم ادوار سے لیا تو "نور الایضاح" عہدِ قدیم سے داخل نصاب پائی اس لئے راقم الحروف کے علم و تحقیق میں یہ درسگاہی داستان صحیح نہیں ـــــ دوسرا بڑا سفر ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں اہلِ برما کی دعوت پر ہوا۔ اس سفر میں آپ کے رفقاء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا احمد بزرگ صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، مولانا یحییٰ صاحب[عہ] کاندھلوی مولانا ادریس صاحب[عہ]

عہ مولانا محمد یحییٰ صاحب:۔ کاندھلہ کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جسکے نامی گرامی افراد میں رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور ہیں موصوف دیوبند آئے اور علامہ عثمانی کے خادمِ خاص بن گئے مولانا عثمانی لاولد تھے برادر خورد بابو فضل الرحمان سابق پوسٹ ماسٹر کی ایک لڑکی مولانا عثمانی کی منہ بولی بیٹی تھیں جنکی پرورش بھی موصوف ہی نے کی تھی ان صاحبزادی کا نکاح مولانا یحییٰ صاحب سے کیا گیا اس رشتہ سے یہ علامہ کے داماد بھی ہوگئے۔ حضرت علامہ کشمیری کے تلامذہ میں ہیں دار العلوم دیوبند میں مدرس رہے ہدایہ اولین وغیرہ پڑھاتے اور تدریس میں مقبولیت پیدا کی تھی، علامہ عثمانی ڈابھیل پہونچے تو یہ بھی انکے ہمراہ تھے سنا ہے کہ اب کراچی میں کسی کالج میں دینیات کے پروفیسر ہیں دیوبند میں رہتے ہوئے انکے یہاں ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا جسکا نام مولانا عثمانی نے "یعیش" تجویز فرمایا تھا اب خدا جانے کتنی اولادیں ہیں۔

عہ مولانا محمد ادریس صاحب:۔ ضلع سہارنپور میں بھگوان پور کے قریب ایک بستی "سکرودڈہ" نامی ہے یہ مسلم راجپوت اور سادات کی مشترکہ آبادی ہے۔ موصوف یہیں کے باشندہ تھے۔ دیوبند پڑھنے کے لئے آئے تو مولانا حبیب الرحمٰن نے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پہونچا دیا پھر انھوں نے ایسی جم کر خدمت کی کہ چالیس سال کے طویل عرصہ میں کبھی جدا نہیں ہوئے، دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے امتحان دینے کا شوق چرایا تو بلا اطلاع غائب ہوگئے کچھ عرصہ بعد حضرت شاہ صاحب کو معلوم ہوا کہ لاہور میں ہیں استاد اپنے شاگرد کی مخلصانہ خدمت سے اس قدر مانوس ہوچکے تھے کہ ان کی تعاقب و تلاش میں لاہور جا پہونچے

(باقی آگے)

سکروڈھوی، مولانا محمد اسماعیل[عہ] صاحب گارڈی رئیس اعظم افریقہ تھے۔ بحری جہاز کے ذریعہ سفر کا آغاز ہوا اور ۱۲ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ کو رنگون پہنچے ۲۱ روز مسلسل قیام کے بعد ۸ رجمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں بمبئی، کلکتہ، رنگون اور رنگون کے مضافات میں دینی دعوت اور

صفحہ ۱۳۷ کا بقیہ:- مولانا ادریس لاہور پہونچنے کے ساتھ ہی "اپٹوڈیٹ" بن گئے۔ شاہ صاحب نے اپنی پوشاک پہنائی اور پھر دیوبند لے آئے اسکے بعد فرار کی کبھی نوبت نہیں آئی، دارالعلوم میں مدرس رہے اور پھر ڈابھیل میں بھی مگر علم سے واجبی ہی تعلق تھا۔ تمامتر توجہات تجارت کی طرف تھیں یوپی کا سامان مثلاً کھڑاؤں، مسواک، کھدر کے تان، کھینچ کر گجرات لے جاتے اور گجرات کی مشہور اشیاء کو یوپی میں درآمد کرتے۔ کھانا پکانے کا خاص ذوق تھا حضرت شاہ صاحب کی چائے ہمہ وقت تیار ہی رکھتے بلکہ حلوۂ گذر، شب دیگ اور طرح طرح کی ہانڈیاں پکاتے، گاجر کا حلوہ موسم سرما میں تیار کرتے جسکی صورت کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہوتی خود بھی اسمیں سے روزانہ بمقدار ایک چمچہ اٹھاتے، نہایت جزرس تھے۔ پان کے شوقین اور خود شاہ صاحب بھی پان کے متوالے اسلئے دوران درس بھی چھالیہ کاٹنے کا شغل رہتا کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ اسپر عنایت فرماتے کہ "میرے پاس مدت سے ہے اور کوئی علمی استفادہ نہیں کیا گاہے گاہے خادم بھی مخدوم سے الجھ جاتا" شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بیشتر وقت ڈابھیل میں گذرا۔ فن ریاضی وہیئت میں طبیعت نافذ تھی عمر کا آخری حصہ دہلی کے "مدرسہ حسین بخش" میں مدرسی کرتے ہوئے بیتا، یہیں دلی میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک مسجد میں امامت کرتے مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو ان کے داماد مظفر نگر لے آئے وہیں کی خاک میں آسودہ خواب ہیں اولاد ذکور میں کوئی نہیں صرف تین لڑکیاں تھیں سب سے چھوٹی شاہجہاں بیگم بعالم شباب رخصت عالم جاودانی ہوئیں ایک لڑکی بابو محمد ظفر نصیب کے نکاح میں ہیں تیسری لڑکی مولانا محمد بشیر صاحب کے نکاح میں ہیں جو خود بھی شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں ان ہی مولانا بشیر احمد صاحب کی لڑکی یعنی مولانا محمد ادریس صاحب کی نواسی شاہ صاحب کے فرزند اکبر مولانا ازہر شاہ قیصر مدیر رسالہ "دارالعلوم" کے حبالۂ عقد میں آئیں۔

عہ مولانا محمد اسماعیل گارڈی:- ڈابھیل گجرات کے باشندہ، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ ہیں۔ ان کے والد افریقہ پہونچے معمولی کاروبار سے ابتدا کی پھر رئیس التجار ہوگئے، مال و دولت کا یہ عالم ہے کہ اسکی صحیح حیثیت خاندان کے افراد کو بھی معلوم نہیں۔ افریقہ، بمبئی اور بہت سے شہروں میں پڑا ہوا ہے۔ اپنی بستی میں مولانا اسماعیل گارڈی نے ایک ہسپتال عام پبلک کے لئے کھولا جس سے عوام کو طبی سہولتیں مفت مہیا کی جاتی ہیں اور اس بستی میں بجلی اور پانی کا بھی انتظام کیا۔ نوساری میں ایک مسافر خانہ بھی ان ہی کے امداد و تعاون سے چلتا ہے۔ ڈابھیل کے مدرسہ کی تعمیر اور کچھ سال تن تنہا اسکے متکفل رہے۔ تجارت میں صبح و شام و شب و روز کی مشغولیت کے باوجود علم تازہ، مضامین مستحضر اور بڑے خوش نویس ہیں۔ مثنوی مولانا روم کے عاشق اور دلچسپ وعظ کہتے ہیں۔ خاکسار کے پاس کبھی کبھی گرامی نامہ آتا ہے تو نگارش فاضلانہ و عالمانہ محسوس ہوتی ہے۔

تبلیغ کا اہم فریضہ انجام دیا اور اہلِ رنگون پر حضرت شاہ صاحب کے استغنار، زہد و قناعت، وسعتِ علم کا خاص اثر ہوا۔ اس وقت رنگون میں مولانا ظفر احمد تھانوی مقیم تھے جنھوں نے اس وفد کی پیشوائی و پذیرائی میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ جمعیتہ العلماء صوبہ برما نے وفد کو سپاسنامہ دیا جسکی ابتدا میں یہ جلیل القاب موجود ہیں۔

"بجناب معلی الالقاب، سید المحققین، رأس المدققین، غزالیٔ زماں، بیہقیٔ دوراں، ذوالفضل والجاہ مولانا سید انور شاہ"

سپاسنامہ میں اہلِ علم کی طویل خدمات خصوصاً ہندوستان میں دانشور طبقہ کی امتیازی کوششیں، دارالعلوم دیوبند کا وقیع تذکرہ اور اہم تاریخی حقائق و علمی نکات زیر گفتگو ہیں خاتمہ پر پھر ان الفاظ سے شاہ صاحب کے علم و کمال کو ذکر کیا گیا ہے۔

"حضرتِ والا! آپ تینؔ بزرگوں میں سے شیخ العلماء والفضلاء حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا مرتبۂ علم و فضل محتاج بیان نہیں بالخصوص طبقۂ اہل علم میں کون ایسا ہے جو آپ کو جانتا نہیں، ایک جماعتِ علماء آپ کی شاگرد، اور آپکے شاگردوں کی شاگرد آپ کے فضل و کمال پر شاہدِ عدل ہے۔ آپ شیخ العالم حضرت مولانا محمود الحسن محدث رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور ان کے بعد مدرسہ عالیہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس ہوئے جہاں سے آپ کے ہاتھوں صدہا طلباء فارغ التحصیل ہو کر ہدایت خلق اللہ اور سلسلۂ درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ پھر خدائے پاک کو منظور ہوا کہ صوبۂ گجرات کو آپ کی ستودہ صفات ذات سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملے اسی لئے "بمقتضائے رحمت حق بہانہ می جوید" ایسے اسباب پردۂ غیب سے ظہور میں آئے کہ آپنے اپنے قدم میمنت لزوم سے مدرسہ "تعلیم الدین ڈابھیل" کو مشرف فرمایا اور بیک چشم زدن ایک چھوٹی سی درسگاہ کو دارالعلوم کے درجہ تک پہونچا دیا۔" الخ

(بحوالہ روئیداد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل)

سپاسنامہ کے ان اجزاء سے معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کی حیات ہی میں آپکی عبقریت و نابغیت کے چرچے ہندوستان سے باہر پہونچ چکے تھے جمعیتہ العلماء برما نے اشعار میں بھی بعض سپاسنامے پیش کئے جنمیں سے ایک سپاسنامہ حکیم اسماعیل احسن نفیسؔ صاحب امروہوی کا ترتیب دادہ ہے

جسکے بعض اشعار متعلقہ حضرت شاہ صاحب نظرِ قارئین ہیں ۔

یا حبذا اجاءت شیوخ سنامانی	بمناهل الفیضان والعطشان
نزلوا بانواع الکرامة والهدی	لشفاء القلب الهائم الولهان
فیهم فقیه عالم متفطنٌ	متمتع بمواهب الرحمان
نور التقی متلألئ فی وجهه	یُدعی بانور شاه فی البلدان
بدر منیر فی سماء فضیلة	وجبینه کالشمس فی اللمعان
انفاسه کنائم من روضة	فیها سکون الخاطر اللهفان
وحدیثه لسقیم الالام الجوی	راح لراحة قلبه السکران
متکلم شهم ذکی بارعٌ	طلق خطیب مصنع ببیان

مولانا ظفر احمد صاحب[ع] نے بھی اشعار میں ایک خیر مقدمی قصیدہ پیش کیا جن میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ اس طرح ہے ۔

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن	از گلِ رعنا بگو ما ما سخن
مرحبا اے قاصدِ طیارِ ما	می دہی ہر دم خبر از یارِ ما
مرحبا اے نور و مہر و ماہ ما	مرحبا علامہ انور شاہ ما
منطق الطیر سلیمانی بیا	بانگ ہر مرغے کہ آید می سرا
الصدا گفتیم اے اہلِ رشاد	کین زماں رضواں درے جنت کشاد
ایہا العشاق السقیا لکم	انتم السابقون والبقیا لکم
ایہا الصالون قوموا و عشقوا	ذات ریح یوسف استنشقوا

ع مولانا ظفر احمد تھانوی :- اصلاً دیوبند کے باشندہ تھے۔ دیوبند کے محلہ بنام "دیوان" میں آبائی مکان تھا۔ مظاہر العلوم سہارنپور سے فراغت حاصل کی، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی اہلیہ کی جانب سے حضرت کے رشتہ دار تھے۔ رنگون میں طویل قیام کے بعد تھانہ بھون مقیم ہوئے اور حضرت کے ایماء پر حدیث سے فقہ حنفی کی مستدلات بطرز مشکوٰۃ "اعلاء السنن" کے نام سے کئی جلدوں میں جمع کئے۔ مسلم لیگ کے شدید حامی تھے غیر منقسم بنگال میں لیگ کو کامیاب بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ پاکستان بنا تو "ٹنڈو الٰہ یار" کے مدرسہ میں شیخ الحدیث بنائے گئے حال ہی میں شیخ ابو غدہ نے مولانا ظفر احمد تھانوی کی اصولِ حدیث میں لکھی ہوئی "ظفر الامانی" کو ایڈیٹ کر کے آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ مرحوم دیدہ ور محقق اور باکمال علماء میں تھے۔ غالباً گذشتہ سال پاکستان میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

علمائے ربانی کا یہ وفد سرزمین بر ہا پر اپنے علم و فضل، دانش و بینش، زہد و غنیٰ کے وہ نقوش چھوڑ آیا جو ابد نشان ہیں ذکر حضرت شاہ صاحب کے اسفار کا چل رہا تھا اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ یہ دو تین آپ کے غیر ملکی طویل سفر ہیں۔ اندرون ملک دیوبند سے کشمیر، پنجاب، دیوبند سے ڈابھیل، اطراف ڈابھیل، یوپی کے مشہور شہر بجنورا ور اسکے مضافات میں بکثرت اسفار رہے۔ اپنے رفیقِ خاص مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری سے خصوصی و قلبی تعلق کی بنا پر اکثر ایامِ رخصت و ایامِ علالت بجنور ہی گزرتے سال میں کئی بار بجنور کا سفر ہوتا۔ ردِّ قادیانیت کے سلسلہ میں کئی اسفار فرمائے اور بھاولپور کے مقدمہ کے لئے وہاں طویل ترین قیام کیا مگر یہ سب سفر طبیعت پر جبر اور شدید تقاضوں کے تحت ہوئے ورنہ عموماً سفر سے طبیعت کنارہ کش تھی۔ مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے کہ اگر کوئی شاہ صاحب کو سفر کے لئے مجبور کرتا تو بالعموم یہ شعر پڑھتے ؎

طفلی و آغوشِ مادر خوش بہارے بودہ است
تا بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سفر سے طبعی وحشت کی بنا پر اگر کبھی سفر فرماتے تو لوگوں کو بھی انکی مسافرت پر استعجاب ہوتا۔

بیعت و خلافت

جاننے والے جانتے ہیں کہ علوم دینیہ کا مقصود اور اس راہ میں تگ و دو کی آخری منزل نیت کی درستگی، اخلاص کی دولتِ بے بہا، معاملات کی صفائی، عبادات کا اہتمام، باطن کا تزکیہ اور اعمال کا تجلیہ ہے۔ رمز آشنائے حقیقت "مولانا روم علیہ الرحمہ" نے جنکی مثنوی کے بارے میں اسرار باطن کے حاملین کا فیصلہ ہے کہ "ہست قرآن در زبانِ پہلوی" اپنے ایک شعر میں دینی علوم کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ؎

جان جملہ علمہا ایں است و ایں ⁂ تا بدانی من کیم در یوم دیں

کہ تمام علوم کا حاصل اور منتہا یہی ہونا چاہیئے کہ انسان کو عاقبت کی فکر اور زمرۂ سعداء میں شریک ہونے کی بیقرار تمنا نصیب ہو۔ غور سے اگر دیکھا جائے تو خود انسانی و اسلامی زندگی کا مقصد بھی اسکے سوا اور کوئی نہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ بر خود غلط انسان نے حقیقی منزل کو چھوڑ کر ان راہوں پر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا جو اسے مقصود سے قریب تر کرنیکے بجائے

بھیانک اور مہیب وادیوں میں پہونچا رہی ہیں. حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں احسانی کیفیات کا فیضان نہیں بلکہ عرفانی بارشیں آپ کے ابر نبوت و رسالت سے اس انداز میں ہورہی تھیں کہ کسی ریاضت و تمرین کے بغیر خدا کے مقدس بندے تزکیہ و تجلیہ کی حقیقی دولتوں سے دامنِ مراد بھرتے لیکن آپ کی رحلت کے بعد زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح ایک مربوط و منظم تعلیم کی ضرورت پیش آئی، احسانی کیفیات کو حاصل کرنے کے لئے بھی ایک مرتب و مسلسل نظام کی ضرورت کھڑی ہوگئی تعلیم کے لئے درسگاہیں کھل گئیں جنکے مسند نشین علماء اور استفادہ کرنیوالے طلباء کہلائے. تزکیہ کے لئے خانقاہی نظام وجود میں آیا۔ جہاں دینے والے مرشد اور لینے والے مسترشد کے نام سے مشہور ہوئے، خاکسار کو ان سطور میں تصوف اور اسکے نظام پر کوئی طویل گفتگو نہیں کرنی یہ تو ضمناً و ذیلاً چند سطور قلم پر آگئیں. بتانا تو یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک وقت ایسا گذرا کہ جبتک یہاں کا فاضل کسی خانقاہ سے وابستگی پیدا کرکے معمورۂ باطن کی تطہیر نہ کراتا اسے سندِ فراغ نہ دیجاتی. دارالعلوم کا یہ وہی میمونی عہد ہے جسمیں اسکے مدرسین و کارکن بلکہ جرس نواز تک احسانی کیفیات کے رازدار تھے، گنگوہ میں حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمہ کی خانقاہ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی خانقاہ رائے پور، تھانہ بھون کا زاویہ جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمہ کے وجود اقدس سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، سہارنپور میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیوبند میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ وہ اساطین امت تھے جنکے فیوض سے مستفیدین بقدر وسعت ظرف فائدہ اٹھا رہے تھے۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ جنکی پہلی تربیت اپنے بزرگوار والد حضرت مولانا معظم شاہ صاحب کی آغوش شفقت میں ہوئی وہ "سہروردی" طریقہ کے منتخب اشخاص میں تھے، مرحوم نے اپنے نامور بیٹے کو سہروردی سلسلہ میں مجاز بھی فرمایا تھا۔ آپ دارالعلوم سے فراغت پر "گنگوہ" حضرت گنگوہیؒ کی درسگاہ میں سماعت حدیث کے لئے پہونچے اور ظاہری علوم کے استفادہ کے ساتھ باطنی کمالات کا بھی اکتساب کیا، چنانچہ ۱۳۱۹ھ میں جب حضرت شاہ صاحب اپنے وطن کشمیر مراجعت فرمارہے تھے تو حضرت اقدس مولانا گنگوہی علیہ الرحمہ نے آپکو مجاز قرار دیا. مولانا منظور صاحب نعمانی نے اپنے ایک مکتوب میں بنام خاکسار تحریر فرمایا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی روایت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے سیوہارے میں ایک مجمع میں خود اس کا اظہار فرمایا تھا کہ وہ حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ سے مجاز ہیں لیکن حضرت گنگوہی کے خلفاء کی فہرست میں شاہ صاحب کا نام موجود نہیں ہے، بہت ممکن

ہے کہ یہ فہرست خلفاء پہلے کی تیار کی ہوئی ہو جسکی اشاعت بعد میں ہوئی یا کوئی اور خاص وجہ نام داخل فہرست نہ ہونے کی ہو۔ تیسری اجازت حضرت مرحوم کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جسکا تذکرہ نفحۃ العنبر میں تفصیل سے موجود ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ موصوف اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند سے بیعت کی اور جب حضرت موصوف بارادۂ ہجرت دیوبند سے رخصت ہونے لگے تو ان دونوں حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت کے بعد کس سے رجوع کریں اس پر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرنے کا حکم فرمایا چنانچہ مولانا مفتی شفیع صاحب، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور بہت سے اہل علم شاہ صاحب سے بیعت کا تعلق بھی رکھتے تھے۔

یہ تفصیل خاکسار نے اس لئے پیش کی کہ حال ہی میں اکابر دارالعلوم پر "بجنور" سے ایک کتاب شائع ہوئی مصنف کو حضرت شاہ صاحبؒ کے اس گوشۂ کمال پر اطلاع نہیں ہے تو انھوں نے شاہ صاحب کی جانب سے عجیب وغریب دفاع کیا ہے۔ اگر "نفحۃ العنبر" کا جدید ایڈیشن ص ۲۱۲، ۲۱۳ پیش نظر ہوتا تو ان مصنف کو گفتگو کی ضرورت نہ پیش آتی۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے علاوہ وطن مالوف کشمیر میں چھ ماہ مسلسل چشتی سلوک و تصوف کے معمولات کے مطابق صرف کئے۔ مولانا یوسف صاحب بنوری نے لکھا ہے اور یہ روایت انہیں قاری محمد یامین صاحب استاذ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے پہونچی کہ پنجاب سے ایک بزرگ دیوبند تشریف لائے تو حضرت شاہ صاحبؒ و مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ سے ملاقات کے بعد میں فرمایا کہ

"ان دونوں حضرات کی نسبت باطنی بڑی قوی ہے خصوصاً حضرت شاہ صاحب کی نسبت باطنی سے اپنے گہرے تأثر کا اظہار کرتے تھے۔"

علمی اشتغال کی بنا پر بیعت کا سلسلہ دراز نہیں تھا لیکن اہل علم اور عوام نے آپ سے بیعت بھی کی خصوصاً کشمیری عوام بکثرت مرید ہوئے ہیں۔ اعمال واشغال میں آپ کسی خاص طریقہ کے پابند نہ تھے۔ مسترشدین کے ذوق اور ان کی باطنی صلاحیتوں کے پیش نظر کسی کو چشتی مکتبۂ فکر کے معمولات کی تلقین فرماتے تو کسی کو نقشبندی اور سہروردی طریقوں کی، اگر طلباء بیعت کرتے تو انہیں زیادہ تر انہیں اشغال کی تعلیم دیتے جو حدیث سے ثابت ہیں۔ تہجد، صلوٰۃ اوابین اور بعد نماز فجر پاس انفاس کا ذاتی طور پر اہتمام تھا۔ مولانا یوسف بنوریؒ نے "نفحۃ العنبر" میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کرامات بھی دیکھنے میں آئیں خصوصاً سفر کشمیر جو مولانا

نے حضرت شاہ صاحب کی رفاقت میں کیا اسمیں بہت سی کرامات کا مشاہدہ کیا اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اخلاق کی درستگی، معاملات کی صفائی، اتباعِ سنت کا جذبۂ وافر، زہد عن الدنیا، التفات الے الآخرہ۔ یہی سلوک وتصوف کے ثمرات ہیں اور الحمد للہ ممدوح کا قدم ان معاملات میں بہت راسخ تھا تنقید وتبصرہ، غیبت وبدگوئی، حریف ومخالف کے لئے کلمات ناروا وناسزا جو رزائل سے ہیں موصوف ان سے کلیۃً محفوظ تھے، مجلس میں کوئی شخص غیبت کر نہیں سکتا تھا اگر کوئی غیبت شروع کرتا تو آپ "حسبنا اللہ ونعم الوکیل" پڑھتے اور ایک لطیف انتباہ سے مجلس یا گفتگو کا رخ بدل ڈالتے، حنفیت میں استحکام کے باوجود دوسرے فقہی مکاتیب کے ان جلیل القدر اشخاص پر بھی تنقید میں احتیاط برتتے جنکی جرح وتنقید سے حنفیت کو خاصا نقصان پہونچا۔ درس میں خود ارشاد فرمایا۔

"حافظ ابن حجر عسقلانی رح جنھوں نے حنفیت کو خاص طور پر نقصان پہونچایا جب سے مجھے "بخاری" پڑھانے کے لئے دی گئی تو حنفیہ کی جانب سے حافظ ابن حجرؒ کی زیادتیوں کا جواب دینے کے لئے میں ذاتی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا "سرہند" پہونچکر حضرت مجدد الف ثانی رح کے مزار پُر انوار پر مراقب ہوا اور اس طویل مراقبہ کے بعد قلب میں یہ بات آئی کہ حافظ ابن حجر رح نے حنفیت کو نقصان پہونچانے کی ابتدا کی ہے اسلئے ان کی زیادتیوں کا جواب دفاع ہوگا آغازِ جنگ نہیں۔"

بلکہ ایک موقعہ پر سبق میں یہ بھی فرمایا کہ

"الحمد للہ میں کسی فن میں کسی کا مقلد نہیں ہوں ہر فن میں میری مستقل رائے ہے بجز فقہ کے کہ فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا صرف امام اعظم رح کا مقلد ہوں ہر فن کی اساسی شخصیتوں اور انکے افکار پر میرے تعقبات ہیں جنھیں میں پیش کروں تو سلیم الفکر ان کا انکار نہیں کریں گے لیکن اسکے باوجود طلباء کو نصیحت کرتا ہوں کہ اہلِ علم کے احترام میں کوتاہی نہ کریں خواہ ان علماء کا تعلق کسی بھی مکتبۂ فکر سے ہو، خصوصاً ائمہ فقہ پر مناقشات اور تعقبات میں سوء ادبی کو ہرگز شریک نہ ہونے دیں۔"

زبان کی احتیاط، مزاج کی یہ لطافت، ذوق کی یہ سلامتی، فکر کی یہ ہمواری فضائل کے شعبے ہیں جنکا حصول سلوک وتصوف کی وادیاں عبور کئے بغیر نہیں ہوتا، لیکن اسکے باوجود مروج پیری مریدی یا سلوک وتصوف کی دکانداری حضرت موصوف کے یہاں نہیں تھی۔

درس کی خصوصیات:۔ مرحوم کی زندگی میں سب سے نمایاں عنوان آپ کا اجتہادی درس اور درسی خصوصیات ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی اور اسکے پاکیزہ گوشوں میں یہی ایک مرکزی نقطۂ بحث ہے بلکہ درس میں آپ نے جو انقلابی تبدیلیاں کیں ان کی تفصیلات خود ہماری ان نگارشات کا قلب ہے اس سے پہلے کہ اس عنوان پر کچھ لکھا جائے گفتگو کی ابتدا آپ کے نامور شاگرد مولانا مفتی محمود صاحب کے ارشاد سے کرنا چاہتا ہوں مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، شاہ صاحب کے خصوصی تلمیذ اور تقریباً تیس۳۰ چالیس۴۰ سال تک مالوہ میں افتاء نویسی کا دقیق کام انجام دیتے رہے انھیں اپنے استاذ سے عشق اور استاذ کی خصوصیات پر مبصرانہ نظر تھی، ایک مجلس میں انھیں سے سنی ہوئی یہ بات محفوظ رہ گئی کہ

"ہندوستان نے حضرت شاہ ولی اللہ سے بڑھکر کوئی مصنف اور مولانا انور شاہ سے ممتاز کوئی مدرس پیدا نہیں کیا"

واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے امام دہلوی کی تالیفات وتصانیف کا مطالعہ کیا ہے اور جنھیں مولانا کشمیری کے درس کی خصوصیات کا علم ہے وہ مفتی صاحب کے اس تبصرہ کی اصابت کو تسلیم کرینگے۔ مجھے حضرت شاہ ولی اللہ کے تصنیفی کارناموں پر کچھ کہنا نہیں لیکن مولانا کشمیری کے طریقہ درس پر کچھ عرض کروں گا اور اس کی کوشش رہے گی کہ درس کی خصوصیات کا ایسا مرقع تیار ہو جس سے آپکے امتیاز واختصاص کو سمجھنے میں مدد ملے، بات جو کچھ کہنا ہے اس سے پہلے کچھ تفصیلات ضروری ہیں، معلوم ہے کہ ہندوستان میں درس حدیث کا باقاعدہ نظام حضرت شاہ ولی اللہ کا مرہون منت ہے۔ موصوف نے ہندوستان کو حدیث سے واقف کرنے کے لئے براہِ راست مہبطِ وحی کا سفر کیا اور وہاں سے سب کچھ سیکھنے کے بعد ان پاکیزہ علوم کی اشاعت کے لئے ہندوستان لوٹ آئے جن مؤرخین نے دلی کی اس تاریخی درسگاہ کی علمی داستانیں ہم کو سنائیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینۂ منورہ میں حدیث کی مشہور کتب کو ایک ہی سال میں پورا کرادیا جاتا۔ شاہ صاحب نے اسی طرز کو ہندوستان میں جاری کیا، آپ کی درسگاہ میں ایک سال "مشکوٰۃ شریف" اس طرح ہوتی کہ حدیث کے معنی مشکل الفاظ کی شرح، دفع تعارض، مطالب ومعنی، یہ مباحث گذر جاتے۔ شاہ صاحبؒ کا دستور تھا کہ ایک دن مشکوٰۃ کا درس اور دوسرے دن انہیں پڑھائی ہوئی حدیثوں سے متعلق مشہور شارح مشکوٰۃ علامہ طیبی کی شرح کا درس بھی باقاعدہ دیتے اس سے اگلے سال انہیں احادیث کو جو مشکوٰۃ میں سند کے بغیر پڑھائی گئیں تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سند متصل کرنے کیلئے

صحاحِ ستہ میں پڑھادی جاتیں، گویا کہ صحاح ستہ کی تعلیم وتدریس کا اہم مقصد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سندی اتصال تھا اسی لئے طالبعلم حدیث پڑھتا اور شاہ صاحبؒ اس کو سنتے کہیں کہیں درمیان میں کوئی اہم بات ہوتی تو بتلاتے ورنہ عام حالات میں اس درس کا دائرہ قرأت وسماع ہی تھا، شاہ صاحبؒ نے خود فرمایا کہ مدینہ منورہ میں حدیث کی تعلیم اسی نہج پر تھی۔ حنفیت، شافعیت، مالکیت اور حنبلیت کے قصے اتنے وسیع نہ تھے کہ انہیں طے کرنے کے لئے مسافتیں طے کی جائیں، ہندوستان میں حدیث کا فن شہرت پذیر ہوا تو اسے ایک نئے فتنے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ فتنہ غیر مقلدین کا پیدا کردہ تھا جسمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ابوحنیفہ الامام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث وارشادات کے علی الرغم اپنی ذاتی رائے وقیاسات پر اسلامی شریعت کا ایک نیا نظام قائم کیا ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کہنے کے بجائے ابوحنیفہ کی شریعت کہنا زیادہ صحیح ہوگا اسلئے دیوبند کو اپنے آغاز ہی سے جن بعض افکار وعقائد سے تصادم کی نوبت آئی ان میں سے ایک تو امام ابوحنیفہ رح کے متعلق اسی مغالطہ کا ازالہ تھا، دوسری جانب اسلام کے نام پر اسلام کے سب سے بڑے دشمن اس گروہ کے مقابلہ میں آنا پڑا جو بدعات ومحدثات کو اسلام سمجھ رہا ہے اور سمجھا رہا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ تربیت جماعت جنکے ذہنی سانچوں کو خود پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراش وخراش کیا تھا۔ چونکہ ہندوستان اس مقدس جماعت سے اسلام کو سیکھنے سے محروم رہا۔ مستزاد ہندوستان میں کفر اور شرک کی ہزاروں سال پرانی تاریخ، اسلئے دین کو مسخ اور محرف کرنے کے راستے یہاں آسانی سے فراہم تھے۔ مجدد الف ثانی نے بدعات کے خلاف اعلان جنگ کیا ان کی عملی کوششوں کے ساتھ ان کے علمی وثائق جو گرانقدر مکتوبات کی شکل میں موجود ہیں انمیں شریعت وسنت کو قائم کرنے کے لئے ایک بیتاب روح ظاہر ہے، لیکن تاریخ کا یہ ہائلہ بھی حیرت خیز ہے کہ حضرت مجدد کا تعلق سلوک وتصوف کے ایک مخصوص زمرہ سے قائم ہونے کی بنار پر آپ کے تصورات وتخیلات وہ وسعت حاصل نہ کرسکے جس وسعت پذیری کے وہ حامل تھے، اسی طرح دہلی کا مشہور علمی خانوادہ جس کے امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ بدعت کے خلاف محاذ پر ان کی کوششیں بھی اس تاریخی وقعت کو حاصل نہ کرسکیں جسکی بجاطور پر وہ مستحق تھیں، ہند میں اسلام کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا امتیاز دیوبند کو حاصل ہوا کہ آج بدعت کے خلاف ایک مضبوط محاذ دیوبند ہی ہے بلکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ بریلویت کے خلاف جس مکتبۂ فکر نے

ایک عالمی شہرت اختیار کی وہ صرف دیوبند ہے۔ دیوبند کی تاریخ پر انصاف اور احتیاط کے ساتھ
جب کبھی غور کیا تو اس جد و جہد کا امام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ
کو تسلیم کرنا پڑا۔ انکے اس پُرعزیمت کارنامہ کو تاریخ بھلا نہیں سکتی کہ قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہؒ
سے روحانی وابستگی اور مسترشدانہ عقیدتوں کے باوجود دیوبند کے فکر کو سنّت کے صحیح سانچوں میں
ڈھال دینا انھیں ہر دو کا کارنامہ ہے۔ بہرحال ہندوستان میں درس حدیث میں اس کا التزام
کہ فقہ حنفی کی نشاندہی قرآن و حدیث سے کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ فلاں مسئلہ میں ابوحنیفہؒ
کے مسائل و فتاویٰ کی تائید فلاں اور فلاں آیات اور احادیث کرتی ہیں۔ دیوبند اسی فکر اور طرز
پر تعلیم دے رہا ہے۔ طریق تعلیم کا یہ طریقہ جو وقتی ضرورتوں کے تحت اختیار کیا تھا۔ تجربہ و مشاہدہ
بتاتا ہے کہ اسکی افادیت بڑی طویل الذیل ہے۔ اس تعلیم سے جہاں وہ غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں کہ
فقہ حنفی قیاس و رائے کا ایک مجموعہ ہے وہیں تحقیق و تنقید کا ایک مفید شعور بھی پیدا ہوتا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ شاہ ولی اللہؒ کا طریقِ درس حدیث کی ضروری وضاحت سے زیادہ
نہیں تھا۔ مولانا گنگوہیؒ و مولانا نانوتویؒ نے اس میں فقہ حنفی کے ماخذ کی نشاندہی کا اضافہ کیا
لیکن مولانا کشمیری قدس سرہ العزیز نے عام درسگاہی طریق درس میں یکسر انقلاب برپا کیا
آپ نے حدیث کی شرح و تفصیل میں صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ، معانی و بلاغت، اسرار و حکم،
سلوک و تصوف، فلسفہ و منطق، سائنس و عصری علوم کا ایک گرانقدر اضافہ، رجال کی بحثیں، مصنفین و
مؤلفین کی تاریخ و سوانح، تالیفات و تصنیفات پر نقد و تبصرہ آپکے درس کا ایک امتیاز تھا اسکے نتیجہ
میں درسی تقریریں بجائے مختصر ہونے کے طویل ہوگئیں۔ نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزرتا ہے
کہ دارالعلوم کے طریق تعلیم میں یہ خوشگوار انقلاب آیا اور اب ہند و پاکستان میں جہاں کہیں
دارالعلوم کے فضلاء تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں اسی مجتہدانہ طریق تعلیم کے خطوط
پر ان کی مخلصانہ کاوشیں جاری ہیں۔ ہندوستان کے وہ مدارس جو اس طریق تعلیم کو اپنانے سے
خدا جانے کن جذبات کے تحت انھیں اسکی افادیت میں شبہ ہے۔ میں اُن افراد و اشخاص
کو اس موقعہ پر سند و دلیل کے اعتبار سے تو پیش نہیں کروں گا جو دارالعلوم کے دامن تربیت
سے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ تجربہ و مشاہدہ کو بطور دلیل بلاشبہ پیش کر سکتا ہوں ظاہر
ہے کہ طالب علم کو ایک ہی وقت میں جب گوناگوں معلومات کا خزانہ ہاتھ آئے گا تو اسکی علمی حوصلوں
میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا ہونا ضروری ہے اور ذہن و دماغ کی بند کھڑکیاں

کھل کر خیالات وافکار میں وسعت بدیہی نتیجہ ؎۵ ہے۔

دار العلوم کے وہ طلبار جو دوسرے مدارس کی تعلیم سے متاثر ہو کر طویل درسی تقریروں کی افادیت میں کچھ شبہ محسوس کرتے رہے فراغت کے بعد جب انہیں دینی خدمت کا موقعہ ملا اور نیت نئے دینی فتنوں کے مقابلہ کے لئے اپنی علمی توانائیوں سے کام لینا ضروری ہوا تو اس کا اعتراف کیا کہ درس میں مختلف عنوانات کے تحت اساتذہ کے افادات ہمارے لئے کارآمد ہوئے، بھلا آپ خود ہی سوچئے کہ ایک طریق تعلیم کے نتیجہ میں صرف متعلقہ کتاب کا حل دوسری جانب فن کی تعلیم اور تیسری طرف مختلف فنون کا افادہ ان تینوں طریقوں میں جامع شخصیتیں تیار کرنے کے لئے کون سی صورت مفید و کارگر ہے ظاہر ہے کہ جماعت میں موجود طلبار کی ایک بڑی تعداد میں بعض وہ فہیم طلبار بھی ہوں گے جو ان مختلف فنون پر پھیلی ہوئی تقریروں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رہ گئے دوسرے اور تیسرے درجہ کے طالبعلم، یقین ہے کہ وہ بھی اس اجتہادی طریق تعلیم سے کلیۃً محروم نہیں رہے سنی سنائی اور کانوں میں پڑی ہوئی باتیں کسی نہ کسی وقت ان کے لئے بہر حال کارآمد ہوتی ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ تعلیم کے اس اچھوتے طرز کو نبھانے کے لئے جامع شخصیتیں مطلوب ہیں جنہیں وسعت علم کے ساتھ حفظ و یادداشت کی غیر معمولی صلاحیتیں بھی حاصل ہوں اس راہ کی دشواریوں کا مجھے سب سے پہلے احساس "ترمذی شریف" کے ابتدائی سبق میں ہوا جبیں اپنے استاذ اکبر مولانا حسین احمد مدنی"

؎۵ دار العلوم دیوبند کے جوانمرگ استاذ مولانا سید حسن دیوبندی جو اپنی جودت طبع اور ثاقب ذہن کے اعتبار سے مستقبل کی ایک ہونہار شخصیت تھے۔ راقم الحروف کو ان کے درس قرآن میں اس کا بھرپور تجربہ ہوا، وہ کہنے کو تو ترجمۂ قرآن پڑھاتے لیکن یہ ترجمہ تفسیر کے بھی خطوط سے بڑھا ہوا تھا، قرآن کو سمجھانے کے لئے مختلف فنون کا درس میں تذکرہ، متعدد کتابوں کے حوالے سن سنا کر سچ عرض کرتا ہوں کہ اسی زمانہ میں تفسیر رازی۔ قرطبی۔ المنار۔ روح المعانی وغیرہ کی ورق گردانی طلباء کرنے لگے تھے آج بھی دار العلوم کے کتب خانہ میں اساتذہ کی طویل تقریریں اور کتابوں کے نام سننے کے بعد مطالعہ میں جس کثرت کے ساتھ طلبار مصروف نظر آئیں گے مجھے یقین ہے کہ ہندوپاکستان کی کوئی درسگاہ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی، ابتدا میں اس مطالعہ کا صحیح فائدہ اٹھانے سے طبیعتیں قاصر رہتی ہیں لیکن بتدریج ذوق و شوق، کدوکاوش اور استفادے کے گر طالب علم کو معلوم ہو جاتے ہیں اس لئے دار العلوم کی درسی وطویل تقریریں اس حیثیت سے بھی مثمر اور بارآور رہیں۔

سے یہ الفاظ کانوں میں پہونچے۔

"مرحوم حضرت شاہ صاحب کشمیری نے طویل تقریروں کی بنیاد
ڈال کر ہم ایسوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا وہ اپنے بے پناہ علوم اور زبردست
قوتِ حافظہ کی بنا پر اس طریقہ کو نبھاتے لیکن جو ان صفات سے
خالی ہیں وہ ضیق محسوس کرتے ہیں۔"

موصوف کا یہ ارشاد اپنی حد تک انکی معروف منکسر المزاجی کا آئینہ دار ہے ورنہ جنکو ان کے سبق میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی وہ شہادت دیں گے کہ مسائل کے اطراف وجوانب پر حاوی، مبسوط تقریر وہ بھی فرماتے، غرضیکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا روایتی طریق تعلیم باوجودیکہ دار العلوم اس کا سب سے بڑا ترجمان وشارح ہے لیکن اسی طرز کو اس درس گاہ میں کلیتہً چھوڑ دیا گیا اور بلاشبہ تعلیمی وتدریسی لائنوں پر جو ایک دُور رس نتائج کا حامل انقلاب رونما ہوا، اس کے سب سے پہلے مؤسس مولانا انور شاہ کشمیری ہیں۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت سے متعلق اپنے طویل مقالہ میں لکھا ہے کہ

"حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں کچھ ایسی خصوصیات
نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ
آپ کا انداز درس دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلابِ عظیم
ثابت ہوا۔"

یہی امتیازی خصوصیات جو علمی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کا آپ کو علمبردار بنا رہی ہیں انھیں کی تھوڑی بہت تفصیل اس وقت پیش نظر ہے۔

اس ذرہ بے مقدار کو مرحوم کے درس میں شرکت کی توفیق میسر نہ آئی اگرچہ آپ کی املائی درسی تقریروں کے مجموعے دیکھ کر خصوصیات کا ایک قریبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تاہم اس عنوان کے واقعی حق کی ادائیگی آپ کے وہ ممتاز طلباء ہی کر سکتے ہیں جنھوں نے اس بحرِ ذخار کے تلاطم کو خود دیکھا ہے اس لئے اس عنوان کی تکمیل کے لئے آپ ہی کے تلامذہ کے ان نقوش وتاثرات سے امداد لی ہے جو ان کے قلم سے تیار ہوتے رہے ہے اس لئے جو کچھ عرض کروں گا تفصیل طلب

اضافے کے سوا جہاں تک متن کا تعلق ہے انھیں دانشوروں کی نگارشات ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی جنکی بلند پایہ تحقیقات سے آج بھی ہندو پاکستان کی علمی فضائیں شاداب ہیں شاہ صاحب کی خصوصیات درس پر اپنے البیلے انداز میں رقمطراز ہیں

"خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے طلبار کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحب اس عبارت کا ترجمہ و مطلب طلبار کو بتائیں گے لیکن پہلی دفعہ درس کے ایک نئے طریقہ کے تجربہ کا موقعہ میرے لئے یہ تھا کہ "بسم اللہ" بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔"

ہندوستان کی درسگاہوں میں درس کا جو روایتی طریقہ چلا آرہا ہے فاضل گیلانی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ

"ایسے اساتذہ سے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا تھا جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے لفظوں کے الٹ پھیر سے دھرانے کے عادی تھے، صلوٰۃ کی شرح اور مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب اسکے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچے کے عمومی اجزار کے متعلق سوال و جواب، ردّ و قدح کا موروثی سرمایہ حواشی و شروح میں جو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اسی کو غریب طالبعلموں پر پیش کر کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے۔"

صدیوں سے متوارث اس طریق تعلیم کی نشاندہی کے بعد یکایک فاضلِ گیلانی کو طرزِ تعلیم کا جو ایک نیا مشاہدہ و تجربہ ہوا اسکی کچھ تفصیل ان ہی کے قلم سے سنئے، لکھا ہے کہ

"لیکن الامام کشمیری نے قبل اسکے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو ایک خاص قسم کی دلچسپ ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی۔ کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا تقریباً چالیس سال بعد اسکا دہرانا آسان نہیں لیکن بعض انقلابی تأثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے۔"

صحاح ستہ میں مسلم شریف کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس پر ایک مختصر تبصرہ کرنیکے بعد فاضل گیلانی لکھتے ہیں کہ

"پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکایک میرے سامنے آگئے۔"

گویا کہ علامہ کے درس کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہی جامعیت اور ایک ہی وقت میں علمی نوادر سے طلباء کے دامن دماغ کو لبریز کرنا تھا پھر معلومات کا یہ وسیع افادہ جس طرح کسی ایک ہی دائرہ میں بند نہیں تھا بلکہ اسکا تعلق مختلف علوم وفنون سے تھا ایسے ہی افادات کا یہ گنجِ گرانمایہ درس کی پوری مدت پر پھیلا ہوا تھا، متعلقہ موضوع کی مناسبت سے جب آپ ضمنی مسائل ومباحث کی طرف متوجہ ہوتے تو اس کا نام خود آپ کی زبان پر "دفاع" تھا، مولانا گیلانی ہی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

"یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا۔ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوتا تو عموماً فرماتے "دفاع ہوگیا مجھے اس مسئلہ کی طرف" ان دفاعی مسائل میں صرف ونحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شامل تھے۔"

درس کی اس اہم خصوصیت میں محقق گیلانی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یہ ہمنوائی بھی قابلِ غور ہے لکھتے ہیں کہ

"حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحرِ ذخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علومِ حدیث تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ضمناً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی اگر معانی وبلاغت کی بحث آتی تو محسوس ہوتا کہ علم معانی کا یہ مسئلہ واضع نے اسی حدیث کے لئے وضع کیا تھا معقولات کی بحث چل نکلتی اور آپ معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ گویا یہ حدیث معقولات کے مسئلہ کے ہی تردید کے لئے قلبِ نبوی پر وارد ہوئی تھی غرض اس نقلی وروایتی فن میں نقل وعقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی پھر علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی

فی نفسہٖ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔"

فاضل مقالہ نگار کے قلم نے اس داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے پھر یہ سنایا۔

"حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس الغرض تمام علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا۔"

نہ صرف یہ کہ معلومات کا بیش بہا خزانہ مختصر مدت میں طالب علم اپنے لئے فراہم پاتا بلکہ ضمناً حدیث و قرآن سے متعلق شک و ریب کے وہ کانٹے بھی دل و دماغ سے نکل جاتے جن کی خلش ایک مومن کے لئے انقباض و تکدر کا موجب ہے۔ وہی پہلے دن کا درس جسکا قلمی خاکہ مولانا گیلانی کے قلم نے تیار کیا اسکی تفصیلات میں موصوف نے اپنی بعض خلشوں کا ذکر کرتے ہوئے الامام کشمیری کی شفا بخش تقریروں کی چارہ سازی اس عنوان سے بیان کی ہے۔

"اس وقت تک میرا تاثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جا سکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی ہے اور یقین کی قوت سے محروم ہے۔"

ایک مولانا گیلانی ہی کیا خیر القرون کے اختتام کے ساتھ ہی دین کے اسی انتساب کے بارے میں نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مغالطوں میں عوام مبتلا کر دئے گئے اور عصر حاضر کے مہیب فتنوں میں تو حدیث کو عجمی سازش قرار دے کر دیدۂ و دانستہ دین کے اہم و بنیادی ستونوں ہی پر حملہ کر دیا گیا، عجمی سازش کا شوشہ چھوڑنے والوں نے اپنی چابک دستیوں سے لے کر جو ہیچ پوچ دلائل اس مقصد کے لئے تلاش کئے ہیں انھیں سے مرعوب ہو کر بلا مبالغہ لاکھوں تک تعداد ان سادہ لوح مسلمانوں کی پہونچتی ہے جو صاحب شریعت کی جانب حدیث کا انتساب مشتبہ گردان رہے ہیں اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کے خدام درس کے حلقوں میں بھی اس زہر کا تریاق بہم پہونچاتے رہیں، یقین ہے کہ اگر طلباء کے ذہنوں میں دلائل کے ساتھ یہ بات ڈالدی گئی کہ حدیث کوئی عجمی سازش نہیں بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے اور مناسب ہتھیاروں سے انھیں مسلح کر دیا گیا تو منکرین حدیث کی زہر چکانیوں کا شافی علاج ہو سکے گا۔ الامام کشمیری کو خدا تعالےٰ نے فتنوں کو بھانپ لینے اور ان کا ضروری مقابلہ کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی اسی کا

نتیجہ تھا کہ آپ بالکل ابتدائی مرحلہ میں طلباء کے رُوبرو حُجت حدیث کے موضوع پر ایسی فاضلانہ تقریر فرماتے جس سے حدیث کی حُجیت ایک حقیقت نظر آتی، ممدوح گیلانی نے تفصیل سناتے ہوئے بتایا کہ

"پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا، تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سُنا، سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہونچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے^ع۔"

دین کے اس اہم اور ضروری عُنصر پر جو فاضلانہ دلائل بہم پہونچائے گئے ان کو سنکر مقالہ نگار نے اپنے متعلق یہ شہادت دی ہے۔

"یہ پہلا دن تھا جمیں قرآن کے بعد دین کا سارا نظام میرے لئے یقینی قطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں عمر کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے

ع تواتر کی ان اقسام چہارگانہ کو مولانا گیلانی ہی کے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً انھیں باتوں میں ہوئی جو روایت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوں لیکن ایسی بات کہ شاہجہاں ہندوستان کا حکمراں تھا یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنیوالے ان کے کون ہیں؟ جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں۔ عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے۔ سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے تو روزہ مسلمان کو رکھنا پڑتا ہے یہ ایسی باتیں ہیں جسے مسلمان ہی نہیں بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں انکے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں، اسطرح "حاتم" کی سخاوت "رستم" کی شجاعت، اگرچہ گذرے ہوئے واقعات ہیں لیکن ان کی تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت کے یا رستم کی بہادری کے جو قصے مشہور ہیں ان قصوں کا یقینی ہونا تو ضروری نہیں لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا، رستم بہادر آدمی تھا اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمدؒ نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کے ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ حضرت علامہ کشمیریؒ ہی سے یہ بات سننے میں آئی۔

کے میرا یہ تأثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔"

خاکسار نے ابھی عرض کیا تھا کہ درسی افادات میں معلم واستاذ اس نہج پر اگر دماغوں کی آبیاری کرتے رہے تو دین کی جانب سے دفاع کرنے والوں کا جو مضبوط حلقہ قائم ہوگا وہ درسگاہوں سے لی ہوئی روشنی سے ہمیشہ کام لیتا رہے گا چنانچہ فاضل گیلانی نے اپنے متعلق خود لکھا ہے کہ

"خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا ہے۔"

بلکہ ــــ "مسلمانوں کی دینی اختلاف کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔"

بہرحال درس میں جامعیت اور وسیع ترین افادی معلومات جو شاہ صاحبؒ کی دُربار زبان سے ظاہر ہوئے اس سے جہاں ایک فائدہ وہ تھا جسے مولانا محمد طیب صاحب نے بتایا کہ

"اُس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لیکر اُٹھتا اور اسمیں یہ استعداد پیدا ہو جاتی کہ وہ بضمنِ کلامِ خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام کشمیری نے اختیار فرمایا۔"

مولانا طیب صاحب ہی کے قلم نے حضرت شاہ صاحب کے ایک ملفوظ سے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا کہ درس کا آپ کا یہ اجتہادی طرز دورِ حاضر کے فتنوں کے مقابلہ کی سوچی سمجھی تیاری تھی چنانچہ آپ خود درس میں طلباء کو مخاطب کرکے فرماتے۔

"بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے۔"

اس سے واضح ہوا کہ درس میں مختلف عنوانات سے متعلق یہ تقریر، اپنے علم کا اظہار یا اپنے تبحر کا مظاہرہ نہیں تھا بلکہ آپ طلباء کو نت نئے فتنوں کے مقابلہ میں اسطرح مسلح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ دین کی جانب سے دفاع کر سکیں۔ آج دارالعلوم کی پچاس سالہ تاریخ جسکی ابتداء آپ کی تدریس وتعلیم سے ہوتی ہے شاہد ہے کہ آپ کی درسگاہ سے نکلے ہوئے فضلاء اپنی اپنی جگہ دین کی حمایت ونصرت میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ بہرحال درسی خصوصیات میں سے ابتک ڈو بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا آپکے درس کی تیسری اہم خصوصیت وہ ہے جسکے

ناقل ملک کے مشہور فاضل وعالم مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (شارح مشکوۃ) وشیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ہیں. حسب معمول مولانا کاندھلوی نے اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل سے کام لیا ہے اس تفصیل کے بغیر مولانا کا مقصد واضح نہیں ہوتا اسلئے خاکسار بھی مفصل پیش کرتا ہے. لکھا ہے کہ

"دُنیا کے علم میں خیر وشر، محمود ومذموم کی تقسیم ہے مگر آخرت اور دین کے علم میں یہ تقسیم نہیں، آخرت اور دین خداوندی کا علم خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے. خلاصہ اسکا یہ ہے کہ اوّل مرتبہ ایمان واسلام کا ہے اور اس کے بعد علمِ دین کا."

اسکے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ علم کے لئے دو قوتیں درکار ہیں۔ ایک قوتِ فہم دوسرے قوتِ حافظہ. تحریر فرمایا کہ

"حضرت شاہ صاحب کو خدا تعالٰے نے ان تمام قوتوں سے اسطرح سرفراز فرمایا تھا کہ عالم میں اِس وقت اسکی نظیر نہیں."

بلکہ طبقہ علماء میں آپ کی خصوصیت وامتیاز یہ تھا کہ

"جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحب کی طرف مراجعت کرتا تو مسئلہ کا مادہ اسکے سامنے کر دیتے اور اسکے بعد اپنا فیصلہ بھی بتا دیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے."

جسکا حاصل یہ نکلا کہ خام علم اور ناپختہ آگہی کے جو مظاہر آئے دن ہمارے سامنے رہتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی بات پوچھی جائے تو اول تو بیچارہ شاید اس علم کے بارے میں ظنی وتخمینی رائے بھی نہ رکھتا ہو اور اگر مختلف اقوال بھی نقل کر دے تو راجح اور مرجوح کی تعیین سے بہرحال محروم ہی ہوگا لیکن علاّمہ کا حال یہ تھا کہ

"ہر مسئلہ آپکے نزدیک طے شدہ تھا، اختلاف اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردّد نہیں بلکہ راجح اور مرجوح متعیّن رہتا."

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کاندھلویؒ اپنے جلیل استاذ کی جس خصوصیات کا ذکر کر رہے ہیں وہ فنی مہارت اور علمی حذاقت کی دوسری تعبیر ہے. نقول کے انبار سے کارآمد چیز کو اٹھا لینا اسوقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ علم ملکۂ راسخہ نہ بن جائے اس خصوصیت کے بعد

فاضل مضمون نگار نے شاہ صاحبؒ کے خداداد فہم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

"فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کی اصل اور اسکا سرا معلوم تھا اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اسپر متفرع ہے اور ان مسائل میں مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف یہ ہے۔"

ظاہر ہے کہ اختلاف اور قدر مشترک کی بنیادوں کو متعین کرتے ہوئے مسئلہ کی روح پر اطلاع خود مولانا کے الفاظ میں کہ

"یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے۔"

تاوقتیکہ اختلاف علماء کے پس منظر پر پوری اطلاع نہو تمیز و امتیاز کی یہ قوت و صلاحیت ممکن ہی نہیں چنانچہ موصوف لکھتے ہیں۔

"جب تک روایات مختلفہ میں فقہاء کرام کا منشاء خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہو مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔"

اسکے بعد فاضل کاندھلوی نے علامہ کے درس حدیث کی بنیادی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ

"درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت کے واضح ہوجائے کوشش اسکی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔"

یہ اسلئے کہ

"اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً و رتبۃً مقدم ہیں۔"

اور یہ ساری کوشش اسلئے ہوتی کہ

"حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے۔"

جو شخص مسائل و مباحث میں ان بنیادی اصول پر پوری بصیرت رکھتا ہو، جس اصل پر یہ مسائل پھیلے ہوئے ہیں اسکی تعلیم و تدریس افادی نقطۂ نظر سے بڑی جامع ہوگی۔ قوتِ حافظہ نقول کی حد تک طلباء کے سامنے اقوال کا انبار لگا سکتی ہے لیکن فہم ثاقب کی جلوہ فرمائیاں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ علامہ کے درس کی یہی بڑی خصوصیت تھی کہ آپ اقوال میں اپنے خداداد فہم سے کام لیکر ترجیح بھی جاری فرما سکتے تھے۔ مولانا کاندھلویؒ نصف صدی سے درسگاہی ضرورتوں پر تام اطلاع

رکھتے ہیں اسلئے آپ کی نظر درس کے اس امتیازی پہلو پر جا پہونچی جو طلبار کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ حدیث، قرآنی بیانات و مضامین کی ایک واقعاتی تشریح ہے اور غالباً اسی لئے ——— الشافعی الامام ——— کو کہنا پڑا کہ قرآن کے مجملات کو حدیث ہی کی امداد سے سمجھنا ممکن ہے جبکہ حدیث بجائے خود اسقدر واضح اور صاف ہے کہ اسکی مراد کی تعیین کے لئے کوئی تشریح درکار نہیں غالباً اس اہم حقیقت کے پیشِ نظر علامہ نے درس میں اس کا بھی اہتمام فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی اُن آیات کی تعیین فرمادیں جو حدیث کا ماخذ یا حدیث جس اجمال کی شرح ہے۔ مولانا کاندھلویؒ ہی کہتے ہیں کہ

"حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے"۔

اس التزام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ

"بہت سی مشکلاتِ قرآنیہ کو حل فرمادیتے"۔

گویا کہ آپ کا درس حدیث ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ دین کی دوسری اور اہم بنیاد قرآن مجید کو بھی حل فرما کر طلبار کی واقفیت کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا، مولانا گیلانی نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں شاہ صاحبؒ کی اس درسی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم سے متعلق آپکے مخصوص نظریات کا ذکر کیا ہے جو مناسب عنوانات کے تحت نذرِ قارئین کئے جائینگے، والامر بید اللہ۔

حدیث کی صحت و عدم صحت تمامتر راویوں کے احوال پر قائم ہے اور اسی ضرورت سے اسمار الرجال نامی فن کو محدثین نے ایجاد بھی کیا اور اختیار بھی۔ حدیث کی یہی وہ ضرورت ہے جسکی بنار پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر ارشاد کے ساتھ سند کا طول وطویل اضافہ کر دیا گیا۔ افسوس کہ آج ہماری درسگاہوں میں جن بنیادی علوم وفنون سے صرف نظر کی جارہی ہے اسمیں اسمار الرجال بھی ہے۔ اسمار الرجال کی طرح اس کا دوسرا ضروری شعبہ "جرح وتعدیل" بھی یکسر چھوڑ دیا گیا حالانکہ مذہبی و فقہی تعصب کی بنار پر بہت سی وہ روایتیں قبول کرلی جاتی ہیں جو کسی خاص فقہی مکتبِ فکر کی تائید کرتی ہوں، اگر فنی نقطۂ نظر سے جانچ پڑتال کی جائے تو سلسلۂ سند میں بہت سی وہ شخصیتیں نظر آئیں گی جنکی حیثیت قطعاً مجروح ہے یا ان رواۃ پر نار وا جرح کا دفتر ملے گا جنکی روایت کسی ناپسندیدہ فقہی اسکول کی تائید کرتی ہو اسلئے کوئی بالغ النظر عالم ہی ردّ و قبول کے ان نالائم فیصلوں پر انصاف کی بات کہہ سکتا ہے اسلئے ضرورت اس بات کی تھی کہ

اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے علم کو ان درسگاہی فنون میں داخل کیا جاتا جنکی باقاعدہ تعلیم جاری ہے مگر اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فن سے اس غفلت کا کیا شکوہ، درسگاہوں میں تو اصولِ حدیث کے فن کو ہی کلیۃً ترک کر دیا گیا بقول شاعر ؎

"وہاں کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے۔"

ایک لے دے کر حافظ ابن حجر عسقلانی کی "نخبۃ الفکر" اصول حدیث میں ہماری درسگاہوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اسکی بھی تعلیم جس لئے دئے انداز میں ہوتی ہے اس سے کچھ ہمارے طلباء ہی واقف ہیں۔ع شاہ صاحبؒ نے حدیث کی اس سب سے بڑی ضرورت کا خیال فرما کر راویوں سے متعلق مناسب تفصیل کا بھی التزام اپنے درس میں فرمایا۔ اسی سلسلہ میں مولانا کاندھلوی کا بیان ہے۔

"اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رُواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے جرح وتعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنا قولِ فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابلِ قبول ہے اور یہ کہ اسکی روایت "حسن" کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں یا قابل رد ہوگی یا قابلِ اغماض، زیادہ تر فیصلہ کا یہ طریقہ ہوتا کہ جب کسی راوی کے جرح وتعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ فرماتے کہ یہ راوی ترمذی کے فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔"

اسماء الرجال کا یہی فن جو زبردست قوت حافظہ کا مطالبہ کرتا ہے اسکے ساتھ وسعت

ع کس کس ظلم کا رونا روئیے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ قرآن وحدیث کو دین کے اہم دو ستون قرار دینے والے جو معاملہ اصولِ حدیث سے کر رہے ہیں ٹھیک وہی انداز اصول تفسیر کے ساتھ بھی چلا آ رہا ہے۔ الامام الدھلوی کی "الفوز الکبیر" جسکی ضخامت پچاس ساٹھ صفحہ سے زیادہ نہیں درسگاہوں میں اصول تفسیر پر نایاب ذخیرہ قرار دیا گیا قدیم اور جدید ذخیرہ میں اصول تفسیر ہی پر جتنا کچھ موجود ہے اسے چھوڑ چھاڑ کر ایک رسالہ کو چمٹ جانا حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ اصول حدیث واصول تفسیر کے ساتھ جو معاملہ اختیار کیا گیا کچھ اسی نوعیت کا معاملہ امام طحاویؒ کی معرکۃ الآراء حدیثی تالیف کے ساتھ بھی برتا گیا حنفیہ کی کل یہی ایک کتاب اور ہزار ہا ہزار حنفی درسگاہوں میں تبرک کی حیثیت سے اسکی تعلیم مظالم کی داستان میں ایک خونچکاں عنوان ہے۔

فالی اللہ المشتکی۔

مطالعہ کا بھی طالب ہے۔ حدیث کے طول وطویل دفتر میں ناقدین نے جہاں کہیں کسی راوی کی تعدیل کی ہے اور پھر کسی مذہبی عصبیت کی بنا پر اسی راوی کو مجروح قرار دیا اسکی تعدیل سے فائدہ اٹھانے کے لئے حدیث کے پورے ہی ذخیرہ پر واقفیت کی ضرورت ہے۔ خدا تعالےٰ نے آپکو یادداشت کی غیر معمولی قوت کے ساتھ جو وسعتِ نظر عطا فرمائی تھی اس سے کام لے کر احناف کے لئے مفید روایتوں اور راویوں سے کام لیتے اور اس سلسلہ میں شافعی المسلک اُن علمار کی زیادتی پر خصوصی توجہ دلاتے جنکا مقصد احناف کے لئے مفید روایت اور رُواۃ کی بیخ کنی ہوتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری سے آپ کی غیر معمولی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جبل العلم، حافظ الدنیا سے آپ کا اشارہ ابن حجر ہی کی جانب ہوتا لیکن جب محسوس فرماتے کہ ابن حجر دانستہ کفِ لسانی سے کام لے کر حنفیہ کے لئے کسی مفید روایت سے سرد مہری کا معاملہ کر رہے ہیں تو ان کے اس طرز کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو گردش دے کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے بارے میں شوافع کے یہاں "اصح ما فی الباب" (یعنی اس باب میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہ ہے) کا جو ترجیحی طریقہ جاری ہے اسکا جب کبھی ذکر آتا تو فرماتے کہ لیجئے شوافع نے "پٹھے ٹٹولنے" کا کام شروع کر دیا۔ اس علمی لطیفہ کی دلچسپ تفصیل فاضل گیلانی سے سنئے لکھتے ہیں کہ

> "اسمار الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو ناقابلِ لحاظ بنا دینا اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا اور آثارِ صحابہ قرآنی آیات کے اقتضار اور اسلام کے کلی قوانین واصول سے چشم پوشی حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرزِ عمل کو روایتوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے تھے۔ جرح کیلئے اما لی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انھوں نے "پٹھا ٹٹولنا" رکھ لیا تھا، فرماتے کہ یہ تو قصابوں کا کام ہوا کہ جو جانور کمزور نظر آیا اسی کو بیخ کر ذبح کر ڈالا۔"

عرض کر چکا ہوں کہ فنِ حدیث کا یہ اہم ترین شعبہ یعنی اسمار الرجال غیر معمولی بصیرت کا مقتضی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ "حجاج بن ارطات" کی ایک روایت جو کسی مسئلہ پر احناف کے لئے مفید ہے شوافع نے اس روایت کو ناقابل قبول ٹھہرانے کے لئے حجاج کی شخصیت پر جو تابڑ توڑ حملے کئے ہیں انمیں ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔

علاّمہ نے فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ حجّاج کو اس جرم کی وجہ سے متروک قرار دیا جائے درانحالیکہ امام دارالہجرۃ ایک مدت تک مسجد میں تشریف نہیں لائے اور اسکے باوجود الامام کی روایتیں بدستور قابلِ قبول ہیں۔ حجّاج کی مدافعت میں جو دقیقہ شاہ صاحب نے دریافت فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کس دقت نظری سے اس فن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ اسی لئے اسمار الرجال جو فن حدیث کا ایک نہایت ہی اہم اور ضروری عنصر ہے شاہ صاحب اس فن کی اہمیت کے پیش نظر درس میں اسکا باقاعدہ اہتمام فرماتے، اسمار الرجال ہی نہیں بلکہ درس میں جن تصانیف کے حوالے پیش کرتے ان کے مصنفین و مؤلفین کے حالات، مصنف کا علمی پایہ اور خود اسکی ثقاہت پر ایک جامع تبصرہ بھی ہوتا جس سے طلبار کو مختصر وقت میں سیر وسوانح کے ساتھ کتاب کی علمی حیثیت بھی معلوم ہوتی اور اس طرز سے نئی کتابوں کے مطالعہ کا شوق و ذوق بھی پیدا ہوتا۔ فاضلِ گیلانی ہی لکھتے ہیں :-

"وہ اپنے عہد کے طلبار کی علمی بے بضاعتی کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً جن مصنفین کے کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت و وفات کے سنین کے ساتھ مختصر حالات اور ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے، ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جسکی بدولت شوقین اور محنتی طلبار ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہو جاتے یا کم از کم مسلح بننے کا ڈھنگ انکو آجاتا تھا۔"

لیکن اسمار الرجال کی طرح یہ کام بھی انتہائی دشوار ہے۔ غیر معمولی حافظہ کے ساتھ وسیع مطالعہ اس سنگلاخ وادی کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے عام مدرسین و اساتذہ اگر اسکا اہتمام نہیں کر پاتے تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے، فاضل گیلانی نے بھی لکھا ہے۔

"لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس و استاذ کے بس کی یہ بات بھی نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس عالم کا ذکر آجائے اسکے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلبار کو آگاہ کرنے پر قادر ہو یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔"

مشفقانہ افادہ کے وہ جذبات جو مرحوم میں بقوۃ موجود تھے اور جسکے تقاضوں کی بنا پر آپ نے اپنے حلقہ درس میں شریک طلبار کی مناسب تربیت کے لئے جن ذیلی اضافوں کا اہتمام

فرمایا تھا۔ انہیں سے ایک یہ بھی تھا کہ دوسرے فن کے اہم مسائل خصوصاً اختلافی مباحث پر واقف کارانہ کلام فرماکر اختلاف کی ابتدا وانتہا اور محاکمہ کرتے ہوئے قولِ فیصل سے طلباء کو اطلاع دیتے۔ جیساکہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے:۔

"عموماً وہ اسکا موقعہ بھی تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلباء وعلماء کے لئے دوسرے متعلقہ علوم وفنون کے جن اصول وکلیات کا جاننا ضروری ہے ان کا ادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان فرماتے جسکے سننے کے بعد معلوم ہوجاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی اور کن کن نقاط سے گذرتے ہوئے موجودہ حال تک پہونچا۔"

اس ساری کدوکاوش سے مقصود طلباء کے ساتھ ان کی وہ غیر معمولی شفقت تھی جس سے ان کا قلب معمور تھا وہ چاہتے تھے کہ طلباء کو اسطرح تیار کردیں کہ آئندہ علمی مرحلوں میں انکے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے۔ اسلئے وہ نہ صرف مطالعہ کا طلباء میں ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے بلکہ انکے پیش نظر مطالعہ کے طریقہ سے بھی طلباء کو آگاہ کرنا تھا۔ خاص اس مقصد کیلئے ان کے سامنے درس میں کتابوں کا انبار رہتا جس سے ضرورت کے وقت بطور حوالہ اصل ماخذ پر نشاندہی فرماتے تاکہ طلباء زبانی حوالوں ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ مسائل میں مدلّل گفتگو کی انھیں عادت پڑجائے۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے مقالہ میں ان کی اسی خصوصیت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے۔

"درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ حدیث کی اور کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے۔"

جیساکہ آپ کے تلامذہ کے متعدد حوالوں سے واضح کیا گیا کہ مرحوم کا درس صرف حدیث ہی کی شرح وتفسیر تک محدود نہ تھا بلکہ حدیث کے عنوان پر ہمہ جہت افادات جنہیں تنوّع کے ساتھ جامعیت وگہرائی ہوتی آپ کے درس کا امتیاز تھا۔ اسکے باوجود جب آپ کسی مسئلہ پر کلام کرتے تو اگرچہ یہ کلام کسی ادنیٰ مناسبت کی بنا پر ہوتا مگر جس جانب بھی طبیعت متوجہ ہوتی اسپر مکمل اور سیر حاصل بحث فرماتے۔ درس میں خصوصی اضافوں میں ایک اضافہ اسرار وحکم کا تھا۔ اسرار وحکم کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے احکام کی علت اور حکمت کو دریافت کیا جائے۔ قرآن حکیم کے احکام جیساکہ معلوم ہے حاکمانہ وحکیمانہ دونوں لب ولہجوں میں انسانوں تک منتقل کئے گئے حاکمانہ لب ولہجہ کسی حکم کو جاری

کرنے کے بعد اسکی حکمت وعلت کا بیان نہیں کرتا جبکہ حکیمانہ انداز بیان میں مصلحت اور حکمت کی مختصر تفصیل آجاتی ہے اسے یوں سمجھئے کہ قبلہ کی تبدیلی پر ایک ان محروم عقل لوگوں کا گروہ تھا جو اس تبدیلی پر سب سے زیادہ چراغ پا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے حکمت آمیز کلام کے مقابل میں حکومتی لب ولہجہ درکار تھا اسلئے خدا تعالٰے نے ان کے جانب روئے سخن فرمایا تو صرف اتنا ارشاد ہوا قُل لِلّٰہِ المَشرِقُ وَالمَغرِبُ (ان معترضین سے کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب کے ہم مالک ہیں اسلئے جو چاہیں حکم دیں) پس جسطرح مالک کو اپنے مکان میں اور خسرو سلطنت کو اپنے ملک میں تمام تصرفات کا پورا اور قانونی حق حاصل ہے ایسے ہی احکم الحاکمین کو اپنی وسیع حکمرانی میں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ پھر اسکے کسی حکم پر اعتراض سرے سے بے معنی ہے۔ دوسری جانب مخاطبین کا وہ گروہ تھا جنھوں نے تبدیلی قبلہ کے حکم کو دل وجان سے قبول کیا۔ ضرورت یہ تھی کہ انہیں اس حکم کی مصلحت سمجھا دی جائے تاکہ وہ مؤمنانہ طمانینت سے بھی سرفراز ہوں اس لئے ان کے لئے ارشاد ہوا۔ الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ۔ (اور یہ قبلہ ہم نے اس لئے تبدیل کیا تاکہ رسول کی اتباع کرنے والے اور حکم کی مخالفت کرکے کفر کی جانب لوٹ جانے والے کھلکر سامنے آجائیں۔

گویا کہ قبلہ کی تحویل سے متعلق چند در چند حکمتوں میں سے یہاں ایک حکمت زیر گفتگو رہی۔ حاکمانہ وحکیمانہ فرق کو قرآن مجید نے اس جگہ جیسے ملحوظ رکھا وہ اس کی معروف بلاغت کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے۔ بہرحال عرض تو یہ کیا جارہا تھا کہ قرآن حکیم التزاماً تو نہیں لیکن کہیں کہیں مصلحت حکم کو کھولتا بھی ہے جیسا کہ روزہ والی آیت میں ارشاد ہے۔ کتب علیکم الصّیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ تم پر فرض کردئیے گئے روزے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض تھے توقع ہے کہ اس سے تم میں تقویٰ پیدا ہوگا۔

اس ارشاد میں روزے کی فرضیت کی مصلحت تقویٰ کو قرار دیتے ہوئے اسے بیان بھی کردیا گیا۔ نماز کے متعلق بھی ارشاد فرمایا۔

تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ کہ وہ تم کو برائیوں اور بدکاریوں سے روکنے والی ہے۔

بہرحال اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ ایک مسلمان سے احکام کی اطاعت کا ہے ایمانی تقاضے حکم کو بلا چون وچرا تسلیم کرنے ہی سے پورے ہوتے ہیں اسلئے قرآن وحدیث دونوں نے اسرار وحکم کے موضوع پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ مگر یہ بھی عجیب بات ہے اسلامی تعلیمات کا متن

یا اجمال ایک دوسری تفصیل وشرح کی جانب منتقل ہوتا رہا۔ قرآن مجید کے اجمال کی سب سے کامل اور کامیاب تفصیل حدیث ہے اور حدیث میں جو کچھ اجمال باقی رہ گیا اسکے ایک حصہ کا بیان فقہاء نے کیا اور دوسرے جزء کی تشریح وتفصیل صوفیا علیہ الرحمہ نے کی۔ پس جسطرح فقہ اسلام کا ایک لاینفک عنصر ہے احسان وسلوک بھی ضروری عنصر ہے۔ غرضیکہ اسلام میں نہ فقہاء سے بے نیازی برتی جاسکتی ہے اور نہ صوفیاء ہی سے۔ اسلئے علامہ کا خاص دستور تھا کہ وہ حدیث کے اسرار وحکم بلکہ مجموعہ شریعت کے مصالح پر طویل کلام فرماتے۔ یوں بھی آپ کو صوفیاء سے ایک غیر معمولی عقیدت تھی۔ یہی تأثر کبھی کبھی ان الفاظ میں آپ کی درسگاہ میں سناجاتا کہ

"صوفیاء کی دل پسند باتوں سے قلب ودماغ مطمئن ہوتے ہیں جبکہ مناطقہ وفلاسفہ کے ہفوات سے ایک نہ ختم ہونیوالی تشویش پیدا ہوتی ہے"

بلکہ قرآن حکیم اور بعض اختلافی احادیث میں جہاں مختلف اقوال کے ایک صحرا کی رہ نوردی کے باوجود تشفی نہیں ہوتی مرحوم اس قیل وقال میں صوفیاء ہی کی تحقیق کو اطمینان بخش قرار دیتے۔ سورۂ والنجم میں وہی معرکۃ الآراء اختلاف کہ آپ کی زبانِ مبارک پر والعیاذ باللہ بتوں کی تعریف میں تلك الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی (یہ لمبی لمبی گردن والے بت ان کی شفاعت کی توقع کی جاتی ہے)، جاری ہوگیا اور بتوں کی یہ تعریف سنکر کفار مسرت سے جھوم اُٹھے۔

روایت کے اعتبار سے ابن حجر جیسے بلند پایہ محقق کو اصرار ہے کہ کثرتِ طرق کی بناپر روایت کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتی ہے۔ ابن حجر اور دوسرے محدثین کی اس اصرار پر جاننے والے جانتے ہیں کہ علمی حدود میں یہ مسئلہ اپنے دوررس نتائج کے اعتبار سے کیسی خوفناک کشاکش کا باعث ہے۔ مرحوم نے اس ساری بحث میں عبد العزیز دباغ صاحبؒ تبریز کی صوفیانہ تحقیق کو مکمل قرار دیتے ہوئے فیصلہ کی اہم بنیاد قرار دیا ہے۔ خاکسار نے تو نمونہ کے طور پر ایک مثال ذکر کردی۔ آپ کی املائی تقریر "فیض الباری" میں اسطرح کے بہت سے نمونے مل سکتے ہیں۔ غرضیکہ آپ اسرار وحکم کو ایک اہم اور ضروری علم قرار دے کر اپنے درس میں اس کا ذکر فرماتے۔ مجھ ہی سے آپ سُن چکے ہیں کہ تواضع اور انکسار جس کا آپ پر پورا پورا غلبہ تھا اس کے نتیجہ میں "ہمہ دانی" کا دعویٰ تو درکنار "ہیچ ندانم" کا نعرہ آپ کی زبان پر رہتا لیکن اسکے باوجود جن دوچار علوم سے اپنی مناسبت کا تذکرہ ہوتا۔ ان میں معانی وبلاغت، اعجاز قرآن اور اسرار حکم کا خاص طور پر ذکر فرماتے کبھی یہ بھی فرماتے کہ

"اسرار و حکم کو بجز شیخ محی الدین ابن عربی کے سب سے زیادہ میں جانتا ہوں
بلاشبہ شیخ اکبر اس فن میں مجھ پر فائق ہیں"۔

شیخ اکبر سے اسی غیر معمولی عقیدت کی بنا پر اسرار و حکم کے موضوع پر ان کے اقوال یا پھر عبدالوہاب شعرانی کی تحقیق پیش فرماتے۔ الکاندھلوی نے بھی اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اسرار شریعت میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ شعرانی کا کلام
ہمیشہ نقل فرماتے"۔

اسرار و حکم کے بیان سے شرعی احکام کو معقول سمجھنے کے ساتھ انکی قبولیت کیلئے بھی دل و دماغ کے دریچے کھل جاتے ہیں اسلئے درس کا یہ رُخ بھی بڑی افادیت کا حامل رہا مگر افسوس کہ جہاں ہماری درسگاہوں میں اور بہت سے ضروری علوم چھوٹ گئے ان کے ساتھ اسرار و حکم کا فن بھی رخصت ہوا۔

علماء و طلباء تو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں لیکن جو نہیں جانتے انہیں کو سمجھانے کیلئے اس کلپترہ گوئی سے کام لینا پڑ رہا ہے کہ اہل علم پر اٹھائے ہوئے بہتان و افتراء جس سے دوچار امت کے عام ہی ممتاز و منفرد اشخاص ہوتے رہے انہیں میں امام ابوحنیفہؒ کی بھی ستودہ صفات ذاتِ گرامی ہے۔ حسب و نسب سے لیکر ان کی شخصیت، علم، تفقہ، دیانت و تقویٰ، رائے اور حزانت، کونسا وہ گوشہ ہے جو مخالفین کی نکتہ چینیوں سے محفوظ رہا ہو، چنانچہ چلا ہوا اور عام ایک اعتراض اس جلیل امام پر مسلسل یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ حدیث سے وہ سراسر ناواقف تھے یا ان کے فقہ کی تمامتر بنیاد ذاتی رائے و قیاس پر ہے۔ حیرت یہ ہے کہ کہنے والوں اور سننے والوں نے آخر یہ کیوں نہ سوچا کہ بھلا اسلامی فقہ کا استخراج و استنباط کرنے والا حدیث سے کس طرح بے نیاز ہوسکتا ہے۔ عوام سے تو نہیں پوچھنا ان خواص سے ہے جو امام الائمہ پر اس اعتراض کو جڑنے کے لئے پھیپھڑوں کی تمام ہی قوت استعمال کر رہے ہیں۔ آخر بتائیں کہ فقہ کی چار اہم بنیادیں (یعنی قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس) قرار دے کر پھر امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کو مستقل فقہ مانتے ہوئے حدیث جیسے اہم جز سے بے اعتنائی کا الزام آخر کس معقول بنیاد پر ہے مگر جہاں نبی کو کاہن، ساحر اور شاعر کہنے والے اور قرآنِ حکیم کو اساطیر الاولین بتانے والے موجود رہے اور ان کی ناگفتنی کو بھی سننا پڑا تو غریب امام ابوحنیفہؒ کے متعلق اگر کچھ کہا جا رہا ہے تو خواہی نخواہی

اسکو سننا ہی ہوگا۔
شاہ صاحب جنھیں فقہ حنفی کے مطابق للحدیث ہونے کا پورا یقین تھا اور جنھوں نے تیرھویں صدی میں حنفیت کی خدمت اور اس کے استحکام میں تاریخی کردار ادا کیا (تفصیل کے لئے اس عنوان سے متعلق مفصل باب آگے آتا ہے) اپنے درس میں احناف کے ماخذ کی خصوصی نشان دہی فرماتے کبھی کبھی مختلف اقوال میں جب کسی قول کو ایک دوسرے کے مقابل میں راجح و مرجوح یا قوی وضعیف کے دائروں میں سمیٹنا مشکل ہوتا تو اپنی تحقیقی رائے پیش فرماتے جیسا کہ مولانا کاندھلوی ؒ نے لکھا ہے کہ

"فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو اس مذہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہیں پھر اُن کا شافی جواب اور امام اعظم ابو حنیفہ ؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے۔"

حنفیت، شافعیت بلکہ چاروں ہی فقہ متقدمین اور متاخرین کی جس تاریخی تقسیم میں بٹ گئے ان دونوں جماعتوں میں ان کا اعتماد اور بھروسہ متقدمین پر زیادہ تر تھا جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے۔

"نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے بلکہ معمولاً متاخرین کی نقول پر متقدمین کی نقول کو مقدم رکھتے۔"

بلکہ ان کی کوشش زیادہ تر یہ رہتی کہ اگر کسی اختلافی مسئلہ میں مجتہد اور خود صاحبِ مذہب کی کوئی تحقیق اور قول ہاتھ لگ جائے تو اسی کو بنیاد بنائیں محولہ بالا مقالہ ہی میں ہے۔

"ائمہ اجتہاد کے اصل قول پہلے نقل فرماتے اور مشائخ کے اقوال بعد میں۔"

یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ خلافیات کے معرکۃ الآراء مباحث و مسائل میں خود انکی محققانہ رائے ہوتی جسے سننے والا سنکر مطمئن ہوتا۔ اس ذیل میں مولانا کاندھلوی رقم طراز ہیں۔

"مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلادیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلباء کیلئے موجبِ طمانیت ہوتا۔"

غرضیکہ آپ نے چالیس سالہ درسِ حدیث میں غیر متزلزل بنیادوں پر یہ حقیقت روشن کردی کہ نعمان ابن ثابت الکوفی الکنیۃ بابی حنیفہ طاب ثراہ پر یہ الزام کہ انھوں نے حدیث سے ہٹکر

رائے وقیاس سے فقہ کی تعبیر کی ہے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے والقصۃ بطولہا۔

فہرست تلامذہ:۔ مشہور مقولہ ہے کہ درخت کا بہترین تعارف اس کے اپنے پھل ہیں صدیاں گزرنے کے باوجود اس مشہور مقولہ کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، ہے مستثنیات تو وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی غزارۂ علمی عبقریت و نابغیت کے بلند و بالا شواہد تو وہ تاثرات بھی ہیں جو ان کے اساتذہ، معاصرین بلکہ ان کے بزرگوں سے منقول ہیں لیکن حلقۂ درس میں اُنکے افادات علمی تربیت اور دانش وبینش کا فیضان اُن سینکڑوں تلامذہ سے بھی نمایاں ہے جنھیں اُن سے شرفِ تلمذ رہا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کم از کم نصف صدی سے ہندوستان بشمول پاکستان کی مصروف زندگی اور اسکے نمایاں گوشوں میں مرحوم کے "تلامذہ اسطرح برسرکار ہیں کہ وہ خود اپنے استاذ کا کامل تعارف بن گئے۔ چالیس سال سے زائد آپ کی درس وتدریس کی مدت ہے اسمیں سینکڑوں ہی طلباء نے آپ سے استفادہ کیا۔ جن ممتاز افراد اور نامور شخصیتوں کا تذکرہ آرہا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ مرحوم کے حلقۂ درس سے علم وعمل اور فضل وکمال کے کیسے آفتاب وقمر تیار ہوکر نکلے۔ اپنے بزرگوں سے سنا ہوا یہ مقولہ دارالعلوم کے تاریخی ادوار اور مختلف زمانوں کی روایات وخصوصیات کے لئے بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ

> "دارالعلوم کے بعض صدارتِ تدریس کے عہد ایسے گزرے جسمیں دارالعلوم کے درودیوار سے ہر وقت "ذکراللہ" کی صدائیں آتیں اور صبح وشام اسی کے چرچے رہتے اور حضرت شاہ صاحب کے دور میں علم ومطالعہ تحقیق وتجسّس، اکابر امت کے تفردات، انمیں ردّ وقبول کی بحثیں اور نت نئی موشگافیاں طلباء کا عمومی ذوق تھا۔"

راقم السطور کی نظر سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی سوانح گزری اسمیں ہے کہ ان خلیفۂ راشد کے میمون عہد میں ذوقِ عبادت عام لوگوں کے ذہنوں پر اسطرح مستولی تھا کہ صبح اٹھنے کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات میں دریافت کرتے کہ "گئی ہوئی رات میں تم نے تہجّد کی کتنی رکعتیں پڑھیں یا آج دن میں تم کس قدر عبادت کا اہتمام کروگے؟"

مشہور ہے کہ الناسُ علیٰ دینِ مُلوکِهِمْ (ملوک سے تبادر تو بادشاہانِ وقت ہی ہیں) لیکن اسکی گنجائش ہے کہ اسکے مفہوم کو وسیع کرتے ہوئے ذمہ دار اشخاص ورجال بھی اسمیں شریک کردیے جائیں پھر دارالعلوم کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا وہ بے تکلف اس مقولہ کی صداقت کا ایک

مضبوط شاہد ہوگا اور اسمیں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ مرحوم کے تلامذہ کا آج تک ذوقِ علمی مجروح و مضمحل نہیں. آپکے وہ مستفیدین جو زندگی کے دوسرے گوشوں میں براہِ راست داخل ہوگئے ان کی خصوصی مجلسیں گواہ ہیں کہ حلقۂ درس میں جو چھاپ انپر لگی تھی اسے وقت کے ہنگامے مٹا نہ سکے، عہد ساز شخصیتوں کی یہ خاص علامت ہوتی ہے کہ انکے حلقہ سے اٹھنے والے ان شخصیتوں کے گہرے اثرات کو زمانۂ دراز تک منتقل کرتے ہیں. انکے درس کی اہم خصوصیات کا مرقع آپکے سامنے آیا جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر منفرد تھا. اس درس کی افادیت پر شواہد کے بطور یہ مختصر فہرست تلامذہ "درسی خصوصیات" کے بعد مناسب ترین ہے۔

نمبر	نام	نمبر	نام
۱	حضرت مولٰینا شاہ عبد القادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ	۱۱	حضرت مولٰینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم
		۱۲	" " بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی رح
۲	" " مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رح خلیفۂ اجل حضرت تھانوی رح	۱۳	" " مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی مرحوم
۳	" " شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ	۱۴	" " حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی محدث شہیر
۴	" " فخر الدین صاحب رح شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند	۱۵	" " عبد اللہ صاحب مرحوم نقشبندی خانقاہ کندیاں
۵	" " عبد الرحمان صاحب کیمل پوری رح سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور	۱۶	رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی رح
		۱۷	خطیب العصر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم
۶	شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رح امروہوی (خصوصی استفادہ کیا)	۱۸	مولانا محمد انوری لائلپوری رحمۃ اللہ علیہ
		۱۹	" مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سربراہ ندوۃ المصنفین دہلی
۷	حضرت مولٰینا مناظر احسن گیلانی مرحوم		
۸	" " قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند	۲۰	" محمد منظور نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" لکھنؤ
		۲۱	" محمد سعید صاحب اکبرآبادی مدیر "برہان" دہلی
۹	مجاہد ملت مولٰینا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند	۲۲	" یوسف صاحب بنوری مدظلہ بانی مدرسہ اسلامیہ عربیہ کراچی
۱۰	حضرت مولٰینا محمد میاں صاحب دیوبندی رح سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند	۲۳	" قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی رکن شوریٰ دار العلوم

٢٤ مولینا حامد الانصاری غازی صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم
٢٥ ڈاکٹر مصطفےٰ احسن علوی کاکوروی صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم
٢٦ مولانا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ
٢٧ ” مشیت اللہ صاحب مرحوم رئیس بجنور
٢٨ علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم سابق اڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور
٢٩ مولانا محمد طاہر صاحب دیوبندی ابن حافظ احمد صاحبؒ
٣٠ ” ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری
٣١ ” قاسم صاحب ”
٣٢ ” شمس الحق صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست قلات
٣٣ ” محمد ادریس صاحب میرٹھی ثم کراچوی
٣٤ ” محمد یسین صاحب شیخ الحدیث احیاء العلوم مبارک پور
٣٥ ” سیف اللہ شاہ صاحب کشمیری
٣٦ ” محمد یوسف صاحب میر واعظ کشمیری
٣٧ ” میرک شاہ صاحب کشمیری مرحوم
٣٨ ” محمد مصطفےٰ کشمیری مرحوم سابق اسپیکر اسمبلی برائے ریاست کشمیر
٣٩ ” مفتی محمود صاحب نانوتوی مرحوم
٤٠ ” حمید الدین صاحب فیض آبادی مرحوم
٤١ ” حبیب الرحمان صاحب مکی
٤٢ ” اسلام الحق صاحب اعظمی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند
٤٣ مولینا شمس الدین صاحب افغانی
٤٤ ” جلیل احمد صاحب سابق استاذ دارالعلوم دیوبند
٤٥ ” محمد میاں سملکی مرحوم افریقہ
٤٦ ” پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹی ثم کراچوی
٤٧ ” محمد یوسف اسماعیل صاحب گارڈی رئیس اعظم افریقہ
٤٨ ” محمد ادریس مرحوم سکھروڈھوی
٤٩ ” حکیم محفوظ علی صاحب مرحوم
٥٠ ” حکیم محمد اسماعیل دہلوی مرحوم
٥١ ” احمد رضا صاحب بجنوری مؤلف "انوار الباری"
٥٢ ” حکیم محبوب الرحمٰن صاحب بجنوری
٥٣ ” محمود صاحب گیاوی
٥٤ ” عبدالقدیر صاحب کیمبلپوری
٥٥ ” محمد صدیق صاحب مرحوم استاذ النحو مظاہر العلوم سہارنپور
٥٦ ” ظہور احمد صاحب مرحوم سابق استاذ دارالعلوم
٥٧ ” اختر حسین میاں صاحب استاذ دارالعلوم
٥٨ ” محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی سابق استاذ ”
٥٩ ” سعید احمد صاحب گنگوہی استاذ دارالعلوم
٦٠ ” سیف الرحمٰن صاحب استاذ شعبۂ دینیات پشاور یونیورسٹی
٦١ ” فیوض الرحمٰن صاحب عثمانی
٦٢ پروفیسر انوار الحق علوی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

۶۳	مولانا کریم بخش صاحب سابق پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور
۶۴	" غلام اللہ خانصاحب مفسّر قرآن راولپنڈی
۶۵	" محبوب الٰہی صاحب بنگلوری سابق پروفیسر اورنٹیل کالج دہلوی
۶۶	" محمد یحییٰ صاحب لدھیانوی
۶۷	" لطف اللہ صاحب پشاوری
۶۸	" عبدالحی حقانی
۶۹	" عبدالکبیر صاحب کشمیری
۷۰	" صدیق حسن صاحب نجیب آبادی مؤلف "انوار المحمود"
۷۱	" فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ ریاست حیدر آباد
۷۲	" تاج الاسلام صاحب سابق شیخ الاسلام مشرقی پاکستان
۷۳	" محمد علی جالندھری مرحوم خطیب پاکستان
۷۴	" آلِ حسن صاحب مقیم میرٹھ
۷۵	" شارق احمد صاحب عثمانی سابق ایڈیٹر "عصر جدید" کلکتہ
۷۶	" محمد یعقوب صاحب چاٹگام
۷۷	" عبدالوہاب " "
۷۸	" ریاست علی صاحب فتحپور
۷۹	" اطہر علی صاحب سلہٹ
۸۰	" فصیح الدین صاحب بہاری
۸۱	" عبدالحنان صاحب ہزاروی

۸۲	مولانا فیض اللہ صاحب چاٹگام
۸۳	" محمد اکھلوایہ مرحوم افریقہ
۸۴	" ایم، آئی ناتا
۸۵	" مفتی بسم اللہ صاحب مرحوم گجراتی
۸۶	" محمد یٰسین صاحب برما
۸۷	" تاج الاسلام صاحب کمرلا
۸۸	" محمد ایوب صاحب اعظمی صدر مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
۸۹	" نثار احمد صاحب دربھنگہ
۹۰	" شاہ عثمان غنی صاحب پھلواری شریف پٹنہ
۹۱	" حکیم جلیل صاحب دہلوی
۹۲	" خواجہ عبدالحی صاحب جامعہ ملیہ
۹۳	" محمود اللہ صاحب ڈھاکہ
۹۴	" محمد یحییٰ صاحب لدھیانوی
۹۵	" لطف اللہ صاحب پشاوری
۹۶	" قاری اصغر علی صاحب مرحوم سابق استاذ دار العلوم دیوبند
۹۷	" مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی
۹۸	" حشمت علی صاحب سہارنپوری سابق مہتمم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۹۹	" عبدالکبیر صاحب کشمیری
۱۰۰	" سلطان محمود صاحب سابق صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی
۱۰۱	" قاضی شمس الدین صاحب سابق استاذ دار العلوم دیوبند
۱۰۲	ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ

نمبر	نام	نمبر	نام
١٠٣	مولینا عزیز الحق صاحب مرحوم بہاری	١١٠	خواجہ حسن نظامی دہلوی (مشہور ادیب)
١٠٤	〃 اسماعیل صاحب سنبھلی مرحوم	١١١	مولینا ریاست علی صاحب سلہٹ
١٠٥	〃 عبد العزیز 〃 کاملپوری 〃	١١٢	〃 مفتی عبد الرحمٰن صاحب بھاولپوری
١٠٦	〃 عبد اللہ خانصاحب کرتپوری	١١٣	〃 سید جمیل الدین صاحب میرٹھی
١٠٧	〃 غلام غوث صاحب سرحدی	١١٤	〃 موسیٰ بھام جی صاحب
١٠٨	〃 حمید حسن دیوبندی مرحوم	١١٥	〃 حمید احمد صاحب حیدر آبادی
١٠٩	〃 حبیب اللہ صاحب سلطانپوری	١١٦	〃 مفتی عبد الرحمٰن صاحب بھاولپوری

حنفیت کی ترجیح و استحکام:- اور یہی قصہ جسکی طوالت قلم گیر ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی سوانح میں ایک نمایاں وجلی عنوان کی حیثیت میں شریک رہے۔ ممدوح نے اپنی زندگی کا نصف حصہ حنفیت کے استحکام اور حدیث وقرآن سے اسکی مطابقت نمایاں کرنے میں صرف کر دیا۔ جس زندگی کا پچاس سالہ طویل وقت ایک خاص مقصد کے لئے گذرتا رہا۔ سوانحی خاکہ میں اسکا نظرانداز کرنا کس طرح ممکن ہے اسلئے ان کے سوانح نگار کو اس عنوان کی گرہ کشائی بہرحال کرنا ہوگی۔ یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ دار العلوم جن اساسی تصورات پر قائم ہے ان اجزاء ترکیبی میں حنفیت کا استحکام وترجیح، اس کا فروغ واشاعت قوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے ایک بلندپایہ فاضل اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے نامور شاگرد مولانا عبید اللہ[ع] سندھی جن کے شب وروز افکار ولی اللٰہی کی اشاعت اور قاسمی فکر وطرز

ع یہی چودھویں صدی جبکی شاداب فضاؤں سے نکلکر یکایک خزاں کے سموی جھکڑوں سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں جاننے والے جانتے ہیں اسکی ابتدا کارآمد وکارگر شخصیتوں کی نمود ونمائش کا دور شباب اور خاتمہ سود مند شخصیتوں کی فراہمی سے محرومی کا حسرتناک انجام ہے۔ دار العلوم اپنی زندگی کے دوسرے عہد سے گذر رہا تھا کہ ایک سکھ خاندان کا فرد جو واقعی اپنی خصوصیات میں فرید تھا عبید اللہ نام، سندھ وطن اور ابتداہی میں عبید اللہ نامی ایک نومسلم کی تصنیف "تحفۃ الہند" سے اسلام کا حلقہ بگوش ہوا اور اسی مصنف کے نام پر اپنا نام رکھا۔ اسلام کے مبادیات سے واقف ہوکر دار العلوم پہونچا اور شیخ الہند کے آتشی نفوس نے پہلے سے جمع شدہ خس وخاشاک میں آگ لگادی۔ اپنی غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور اجاگر صلاحیتوں کی بنا پر اس درسگاہ کا ایک فاضل جلیل کہلایا اور پھر ریشمی رومال کی تحریک کا ایک ایسا فعال کارکن کہ "رولٹ کمیٹی" کی رپورٹ میں ان ہی مولانا عبید اللہ سندھی کو تحریک کا دماغ قرار دیا۔ افغانستان میں ہندوستان کی پہلی جلاوطن (باقی آگے)

کی ترجمانی وشرح میں بسر ہوئے وہ دارالعلوم کے بنیادی فکر کو عناصر اربعہ سے مرکب قرار دیتے ہوئے ایک اہم جز حنفیت کی صداقت پر کامل یقین بتاتے تھے۔ نہ جاننے والوں کے لئے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ سندھ کا یہ مردِ غیور جن افراد واشخاص کے دامنِ تربیت سے خصوصی وابستگی رکھتا دارالعلوم کے عناصرِ اربعہ سے واقفیت ایک وراثت کے طور پر مرحوم تک پہونچی تھی اسلئے ان عناصرِ اربعہ کی دریافت مولانا کی اختراعی صلاحیتوں کا کارنامہ نہیں بلکہ اکابر سے منتقل ایک راز ہے جسے اگلوں سے پچھلوں تک منتقل کر دیا گیا۔ شیخ الہندؒ کے متعلق معتبر ذرائع سے یہ لطیفہ بھی سنا گیا کہ جس مسئلہ میں ابوحنیفہ الامام کو منفرد پاتے تو طلبہ تک یہ نعرۂ حق پہونچا کہ

"بھائی حق یہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا، بات اتنی دقیق تھی کہ سوائے امام ابوحنیفہؒ کے کسی اور کی نظر یہاں تک پہونچ نہ کی۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے کہ ۱۰۰ سو سال کے عرصہ پر خداتعالیٰ ایک ایسی شخصیت کو پیدا کرے گا جو دین کی تجدید کرے گا۔ چودہ سو سال کے عرصہ میں دین پر ہر جانب سے جو تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے بلکہ خود اہلِ دین کی جفائے وفانما سے جسطرح اسکی شکل بدلتی رہی قدرتی طور پر اس ابدنشاں دین کی تطہیر کے لئے مجدد کی ضرورت ایک بدیہی امر ہے۔ اسلام کی طویل تاریخ میں سینکڑوں اشخاص مجدد دین کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے اس امت کو جس وقت جسطرح کی ضرورت پیش آئی خداتعالےٰ نے اسکی تکمیل فرمادی۔ ضرورت تھی کہ مجاہدین کا جم غفیر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع ہو تاکہ دین کی مخالف قوتوں کے سرچشموں کو بقوت بند کر دیا جائے تو سینکڑوں نہیں بلکہ ایک لاکھ کے قریب حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قدوسی ہجوم جاں سپاری

صفحہ ۱۷۰ کا بقیہ:- گورنمنٹ کی داغ بیل جسکے سربراہ راجہ مہندر پرتاب تھے۔ مولانا ہی کا کارنامہ ہے، افغانستان روس، جرمنی اور حجاز میں جلا وطنی کا طویل وقت گذارنے کے بعد ہندوستان لوٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر کی اشاعت خصوصی مشغلہ قرار دیا۔ اجتہادی بصیرتوں کے ساتھ سیاسی داؤ پیچ کو سمجھنے اور اس کی کاٹ کی جن وافر صلاحیتوں سے بہرہ مند تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مخصوص افکار ونظریات کے موسس وداعی تھے مگر افسوس کہ ملک وملت ان نظریات کو قبول نہ کر سکے اور یہ تو کیسے ممکن تھا کہ مرحوم جیسا مجتہد کسی تقلید کے قلادہ کو اپنی آزاد گردن میں ڈالتا۔ چنانچہ یہ سیماب وار زندگی سندھ کی ریگستانی فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے تحلیل ہوگئی۔

فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

وجاں نثاری کی عاشقانہ اداؤں کے ساتھ موجود و مہیا تھا۔ اس کارزار کی تاریخ پڑھ جائیے جو سرورِ کائنات فداہ ابی وامی کی زیرِ قیادت بدر وحنین کی صورت میں وجود پذیر ہوا اور جس فدائیت کا مظاہرہ مجاہدین کی جانب سے ہوتا رہا جسکی مؤثر وبلیغ تعبیر قرآنی الفاظ میں یہ ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ احزاب ع ۲۲۔ (ان مومنین میں ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اسمیں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔)

گویا کفن بردوش یہ قدسی ہجوم کارزار میں جاں سپردگی کا عہد کر کے جاتا۔ دنیا میں لاکھوں چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں جنکی تاریخ بھی آج تک محفوظ چلی آتی ہے لیکن موت کو اپنی ایک ضرورت وتمنا کا درجہ دینا یہ صرف اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے[عـہ]۔ اسی طرح جب اسلامی ریاست کو حکمراں طبقہ کی ضرورت پیش آئی تو وہ مدبر طبقہ سامنے آیا جن کے ناخنِ تدبیر نے رشتۂ کار میں پڑی ہوئی ہر گرہ کو کھول کر رکھ دیا۔ بیدار مغز، بے لوث، عدالت پسند، زہد پیشہ، متوکل حکمراں کا ایک ایسا گروہ جس کی نظیر پیش کرنے سے ماضی ومستقبل ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ جنکی راتیں عبادت کے سفر و گداز سے آشنا اور جو دن کے اجالے میں قصرِ امارت کے فقر پسند حاکم تھے اور اگر جمع قرآن کی امت کو ضرورت ہے تو ایک ایک حرف جمع کر لیا گیا۔ تدوینِ حدیث کا مرحلہ سامنے ہے تو احتیاط کی چھلنی میں احادیث کو اسطرح چھانا گیا کہ اس کوثر و تسنیم کے چشموں میں کدورت کا نام ونشان نہ چھوڑا اور جب قرآن وحدیث سے ماخوذ اسلامی قانون کی جمع و ترتیب امت کی سب سے بڑی ضرورت بنکر سامنے آئی تو دنیا کے بہترین قانون ساز ادارے وجود پذیر ہوئے اور وہ ماہرِ قانون سامنے آئے جنہیں اسلامی اصطلاح میں فقہاء کہا جاتا ہے۔ ذکاوت و ذہانت، ثقاہت و رزانت، ورع و تقویٰ، احتیاط و موشگافی، علم کی گہرائی و گیرائی، دور اندیشی و دقت نظری

عـہ اپنی مختصر زندگی میں ایک عظیم ملک کی فوج ظفر موج کے متعلق ثقہ ذرائع سے یہ سننے میں آیا کہ ان کو جب فوجی ٹرکوں میں بھر کر محاذِ جنگ پر لے جایا جارہا تھا تو ان میں سے کچھ قضائے حاجت کے بہانے اترے اور ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئے۔ اور یہ چشمدید ہے کہ محاذ پر درآمد کئے جانے والے "بہادر نوجوان" موت کے خوف کی بنا پر موتوا قبل ان تموتوا کا منظر پیش کر رہے تھے۔

اس جماعت کا وہ ممتاز وصف ہے جسمیں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں۔ اب قیامت تک مصنوعی اجالوں سے لبریز یہ دنیا ابوحنیفہ الامام، امام دار الہجرہ، الشافعی الفقیہہ، امام بطل وحریت احمد بن حنبل کی نظیر نہیں دیکھ سکتی۔

اسلئے خاکسار کی ناقص رائے سالہا سال سے یہ چلی آتی ہے کہ دین کی حفاظت کا جو وعدہ ایفائے عہد میں سب سے زیادہ سچی و پکی مقتدر ہستی خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا تھا اس کے ایفائی مناظر چودہ سو سال کے طویل وعریض عرصہ میں ہمیشہ سامنے آتے رہے اور رہیں گے۔ پس مجدد دین کا تعلق دین کے کسی خاص شعبہ سے نہیں بلکہ اس منصب کا دائرۂ کار دین کے تمام ہی شاخوں پر حاوی اور پھیلا ہوا ہے۔ اس تمہید کے بعد عرض یہ کرنا ہے کہ صاحب سوانح حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس ہماری چودھویں صدی میں اپنے تجدیدی کارناموں کے اعتبار سے حنفیت کے لئے لاریب مجدد تھے۔ خود مرحوم نے بھی اس حقیقت کا اظہار فرمایا۔ مولانا بنوری اسی سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ درس میں اظہار ان الفاظ میں ہوتا کہ

"خدا تعالیٰ نے مجھے اس عہد میں حنفیت کے استحکام کے لئے پیدا کیا ہے۔"

ایک موقعہ پر یہ بھی فرمایا کہ

"میں نے حنفیت کو اس درجہ مستحکم کر دیا کہ اب انشاء اللہ ۲۰۰ سو سال تک اسمیں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

حقیقت پر مبنی ان جملوں کی حقیقت واضح تر کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل درکار ہے جسمیں اضطراری طوالت کے لئے قارئین سے معذرت طلب ہوں۔ تقلید و عدم تقلید کی جو آویزشیں بدقسمتی سے رونما ہوئیں وہ امت کے لئے ایک ہائلہ ہے۔ بات بہت آسان تھی کہ قرآن وحدیث سے قانون کے استخراج، پھر قانون کی تدوین، کلیات وجزئیات کی ترتیب کے لئے ایک طبقہ کا وجود امت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ پھر یہ بھی سامنے کی حقیقت ہے کہ صلاحیتیں تفاوت، علوم میں فرق وامتیاز ماحول اور گرد وپیش کے تقاضے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے اسکے نتیجہ میں فقہ کے طول وطویل انبار میں عدم یکسانیت لازم تھی ادھر انسانوں کا عام ہجوم سہولتوں کا طالب اور سہل پسندی کا خوگر ہے۔ اس خطرہ کا سد باب کہ شریعت کی پابندی میں کہ فقہ اسی کی دوسری تعبیر ہے۔ اپنی سہل انگاریوں کو بروئے کار لاکر دین کا استہزاء اور تلاعب بالدین خواہی نخواہی

شروع کر دیا جائیگا۔ تدارک اس کا تقلید کی جکڑ بندیوں کے سوا اور کیا تھا۔ حکمت آمیز، پر از تدبیر ایک فیصلہ تقلید کی شکل میں سامنے آیا اور دین کے یسری پہلو کے پیشِ نظر اس امت کو چار فقہوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا مگر یہ بدقسمتی بھی زلزلۃ الارض سے کم خوفناک نہیں کہ سلفیت کے نام پر دین سے وابستہ رکھنے کی تدبیر جنگ وجدل کا پیش خیمہ بن گئی اور ان ستم رانیوں کا خصوصی شکار حنفیت ہے۔

فقہِ حنفیت پر خصوصیت سے دو اعتراض ہمیشہ کئے جاتے رہے۔ ایک یہ کہ فقہ حدیث کے بالکل مخالف ہے (۲) اسکی تمامتر بنیاد قیاس واجتہاد پر ہے۔

مؤخر الذکر اعتراض تو اس حیثیت سے بھی کوئی وزن نہیں رکھتا کہ امت میں طے شدہ فیصلہ کے مطابق اسلامی قانون کے عناصرِ اربعہ میں قیاس خود بنیادی حیثیت کا مالک ہے پس قیاس پر مبنی مسائل عناصرِ اربعہ سے باہر یا مخالف کوئی چیز نہیں۔ چاروں فقہاء نے قیاس سے کام لیا ہے۔ رہ گیا کثرت وقلت کا معاملہ کہ کسی نے قیاس سے زیادہ کام لیا اور کوئی قیاس سے کم کام لیتا ہے۔ یہ نکتہ چینیوں کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اول الذکر اعتراض یعنی امام اعظمؒ کا فقہ حدیث کے مخالف ہے تو شاید ہی دنیا میں اس سے بڑھکر جھوٹ بولا گیا ہو۔

حدیث کی امہات کتب میں طحاویؒ کی معانی الآثار جس حیثیت کی ہے اہلِ علم جانتے ہیں کہ مکمل حنفیت پر سدا بہار گلشن امام موصوف کا یہ قلمی کارنامہ ہے۔ فقہ کی مشہور ترین کتاب ہدایہ، اسکی شروحات، خصوصاً ابن ہمام کی فتح القدیر، تخریج میں زیلعی کی نصب الرایہ سب کتابیں فقہِ حنفی کی اُن مستدلات پر مشتمل ہیں جن کا تعلق احادیث میں فقہ حنفی سے ہے۔ متاخرین میں مولانا شوق نیمویؒ کی "آثار السنن" "حضرت تھانویؒ کی اعلاء السنن" مولانا عبد اللہ نقشبندی کی زجاجۃ المصابیح حنفی فقہ پر چلے چلائے اسی اعتراض کا شافی جواب ہے اور حال ہی میں پاکستان سے شائع ہونے والی ایک طویل وعریض کتاب "امام ابوحنیفہ اور علم حدیث" نے تو اس بے بنیاد اعتراض کو مفلوج ہی کر ڈالا۔

بہرحال مجھے تو یہ عرض کرنا تھا کہ ہندوستان میں سلفیت کے نام پر اٹھائے ہوئے ہنگامے سے خدا جانے اسلام کو کس سانحہ سے دوچار ہونا پڑا لیکن خدا تعالےٰ نے دار العلوم کی شکل میں حنفیت کے استحکام کا ایک مضبوط ترین ادارہ قائم کیا اور مولانا انور شاہ ایسے بالغ النظر عالم جلیل کی اس سلسلہ کی تجدیدی کوششیں سونے پر سہاگہ ہیں۔ آپ نے فقہ حنفی کے مستدلات

کو واضح فرماتے اور حدیث میں ان مواقع کی نشاندہی درس کا خصوصی عنصر تھا جو امام ابوحنیفہؒ کے دلائل ہیں۔

یہ اطمینان کہ فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے چند ہفتوں اور چند مہینوں کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ ربع صدی سے زائد اسی کاوش میں صرف فرمانے کے بعد طلبہ کے کانوں اور انکے دماغوں میں یہ حقیقت بسائی کہ "فقہ حنفی حدیث کے موافق ہے مخالف قطعاً نہیں"۔ مولانا منظور نعمانی نے آپکی ایک تقریر کے یہ الفاظ سنائے ہیں کہ

"ہم نے اپنی عمر کے تیس سال یہ دیکھنے کے لئے صرف کر دیئے کہ فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں؟ سو ہم اپنی اس تیس سالہ محنت کے بعد قطعاً مطمئن ہیں جہاں جس درجہ کی حدیث دوسرے فقہاء کے پاس ہے اس درجہ کی حدیث امام ابوحنیفہؒ کے پاس بھی ہے اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام اعظمؒ نے مسئلہ کی بنیاد قیاس واجتہاد پر رکھی ہے وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں۔"

ایک دوسرے موقعہ پر یہ بھی ارشاد ہوا کہ

میں اپنی طویل کاوشوں کے نتیجہ میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی مضبوط احادیث سے مؤید ہے صرف دو مسئلوں میں ان کا مستدل فن حدیث کے اعتبار سے ضعیف ہے۔"

مولانا بنوری رقم طراز ہیں کہ آپ نے ان دو مسائل میں ایک مسئلہ خمر کا ذکر فرمایا تھا اور دوسرا مسئلہ مولانا بنوری کو یاد نہیں رہا۔

فقہ حنفی کے استحکام کی فکر آپ کا شب و روز کا ایسا محبوب مشغلہ تھا کہ فقہ حنفی کی اہم ترین کتب کی منظم تعلیم وتدریس کو سب سے بڑی ضرورت بتاتے۔ یہ عجیب تاریخ کا راز ہے جس کے وجوہ وعلل کا دریافت تاریخ کا سب سے بڑا انکشاف ہوگا کہ حدیث کے بیشتر وہ مجموعے جو آج ہمارے کتب خانوں کی زینت ہیں غیر حنفی قلم سے ان کی جمع وترتیب ہوئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس مہم میں حنفی مکتب فکر بھرپور شرکت کیوں نہیں کر سکا۔ عجب نہیں کہ یہ پامال اعتراض کہ ابوحنیفہ الامام حدیث سے نابلد وناواقف تھے۔ ان شبہات وشکوک میں اس سے بھی مدد لی جارہی ہو کہ احناف تدوین حدیث کے کاروبار میں پسماندہ ہیں۔ اگرچہ متاخرین کی اس سلسلہ کی کاوشیں

اس خلجان کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتیں تاہم اسباب کچھ بھی ہوں پھر بھی اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حدیثی مجموعوں میں احناف کی تالیفی دستاویزات نہ ہونے کے برابر ہیں ان کی تمامتر توجہ اور زورِ قلم فقہ کی تعمیر، استخراجِ مسائل، نت نئی جزئیات، حوادث و فتاویٰ کی ترتیب و تدوین ہی پر رہی۔

امام ابوجعفر الطحاوی علیہ الرحمۃ کی "معانی الآثار" جسمیں فقہ حنفی کو حدیث ہی سے ثابت کرنے کی سعی مشکور کی گئی۔ لطیفہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہزار ہا ہزار مدارس میں ہماری تعلیم کا انتہائی مرحلہ جو "دورہ حدیث" کے مقدس اصطلاح سے موسوم ہے اسمیں نقلِ مجلس کی حیثیت سے یہ طحاوی بھی شریک ہے۔ وہی احناف جو فقہ حنفی کے ثبوت و اثبات میں ہر وقت سینہ سپر نظر آتے ہیں انھیں کے ہاتھوں "طحاوی" کے اس عجیب و غریب کارنامے کی درگت جسطرح بن رہی ہے[عـه] اسکو دیکھنے اور جاننے والے "نقلِ مجلس" کے اس لفظ پر انشاء اللہ جبیں بہ جبیں نہ ہوں گے۔ سال بھر کے تعلیمی عرصہ میں طحاوی کے بیس پچیس[۲۵] صفحوں کی ورق گردانی جس لئے دئے انداز میں ہوتی ہے اس حادثہ کی صحیح تعبیر و ترجمانی مذکورہ لفظ سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ جو فقہ حنفی کی تاسیس و تقویت کو اپنے تجدید کے مخصوص دائرہ کا بہت بڑا فرض سمجھتے تھے ان کا دل و دماغ اس کتاب کی احناف ہی کے ہاتھوں درگت پر ہمیشہ کھولتا۔ بارہا سبق میں اس کا اعلان فرمایا کہ

"طحاوی سے سب سے زیادہ فائدہ الگی مکتبِ فکر نے اٹھایا اور احناف

عـه امام طحاویؒ کی اس معرکۃ الآرا تصنیف سے خود حنفیہ کے حلقہ میں جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے اسپر علامہ مرحوم کی بے چینی اور تاسف واضح کر چکا ہوں۔ یہ تو بار بار فرماتے کہ موالک نے طحاوی سے جسقدر فائدہ اٹھایا احناف اس سے محروم رہے اور خود غریب طحاوی حنفیت کی وکالت و دفاع میں ہدفِ علامت بنکر رہ گئے۔ پچھلے دنوں دارالعلوم کے مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں حضراتِ مدرسین کی مقدارِ اسباق زیرِ بحث تھیں۔ طحاوی کی مقدار بہت کم رہی تو اراکینِ شوریٰ اسپر تاسف کا اظہار کر رہے تھے مولانا مفتی عتیق الرحمن جو طویل و تلخ بحثوں کو لطائف میں اڑانے میں خاص مشاقی رکھتے ہیں بولے کہ

"بھائی ہمارے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جعفر کے ابا کے ساتھ کسی نے انصاف نہیں کیا" (ابوجعفر امام طحاوی کی کنیت ہے)

اس ظلم کو بھی کہ طحاوی کی مقدار کم ہوئی ہے مظالم علی الطحاوی میں شمار کرو۔ بات آئی گئی ہوئی۔ سنا اصل میں یہ تھا کہ شاہ صاحب کبھی کبھی اپنی روحانی اذیتوں کو لطائف کی زبان میں بھی ادا کرتے۔

اسکی قدر و قیمت نہ سمجھ سکے۔"

دار العلوم کے عہد تدریس میں آپ مسلسل اس کوشش میں لگے رہے کہ طحاوی کو بنیادی کتاب قرار دے کر جو کاوشیں بخاری و مسلم یا ترمذی پر کی جارہی ہیں اُن کا عشر عشیر اس کتاب پر بھی صرف کیا جائے لیکن جب دار العلوم کے لگے بندھے روایتی نظام درس میں اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تو دوسرے مدارس کا رُخ کیا۔ مولانا زکریا صاحب سہارنپوری شیخ الحدیث خود نوشت سوانح میں رقمطراز ہیں کہ

"ایک روز اچانک حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سہارنپور میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ طحاوی کی جو عظمت و قدر ہونی چاہیئے افسوس کہ وہ ہمارے حنفی اداروں میں بھی نہیں۔ میں مسلسل دار العلوم میں یہ کوشش کرتا رہا کہ اس کتاب کی کماحقہا تعلیم و تدریس ہو لیکن دار العلوم کے شورائی نظام میں میں تنہا کیا کر سکتا ہوں۔ آپ ماشاء اللہ مظاہر العلوم کے نظام میں قابو یافتہ حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے میری یہ درخواست ہے کہ طحاوی پر خصوصی توجہ کیجئے اور ایک خاص نظام کے تحت خود اس کا درس دیجئے۔"

اسی سوانح میں موصوف رقمطراز ہیں کہ

شاہ صاحب نے طحاوی کو جس طرز سے پڑھانے کی تلقین کی تھی اسے مظاہر العلوم میں بھی قائم نہیں رکھا جا سکا۔ ان تفصیلات سے ایک ہلکا سا اندازہ اس کا ہوا کہ مرحوم کو حنفیت کی مؤید تالیفات کی اشاعت و باقاعدہ تدریس کا کسقدر اہتمام تھا۔ ملا علی قاریؒ شارحِ مشکوٰۃ اپنی بلند پایہ تصانیف کی وجہ سے شہرتِ دوام کے مالک ہیں لیکن شاہ صاحب کو ان کی تمام تصانیف میں "شرح نقایہ" بہت پسند تھی۔ شرح نقایہ نایاب تھی اور اسکے چند ہی نسخے بعض مشہور کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے تھے، اپنے ایک مخصوص شاگرد مولانا سید احمد مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند جو حیدر آباد دکن میں تھے انہیں ملازمت سے سبکدوشی کا مشورہ دیکر دیوبند میں کتب خانہ قائم کرنیکا اشارہ کیا اور سب سے پہلی کتاب جسکی طباعت کے لئے اصرار فرمایا یہی شرح نقایہ تھی۔ مولانا اعزاز علی نے اسپر حاشیہ لکھا ابھی دو ہی جلدیں شائع ہونے پائی تھیں کہ حضرت شاہ صاحب کا وصال ہو گیا اور کتاب کی طباعت رُک گئی۔ بعد میں مولانا اعزاز علی صاحب اپنی مخصوص جماعت کو باقاعدہ اس کا درس دیتے رہے لیکن اُن کی وفات پر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ مسندِ عبد الرزاق

ومصنف ابی شیبہ کی احادیث حنفیہ کے لئے خاص طور پر مفید ہیں، ہر دو کتاب کی اشاعت کی خصوصی تمنا فرماتے۔ اب دونوں کتابیں مجلسِ علمی کی کوششوں سے طبع ہو گئیں۔ مولانا ظہیر حسن شوق نیموی نے اثار السنن نامی ایک کتاب تصنیف فرمائی جسمیں مشکوٰۃ کے طرز پر دلائل مسلکِ حنفیہ احادیث سے جمع کئے۔ مولانا نیموی نے اس کتاب کو بغرضِ تصحیح حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خدمت میں بھیجا۔ مرحوم اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر مطالعہ نہ فرما سکے اور حضرت شاہ صاحب کو کتاب دیدی۔ موصوف نے دونوں جلدوں پر نہایت قیمتی و فاضلانہ حواشی درج فرمائے جنمیں ہزار ہا ہزار کتابوں کے بقیدِ صفحات حوالے موجود ہیں۔ یہ مرحوم کی زندگی کا حاصل اور حنفیت کی تائید و استحکام کی مضبوط کوشش ہے مگر افسوس کہ عوام بلکہ خواص بھی اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ کاش کہ حضرت کا کوئی شاگرد خصوصاً مولانا یوسف بنوری اس طرف توجہ فرمائیں۔ حال ہی میں مجلسِ علمی کی کوششوں سے اُسکے فوٹو لنڈن میں لے کر چند نسخے محفوظ کر لیے گئے جیسا کہ معلوم ہے کہ دو چار کتابوں کو چھوڑ کر علامہ کا اکثر تصنیفی و تالیفی سرمایہ بھی انہیں مسائل پر ہے جن پر احناف کا دوسرے فقہی مکاتیب سے اختلاف رہا۔ مثلاً "فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب" "کشف الستر عن صلوۃ الوتر" "بسط الیدین فی مسئلۃ رفع الیدین" "نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین" اور اسطرح آپ کی جو املائی تقریریں قلمبند کی گئیں ان کے اہم مباحث حنفیت کے روشن چراغ کے لئے کار آمد روغن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فتنۂ قادیانیت اور اسکا استیصال

اسلام اپنے آغاز ہی سے جن فتنوں کا نخچیر رہا ہے اسکی دلدوز تاریخ سامنے ہے اور یہ بھی کہ محمد روحی فداہ علیہ صلے اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک آپؐ کے جانشینوں کو سازشوں کی کن ہولناک وادیوں میں اتر کر باطل کا بھرپور مقابلہ کرنا پڑا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس مقابلہ کی تاریخ دُنیا کے اُن اوقات سے شروع ہے جسکی تاریخیت پر انسانی علم ابتک باخبر نہ ہو سکا۔ پس جب سے دنیا میں حق ہے اس وقت سے باطل اسکے مقابلہ میں موجود، نور کے ساتھ ظلمت، خیر اور شر کی نبرد آزمائی، کفر و ایمان کی معرکہ آرائی، سعادت و شقاوت کے باہمی مقابلے بڑی پرانی داستان ہے۔

آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے معصوم بھائی ہابیل کی نعش اپنے ہاتھوں سے تیار کی، نوح علیہ السلام نافرمانی کا مظاہرہ اپنے ہی بیٹے کنعان سے دیکھ رہے تھے اور ابراہیم علیہ السلام کو اپنے باپ آذر کی بت تراش ذہنیت کے مقابلہ میں صنم شکن ایمان کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سامری اور قارون کوئی باہر کی شخصیتیں نہیں بلکہ موسےٰ علیہ السلام کے لئے یہ آستین کے اژدر تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر کانٹوں کا تاج اور سولی کی سزا ہموار کرنے والا آسمان سے اتر کر نہیں آیا تھا بلکہ ہماری اور آپ کی یہی زمینیں اس کا بوجھ اٹھائے ہوئی تھی۔ پس ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کچھ بے جانہ ہوگا کہ حق و باطل کی آویزشیں نئی نہیں ہیں بلکہ قدامت کی وہ چھاپ اُن پر ہے جسکی تاریخ، دن اور زمانہ، سال اور صدی متعین نہیں کی جاسکتی غرضیکہ امتِ مرحومہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اہلِ حق کو چودہ سو سال کے عرصہ میں فراغت کا کوئی ایسا لمحہ میسر نہیں آیا جسمیں باطل کو سرنگوں کرنے کے لئے حق پسندوں کا یہ گروہ پیش پیش نہ ہو۔ ابوجہل، ابولہب، عاص بن وائل، عقبہ بن معیط، ولید بن مغیرہ کے اٹھائے ہوئے ہنگاموں سے بچکر نکلنے والا مقدس انسانؐ جب مدینہ کی نمناک خاک پر پہونچا تو وہیں ابی بن سلول کی شکل میں کچھ اڑتے ہوئے بگولے بھی نظر آئے اور کائنات کا یہ محسنِ اعظمؐ جب داخلی اور خارجی فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر رہا تھا تو اچانک مسیلمہ کذاب کی باطل نبوت کا دعویٰ بھی اسکے پاکیزہ کانوں میں پہونچ گیا۔ آہ! اس

محسنِ اعظم ؐ نے ناسپاس دنیا کے اس بھیانک جرم کی نمائش اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ اسکی ختم نبوت ہی کے مقابلہ میں نبوت کا دعویدار کھڑا ہو گیا۔ اور ابلیس نے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ یہ النبی الامی اس احسان فراموش دنیا سے سکونِ دل لے کر اٹھتا مسیلمہ کے بعد اسود عنسی، سجاح بنت خویلد ، ابن المقنع نخشب، سینکڑوں بلکہ ہزاروں نبوت کے پاکیزہ و مقدس دامن کو تار تار کرنے والے پیدا ہوتے رہے اور یہی ایک محاذ نہیں بلکہ سینکڑوں وہ محاذ کھل گئے جن کی اطلاع خود محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اس الہامی اطلاع کے ساتھ دی تھی کہ "میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ہر فرقہ دوزخ کا کندہ ثابت ہوگا بس ایک ہی جماعت اپنے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جنت کی مستحق ہو گی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ

"خدا کی قسم تم بھی پچھلی امتوں کے گمراہ پسندوں کے قدم بقدم چلو گے تاآنکہ اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کا مرتکب ہوا ہے تو یہ ارتکاب تم سے بھی ہوگا"

الصادق والمصدوق نے جو اطلاع دی تھی وہ غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ امت میں اٹھنے والے داخلی وخارجی فتنے اور اسکی طویل داستاں اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کی بھرپور تصدیق کر رہی ہے۔ پولیس کے ہتھکنڈے جب عیسائیت کو نقصان نہیں پہونچا سکے تو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی توہین کا یہ سب سے بڑا مجرم ایک مقدس ظہور[عہ] کا دعویٰ کرتے ہوئے یکایک عیسائیت کا منادبن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عداوت کا لبدہ دوستی کے قالب میں ڈھل گیا ٹھیک اسی طرح ابن سبا یہودی النسل

عہ اشارہ اسی حیرت انگیز تبدیلی پر ہے جو پولیس میں اسی کے دعویٰ کے مطابق انقلابی انداز میں پیدا ہوئی تھی حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیوں کا یہ بدترین دشمن جب تھک کر چور چور ہو گیا اور منصوبہ کے مطابق یہ یہودی النسل عیسائیت کو زک دینے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اچانک ایک دن اس کے دعوے کے مطابق تنہائیوں میں عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مترنم لیکن کسی قدر ترش لہجہ اسکے کانوں میں پہونچا

" شاول شاول تو مجھے کیوں ستاتاہے" (شاول پولیس کا پرانا نام ہے)

اس مقدس ظہور کے بعد شاول پولیس بنا اور یہودیت کے جامہ کو اتار کر پھینک دینے والا چالاک انسان بھولے بھالے عیسائیوں کا خدا بن بیٹھا اور اسطرح عیسائیت کو جو نقصان کھلے محاذ پر نہیں پہونچا سکا تھا اندر گھسکر زیادہ کام کر گیا۔ توحید کی روشن دنیا سے نکال کر تثلیث کے تیرہ و تار گھاٹیوں میں پوری عیسائیت کو دھکیل دینے والا یہی پولس ہے جس کی سازشیں دوسروں کے لئے طشت ازبام اور عیسائیوں کے لئے عقیدت و نیازمندی کے دبیز پردوں میں ڈھکی چھپی ہیں۔

نے اسلام کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے اسلامی قالب اختیار کیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معصوم خون کا انتقام لینے کے منصوبوں سے لے کر علیؓ اور معاویہ کے مشاجرات میں برابر شریک رہا بلکہ علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت و خدائی کا نعرہ لگا کر پولیس کے اس کردار کا مظاہرہ کیا جنہیں پولیس نے عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کا انکشاف کیا تھا مگر نتائج کے اعتبار سے پولیس کامیاب تھا اور ابن سبا کو ناکامی سے سابقہ رہا۔ پھر اسی تاریخ میں کربلائی معرکے، حجاج کی سفاکیاں، مسئلہ تقدیر اور اسپر ہنگامہ آرائیاں، اعتزال کا فتنہ، خوارج کا طوفان، رافضیت کا سیلاب، شیعیت کی آندھی، خلقِ قرآن کا بگولہ اور خدا جانے چھوٹی بڑی کتنی آندھیاں اور بگولے تاریخ کے میدان میں تیز رفتار اور دھیمی چال سے آگے بڑھتے اور رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے اسی ہندوستان میں عقیدہ اور عمل دونوں گوشوں میں ضلالت و گمراہی کے کیسے ہچکولے آئے جن کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ مگر جس قادر و توانا ہستی نے ابلیس کو باطل کے پھیلانے کا موقع دیا وہی مقتدر ہر عہد کے بطلان کے مقابلہ کے لئے حق پسندوں کا گروہ بھی کھڑا کرتا رہا۔ اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ ابولہب وابوجہل کے مقابلہ میں فاروق و صدیق صفت انسانوں سے انشاء اللہ یہ کائنات کبھی خالی نہیں رہیگی۔ افکار و نظریات، عقائد و اعمال میں اختلاف و آویزشوں کی لمبی چوڑی تاریخ کنگھال کر دیکھ لیجئے ہر مرحلہ پر باطل پرست حق پرستوں کی شدید مزاحمت سے دوچار ہوتے رہے۔ خلقِ قرآن کے فتنہ پر عوامی طاقت نہیں بلکہ سلطنتِ وقت کی قوت اور اس کا جبر و استبداد سایہ فگن تھا مگر صرف ایک ہی بطلِ جلیل احمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا۔ آج خلقِ قرآن اور اس دور کے آویزشوں کے تذکرے سرسری طور پر مل جاتے ہیں مگر اس گمراہی کے پشتارہ کو اٹھانے والا کوئی ایک بھی نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں دینِ الٰہی کی فتنہ سامانیاں محض شیخ مبارک، ابوالفضل، اور فیضی کی دماغی اپج نہیں تھیں بلکہ اسکی تائید و تقویت کے لئے اکبر کی وسیع ترین حکمرانی منہ سے آگ اگل رہی تھی اور جہاں بانی بھی کوئی جمہوری حکومت نہیں، جہاں دادرسی کے کچھ مواقع میسر ہیں یہ تو ایک جبروت پسند شہنشاہیت تھی جسمیں جزء و کل پر کامل اقتدار بادشاہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہوتا مگر اسی اکبری الحاد کو توڑنے پھوڑنے کیلئے ایک ہی شیخ احمد سرہندی الملقب بمجدد الف ثانی تغمدہ اللہ بغفرانہ عزیمت واستقامت کی دولتوں سے مالامال ہوکر اس قوت سے سامنے آئے کہ اکبر اور اسکی سہ رتنی گمراہ پسند جماعت نے جس دینی فضا کو گھٹاٹوپ اندھیریوں میں جھونک دیا تھا المجدد کی آتش نوائی سے وہی فضا نورِ ایمان سے لبریز ہوگئی ٹھیک اسیطرح آج سے تراسی سال

پہلے پنجاب میں قادیان نامی ایک گاؤں میں وقت کے ایک ضال مضل کا ظہور ہوا جس نے نبوت کا دعویٰ کرکے خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے دامانِ نبوت کو نوچنا چاہا۔ یہ فتنہ اٹھا، بڑھا اور پھیلا مگر سنتِ الٰہی جو اسطرح کے مواقع پر باطل کی گردن کے لئے ایک شمشیر برّاں ہے اس نے حق پژوہوں کا ایک گروہ اس قوت سے کھڑا کر دیا جنھوں نے قادیانی نبوت کے طلسم کو توڑ کر رکھدیا۔ صاحبِ سوانح الامام کشمیریؒ اس جماعت کے امام تھے جو قادیانی نبوت کی اندھیری کو ختم کرنے کیلئے کھڑی ہوئی تھی اور یہ آپ کی زندگی کا ایک بڑا مشن رہا ہے اسلئے آپ کے سوانحی خطوط کی تکمیل کیلئے اور آپ کی اس سلسلہ کی جدوجہد علمی و عملی کو اجاگر کرنے کے لئے اس عنوان پر ذرا تفصیل سے گفتگو ضروری ہے۔ قادیانیت کو سمجھنے کے لئے اسکے بانی غلام احمد قادیانی کی مختصر سوانح بھی سامنے رکھنا ہوگی جس سے قادیانیت کا پسِ منظر واضح ہوسکے گا۔

مرزا کے نشیب و فراز :- مرزا قادیان کے ایک گھرانہ میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے مرزا کی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ معمولی شدبد کا یہ انسان تلاشِ معاش میں نکلا اور پٹواری گیری کی معمولی ملازمت پر متعین ہوا۔ ملازمت کی ذمہ داریاں بھی جب یہ شخص پورا نہ کرسکا تو استعفاء دیکر گھر آبیٹھا اور اچانک اس نے اعلان کیا کہ وہ "براہینِ احمدیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے جسمیں اسلام کی صداقت و سچائی کیلئے بے پناہ دلائل ہوں گے۔ اگرچہ یہ دعویٰ پورا نہیں ہوسکا اور بعد میں اس عدد میں مرزا نے حسبِ عادت تاویل کرتے ہوئے راہِ فرار نکالی۔ لیکن براہینِ احمدیہ کی تصنیف و تالیف کیلئے مسلمانوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ تعاون کیا اور مرزا کی یہ ناقص تصنیف [عہ] منظرِ عام پر آئی۔

اس تالیف میں یہ قادیانی اسلام کی عالمگیر صداقت کا بظاہر پرجوش مبلغ نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اس عنوان پر گاہے بگاہے مرزا کے بعض مضامین بھی اخبارات میں شائع ہوئے اور بعض ایسے اشتہارات بھی شائع کئے گئے جس میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کیلئے اپنے خاص منصوبوں کا ذکر ہوتا۔ کتاب، مضامین اور اشتہارات کے مضمون سے متاثر مسلمانوں کی ایک جماعت مرزا کے نیازمندوں کی بن گئی جسمیں خصوصی حیثیت حکیم نورالدین کی ہے جو مرزا کے بعد بلا فصل اس کا خلیفہ ہوا۔ اسی شخص نے قادیانی نبوت کی بیل منڈھے چڑھائی اور غلام احمد کو اعلانِ نبوت

عہ اپنے اکابر قطبِ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق سنا ہے کہ "براہینِ احمدیہ" کو دیکھنے کے ساتھ ہی ان کی مؤمنانہ فراست نے تاڑ لیا تھا کہ کتاب کا مؤلف کسی وقت ضلالت و گمراہی کا منادی بنکر رہیگا اور سنا ہے کہ اپنے اس "ادراک" کا مرحوم نے اظہار بھی کر دیا تھا۔

کی راہیں سمجھائیں۔

چنانچہ مرزا اپنے اس آخری دعویٰ کے لئے مسلسل زمین ہموار کرتا رہا اور اس خیال سے کہ مسلمان اچانک کسی نفرت و وحشت میں مبتلا نہ ہوں دانشمندی کے ساتھ دعاوی کے مرحلے قدم بقدم طے ہوتے رہے اس نے پہلے دعویٰ کیا کہ میں مجدد ہوں۔ پھر دعویٰ کیا کہ میں مہدی موعود ہوں۔ تیسرا دعویٰ مثلِ عیسیٰ ہونے کا تھا اس سے آگے بڑھکر مدعی ہوا کہ میں وہی عیسیٰ ہوں جنکے نزول کی اطلاعات دی گئی ہیں اور پھر نبی و رسول کا دعویٰ اور تان اسپر آکر ٹوٹی کہ مرزا نے خدائی کا بھی دعویٰ کیا۔ نعوذ باللہ من سکرات العقل وطغیانہ۔ نبوت و رسالت کے دعوی کے بعد مرزا نے اپنی وحی کو قرآن کریم کے ہم مرتبہ قرار دیا، جہاد کو منسوخ کیا اور حج کی منسوخی کا بھی اعلان کیا۔ یہ بھی اعلان تھا کہ برطانوی گورنمنٹ اس زمین پر خدا کی حکومت ہے۔ مرزا اس فن میں خاص چابکدستی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ قرآن کریم میں جتنی آیات و اوصاف خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذکر ہوئے ہیں ان کا مصداق اپنے آپ کو قرار دیتا ہے۔ مرزا نے اس کا بھی اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی اور اب اُن کے نزول کا انتظار جہل و گمراہی ہے بلکہ اس شقی نے سیدنا عیسےٰ علیہ السلام کی توہین واہانت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ انگریز گورنمنٹ نے یہ دیکھکر کہ مرزا کی نبوت سے مسلمانوں کے عقائد میں عظیم اختلال پیدا ہو رہا ہے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی تمام اہانت کو شیر و شکر کی طرح گوارا کیا مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں خود کو حکومتِ برطانیہ کا خود کاشتہ پودہ قرار دیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کا یہ ایک خوفناک حربہ تھا جو غلام احمد قادیانی کی شکل میں پنجاب کی زمین پر رونما ہوا اور عجب نہیں کہ مرزا کے ناپاک قلم سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی توہین ایک نمائش و سازش ہو تاکہ عام مسلمان کا ذہن مرزا کی اصل حقیقت اور اسکی تحریک کے پسِ منظر تک نہ پہونچ سکے۔ لیکن خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ انگریز اور مرزا اپنی سازشوں میں ناکام رہے اور بہت جلد مسلمانوں پر یہ حقیقت کھل گئی کہ القادیانی اسلام کی آستین کا سانپ ہے۔ انفرادی و اجتماعی طور پر مرزا سے نمٹنے کے لئے جو کچھ کوشش کی گئیں ان میں بڑا زبردست کردار دارُالعُلوم دیوبند کا رہا ہے۔ ایک صدی پرانا علم و معرفت کا یہ میخانہ جسکی بنیاد اُن اکابر اہل اللہ نے رکھی جو اپنے وقت میں تکوینیات کے قطب اور تشریع کے امام تھے۔ یہ محض ایک تعلیم گاہ نہیں بلکہ فکر و نظر کی ایک ٹکسال ہے۔ ہندوستان میں اسلامی اقتدار ٹوٹ جانے کے بعد

خود اسلام کو جن خطرات کا سامنا تھا اُن سے حفاظت کے لئے لطیفۂ قدرت نے دار العلوم کی شکل اختیار کی۔ آج ہند و پاکستان میں پچانوے فی صدی مدارس، درسگاہیں، تعلیمی ادارے، تصنیف و تالیف کے شعبے دار العلوم کے فیضان کا پرتو ہیں جبکہ پانچ فی صدی یہ کارنامے دوسرے اداروں کے حصہ میں آتے ہیں۔ دار العلوم نے جو کچھ کیا ان جلیل خدمات کا تعارف کا مقصد اس وقت سامنے نہیں تاہم قادیانی تلبیس کو شکست و ریخت کرنے میں جو کچھ اس کا کردار ہے اسکی ایک مختصر تفصیل بہرحال پیش کرنا ہو گی۔

اس ادارہ کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ وقت کا جب بھی کوئی ایسا فتنہ اٹھا جسکے سرے خفی و اخفی انداز میں الحاد و زندقہ یا ضلالت و گمراہی سے مل رہے ہوں دار العلوم کے اکابر نے انہیں پہلے ہی لمحہ میں دریافت کیا اور جراثیم کی دریافت جو دوسروں کے لئے راز تھی اکابرِ دار العلوم کے لئے ایک سامنے کی حقیقت رہتی۔ سابق میں آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی مومنانہ فراست نے "براہین احمدیہ" کے پیچ و خم میں مرزا کے زیغ و ضلال کو پڑھ لیا تھا۔ عنایت اللہ مشرقی جنکی تحریک بظاہر عسکری تنظیم تھی اور مسلمانوں کو فوجی نظام سے آگاہ و مربوط کرنے کے لئے خوبصورت عنوان میں الحاد کا مضمون جس انداز میں چھپا ہوا تھا دوسروں کیلئے اس کا ادراک و انکشاف اسوقت تک نہ ہو سکا تاوقتیکہ المشرقی کی تالیف "تذکرہ" سامنے نہ آئی جسمیں مؤلف کے قلم نے قرآنِ کریم کے بعض مواقع کو معنوی تحریف کے روپ میں دکھایا تھا مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ دار العلوم کے دار الافتاء نے عنایت اللہ کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

راقم السطور کو اس اظہار میں کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ دار العلوم کا یہ امتیازی کردار ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

بہرحال قادیانیت کے اٹھائے ہوئے فتنہ سے نمٹنے کے لئے دار العلوم کی پوری مشنری حرکت میں آئی۔ صاحبِ سوانح مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ مولانا مرتضیٰ چاندپوری، مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا محمد انوری لائلپوریؒ، مولانا بدرِ عالمؒ، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ چھوٹے بڑے سینکڑوں افراد و اشخاص سب دار العلوم کے مشین کے پرزے تھے جو مشترکہ طور پر قادیانیت کے خلاف حرکت میں آئے۔ پس بلاشبہ انفرادی و اجتماعی کوششیں جو ان کی جانب سے قادیانیت کے خلاف منظرِ عام پر آئیں اُن کا تعلق دار العلوم ہی سے ہے اگرچہ اس مہم میں ہندوستان کے دوسرے اداروں نے بھی شرکت کی لیکن قادیانیت کے مقابلہ میں اصل حریف اور اس کی

راہ کا سنگ گراں دارالعلوم دیوبند ہی تھا اس موقعہ پر حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جن کی زندگی کا بڑا حصہ قادیانیت کی تردید میں صرف ہوا اور آپ ہی کی کوششوں سے بہار میں ایک عظیم الشان مناظرہ ہوا جسمیں خود صاحبِ سوانح مولانا کشمیریؒ نے بھی شرکت کی۔ بہرحال علامہ انور شاہ کشمیری جو قادیانیت کے دورِ شباب میں دارالعلوم کے صدر نشین تھے، آپ نے اس فتنہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا اور قلب بریاں کے ساتھ اسلام کے تحفظ وحفاظت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے تلامذہ کی مستقل جماعت تیار کی جنھوں نے تقریر وتحریر دونوں محاذ پر قادیانیت کا بھرپور مقابلہ کیا۔ آپ ان تلامذہ سے اپنی نگرانی میں بیش قیمت کتابیں لکھواتے اور آپ کی تصحیح وتائید کے بعد وہ کتابیں شائع ہوتیں۔ تردیدِ قادیانیت کا یہ ذوق حلقۂ تلامذہ میں اس درجہ استوار کر دیا تھا کہ پھر جہاں کہیں آپ کا کوئی شاگرد پہونچا اُس نے قادیانیت کی تردید کو ایک اسلامی فریضہ سمجھا۔ مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا بدرِ عالم، مولانا محمد انوری، مولوی ابوالوفا شاہجہانپوری یہ کچھ چند نام اس پر جوش حلقہ کے ہیں جسے علامہ نے قادیانیت کے خلاف صف آرا کیا تھا۔

تردیدی تصانیف:۔ ادھر آپ نے خود تردیدِ قادیانیت میں اپنے قلم سے اہم ترین نوادر تیار فرمائے جن میں سب سے زیادہ ضخیم "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام" ہے۔ مرزا بار بار حضرتِ عیسیٰؑ کی حیات کا انکار کرتا اسلئے اسکی تردید میں یہ کتاب تصنیف کی جسمیں قرآن مجید کی اُن آیات کو متن کی حیثیت دی گئی جو حیاتِ عیسٰےؑ سے تعلق رکھتی ہیں پھر اُن کی تشریح وتائید کے لئے احادیث پیش کی گئیں "توفی" کی حقیقت اور مفہوم پر عالمانہ بحث، کنایہ ومجاز کی حقیقت، ذوالقرنین کی تعیین، یاجوج ماجوج کا تشخص، سدِ سکندری کی دریافت اور بہت سے فاضلانہ مباحث اس کتاب میں موجود ہیں۔ اہل علم نے جسطرح اس کتاب کو سراہا اس کا ذکر شاہ صاحب کی تصانیف کے ذیل میں انشاءاللہ مفصل آئے گا۔

دوسری کتاب "التصریح بما تواتر المسیح" ہے جسمیں تواتر پر گفتگو کرتے ہوئے نزولِ مسیح، حیاتِ مسیح، دونوں کو اسلام کے مسلمہ عقائد قرار دے کر اُن احادیث کو جمع کیا ہے جو مذکورہ بالا عنوان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر اُن ہر دو تصانیف پر "تحیۃ الاسلام" کے نام سے اضافہ کیا۔ یہ ہر سہ کتب دیوبند کے مختلف کتب خانوں سے شائع ہوتی رہیں۔ پھر مجلسِ علمی ڈابھیل نے خصوصی مطبوعات میں اُسے شائع کیا اور حال ہی میں مجلسِ علمی کراچی نے ان تینوں کتابوں کو یکجا شائع کر دیا ہے ادھر

دمشق میں شیخ عبد الفتاح (جو علامہ کوثری مرحوم کے مایہ ناز تلمیذ ہیں) نے "التصریح بما تواتر المسیح" کو اپنے گرانقدر حاشیوں کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار سو صفحات کی ضخامت میں ایڈیٹ کیا ہے جس کا ذکر تالیفاتِ شیخ میں آتا ہے۔ بعض نام نہاد علماء یہ سمجھتے تھے کہ غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین کیونکہ خود کو مسلمان کہتے ہیں نماز روزہ کے پابند ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اور بجانب قبلہ نماز ادا کرتے ہیں اسلئے وہ اہلِ قبلہ ہوئے اور ان کی تکفیر جائز نہیں آپ نے بروقت "اکفار الملحدین" کے نام سے چوتھی کتاب لکھی جسمیں اس مسئلہ کے تمام اطراف وجوانب پر سیر حاصل بحث کی اور بتایا کہ ضروریاتِ دین جنہیں عام وخاص مسلمان جانتے ہوں ان کا انکار کھلا کفر ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ اور یہ کہ آپؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا ضروریات دین میں سے ہے اور اس کا انکار کرنے والا یا اس میں تاویل کرنے والا اگرچہ اہلِ قبلہ میں سے ہو تاہم کافر ہے۔ بلکہ کافر کو کافر نہ جاننے والا خود کفر کا ارتکاب کر رہا ہے۔ حسب دستور آپ نے اس تالیف میں فقہاء کے اقوال، لطیف استنباط کا دفتر گرانمایہ پیش فرمایا۔ دوچار سال پہلے آپ کے ایک شاگرد مولانا محمد ادریس میرٹھی نے کتاب کا اردو ترجمہ بلکہ مکمل شرح کئی سو صفحات میں بڑی عرق ریزی وجانفشانی سے کی جسے مجلسِ علمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ کشمیر کے غریب اور ناواقف مسلمان اپنی غربت وناداری کی بنا پر قادیانیت کا خاص شکار ہوئے۔ قادیانی مشنری نے اُن غریب مسلمانوں کو بے دریغ روپیہ دے کر اُن کے ایمان کے سرمایہ کو خرید لیا۔ علامہ کا وطن کشمیر تھا اس صورتِ حال پر آپ سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین تھے۔ مرضِ وفات میں جب آپ نیم جاں ہوکر بسترِ مرگ پر لیٹے ہوتے تھے فارسی زبان میں ایک رسالہ "خاتم النبیین" کے نام سے لکھا جسمیں نثو دلائل آنحضور کے خاتم النبیین ہونے پر قائم فرمائے اور اس موضوع پر بڑی دقیق علمی گفتگو کی۔ تالیف کی زبان فارسی کشمیر کی رعایت سے اختیار کی گئی۔ اس کتاب کو آپ اپنے لئے توشۂ آخرت قرار دیتے تھے صرفِ خاص سے طبع کراکر ہزاروں نسخے کشمیر میں تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا تھا مگر یہ تمنا پوری نہ ہوسکی اور یہ کتاب آپ کی وفات کے بعد مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی جس کا اردو ترجمہ حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی استاذ جامعہ طبیہ دار العلوم نے کیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوع ہے۔ یہ کل پانچ کتابیں آپ کے گوہر بار قلم نے ردِ قادیانیت میں تیار کیں۔ بیانات جو وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتے اور تقاریر جو اطرافِ ملک میں تردید قادیانیت کے لئے آپنے کیں وہ ان سے علیحدہ ہیں۔

مجلسِ احرار کا قیام :- تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر اور قادیانیت کے مقابلہ کے لئے بعض مناسب افراد واشخاص کی خصوصی تربیت کے باوجود مرحوم کی رائے تھی کہ اس فتنہ کی مکمل بیخ کنی کے لئے ایک ایسے مستقل ادارہ کی ضرورت ہے جو اپنی تمام توانائیاں اور قوت کار قادیانیت کی تردید میں صرف کرے۔ اسکے لئے آپ نے بار بار "جمعیتہ العلماء ہند" کو بھی توجہ دلائی بلکہ کلکتہ جمعیتہ العلماء کے اجلاس میں جب اس مسئلہ پر غور ہو رہا تھا کہ جمعیتہ العلماء کی رکنیت کے لئے خود اسلامی فرقوں میں سے کس کس کے لئے اجازت ہونی چاہیئے آپ نے یہ سوال اُٹھایا کہ پہلے قادیانیوں کے کفر وایمان کا فیصلہ ہونا چاہیئے تاکہ اُن کے لئے حقِ رکنیت یا عدمِ رکنیت کی بات طے ہو سکے لیکن "جمعیۃ العلماء ھند" نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں جس سرگرمی سے حصہ لیا کسی دوسرے محاذ پر تندہی سے اُس کے لئے کام ممکن بھی نہیں تھا پھر پنجاب جو اس فتنہ کی جائے پیدائش تھی وہاں پر اسکے مقابلہ کے لئے کسی ادارہ کا قیام سب سے زیادہ ضروری تھا۔ پنجاب کے لوگوں کو خدا تعالیٰ نے قوتِ عمل، جوش وخروش کی جن دولتوں سے نوازا ہے اسکی بنیاد پر بھی آپ کی بار بار نظر پنجاب ہی پر اُٹھتی انہیں وجوہ واسباب کے پیش نظر اپنے خصوصی تلامذہ ومتعلقین کو ایک ادارہ کے قیام کی طرف متوجہ کیا۔ اسی زمانہ میں قوم پرور مسلمانوں کا ایک عنصر کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مسلم پنجاب کی نمائندگی کے سوال پر ناراض ہو کر کانگریس سے ٹوٹا اور مجلس احرار کے نام سے جس ادارہ کی تشکیل کی وہ حضرت شاہ صاحب کی تمناؤں کے مطابق تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جالندھری ان سب نے قادیانیت کے استیصال میں جو کام کیا وہ احرار کی تاریخ کا ایک جلی باب ہے۔

بخاری کی ساحرانہ خطابت نے ملک کو آتشیں فضا میں دھکیل دیا۔ شاہ صاحبؒ نے انہیں "امیر شریعت" کے خطاب سے نواز کر قادیانیت کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا اور پھر جاننے والے جانتے ہیں کہ عطاء اللہ شاہ کی تگ ودو سے قادیانیت کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ ظفر علی خاں کی ہنگامہ خیز شاعری نے مرزائے قادیان کی زندگی تلخ کر دی اسطرح مجلسِ احرار کی تعمیر میں قادیانیت کی تردید کا جو تخم ڈالا گیا تھا وہ احرار کی پوری زندگی میں بروئے کار رہا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی قادیانیت سے ایک بھرپور مقابلہ مجلسِ احرار ہی نے کیا اگرچہ سر ظفر اللہ قادیانی کی سازشوں کے نتیجہ میں احرار کے سیکڑوں کارکن نہ صرف قید وبند کی صعوبتوں بلکہ گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ آج بھی احرار کے

"بقیۃ السیف" "تحفظِ ختمِ نبوت" کے نام سے قادیانیت کے استیصال کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ قادیانیت کے خلاف بے پناہ کام کے اُجلے عنوانات اس ادارہ کا وہ کارنامہ ہے جسکی بنیاد پر یہ ادارہ عند اللہ وعند الناس انشاء اللہ سرخرو رہے گا۔ ہزاروں رضا کار، سینکڑوں کارکن اور سینکڑوں آتش نوا مقررین نے احرار کے پلیٹ فارم سے اُٹھکر ملک کو یہ شعور دیا کہ قادیانیت کفر کا دوسرا نام ہے۔ عوامی سطح پر اس شعور کی بالیدگی "احرار" کے بغیر ناممکن تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ خاص اس محاذ پر علامہ کشمیری احرار کی پرجوش قیادت فرمارہے تھے اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ موصوف نے اس مقصد کے لئے احرار ہی کو اپنا مکتبۂ فکر اور دائرہ عمل بنایا۔

کشمیر کمیٹی:۔ مہاراجہ کشمیر نے ایک بار مسائل کشمیر سے نمٹنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جس کا سربراہ خلیفۂ قادیان کو قرار دیا گیا۔ اس کمیٹی کے ایک رُکن علامہ اقبال بھی تھے۔ چونکہ کشمیر میں مسلم اکثریت ہے اور انہیں کے مطالبہ پر اس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا اس لئے مسلم حلقوں میں خلیفۂ قادیان کے تقرر سے ہیجان ہوگیا۔ اول تو اس وجہ سے کہ مسلمانوں کے تصفیہ طلب مسائل کے لئے ایک قادیانی کو مقرر کرنا اس بات کا اعلان تھا کہ قادیانی مسلمان ہے۔ حالانکہ تمام امت متفقہ طور پر قادیانوں کو مرتد قرار دے چکی۔ دوسرے عام قادیانیوں کے بارے میں یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں قادیانیت کی پرجوش تبلیغ کرتے ہیں۔ سر ظفر اللہ خاں کی اس سلسلہ کی کوششوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ اس امر کی تصدیق کریں گے اسلئے یا تو بشیر الدین محمود کشمیر کے مسلم اکثریت کے ایمان کو تباہ و برباد کرتا یا اپنی تبلیغی مشن میں ناکامی کے باعث مسلمانوں کے مسائل کو کمیٹی کی سطح پر خوفناک نقصان پہونچاتا اور عجب نہیں کہ مہاراجہ کشمیر نے کچھ ایسے ہی سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر سوچ سمجھکر یہ تقرر کیا ہو۔ علامہ کشمیری اس صورتِ حال سے مضطرب ہوگئے۔ مذکورۃ الصدر خطرات و اندیشوں کے تحت آپ نے اس تقرر کے خلاف اول تو خود مہاراجہ کشمیر کو اور کشمیر کے بعض ذمہ دار اشخاص کو احتجاجی خطوط لکھے اور ساتھ ہی مجلسِ احرار کو ہمہ گیر احتجاج پر آمادہ و تیار کیا۔ ڈاکٹر اقبال جن سے آپ کے تعلقات پہلے سے تھے وہ ابتک قادیانیت کے مضر پہلوؤں سے تقریباً ناواقف تھے۔ اسی زمانہ میں علامہ نے موصوف کو طویل خط لکھ کر فتنۂ قادنیت کی زہر چکانیوں سے مطلع کیا۔ ڈاکٹر اقبال نے بعد میں کشمیر کمیٹی سے استعفا بھی دے دیا بلکہ وہ فتنۂ قادنیت کے استیصال کے محاذ پر ایک پرجوش داعی ہوگئے۔ چنانچہ اس زمانہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر نے اپنے ایک مضمون میں

ہندوستانی مسلمان کو قادیانیت کی تائید کا مشورہ دیا اور اس دلیل کے ساتھ کہ قادیان کا پیغمبر ہندوستانی ہے اور اُن کے مقدس مقامات بجائے مکہ اور مدینہ کے خود ہندوستان میں ہیں اُن سے وابستگی کے نتیجہ میں وطن پروری کے جذبات پیدا ہوں گے اور ایک غیر ملکی مذہب سے دلچسپیاں کٹ کر وطن ہی میں پیدا ہونے والے مذہب سے راہ و رسم بڑھے گی جس کا منطقی نتیجہ وطنیت کے جذبات سے معمور ہونا ہے۔

اس نظریہ کے آخری محرک ڈاکٹر شنکر داس مہرا تھے جو حال ہی میں سرگباش ہوئے ہیں۔ صدر کانگریس کے اس مضمون پر علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں مسلسل کئی قسطوں میں بھرپور تنقید کی۔ کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ اقبال کے ان دین پرور خیالات کی تعمیر میں حضرت شاہ صاحب کا بڑا حصہ تھا۔

مقدمۂ بہاولپور:- تردیدِ قادیانیت کے ذیل میں حضرت کا وہ تاریخی بیان بھی خاص اہمیت رکھتا ہے جو آپ نے ریاست بہاولپور کی عدالت میں ایک مقدمہ میں دیا۔ آپ کا یہ معرکتہ الآراء بیان قادیانیت پر سیر حاصل تبصرہ اور مرزا کے کفر پر برہانِ قاطع ہے اسمیں وفورِ علمی کا مظاہرہ، بے پناہ معلومات کا اظہار اور ہر دعوے پر قطعی دلائل کا انبار ہے جس سے مرزا کی باطل نبوت ہباءً منثورا ہوگئی۔ یہ بیان اب نایاب ہے خود راقم السطور کو بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوا اسلئے اس علمی یادگار کو محفوظ کرنے کے لئے اس سوانح کے کچھ صفحات صرف کر دئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بیانات کے سرورق کا عنوان "بیاناتِ علمائے ربانی برارتداد فرقہ قادیانی" ہے اس مجموعہ کی کل ضخامت ایکسو اٹھتر (۱۷۸) صفحات ہے جسمیں علماء کے بیانات شریکِ طباعت کئے گئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کا بیان صفحہ ایکسو ایک (۱۰۱) سے تاصفحہ ایک سو بیالیس (۱۴۲) ہے۔ گویا کہ کل اکتالیس (۴۱) صفحات کا بیان کتابی سائز پر ہے۔ ہم سب سے پہلے جامع بیانات مولانا ابوالعباس محمد صادق نعمانی کا وہ دیباچہ نقل کرتے ہیں جس سے مقدمہ بہاولپور کی تاریخ اور اس کا پسِ منظر واضح ہوتا ہے وہ رقمطراز ہیں۔

> ریاستِ بہاولپور پنجاب میں ایک اسلامی ریاست ہے اور اعلیٰ حضرت تاجدارِ عباسی خلد اللہ اقبالہ وملکہ کا آئین[ع] ہے۔ اُسمیں ایک شخص مسمی عبدالرزاق مرزائی ہوکر مرتد ہوگیا۔ اسکی منکوحہ مسماۃ غلام عائشہ نے سنِ بلوغ کو پہونچکر

ع قیام پاکستان کے بعد یہ ریاست پاکستان کی مرکزی حکومت میں اسیطرح ضم ہوگئی جسطرح ہندوستان میں ریاستوں کا ادغام عمل میں آیا۔

۲۴ر جولائی ۱۹۲۶ء کو فسخ نکاح کا دعویٰ کیا اور مقدمہ ۱۹۳۱ء تک ایک دفعہ انتہائی مراحل طے کرکے پھر ۱۹۳۲ء میں ریاست کی عدالت اعلیٰ یعنی دربارِ معلّٰے سے ابتدائی حیثیت میں ڈسٹرکٹ جج صاحب بھاولپور کی عدالت میں بغرض تحقیقِ شرعی واپس ہوا۔ مدعیہ کی طرف سے ہندوستان کے مشہور اکابرِ علماء کی شہادتیں پیش ہوئیں اور مدعی علیہ کی جانب سے ان شہادتوں کی تردید پر پوری کوشش صرف کردی گئی۔ آخر ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو فیصلہ بحق مدعیہ صادر ہوا۔"

گویا کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے ٹھیک تین سال بعد یہ فیصلہ ہوا۔ آپکو تردیدِ قادیانیت میں جو دلچسپی تھی اسی کی بنا پر آپ نے اپنے بعض تلامذہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر میری وفات ہوجائے اور اس مقدمہ میں مرزا اور اسکے متبعین کو کافر تسلیم کرلیا جائے تو فیصلہ کی اطلاع میری روح کی تسکین کی خاطر میری قبر پر آکر دی جائے۔

اس وصیت کا ایک ایک لفظ اس جذبۂ ایمانی کی نشاندہی کرتا ہے جو قادیانیت کے فتنہ کے مقابلہ میں موصوف کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ شاہ صاحبؒ کا بیان اس مجموعہ میں "البیان الازہر" کے نام سے ہے۔ تمہید میں جامع نے لکھا ہے۔

"شیخ الاسلام والمسلمین أسوۃ السلف، قدوۃ الخلف، حضرت مولانا سیّد محمد انورشاہ صاحب قدس اللہ تعالےٰ اسرارہم کی بلند ہستی کسی تعارف وتوصیف کی محتاج نہیں۔ آپ کو مرزائی فتنہ کی تردید اور استیصال کی طرف خاص توجہ تھی۔ جب حضرت شیخ الجامعہ صاحب کا خط حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں دیوبند پہونچا تو حضرت ڈابھیل تشریف لے جانے کا ارادہ فرما چکے تھے اور سامانِ سفر بندھ چکا تھا مگر مقدمہ کی اہمیت کو ملحوظ فرماکر ڈابھیل کا سفر ملتوی فرمایا اور ۱۹ر اگست ۱۹۳۲ء کو بھاولپور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔"

موصوف اس سفر کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے۔ چنانچہ حسبِ روایت مولانا محمد انوری لائلپوری جو اس سفر میں رفیق تھے بھاولپور پہونچنے کے بعد جمعہ آپ نے بھاولپور کی جامع مسجد میں پڑھا اور نماز کے بعد ہزارہا ہزار مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"میں بواسیرِ خونی کے مرض کے غلبہ سے نیم جاں تھا اور ساتھ ہی اپنے

ملازمت کے سلسلہ میں ڈابھیل کے لئے پابہ رکاب کہ اچانک شیخ الجامعہ کا
مکتوب مجھے ملا جسمیں بھاولپور آکر مقدمہ میں شہادت دینے کے لئے لکھا گیا
تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے پاس کوئی زادِ آخرت تو ہے نہیں شاید یہی چیز
ذریعۂ نجات بن جائے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا جانب دار بن کر
یہاں آیا ہوں۔"

یہ سنکر مجمع بیقرار ہو گیا۔ ایک شاگرد مولانا عبد الحنان ہزاروی آہ و بکا کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور مجمع سے بولے کہ اگر حضرت کو بھی اپنی نجات کا یقین نہیں تو پھر اس دنیا میں کس کی مغفرت متوقع ہو گی؟ اسکے علاوہ کچھ اور بلند کلمات حضرت کی تعریف و توصیف میں عرض کئے۔ جب وہ بیٹھ گئے تو پھر مجمع کو خطاب کرکے فرمایا کہ۔

"ان صاحب نے ہماری تعریف میں مبالغہ کیا۔ حالانکہ ہم پر یہ بات
کھل گئی کہ گلی کا کتا بھی ہم سے بہتر ہے اگر ہم تحفظ ختم نبوت نہ کر سکیں۔"

ان کلمات کو سنکر مجمع وقفِ آہ و بکا ہو گیا۔ پنجاب اور بھاولپور میں ممدوح کے اس سفر کو غنیمتِ باردہ سمجھا گیا اور زائرین کا ہجوم ہر وقت رہتا۔ جامع بیانات نے بھی لکھا ہے کہ۔

"ریاستِ بھاولپور اور ملحقہ دیہات و شہر کے علماء و زائرین اس قدر
جمع ہوئے کہ حضرت کے قیام گاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی اور
زائرین مصافحہ سے بھی مشرف نہ ہو سکتے تھے۔"

بہرحال یہ تاریخی بیان حسب روایت جامع
"۲۵ر اگست ۱۹۳۲ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان شروع ہوا۔"

جس وقت بیان شروع ہوا۔

"عدالت کا کمرہ امراء و رؤساءِ ریاست اور علماء سے پُر تھا۔ عدالت کے
بیرونی میدان میں دور تک زائرین کا اجتماع تھا۔ باوجودیکہ حضرت شاہ صاحبؒ
عرصہ سے بیمار تھے اور جسمِ مبارک بہت ناتواں ہو چکا تھا مگر متواتر پانچ دن
تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹہ یومیہ عدالت میں تشریف لاکر علم و عرفاں کا
دریا بہاتے رہتے اور مرزائیت کے کفر و ارتداد دجل و فریب کے تمام پہلوؤں
کو آفتاب کی طرح روشن کر دیا۔"

آپ نے اپنے اس بیان میں کفر اور ایمان کی حقیقت پر جامع تبصرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"کسی کے قول کو اسکے اعتماد پر باور کرنے اور غیب کی خبروں کو انبیاء کے اعتماد پر یقین کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔"

اور کفر......

"حق ناشناسی اور انکار کا نام ہے۔"

دینِ محمدیؐ کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت یا تو تواتر سے ہے یا خبرِ واحد سے۔ تواتر کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات متصلاً پہونچی ہو اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہ ہو۔ تواتر کی چند صورتیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

"تواتر ہمارے دین میں چار قسم پر ہے۔ حدیث من کذب علیّ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہ من حدیث متواتر ہے اور تیس صحابہ سے بسندِ صحیح مذکور ہے اسکو تواترِ اسنادی کہا جاتا ہے۔ نزولِ مسیح کے سلسلہ میں ہمارے پاس چالیس احادیث متواتر موجود ہیں ان کا انکار کفر ہے۔"

تواتر کی دوسری قسم "تواترِ طبقہ" ہے جسمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک چیز کو کس نے کس سے لیا مگر اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ پچھلوں نے اگلوں سے لی تھی قرآن مجید کا تواتر اسی تواتر کے ذیل میں آتا ہے اس کا منکر بھی کافر ہے۔ یہ بیان فرماتے ہوئے آپ نے ایک اہم بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ

"مسواک کا ثبوت بھی اوپر ذکر کردہ دونوں تواتر کے ذیل میں آتا ہے اسلئے مسواک کے ترک استعمال میں تو کوئی حرج نہیں لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکے استعمال کے ثبوت کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہدے کہ "جو" (غلہ) حرام ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "جو" کھائے اور امت ابتک "جو" کھاتی چلی آتی ہے اس تواترِ قطعی کا انکار بھی کفر ہوگا۔ حالانکہ "جو" کا کھانا نہ کھانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔"

تواتر کی تیسری قسم "قدرِ مشترک" جس کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سی حدیثیں خبرِ واحد کی شکل میں آئی ہوں لیکن ان سب کا مضمون اور مفاد تواتر کے حد تک پہونچ گیا ہو جسکی مثال

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں کہ اُن میں سے بعض متواتر ہیں
اور بعض خبرِ آحاد۔"

لیکن

"اُن اخبارِ آحاد میں ایک مضمون مشترک ملتا ہے جو قطعی ہے اس کا
بھی منکر کافر ہے۔"

تواتر کی چوتھی قسم تواتر توارث ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک نسل نے دوسری نسل سے لیا ہو مثلاً تمام امت اس علم میں مساوی طور پر شریک ہے کہ

"خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

اس تواتر کا انکار بھی کفر ہے علامہ مرحوم نے تواتر کی ان چاروں اقسام پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ اگر تواتر کے منکر کو کافر نہ کہا گیا تو اسلام کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے بلکہ آپ نے اس پر بھی توجہ دلائی کہ متواترات میں تاویل اور ان کے مطالب کو مسخ کرنا بھی کفر ہے۔ یہ بھی بتایا کہ باطنیت اور زندقہ میں بھی متواترات کے معنی ہی کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ کفر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ قولی کفر، فعلی کفر۔

فرمایا کہ کفر فعلی یہ ہے کہ کوئی شخص ساری عمر نماز پڑھتا رہے اور مدت دراز کے بعد ایک ہی بار بت کو سجدہ کرلے تو وہ کافر ہے اور تارکِ نماز سے بھی بدتر۔ اور خدا کے صفات و فعل میں کسی کو اسکا شریک قرار دینا یا یہ کہنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آئے گا کفر قولی ہے۔ پھر آپ نے ایک ہی بات جو مختلف مرتبہ کے لوگوں سے کہی جائے اور بات کے ایک ہونے کے باوجود اکی حقیقت بدلتی رہے اسے واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"اپنے برابر کے آدمی سے یہ کہنا کہ تم نے بکواس کی کوئی بڑی بات نہیں ہے
مگر یہی بات اگر استاذ اور باپ کو کہدے تو کہنے والا عاق ہے اور خدانخواستہ
پیغمبر کیلئے یہ کلمہ استعمال کرلیا تو قطعی کفر ہے۔"

بلکہ قرآن مجید سے تو معلوم ہوتا ہے کہ منافقین سے جب یہ کہا گیا کہ آؤ اور خدا کے رسول سے مغفرت کی دعا کراؤ اور منافقین یہ سنکر چلائے۔ پیغمبر کے مقابلہ میں یہ طرز بھی کفر ٹھہرا بلکہ بغیر نیت محض ازراہِ مذاق زبان سے کلمۂ کفر نکالنا بھی کفر ہے۔ ہاں غلطی سے اگر کوئی کلمۂ کفر نکل گیا تو معاف ہے یہ سب حقائق جو ابھی زیرِ بحث آئے اُن کا منکر باغی ہے جسکی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں۔ بیان یہیں تک پہونچا تھا کہ قادیانی وکیل نے کہا کہ کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کس طرح

ہو سکے گا جبکہ دیوبندی، بریلویوں کو کافر کہتے ہیں اور بریلوی، دیوبندیوں کو۔ ہم کسے کافر سمجھیں اور کس کی تکفیر معتبر ہوگی۔ اسپر حضرت نے ارشاد فرمایا۔

"ہمارا اور قادیانیوں کا اختلاف قانون کا اختلاف ہے۔ جبکہ دیوبند اور بریلی کے اختلاف کی نوعیت صرف واقعات میں اختلاف ہے اسے قانونی اختلاف نہیں کہا جاسکتا۔"

اپنے اس دعوی کی تائید میں کہ مرزائیوں سے اختلاف قانون کا اختلاف ہے۔ فرمایا کہ مرزائی نے مہمّاتِ دین کے بہت سے اصول بدل ڈالے اور بہت سے اسمار کا مسئلے بھی بدل ڈالا اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ ختم نبوت کے سلسلہ میں دوسو سے زائد احادیث موجود ہیں اور تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ ہر وہ مسلمان جسے اسلامی عقائد سے ذرا سا بھی واسطہ رہا وہ ختمِ نبوت کے عقیدہ سے کبھی غافل نہیں رہا۔ اسلئے اس عقیدہ میں تحریف یا اس سے انحراف کفر ہے بلکہ اگر کوئی ایسی آیت قرآن میں ہے جس کے معنی و مراد پر تمام صحابہ یا امت کا اجماع ہوچکا تو اس سے انکار یا اسمیں تحریف بھی کفر ہوگی۔ آپ کی اس وضاحت پر قادیانی وکیل بولا کہ اسلام میں اجماع کا دعویٰ ہی غلط ہے۔ کیونکہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ من ادعی الاجماع فھو کاذب یعنی دعوی اجماع کرنے والا جھوٹا ہے مرحوم نے قادیانی وکیل کی اس تلبیس کے جواب میں فرمایا کہ

"یہ جو کہا گیا کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ دعوی اجماع کذب بیانی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ احمد بن حنبل سرے سے اجماع ہی کے منکر ہیں بلکہ امام ھمام کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کہیں کہیں اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان مسائل میں اجماع نہیں ہوتا۔"

ظاہر ہے کہ فقہ کے چار مشہور مکاتبِ فکر میں امام احمد بن حنبل کا فقہ مستند فقہ ہے۔ اقطارِ عالم میں جا بجا حنبلی فقہ کے پیروکار موجود ہیں۔ نہ جاننے والوں کے لئے عرض ہے کہ فقہ کے چار اہم ترین عناصر جنکی مدد و امداد سے مسائل کا استنباط و استخراج کیا گیا۔ اُنمیں اجماعِ امت عمومی حیثیت کا مالک ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ احمد بن حنبل ایک مستقل فکر کے موجد ہونے کے باوجود اجماعِ امت کا انکار کریں مگر قادیانی اسطرح کے شوشے چھوڑ کر امت کے ایمان سے ہمیشہ کھیلتے رہے۔ شاہ صاحب نے اس موقع پر نہ صرف اجماع ہی کا ثبوت بہم پہونچایا بلکہ عدالت کو یہ بھی بتایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ وفات کے بعد اس امت میں سب سے پہلا اجماع ایک نبی کاذب یعنی مسیلمہ

کذاب کے قتل ہی پر ہوا۔

"پہلا اجماع جو اس امتِ محمدیہ میں ہوا ہے وہ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے قتل ہی پر ہوا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں مسیلمہ کے قتل کے واسطے صحابہ کو بھیجا اور کسی صحابی نے مسیلمہ کے قتل میں تردد نہیں کیا جس کا حاصل یہی نکلا کہ خاتم النبیین کے بعد جو ختمِ نبوت کا دعویٰ کرے وہ مرتد زندیق اور بلاشبہ واجب القتل ہے۔

مسیلمہ کذاب کے واقعہ میں ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ خلجان ہو کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسیلمہ کے قاصد کو قتل نہیں کیا تھا تو حضرات صحابہ کے لئے مسیلمہ ہی کو تہ تیغ کر دینے کا جواز کہاں سے نکل آیا۔ مرحوم نے اس حقیقت سے نقاب کشائی کرتے ہوئے بتایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد کو قتل نہ کرنا آدابِ سفارت سے تھا۔ آپؐ کی یہ رعایت خدانخواستہ اس تردد کی وجہ سے نہیں تھی کہ مدعی نبوت شرعاً گردن زدنی نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو بعد میں صحابہؓ کسی بھی دعوائے نبوت کرنیوالے کے ساتھ تعارض نہ کرتے۔ حالانکہ تاریخ و واقعات سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ نے خود مسیلمہ کذاب کے پیرو کاروں کے ساتھ بعد میں کوئی رعایت نہیں برتی۔ چنانچہ آپ نے معجم طبرانی سے یہ روایت کھول کر عدالت کو سنائی کہ جب عبداللہ بن مسعودؓ کو اُن قاصدوں میں سے ایک کوفہ میں ملا تو ابن مسعودؓ نے فرمایا اب تو یہ قاصد نہیں ہے اور حکم دیا کہ اسکو قتل کر دیا جائے چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔ فرمایا کہ یہ روایت بخاری کی کتاب الکفالہ میں بھی موجود ہے بلکہ ہر زمانہ میں اسلامی حکومت نے ہر اُس شخص کو قتل کیا ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے فرمایا کہ

"صبح الاعشیٰ ص۳۰۵ جلد ۱۳ میں ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ایک شاعر کو علماء کے فتویٰ پر یہ شعر کہنے پر قتل کر دیا۔

وکان مبدأ ھذا الدین من رجل ۞ سعے فاصبح یدعی سید الامم

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اس دین اسلام کی ابتدا ایک شخص کی ذاتی کوششوں سے ہوئی جو بعد میں تمام امتوں کا سردار بن بیٹھا۔ اس شعر میں نبوت کو کسبی کہا گیا تھا محض اس جرم پر ایوبی کی تلوار نے شاعر کا بے تکلف کام تمام کر دیا۔

ابھی آپ کا بیان عدالت میں جاری تھا کہ آپ نے قرآن مجید کی اس مشہور آیت پر جو

ختم نبوت کے باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے توجہ فرمائی اور بتایا کہ آیت واضح کرتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت کا علاقہ دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا اور اس کے عوض رسالت اور نبوت کا علاقہ ہمیشہ کے لئے قائم وثابت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ورسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا کو گھیر رکھا ہے کوئی جگہ اس سے خالی نہیں بلکہ احادیث سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ

"آپ خاتم النبیین ہیں بلکہ یہ بھی کھل جاتا ہے کہ اشخاص نبوت کے بھی خاتم ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ انبیاء کے عدد میں کوئی باقی نہیں رہا اسلئے پہلے نبی کو لانا پڑا۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء میں کوئی نبی باقی رہتا تو قرب قیامت میں اس باقی ماندہ نبی کو لایا جاتا۔ سابق انبیاء میں سے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لانا اس بات کی علامت ہے کہ جماعت انبیاء میں کوئی ایسا باقی نہیں رہا تھا جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں مبعوث کیا جاتا اسلئے غلام احمد قادیانی کا دعوائے نبوت کے فریب ہے آج بھی کچھ ایسے سادہ لوح جو غلام احمد قادیانی کے کفر میں صرف اس وجہ سے متردد ہیں کہ مرزا کا تعلق اہل قبلہ سے ہے اور ان برخود غلط لوگوں نے کہیں سے یہ بھی سن پایا کہ اگر کسی شخص کے کلمۂ کفر میں ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایمان کا صرف ایک ہی امکان ہو تو اسکی بھی تکفیر میں احتیاط برتنا چاہیئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ علوم ومعارف کے طویل وعریض دفتر سے ناآشنائی کے باوجود صرف اس بنیاد پر یاوہ گوئیوں کا جواز ان غریبوں کے ہاتھ کہاں سے لگ گیا۔ سامنے کی بات ہے کہ طب اور ڈاکٹری کے کسی ایک ادھورے مسئلے کو اٹھا کر طبابت وڈاکٹری کے اسرار ورموز سے بھرپور واقفیت کا دعویٰ کیا صحیح ہوگا؟ آج ہم میں سے کتنے وہ لوگ ہیں جو رائج الوقت قوانین کے بہت سی دفعات پر براہ راست واقفیت رکھتے ہیں تو کیا فقط اسی بنیاد پر وکالت کی دکان سجا کر بیٹھ جانا دانشمندی ہوگی۔ دنیا کے کسی بھی گوشۂ علم وفن میں ادھورے معلومات پر آج تک کسی نے اس علم وفن میں رائے زنی کی ہمت نہیں کی مگر وااسفاکہ دین ہی وہ ایک متاع کس مخر بن کر رہ گیا کہ ہر کہہ ومہ مہات مسائل میں مداخلت کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ علامہ نے دین پر ظلم کرنیوالے اس گروہ کی غلط فہمی پر انتباہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"یہ جو مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں حسب تشریح علماء اسکا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کے کلمات کے بارے میں عاجلانہ تکفیر نہیں کی جائیگی

جو تمام متواترات اور ضروریاتِ دین پر پورا ایمان رکھتا ہو گویا کہ اہلِ قبلہ کا لفظ
ایک عنوان ہے۔ اس کا معنون وہ ہے جو میں نے واضح کیا اس کی مزید تفصیل
فتاوے عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۴۲۰ چار سو بیس ردالمحتار صفحہ ۴۷۳ چار سو تہتر شرح
فقہ اکبر صفحہ ۱۷۹ ایک سو نواسی میں مل جائے گی۔"

یہ ہے حقیقت اس عنوان کی کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں دوسروں کا تو کیا کہنا بعض برخود غلط
دانشور خدا جانے اسی ایک ادھوری بات کو جادو کی چھڑی کی طرح گھما کر نہ جانے کس کس ضلال
پسند کو دھکیل دھکیل کر اسلام کے حصار میں داخل کر رہے ہیں۔ بظاہر تو اُن کی نظر میں یہ کارِ ثواب
ہی ہوگا کہ نکلنے والوں کو زبردستی اندر ہی رکھا جائے مگر سوال یہ ہے کہ جو نکلنے کا ارادہ کر ہی چکے
انہیں روکنے کی کوششیں کیا کارآمد ہوں گی؟ یہ تو ایک غم والم کی ایک کربی کیفیت ہے جو بے اختیار نکل گئی
ورنہ تو میں آپ کو علامہ کا وہی بیان سنا رہا تھا جس نے بہت سی حقیقتوں پر سے یکسر پردہ الٹ دیا۔
ذیلاً آپ نے فرمایا کہ

"میں نے شروع میں کہا تھا کہ اجماع کا منکر کافر ہے اور یہ بھی بتایا
تھا کہ اجماع صحابہ کا قطعی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "اقامۃ الدلیل"
میں وضاحت سے لکھا ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع اپنی قوت کی
بنا پر دوسرے تمام اجماع پر مقدم ہے کیونکہ اجماع مسلمانوں کا تعارف ہے اگر
اجماع کو درمیان سے نکال دیا جائے تو اسلام ہی کی بنیاد گر جائیگی البتہ بعض
گناہ پر تکفیر نہیں کی جاتی ایسا گناہ وہ ہے جو حدِ کفر تک نہ پہونچا ہو لیکن جو
کلمات یا افعال کفر سے ہیں اُن پر تکفیر لازمی ہے۔"

گویا کہ اس مغالطۂ عامۃ الورود کی بقوت تردید کی کہ اہل قبلہ کی تکفیر میں ہر حال میں محتاط رہنا
چاہیئے اور بتایا کہ افعال یا کلماتِ کفریہ کے ارتکاب کے باوجود محض اہل قبلہ سے ہونا کچھ مفید نہیں، ساری
دنیا جانتی ہے کہ ترکِ نماز اور انکارِ فرضیتِ نماز دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اول فسق ہے
دوسرا مرحلہ استلزامِ کفر۔ مگر اسکو کیا کیا جائے کہ نہ جاننے والے صرف اتنا ہی نہیں جانتے بلکہ جاننے
والوں کو بھی الٹا دیوانہ بنانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ مرحوم نے اس بیان میں کفر و نفاق
و زیغ و زندقہ کے دقیق فروق پر گفتگو کرتے ہوئے ضروریاتِ دین کے اہم عنوان پر عدالت کو
انتباہ دیا کہ

"ضروریاتِ دین وہ ہیں جن کو خاص و عام سب پہچانیں کہ ان چیزوں کا تعلق
دین سے ہے جیسے توحید ورسالت، نماز روزہ زکوٰۃ، حج وغیرہ۔"

پس اگر ان ضروریاتِ دین میں سے کوئی کسی چیز کا انکار کرتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا عادی ہے اسکی تکفیر میں تذبذب برتا جائے یہ دین سے کھلی لاعلمی کی علامت ہے۔ کبھی یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ نماز روزہ وحج زکوٰۃ اور تمام اسلامی ارکان کے پابند ہونے کے ساتھ اسلامی تبلیغ میں بھی حصّہ لیتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کو کافر کہنے کے لئے معقول بنیاد کیا ہو سکتی ہے اس الجھن کا جواب دیتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ بخاری شریف میں موجود ہے کہ

"خوارج اپنی نیک پسندی اور نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے باوجود
دین سے اسطرح نکل جائیں گے جیسا کہ تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔"

اور اُن کی نیک روی یا اعمالِ اسلامی میں انہماک کفر کے اس داغ سے ان کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا جو کفریہ قول وعمل سے اُنکے دامنِ ایمان پر لگ چکا۔ مرحوم نے اپنے اس عالمانہ بیان میں جہاں اور بہت سے حقائق وانکشاف کئے اور قادیانیوں کی تکفیر میں عامیانہ سطح پر جو واہی شبہات درپیش تھے اُن کے جوابات دیتے ہوئے اس شبہ کو بھی اٹھایا کہ اگر کلمۂ کفر کسی تاویل کے ساتھ کہا جائے تو قائل پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا۔ غلام احمد قادیانی ممکن ہے کہ ان کلماتِ کفریہ کو کسی تاویل سے پیش کر رہا ہو لہٰذا اصولی طور پر وہ کفر سے محفوظ رہے گا۔ علامہ نے اس پر بھی توجہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"جو لوگ ضروریاتِ دین کے منکر ہوتے ہیں وہ عموماً اپنے کفر کو چھپانے
کے لئے تاویلیں کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہم اہلِ قبلہ ہیں اور اہلِ قبلہ کی تکفیر
جائز نہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ ہم ارکانِ اسلام ادا کرتے ہیں اور تبلیغِ اسلام میں
سرگرم حصہ لیتے ہیں اس لئے ہمیں خارج از اسلام کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی
کہتے ہیں کہ فقہاء نے وضاحت کی ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے وجوہ کفر
ہوں اور صرف ایک وجہ اسلام کی تو مفتی کو چاہیئے کہ اسی ایک وجہ کو اختیار کر کے
اُسے مسلمان کہے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ فقہاء قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص کلمۂ کفر
تاویل سے کہے تو قائل کے کفر کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔"

ان رکیک تاویلات کو ذکر کرنے کے بعد جن سے بالعموم قادیانی کام لیتے رہے۔ علامہ نے ہر

شبہ کا شافی جواب عنایت فرمایا۔ اہلِ قبلہ کے متعلق فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قبلہ کی طرف رُخ کرنیوالا لازماً مسلمان ہوگا اگرچہ تمام عقائدِ اسلامی کا منکر ہو۔ قرآن نے منافقین کو تمام کفار سے بدتر قرار دیا حالانکہ وہ قبلہ رُخ ہوکر نماز ہی نہ پڑھتے تھے بلکہ تمام احکام ظاہری پر بھی عمل پیرا تھے۔ شرح فقہ اکبر میں اہلِ قبلہ ان کو قرار دیا گیا ہے جنھوں نے تمام ضروریاتِ دین کو تسلیم کیا ہے اور یہ جو شہرت ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک علاماتِ کفر نہ پائی جائیں اُس وقت تک کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہیں قرار دیا جائیگا۔ اسی طرح یہ خیال کہ اعمالِ اسلامی کے کرنے کے بعد انسان کفر سے محفوظ ہوجاتا ہے درآنحالیکہ وہ ضروریاتِ دین کا منکر ہو صحیح نہیں۔ فرمایا کہ خوارج کے انہماک عبادت کو حدیث میں تسلیم کرنے کے باوجود انہیں دائرۂ اسلام سے خارج کیا گیا۔ یہ بھی فرمایا کہ ہر اُس شخص کو مسلمان سمجھنا جسکے کلام میں ننانوے وجوہ کفر ہوں اور صرف ایک احتمال اسلام کا لاعلمی ہے۔ فقہاء کا یہ فیصلہ اُس شخص کے بارے میں ہے جس کا ایک ہی کلمہ سامنے آیا ہو اور عام زندگی مستور ہو۔ اور اگر کسی کی زندگی وکردار نمایاں ہے تو پھر اُس کے کسی کلمہ میں ایک اسلام کے احتمال کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ لگانے میں تامل نہیں کیا جائیگا۔ ساتھ ہی اس شبہ کو بھی صاف کیا کہ تاویلاً کلماتِ کفر کا ارتکاب دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے لئے مانع ہے۔ فرمایا کہ تاویل اسی وقت مفید ہے جب اس کا تعلق ضروریاتِ دین سے نہ ہو اور اگر وہ ضروریاتِ دین میں تاویل کرتا ہے تو پھر اُسے کافر قرار دینے میں پس وپیش نہ ہوگا۔ اس موقع پر حضرت شاہ صاحب نے عہدِ فاروقی کے کچھ واقعات کو بطورِ نظائر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے والے کو قتل کرادیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروریاتِ دین میں تاویل موجبِ کفر ہے۔ آپ نے قادیانی لٹریچر سے وہ حوالے بھی پیش کئے جن سے قادیانیوں کا ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کا جرم نمایاں ہوتا ہے۔ فرمایا کہ قادیانی لٹریچر متواتراتِ دین کے انکار سے لبریز ہے۔ بغرض افادۂ عام ہم حضرت ممدوح کے بیان سے ایک مختصر فہرست اُن متواتراتِ دین کے انکار کی پیش کرتے ہیں جن کے مرتکب قادیانی ہیں:۔

۱۔ ختم نبوت کا انکار اور اسکے اجماعی معنی کی تحریف۔

۲۔ دعویٔ نبوت اور غلام احمد کی طرف سے اسکی تصریح کہ میری نبوت انبیائے سابقین کی نبوت کے مثل ہے۔

۳۔ قادیانی کا خود پر وحی کے نزول کا دعویٰ اور یہ کہ میری وحی قرآن کی طرح واجب الایمان ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسلسل توہین (درآنحالیکہ وہ جلیل القدر نبی تھے)
۵۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل اہانت (والعیاذ باللہ)
۶۔ اپنے متبعین کے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دینا۔

بلاشبہ قادیانی قول و عمل میں یہ وہ اساسی وجوہ کفر ہیں جن کو موصوف کی دقتِ نظری نے گرفت میں لیا اور جس کے بعد غلام احمد قادیانی کی تکفیر ایک حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آئی۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے اس معرکۃ الآراء بیان میں ختمِ نبوت کا عقیدہ قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت فرمایا اور اس مضمون پر وہ محکم دلائل پیش فرمائے جن سے انکار ممکن نہیں۔ جابجا محدثین اور مفسرین کے اقوال استدلالاً پیش کئے گئے۔ ان بنیادی حقیقتوں پر قادیانی خرافاتی ذخیروں سے حوالے پیش کئے گئے۔ انبیاء کی جو توہین غلام احمد نے کی ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ کی تالیف "الصارم المسلول" سے حضرت عمرؓ کا ایک فتویٰ نقل فرمایا جسکا حاصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک گستاخی کرنیوالے کیلئے قتل کا حکم ہے۔ فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں من سب اللہ تعالیٰ او سب احداً من الانبیاء فاقتلوہ"۔ اس مضمون کی مزید تائید میں صدیق اکبرؓ کا بھی ایک فیصلہ عدالت کے روبرو پیش کیا۔ آپ نے مرزا کی ان ہفوات کا بھی ذکر فرمایا جو وہ اپنی نبوت میں بروزی، ظلی، مجازی کی سہ گانہ تقسیم کرتے ہوئے عام مسلمانوں کو مبتلائے فریب رکھنا چاہتا ہے۔ نبوت اور ولایت کا فرق صوفیاءِ کرام کے اقوال کا صحیح محمل، اُن کے شطحیات کا مصداق اور اس ذیل میں اہم علمی نکات کا ذکر عدالت میں کیا گیا ہم نے اختصار کے پیش نظر اس اہم علمی بیان کے کچھ منتخب علمی اقتباسات پیش کئے۔ شائقین اصل بیان کے مطالعہ کے بعد اسکی قدر و قیمت پر مطلع ہوں گے۔ قادیانیت کے تار و پود بکھیرنے میں مرحوم نے اپنی زندگی کا ربع حصہ صرف فرمایا ہے۔ آپکی مساعی جمیلہ حیاتِ مبارکہ میں تو اس حد تک کامیاب ہو چکی تھیں کہ قادیانیوں کا کفر امت کا ایک اتفاقی فیصلہ بن چکا تھا لیکن مشیتِ الٰہی بعض اوقات عجیب و غریب رُخ اختیار کرتی ہے۔ اس جدوجہد کے کچھ مرحلے آپ کی ناسوتی زندگی کے بعد تقدیرِ الٰہی میں طے تھے۔ قادیانیت پھیلتی رہی ہند و پاکستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ "سر ظفر اللہ خاں" پاکستانی کابینہ میں ایک مؤثر و مقتدر شخصیت کا مالک ہوا۔ حالانکہ کل عالم ظفر اللہ خاں کی قادیانیت اور مشن کو بڑھانے و پھیلانے میں اسکی غیر معمولی دلچسپیوں پر مطلع تھا۔ نتیجۃً پاکستان کے با اقتدار عہدے براہِ راست و بالواسطہ قادیانیت کے زیرِ اثر آتے چلے گئے بلکہ بعد کی اطلاعات سے پاکستانی فوج میں بھی اس ضلالت کے اثرات اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے دوسری جانب پاکستان میں "حضرت مرحوم" کا حلقۂ تلامذہ بھی بدستور تعاقب میں تھا۔

وقفہ وقفہ سے قادیانیت کے خلاف تحریک ابھرتی لیکن انھیں پوری قوت سے کچل دیا جاتا۔ ان ہی تحریکات میں "تحفظِ ختم نبوت" کمیٹی کے ارکان کی بے تحاشا گرفتاری ہے۔ آخر الامر مولانا محمد یوسف بنوری کے زیر قیادت "مجلس عمل" کا قیام اور علمائے ربانی کی جدوجہد سے مکہ معظمہ میں رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں قادیانیوں کے کفر کا قطعی فیصلہ، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کے عہد میں اس فیصلہ کی پاکستان میں صدائے بازگشت اور یہاں بھی کچھ قیل وقال کے بعد بالآخر قادیانیوں کو عام امت سے جدا فرقہ قرار دینے کی منظوری اور اسطرح ان کے کفر پر عام اتفاق نیز عالم اسلام میں اس فیصلے کے چرچے اور پھر اس تاریخی فیصلہ پر ممالک اسلامیہ کا اتحادِ خیال، مرحوم کی وفات کے چالیس سال بعد اُن کے روحانی اضطراب کے لئے ایک سکون، جدوجہد کی کامیابی کا جانفزا پیغام، اور ایک عالم ربانی کی سوز وتڑپ، بے چینیوں اور بے تابیوں کی کامیابی کا ایک ایمان افروز مظاہرہ ہے۔

مصنف کا یہ ہرگز دعویٰ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اس قادیانیت کے خلاف تحریک میں دوسرے اربابِ علم وفکر یا اصحابِ عزیمت وہمت کی شرکت نہیں تھی۔ بلاشبہ اُن کی کوششیں اس تحریک کے عناصر میں اہم حیثیت رکھتی ہیں لیکن اسے تسلیم کرنا ہوگا اور تاریخی وثائق اس دعوے کی پشت پر بہترین دلیل ہیں کہ شاہ صاحب اس تحریک کے قائدِ اول اور اس کاروانِ عزیمت کے "قافلہ سالار" تھے۔ بہرحال دارالعلوم دیوبند کی وہ ایک خصوصیت کہ سو سالہ اس آخری عہد میں ابلتے ہوئے ہر فتنے کے لئے اسی کے فرزند سینہ سپر رہے۔ اس امتیاز کا نور حضرت شاہ صاحب کی ذات میں جلوہ پذیر ہوا۔ اور راقم الحروف کو علامہ کی ان تمام مساعی کو دارالعلوم کی جانب منسوب کرنے میں الحمد للہ کوئی قلبی تجل نہیں۔

سطور بالا میں بیان بسلسلۂ مقدمہ "بہاولپور" کے کچھ اہم اقتباسات نظر قارئین کئے گئے لیکن اس بیان میں علم کی کن کن بلند چوٹیوں سے انھوں نے قادیانیت کے قلعہ پر پُر قوت سنگ باری کی۔ اس کی تفصیل جاننے کے لئے اس پورے بیان اور آپ کے قلم سے تیار دوسری تصانیف کی طرف مراجعت ضروری وکار آمد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جستہ جستہ کسی عنوان کے ذیل میں یہ بے بضاعت پھر اس داستانِ عزیمت کے کچھ اجزاء قارئین کے سامنے پیش کرے۔ اس وعدے کے ساتھ اس عنوان کو یہیں چھوڑ کر قلم کا مسافر دوسرے عنوانات کی جانب گامزن ہے۔

سیاسی زندگی:۔ اسلام چودہ سو سال سے اس کائنات کا ایک متعارف مذہب، ایک جانا پہچانا دین اور ایک مانوس سرمایۂ ایمان ہے اسکی اساسی و دعوتی بنیادوں میں قرآن و حدیث جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابناک کارنامے اور امت کے سربرآوردہ مجاہد طبقہ کی عزیمت پسندانہ عنوانات کی تفصیل طویل تاریخ میں بکھری ہوئی ہے جسے ہروقت دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جہاں آخری الہامی کتاب جس کا بنیادی وصف "لاریب فیہ" و "تنزیل من رب العالمین" یعنی الصحیفۃ المنزلۃ علی سید الکائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمیں نوح وابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ، زکریا ویحییٰ اور دوسرے مقدس ترین انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات عبرت انگیز و عبرت خیز کوائف کے ساتھ ہیں وہیں داؤد وسلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام کی تاریخِ شہنشاہیت، طالوت و ذوالقرنین کے جلیل کارناموں کی تفصیل بھی موجود ہے۔ کون داؤد وسلیمان؟ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ایک وسیع ترین حکمرانی کے فرمانروا، طالوت ایک سپہ سالار اور ذوالقرنین ایک عادل و منصف بادشاہ۔ کیا آج کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے دین کے محکم و بنیادی خط وخال کو نمایاں کرنے کے ساتھ دنیائے سیاست کے اساسی اصول کو یکسر نظر انداز کردیا؟ اگر یہ دعویٰ کسی زبان پر آئے یا کوئی قلم اسکی تراوش کرے تو یہ قرآن مجید کو نہ سمجھنے کا سب سے بڑا اعلان ہوگا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کا وہ مقدس رخ بھی ہمارے سامنے ہے جسمیں آپ ایک عابد وزاہد، مرتاض شب بیدار اور متقی پاکباز کی حیثیت سے امت کے سامنے آئے اور پھر یہ بھی سامنے ہے کہ زندگی کی سنگلاخ وادی میں ایک باعزیمت قیادت کے ساتھ خدا جانے کتنے معرکے ہیں جنہیں آپ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ظفر موج فوج کی راہنمائی کی اور شجاعت وبسالت کے نقوش صحیفۂ عالم پر ثبت فرمائے۔ پھر صحابہ کے مجاہدانہ کارنامے بلکہ شہ زور اہلِ علم کی سیاسی زندگی کے ابھرے ہوئے عنوانات اس امت کے تاریخ ساز مزاج کو سمجھنے و سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ میں آپ کو یہاں ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی، احمد بن حنبلؒ کا ولولۂ حق، ابن تیمیہؒ کا نعرۂ جہاد کی تفصیل نہیں سناؤں گا سرِ دست اسی داستان کے سرے کو پکڑتا ہوں جس کا تعلق ان ہی پاک طینت علماء سے ہے جو آپ کی اسی ہندوستان کی زمین پر اُٹھے، ابھرے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے اپنے غیر مشتبہ اخلاص ووفا کی تاریخ، تابناک کارنامہ بلکہ ایک جہانِ رنگ و بو چھوڑ گئے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے ہندوستان کی آخری حدود تک مسلم فاتحین کے باقاعدہ حملوں کا براہِ راست تعلق محمود غزنوی علیہ الرحمہ

سے ہوتا ہے پھر اسکے بعد کتنے ہی نامور خاندان ہیں جن کی فوجوں کے قدم اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس ملک کا گوشہ گوشہ آشنا ہے۔ آج بھی تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر کشورکشا کے ساتھ کبھی اہلِ علم کی جماعت، گاہے علمارِ ربّانی کا ہجوم بلکہ اُن کی نقل وحرکت، زہّاد وعبّاد کی مخلصانہ جلو میں مسلسل ہوتی رہی لیکن خود اسلام کے تحفظ اسکی صیانت وحفاظت کا مجاہدانہ کارنامہ مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی عزیمت سے وابستہ ہے۔ مغل حکمرانی کا درمیانی بادشاہ "اکبر اعظم" اپنی ذاتی زندگی یا ملکی پالیسی میں کتنا ہی صاف ستھرے دماغ کا انسان اور عمدہ صفات سے متصف ہو اور اس سے قطعاً انکار نہیں کہ ملک کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور میل وتال پیدا کرنے میں اسکی کوششیں مشکور ہیں مگر اسلام سے جو مخاصمت ومعاندت کا بھیانک کردار اس سے بندھا ہوا ہے وہ اسکی شورش دماغ کا ایک خوفناک پہلو ہے۔ سوال یہ ہے کہ "اکبر" اگر مذہبی رواداری کا علمبردار تھا تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اُس نے ہندوستان میں اپنی پالیسی سے براہِ راست اسلام اور مسلمانوں کو ایک ایسی تباہی سے دوچار کرنا چاہا کہ اگر مجدد ہزارۂ دوم کی ایمانی کوششیں شدید مزاحمت نہ کرتیں تو اس پالیسی کے مہیب اثرات نہایت دوررس ہوتے۔ مجھے مجدد صاحبؒ کے اُن تمام جلیل کارناموں کی تفصیل وداستان سنانا نہیں اس روشن باطن وروشن نہاد انسان سے متعلق ہندوستان کی مروّج زبانوں میں تفصیلات اس قدر موجود ہیں جس سے اس ہزارۂ دوم کے حق پرست کی پوری زندگی اور روشن کارناموں کا مطالعہ بآسانی ممکن ہے۔

بتانا صرف یہ ہے کہ اکبری الحاد وزیغ، شیخ مبارک، فیضی فیاضی، ابوالفضل اور اسی طرز کے انسانوں کی شورہ پشتیوں اور کج دماغیوں کا مؤثر وکارآمد علاج یہی خدا کا مقدس بندہ اپنی خانقاہ سے کر رہا تھا۔ غالباً ان حقائق سے کچھ پیشانیوں پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں لیکن کیا کیجئے "تاریخ کے ان وثائق" کو نہ صفحات سے کھرچا جاسکتا ہے اور نہ اِن پُر عزیمت کارناموں کو مٹایا جاسکتا ہے۔ دانش وبینش سے تعلق رکھنے والے انسانوں سے یہ بھی سوال ہے کہ "اکبر" جس دل ودماغ کا انسان تھا اور جس ڈگر پر وہ کام کر رہا تھا تلوّن مزاجی کی تیرہ وتار کائنات میں اس امکان کو کیوں بعید قرار دیا جاتا ہے کہ اسکی اسلام دشمنی کبھی ختم ہوتی اور وہ کسی دوسرے فرقہ ومذہب کی دشمنی کا رنگ اختیار کرجاتی تو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب فرض کرلیجئے کہ اکثریتی فرقہ کے معتقدات سے اکبری تلاعب دنیا کے لئے پسندیدہ ہوتا؟ ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب سے اسکی دلچسپی، تنوّع مذاہب کے اجارہ داروں سے اسکے قریبی روابط، ہر ایک کی بات سُننا اور ہر ایک سے اثر پذیر ہونا جب اس کا خاص

مزاج تھا تو کیا یہ ناممکن ہے کہ کوئی چرب زبان اپنی ملمع کاری سے بآسانی اسکو کسی دوسرے رخ پر نہ ڈال لیتا۔

اگر ان ہی زوایائے ہوشمند طبقہ اکبر کی پوری ذہنیت پر غور کرے تو ٹھیک ان نتائج پر پہونچے گا جن پر راقم السطور پہونچ کر ٹھہر گیا۔ بہرحال مجھے "اکبر" پرستوں کے فکر و ذہن کو بدلنے اور ان کے ذہنی سانچوں کو توڑ کر نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوئی مہم پیشِ نظر نہیں جو کچھ قلم پر آگیا وہ ارتجالاً ہے۔

بات تو یہ چل رہی تھی کہ اسلامی تاریخ کے بنیادی عناصر یعنی اہلِ علم نے اور علمائے ربانی نے ان فتنوں کا مقابلہ کسطرح کیا اور اُن کی کاوشیں کیا کچھ رنگ لائیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ایک انسانی دل و دماغ اٹھتے ہوئے سیلاب اور اچھلتے بڑھتے طوفانوں کا رُخ بدل سکتا ہے تو حضرت مجدد ان عہد آفریں شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدلا ہے۔ الملک الجلیل سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ کا وجود گرامی اور ان کی مؤمنانہ بادشاہی پورے ہندوستان کے لئے خدائے ذوالمنن کا ایک احسان ہے مگر تاریخ کی چیرہ دستیاں کہ حضرت سلطان الجلیل کو ایک نہایت ہی غلط رنگ میں تیرہ باطنوں نے پیش کیا[ع] اور آج تک تاریخ کے اطراف و جوانب ان ہی غلط صداؤں کی بازگشت سے معمور ہیں جو ملک میں مختلف فرقوں میں یگانگت و مودّت کے رنگین و حسین نغموں کے بجائے زہر چکائی کر نیوالے انگریز دل و دماغ کی کاوش تھی۔ اس سے آگے بڑھئے جب یہ مغل حکمرانی

ع بے اختیار اس موقعہ پر حکیم شیراز و دانائے روزگار سعدی علیہ الرحمہ کی لکھی ہوئی وہ حکایت یاد آتی ہے کہ کسی مردِ صالح نے ایک شب اچانک ابلیس کو خواب میں دیکھا کہ ایک پیکرِ زیبا، ایک حسن مجسم، جمال و رعنائی کی ڈھلی ڈھلائی تصویر، دیکھنے والا ورطۂ حیرت میں سرتاپا غرقاب ہو گیا اور استعجالاً پوچھا کہ تو وہی ابلیس ہے جس کی تصویر ایک مہیب دیو، ایک جاں گسل، ایک خوفناک عدو کی شکل میں ہمیشہ پیش کی جاتی ہے؟ اس سوال پر ابلیسانہ جواب یہ تھا کہ جو کچھ ہوں تم دیکھ رہے ہو۔

ے ولیکن قلم در کفِ دشمن است۔ ابلیس حسین و جمیل ہے یا نہیں اور خواب میں اسکی یہ حسین جلوہ گری ان ہی طاغوتی قوتوں کا کرشمہ ہے جو اس ظالم کو خوب حاصل ہیں۔ لیکن حضرت سلطان اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے ساتھ معاند مؤرخ کے قلم نے واقعتہً یہی بھیانک کام انجام دیا کہ اس خدا پرست بادشاہ کے خدوخال کو بگاڑ کر ظلم پیشہ ستمگر انسان کی شکل میں ڈھال دیا اور یہ بھی عجیب سانحہ ہے کہ مدتوں سے کوئی اور نہیں خود ہندوستان کے اکثریتی فرقہ کے دانشور و مبصر ہی غلط فہمیوں کے تیرہ و تار بادلوں کو اپنے قلموں سے ہٹا رہے ہیں لیکن گھنگھور گھٹائیں کچھ اسطرح تہ بہ تہ محیط کر دی گئیں کہ فضا صاف ہونے نہیں پاتی۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

حضرت اورنگزیبؒ کے نااہل جانشینوں یا شاطر فرنگی کی شاطرانہ چالوں یا ہندوستان ہی کے نفاق پیشہ ننگ تاریخ انسانوں کی منافقانہ سازشوں کے نتیجہ میں چھن چھنا گئی اور ہندوستان اپنے اقتدار سے محروم ہو کر کلیۃً ایک غیر ملکی اقتدار کے آہنی پنجے میں پہونچ گیا تو صورتِ حال کی مرثیہ نگاری الامام الشہیر بولی اللہ الدھلوی اور ان کے خانوادہ کے اُن اربابِ ہمت کے حصہ میں آئی جن کی بلند تاریخ سے صفحاتِ روزگار ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ شاہ صاحب کے حساس دل ودماغ اور ان کے علم ریز قلم نے جو کچھ کیا اور لکھا اسکی تفصیلات الحمد للہ ضائع ہونے نہیں پائیں آج بھی اس عزیمت کے جلی وخفی عنوانات کو دیکھنے والے بسہولت دیکھ سکتے ہیں۔ متصلاً شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کی سیادت حضرت سید احمد شہیدؒ کا سفرِ جہاد، شاہ اسماعیل شہیدؒ کی رفاقت، مولانا عبدالحیٔ بڑھانویؒ کی ہم عنانی ایک حقیقت ہے جسکی تردید ممکن نہیں، ایک واقعہ ہے جسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اسی خانوادۂ شرافت ونجابت کے خوشہ چینوں میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا قاسم النانوتویؒ اور قطب الہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں جنھوں نے دلّی کے اسی مدرسۂ فکر میں مجاہدانہ زندگی کے طور وطریق کی تعلیم حاصل کی اور جب دلّی پر فرنگی تسلّط کی بنا پر اس مرکزی شہر میں بیٹھکر لگائی ہوئی آگ کی چنگاریاں اطراف وجوانب میں پھیلانا ممکن نہ رہیں تو یہ دونوں داعیٔ حق اس امانت کو لے کر ضلع سہارنپور کے مشہور قصبہ "دیوبند" میں پہونچ گئے گویا کہ حریت پسندی، استخلاصِ وطن، غیر ملکی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کا جذبۂ بے اختیار اچانک دلّی کی سرزمین نے دیوبند کی جانب منتقل ہو گیا اور اپنی خاص مساعیٔ جمیلہ کو جن کا تمامتر تعلق ملکی آزادی کا حصول تھا علم ودانش کے حسین نقاب کے تحت جس انداز پر شروع کیا گیا اسکی پوری داستان "دارالعلوم دیوبند" سے وابستہ ہے۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے ایک ہمہ گیر تحریک کی بنیاد نئے تقاضوں کے مطابق جس انداز پر کی اور اس کاروانِ جہاد کو برابر پیش قدمی کے لئے جو سپہ سالارِ اعظم دیا اس کا نامِ نامی "مولانا محمود الحسن المعروف بہ شیخ الہند" ہے علیہ رحمۃ اللہ ورضوانہ۔ فرق اتنا ہے کہ دماغ حضرت نانوتوی کا تھا اور آپ ہی کا فکر لیکن نئے حالات نئے ماحول اور نئی فضا میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان آتشیں جذبات کو انگھیٹیوں میں مستور رکھنے کے بجائے شعلے ان دل ودماغ میں بھی منتقل کرنا شروع کر دئے جو ابتک فرنگی ظلم واستبداد کی شدید گرفت کی وجہ سے کسی طشت از بام جد وجہد کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے کہ آپکی دامنِ تربیت سے صرف فخرِ روزگار دانشمند تیار نہیں ہوئے بلکہ وہ حریت پسندی وجہادِ آزادی کے سرفروش قافلہ کے

قافلہ سالار بھی تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ اپنے استاذ کے باغیانہ خیالات وسیاسی افکار سے بقوۃ متاثر تھے۔

برطانوی سی، آئی، ڈی کا مرتبہ ریکارڈ جو حال ہی میں سامنے آیا اسمیں صاحب سوانح حضرت شاہ صاحب کو حضرت شیخ الہند کی تحریک کا بنیادی شریک قرار دیا گیا ہے اور جو دار العلوم کے اساسی محرکات پر مطلع ہے اسکے لئے ان شخصیتوں کی پیداوار اور خاص خیالات کے بارے میں کوئی تعجب کی بھی بات نہیں۔ آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ دار العلوم درحقیقت "خانوادۂ ولی اللہی" کی وہ امانت تھی جسے "دلی" کے مکتبۂ فکر سے قریبی روابط رکھنے والوں نے بعض اہم مصالح کے پیش نظر "دیوبند" منتقل کر دیا تھا اور جس پر علم ودانش کا نقاب بظاہر ڈالدیا گیا تھا لیکن وہ بباطن ایک ایسا معسکر تھا جسکی مشین پوری تیزی کے ساتھ برطانوی اقتدار کے خلاف مسلسل پرزے ڈھال رہی تھی یہی نہیں بلکہ "دیوبند" کے قرب وجوار اور اسکے مضافات میں جو خانقاہیں تعمیر باطن کا کام کر رہی تھیں ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ آزادیٔ وطن تک انمیں خفیہ بیعت جہاد بھی لی جاتی تھی اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائپوری سے بیعت جہاد کرنیوالوں میں مولانا حبیب الرحمٰن نومسلم سے اس حقیقت کی تصدیق خود راقم الحروف نے کی۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں باستثنائے "خانقاہ تھانہ بھون" ہر خانقاہ میں ان جذبات کی خاص پرورش ونگہداشت کی جاتی جن کا مقصد "برٹش اقتدار" کے خلاف ان جذبات پر مبنی تھا کہ "تخت یا تختہ"۔ ان سطور سے ہرگز ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دار العلوم کے خصوصی افکار سے نامانوس تھے۔ چیرہ دستوں نے حضرت کی حیاۃ مبارکہ ہی میں ان پر منجملہ دوسرے الزامات کے برطانوی حکومت کا "کاسہ لیس" ہونے کا بھی ظالمانہ الزام عائد کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کیا۔ حالانکہ مرحوم کی وہ تصانیف جو قبولیت عام حاصل کر کے گھر گھر پہونچ چکیں اگر صرف ان ہی کی رائلٹی ناشرین سے وصول کی جاتی تو جو کچھ ظلم پیشہ طبقہ انگریز سے ملنے والی رقم بتا رہا تھا اس سے کئی گنا زائد ہوتی۔ بات یہ کہ مولانا اشرف علی صاحب ایک دیدہ ور عالم ہی نہیں بلکہ خدائے تعالےٰ نے ان کو خاص بصیرت وفراست بھی عطا فرمائی تھی۔ اسلئے ہندوستان کے سیاسی مدّوجزر ونشیب وفراز میں وہ ایک مجتہدانہ بصیرت ونقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو جس صورت حال سے سابقہ ہے اسکو دیکھکر مؤرخ فیصلہ کرے گا کہ مولانا تھانوی اپنے فکر میں مصیب تھے یا خاطی۔

القصۃ بطولہا۔

بہرحال حضرت مولانا انورشاہ کشمیری اگرچہ قید و بند کی صعوبتوں سے محفوظ رہے اور سیاسی زندگی میں کوئی ان کا نمایاں کردار بھی نہیں تاہم حریت پسندوں کے جم غفیر میں انہیں شمار کرنے کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔ سطور بالا میں برطانوی ریکارڈ سے ایک اہم و وقیع شہادت نظر قارئین کر چکا ہوں اپنے استاذ مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی سے جو حضرت شیخ الہند کے خصوصی خدام میں تھے اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرس۔ یہ واقعہ بکثرت سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد جب ہندوستان میں برطانوی پولیس نے دار و گیر کا ہنگامہ برپا کیا تو ایک روز مولانا انورشاہ کشمیری کے بھی رہائشی کمرہ پر دوش پہونچنے والی تھی لیکن قبل از وقت انکشاف کی بنا پر حضرت شاہ صاحب نے اس تمام ریکارڈ کو نظر آتش کر دیا جس پر قبضہ کی صورت میں حضرت شیخ الہند کے باغیانہ عزائم کے مضبوط شواہد فرنگی اقتدار کے ہاتھ آتے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنے ان جذبات کے مکمل اخفائی کوششوں کے باوجود کبھی کبھی درس میں بے اختیار فرماتے کہ

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے بجز ایک چائے کی پیالی ڈو بسکٹ اور ایک تلوار جس سے میں اعلائے کلمۃ اللہ کا کام لوں"

طلبہ کا وہ ذہین و فطین طبقہ جو دار العلوم کے اساسی محرکات پر مطلع تھا صاحب سوانح کے اس ایک سطری ارشاد سے اس طوفان کی سمتیں متعین کر لیتا جو آپ کے سینہ میں تلاطم پذیر تھا اور پھر یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا کے زمانہ میں آپ کے خاص تلامذہ نے جب جمعیۃ علمائے ہند کو قائم کیا تو آپ کے تمام تلامذہ اس تنظیم سے وابستہ ہو کر ٹھیک ٹھیک اس منہاج پر کام کرنے میں مصروف ہو گئے جو اپنے یگانۂ روزگار استاذ سے بطور امانت ان تک پہونچا تھا چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے ہمیشہ جمعیۃ العلماء سے قریبی رابطہ رکھا اس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں مسلسل شرکت فرمائی اور جہاں کہیں اس کے سالانہ اجلاس ہوتے اسمیں التزام سے شرکت فرماتے بلکہ ۱۹۲۷ء میں پشاور میں منعقدہ سالانہ اجلاس برائے جمعیۃ العلماء کی صدارت فرمائی اور ایک طویل خطبۂ صدارت تحریر فرمایا جو خزینۂ علوم و معارف ہونے کے ساتھ برطانوی ڈپلومیسی پر ایک بھرپور وار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص مشاغل تعلیم و تدریس، مطالعہ اور ان ہی اوصاف میں بے نظیر شہرت کے ساتھ آپ عصری سیاست، اسکے نشیب و فراز، پیچ و خم پر

کس قدر بصیرانہ نظر رکھتے ہیں۔ اسی طویل وعریض خطبۂ صدارت سے اہم اقتباسات پیش کرنے کا منصوبہ راقم السطور کے ملحوظِ نظر ہے لیکن آپ کی سیاسی زندگی کے شواہد جو کچھ عرض کرچکا ہوں اسمیں اس اضافہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ہندوستان میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے برطانوی ڈپلومیسی جس انداز پر کام کررہی تھی یعنی مختلف خیالات کی نشوونما اور پھر ان کو امت کے اکثریتی طبقہ سے دست وگریبان کردینے کی سازش کہ رات ہی رات میں بریلوی افکار کے ایک ذمہ دار کو انگریز نے خفیہ ملاقات میں خدا جانے کیا ہدایات دیں کہ اچانک بریلوی عالم بدعت ومحدثات کا ہندوستان میں سب سے بڑا داعی بن گیا اور پھر بدعت وسنت یا دیوبندیت و بریلویت کی شکل میں جو قیامت بدوش فتنہ شروع ہوا آج تک ہندوستانی مسلمان اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کراسکا۔ غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ کے خیالات اور افکار میں یکایک انقلاب وتبدیلی کسی بڑی حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ یہی شخص جس کا قلم ابتداء میں نصرانیت کے تاروپود بکھیر رہا تھا اور اسلام کی حقانیت وصداقت پر دلائل بہم پہونچا رہا تھا کسطرح بتدریج مہدویت، ظلی، بروزی نبوت کے مراحل طے کرنے کے بعد صاف صاف نبوتِ کبریٰ کا مدعی بن گیا اور پھر نصف صدی کے طویل ترین اوقات گذرنے کے باوجود اس النبی الکاذب سے اہلِ حق کے جو معرکے رہے موجودہ ہندوپاک میں آج تک وہ بھڑکی ہوئی آگ بالکلیہ ٹھنڈی نہیں ہوسکی۔ پھر کوئی شبہ کرسکتا ہے کہ مولوی احمد رضاخان بریلوی کا تعاقب یا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت کو شکست وریخت کرنیوالا۔ دیوبندی طبقہ پاسبانِ سنت ونبوت ہونے کے ساتھ ظاہر سے گذر کر باطن میں برطانوی ڈپلومیسی کی کرشمہ کاریوں کو دیکھ رہا تھا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ افراد خاص اس نقطۂ نظر سے بھی دجل وتلبیس کے ان گھروندوں پر پیہم حملے نہیں کررہے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی کی دسیسہ کاریوں پر قلم بے اختیار غم وتاسف کے جذبات سے متاثر ہوکر کہیں سے کہیں نکل گیا۔ بات تو درحقیقت صاحب سوانح کے اس معرکۃ الآراء خطبہ پر کرنا تھی جو اجلاس جمعیۃ العلماء منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء میں دیا گیا۔ع٥

ع٥ اس خطبہ کی اصل زبان فارسی ہے۔ صاحبِ خطبہ اردو میں بھی عربی آمیز گفتگو کے عادی تھے۔ اُن کے درسی تقریر قلمبند کرنے والے بے تکلف عربی میں بآسانی منتقل کرلیتے۔ نجی خط وکتابت بھی بیشتر فارسی میں یا عربی میں ہوتی جیساکہ مشہور ہے اس خطبہ کو اردو میں صدر جمعیۃ علمائے ہند مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے منتقل کیا تھا۔ فارسی مسودہ مدتوں اس بے بضاعت کے پاس محفوظ رہا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو معلوم ہوا تو باصرار شائع کرانے کیلئے خاکسار سے لے لیا اور افسوس کہ مرحوم کے دوسرے نایاب علمی ذخیروں کیطرح یہ گنجینۂ علم وبصیرت بھی ضائع ہوگیا۔ اس تصنیف کے وقت خطبہ کیضرورت پیش آئی تو بشمول کتبخانہ دارالعلوم دیوبند جمعیۃ العلماء کی لائبریری بلکہ معروف دوسرے کتبخانوں میں بھی مہیا نہ ہوسکا، کھٹور ضلع میرٹھ کے حکیم شفیق احمد صاحب سے خطبہ فراہم ہوا اور وہ اب خود بھی مرحوم ہوچکے۔

حضرت شاہ صاحب نے غالباً ۲۸ عنوانات پر خطبہ میں اہم مسائل پر توجہ فرمائی ہے جسکے نتیجہ میں ۸۷ صفحات پر یہ خطبہ پھیل گیا جسے مرکزی جمعیۃ علمائے ہند دہلی نے شائع کیا ہے۔ ابتداء میں تشکر و امتنان کے بیانات کے بعد سب سے پہلے بتایا گیا کہ یہ کل کائنات ایک نظام کے تحت مربوط سلسلہ سے وابستہ ہے۔ عالمِ رنگ و بو کی موجودہ شکل واضح طور پر بتاتی ہے کہ سلسلۂ کائنات کے پس پردہ کوئی مقتدر ہستی ہے جو اس نظامِ عالم کو ایک خاص انداز پر چلا رہی ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ

"صوفیا کے یہاں اس عالمِ اکبر کی طرح خود انسان بھی ایک عالم ہے جس کا اساسی محرک قلب ہے اور باقی تمام اعضاء اس کے تابع فرمان"

اس فاضلانہ گفتگو کے چند اقتباسات نظرِ قارئین ہیں ارشاد ہوا کہ

"ترک و اختیار کی تمام حرکات پہلے قلب سے اسی طرح صادر ہوتی ہیں جسطرح بادشاہ کی جانب سے اوامر و فرامین شائع ہوتے ہیں پھر قلب کی اس جنبش کا دماغ پر اثر پڑتا ہے اور دماغ اسکی صحیح تصویر اور موزوں نقشہ کھینچتا ہے۔ اسکے بعد اعضاء و جوارح انسانی اسکے امتثال میں مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں"

ان بلیغ ارشادات کو پھر تفصیل میں اسطرح سمجھایا گیا کہ

"قلب ایک بادشاہ ہے دماغ اس کا وزیر اور اعضاء اسکے خدم وحشم ہیں اسلئے تمام امورِ انسانیہ کے صلاح و فساد کا مدار قلب پر ہے"

استدلال میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث کا بھی تذکرہ فرمایا جسمیں صلاح و فساد کی تمامتر ذمہ داریاں قلب پر ڈالدی گئی ہیں۔ اس سے آگے بڑھکر خود اس کائنات کو جسدِ انسانی کا مشابہ بناتے ہوئے اس میں بھی قلب و دماغ اور اعضاء کی نشان دہی فرمائی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"اسی طرح شخص اکبر (مجموعۂ عالم) کے لئے بھی قلب، اعضاء، دماغ و جوارح ہیں اس شخص اکبر کا قلب تو وہی ہے جس کو اصطلاحِ شریعت میں اولی الامر یا اصحابِ حل و عقد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا دماغ حکماء و علماء شریعتِ غرّہ ہیں اعضاء و جوارح عام افراد ہیں"

اگر قلب کے صلاح و فساد پر کائناتِ انسانی کی صحت و درستگی یا فساد و بگاڑ موقوف تھا تو

عالمِ اکبر کے قلب یعنی علماء کے صلاح وفساد پر خود عالم اکبر کی خوبی و برائی موقوف ہے۔ ان تعبیرات میں جہاں علماء کو ان کے حقیقی فرائض پر متوجہ کیا گیا عوام کو بھی صحیح قیادت کی مکمل اتباع پر توجہ دلائی گئی۔ ذیلاً اس پر بھی بحث کی گئی کہ عالمِ رنگ و بو میں نظامِ تشریع کو قائم کرنے کے لئے جسطرح انسانی کاوشیں وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناکام ہیں لیکن خود وحی الٰہی کو قبول کرنے کے لئے ایک صالح ترین طبقہ کی ضرورت ہے۔ عام انسان اخذ و قبول کی صلاحیت قطعاً نہیں رکھتے اگر یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برگزیدہ طبقہ میں ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ سلسلۂ نبوت کی ابتدا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور اس کا اختتام خاتم النبیین جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر، موضوع کی مناسبت سے بے اختیار حضرت شاہ صاحب کے قلم مبارک سے قادیانیت کی تردید کے شدید جذبات اسطرح اچھل پڑے کہ

"البتہ فضائلِ نبوت میں سے اب بھی بعض چیزیں باقی ہیں جن کو بعض ملاحدہ نبوت سمجھکر دھوکا کھائے ہیں اور بعض دجال ازراہِ تلبیس خود مدعیٔ نبوت و رسالت بن بیٹھے۔"

مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ظہور، عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نزول جو قرب قیامت میں ضلالت و گمراہی کو قلع و قمع کرنے کے لئے ہوگا اسکی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ابد نشان ہے ظہور و نزول بھی نبوت کی حیثیت سے نہیں بلکہ آپ ہی کے نبوت کے تابع ہو کر آپ کی لائی ہوئی شریعت کو از سرِ نو قائم کرنے اور اسکی نشأۃ ثانیہ کے لئے ہوگا۔"

یہاں آپ نے تورات میں جو بزبان عبرانی ہے اسکے ایک بشارتی فقرہ کا ذکر کرنے کے بعد مترجمینِ تورات کی ایک بڑی فریب کاری کا پردہ چاک کیا ہے۔ تحریر فرمایا ہے کہ تورات میں عبری زبان میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وصایا میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

"نابی مقربخ ماحیخ ماموخ باقیم لخ الوھخ الاو تسماعون۔"

عبری و عربی کی قریبی مماثلت کی بنا پر ان وصایا کو عربی میں اسطرح پڑھا جائے گا۔

"نبی من قربك من اخيك كمثلك ويقيم لك الهك اليه تسمعون۔"

یعنی ایک نبی تیرے قریب سے، تیرے بھائیوں میں سے، تجھ جیسا تیرا خدا تیرے لئے مبعوث کرے گا اسکی سنیو۔

لیکن عیسائی مترجم نے مُقَرَّبُخ کا ترجمہ تیرے درمیان سے کر دیا۔ اس مغالطہ کے نتیجہ میں موسیٰ علیہ السلام کی اِن بشارتوں کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر منطبق کرنے میں ممکنہ راہیں مترجمین تورات کی دسیسہ کاری کے نتیجہ میں مسدود ہو گئیں۔

عہ معلوم ہے کہ قدیم علماء میں ہمہ جہت علوم و فنون کو حاصل کرنے کا بے اختیار جذبہ رہا ہے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ماثر الکرام" میں علماء کے سوانحی تذکروں میں ان کی کتابت میں مہارت، خطاطی و خوشنویسی میں ملکہ راسخہ بلکہ بعض علماء کے متعلق موسیقی سے کامل واقفیت کی اطلاع دی ہے اور یہ تو بہت سے جانتے ہیں کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اجلہ خلفاء میں امیر خسروؒ نہ صرف موسیقی کے واقف بلکہ بعض سروں کے موجد ہیں۔ درس نظامی کی مشہور کتاب "تلخیص المفتاح" کا مصنف فن سحر و شعبدہ بازی میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ خاکسار کی نظر سے مولانا مناظر احسن گیلانی کے کسی تصنیفی شاہکار میں اس فاضلِ یگانہ کے شعبدہ بازی کے حیرت انگیز واقعات نظر سے گذر رہے ہیں)۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی متاخرین میں یکتائے روزگار عالم تھے کہ آپکا ذوقِ علم و ذوقِ تجسس آپ کو طب، نجوم، جفر، رمل، موسیقی، کتابت خطاطی اور بہت سے متداول و غیر متداول فنون کی طرف لے گیا۔ خوب یاد ہے کہ ایک بار اپنے رہائشی مکان میں تشریف فرما تھے قریب میں ایک مسلمان نوجوان نے الغوزہ بجایا تو حضرت شاہ صاحب نے اس نوجوان کو طلب فرمایا یہ حافظ محمد حسین تھا جو اس محلہ میں ہمارے ساتھ رہتا اور پھر بہت دیر تک محمد حسین کو اسکے سُر بتاتے رہے۔ بجنور میں مولانا مشیت اللہ صاحب کے مکان پر فوٹو کا تذکرہ آیا تو آپ نے کیمرہ، تصویر کشی، تصویر کے صاف کرنے اس کے مسالے و تمام اجزاء پر مفصل تقریر فرمائی۔ ایسے ہی نجوم و جفر و رمل میں بھی کامل واقفیت رکھتے۔ مولانا کریم بخش سابق پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور نے اپنے ایک مضمون متعلقہ حضرت شاہ صاحب میں حضرت کی ان فنون سے واقفیت کے خاص واقعات ذکر کئے ہیں۔ عم محترم مولانا سیف اللہ شاہ صاحب نے بتایا کہ جب وہ دار العلوم میں طالب علمی کرتے تھے تو مولانا شمس الحق صاحب افغانی سابق وزیر تعلیم آف قلات دار العلوم میں پڑھنے کے لئے تشریف لائے تو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ان برادرِ خورد سے فرمایا کہ یہ طالب علم (شمس الحق) علم نجوم سے خوب واقف ہیں تم ان سے سیکھ لو کبھی کام آئیگا۔ بہر حال متقدمین و متاخرین علماء کے یہاں علوم و فنون سے واقفیت بلکہ فنونِ لطیفہ تک رسائی معیوب نہیں تھی اور اسی سے یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ اہل علم کبھی انگریزی تعلیم کے بھی مخالف نہیں رہے۔ خود حضرت شاہ صاحب نے بچپن میں انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ البتہ ان علوم و فنون سے جو بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان ہی کے یہ حضرات مخالف رہے۔ بتاتا تو مجھے یہ تھا کہ مرحوم نے عبرانی زبان کی بھی تحصیل کی تھی اور تورات و بائبل وغیرہ کے تراجم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق موجود پیشین گوئیوں کا جو حشر خراب کیا ہے اس پر طلبہ کو متوجہ فرماتے۔ مولانا محمد انوری لائلپوری نے حضرت شاہ صاحب سے متعلق جو سوانح بنام "کمالات انوری" تحریر فرمائی ہے اُسمیں لکھا ہے کہ کشمیر کے سفر کے دوران سیالکوٹ میں شاہ صاحب سے ایک انگریزی پادری ملا جس کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کبریٰ پر علاوہ معقول و منقول دلائل کے خود تورات سے بھی دلنشیں دلائل اور اس کی عبارتیں پیش

(باقی آگے)

اسی خطبہ میں آپ نے اس حقیقت کو بھی واضح فرمایا کہ اسلامی قومیت کی بنیاد رابطۂ دینی اور اخوت مذہبی ہے اور اسلامی اقوام و امم میں بجز قومِ عرب، قومِ ترک اور قومِ افغان کے جو بحیثیت نسل بھی مسلمان ہیں اور کوئی قوم بحیثیتِ نسل اسلام میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر ملک کی ہر قوم میں مسلم و غیر مسلم دونوں ہیں اسلئے اسلامی قومیت کا مدار اور اتحادِ نسل یا اتحادِ وطن پر نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں اسلامی قومیت کی زندگی و بقا صرف دین و مذہب اور ملت کے احیاء و بقاء میں منحصر ہے۔

اس اساس کے ہاتھ سے نکل جانے پر متوقع خطرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ

"اگر یہ رابطہ خدانخواستہ درمیان سے اُٹھ جائے تو قومِ مسلم اسی روز تہ خاک دفن ہوا ورمن حیث القوم اس کا وجود ہرگز باقی نہیں رہے گا۔"

انڈین نیشنل کانگریس سے سیاسی اتحاد، اشتراکِ خیال و اشتراکِ کار کے باوجود درآنحالیکہ یہ اکابرِ جمعیۃ ہندوستان کی مختلف قوموں میں جہدِ آزادی کی کامیابی کے لئے ایک مضبوط توافق کے نہ صرف قائل بلکہ اُسے عملی حدود میں بروئے کار لانے کے لئے ہمہ تن مصروف تھے لیکن پھر بھی مداہنت حقیقتوں کے بیان میں تلبیس یا کسی ایسی غلط رواداری کے ہرگز مرتکب نہیں ہوسکے جس سے اسلام، مذہب دین اور ملت کو کوئی نقصان پہونچے۔ افسوس ہے کہ ان حقائق کے باوجود مخالفین نے

صلاا کا بقیہ :- فرمائیں اور یہ بھی فرمایا کہ عیسائیوں کے یہاں موجودہ صلیب کی شکل بھی صحیح و محفوظ نہیں رہی اس عیسائی راہب نے متأثر ہو کر کہا کہ اگر مجھ پر اپنی مذہبی ذمہ داریاں اور اس منصب سے حاصل منافع کے حصول کا غلبہ نہ ہوتا تو یقیناً اسلام قبول کر لیتا۔

عہ غیر منقسم ہندوستان میں لیگی پریس کی فریب کاریوں سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی سابق صدر جمعیۃ علمائے ہند کی ایک تقریر جو دہلی کے کسی محلہ میں کی گئی تھی اور جسمیں آپ نے بوضاحت فرمایا تھا کہ اگرچہ دنیا میں قومیت وطن سے بنتی ہے لیکن اسلام اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے اساسِ قومیت، اخوتِ دینی و مذہبی کو قرار دیتا ہے۔ افسوس کہ اس تقریر کی رپورٹنگ غلط کی گئی اور بتایا کہ مولانا قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دے رہے ہیں جس پر ڈاکٹر اقبال نے مشہور قطعہ تصنیف کیا۔ بلکہ یہ مسئلہ اخبارات میں تلخ مباحث، رد و قدح، سب و شتم کا موضوع بن گیا۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے ایک شاگرد نے طالوت کے نام سے دونوں اکابر سے خط و کتابت اور طویل مراسلت کے بعد ڈاکٹر اقبال کو مولانا مدنی کے حقیقی خیالات و واقعی ارشادات پر مطلع کیا جس پر اقبال نے اس قطعہ سے اپنی برأت کا اعلان کرتے ہوئے کلام کے ناشرین کو توجہ دلائی تھی کہ یہ اشعار آئندہ شریکِ کلام نہ کئے جائیں۔ مگر مسلسل یہ اشعار جو غلط فہمی کے ساتھ بڑی بدمزگی کا بھی موجب بن چکے۔ علامہ کی خواہشات و تصریحات کے بالکل خلاف شریکِ اشاعت کئے جارہے ہیں۔ فیا للعجب۔

ان پاکیزہ افراد و رجال کو بھی رسوا کرنے یا متہم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس دور میں جب کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی یعنی انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان کے تمام باشندوں کی رہنمائی کی دعویدار تھی اور جسکے سیاسی اسٹیج پر وافقتہً ہندوستان کے تمام قوموں کے سربراہ و نمائندے جمع تھے۔ مجتمع طاقت کو مختلف حصوں بخروں میں تقسیم کرنے اور اسطرح ایک مشترکہ جدوجہد کو کمزور بنانے کے جرم سے کلیۃً احتراز ضروری تھا۔ پھر جمعیۃ العلماء کے قیام اسکی تاسیس کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے اسی گوشۂ بحث کو سمیٹتے ہوئے علماء کی اس تنظیم اور عوامی قیادت کے اس جواز کو اپنے الفاظ میں بعض احادیث سے مدلل کرتے ہوئے فرمایا

"اس اہم مقصد (یعنی رابطۂ دینی و اخوتِ مذہبی کو باقی رکھنے کے لیے) کے انصرام کے لئے علماء کرام نے چند سال سے اپنے دائرہ میں ایک نظام قائم کیا ہے جس کا نام جمعیۃ العلمائے ہند ہے تاکہ موجودہ زمانے کے ابھرتے ہوئے مسائل میں جن کا تعلق سیاسیات، مذہبیات، اخلاقیات، معاشرت و تمدن یا اقتصادیات کسی سے بھی ہو اسمیں درپیش حل طلب مسائل کے لئے بحث و تمحیص، تحقیق و تدقیق کے بعد علمائے اسلام جمہور مسلمین کے لئے راہِ عمل نکالیں اور صحیح قیادت کا فریضہ انجام دیں چونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور شریعت غرّہ کا مقتضٰے بھی یہی اور اسلاف کا نمونۂ عمل بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔"

اپنے مدعا کی تائید میں مسند طبرانی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس روایت کو بھی پیش فرمایا کہ حضرت علیؓ نے جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جسمیں کوئی شرعی اجازت یا ممانعت موجود نہ ہو تو پھر ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا! علماء اور عبادت گذار حضرات سے مشورہ کیا جائے شخصی رائے پر عمل سے کلیۃً پرہیز کیا جائے۔

چند سال گزرتے ہیں کہ مصر کے ایک اہم اسلامی اجتماع میں اسی طرح کے ایک موضوع پر دورانِ بحث مولانا یوسف بنوری نے حضرت شاہ صاحب کی پیش کردہ اسی روایت کو سنایا تو موجود مجمع نے بحث کا آخری فیصلہ اسی حدیث کی روشنی میں کیا۔ حجاز کے سفر کے دوران مولانا بنوری راقم السطور سے کہتے تھے کہ اس حدیث پر عام علماء کی نظر نہیں تھی۔ میں نے اس حدیث کے سراغ میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ اور ان کے تبحّر کو بتایا تو اقالیم اسلامی کا یہ مکمل اجتماع بیحد متاثر ہوا۔

پیش کردہ اقتباس میں صاحبِ خطبہ نے دو امور کا تذکرہ فرمایا۔ ایک علمائے ربانی سے مشورہ اور اہلِ عبادت کو شریک مشورہ رکھنا۔ جسکی دلیل میں طبرانی کی یہی روایت پیش کی گئی۔ دوسرے سلفِ صالحین کا طریق کار۔ اس ذیل میں دارمی سے حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ کا تعامل ذکر ہوا کہ وہ اپنے عہدِ خلافت میں اسی طریقِ کار کے پابند رہے۔ مرحوم نے ان دلائل سے جمیعۃ العلماء کے وجوداس کے طریقِ کار کو شرعی نصوص کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے جمیعۃ العلماء کی ان خدمات کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے جو آپ کے زمانہ تک یہ ملی ادارہ انجام دیتا رہا۔ حضرت شاہ صاحب کے اس خطبہ پر نصف صدی ہونے کو آتی ہے اس پچاس سالہ دور میں الحمدللہ یہ تنظیم اپنے شایانِ شان اور مقدور بھر ملک و ملت کی ضرورت سے غافل نہ رہی۔ ۱۹۴۷ء تک آزادی کی طویل جدوجہد، اسمیں جمیعۃ العلماء کا قائدانہ کردار اور ۱۹۴۷ء کے بعد تباہ شدہ و شکستہ دل مسلمانوں کی آبادکاری، ان کے لئے ہندوستان میں باعزت مقام کیلئے جدوجہد، ہولناک فسادات کا پامردی سے مقابلہ، فرقہ واریت کی جڑوں پر مسلسل تیشہ زنی، جائدادوں کی واگذاری، مساجد کا انخلاء، دینی مکاتیب کا قیام، دینی تعلیم کے لئے لٹریچر کی تیاری جمیعۃ العلماء کی وہ خدمات ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیلاً خطبہ میں اسی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے کہ کیا ملک کی آزادی کے لئے غیر مسلم فرقوں سے اشتراکِ کار کے لئے کوئی معاہدہ کیا جا سکتا ہے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معاہدہ بطور شرعی اساس ذکر کیا ہے جو آپ نے مدینہ منورہ حرسہا اللہ تعالیٰ عن الشرور والفتن کے تحفظ کے لئے یہود سے کیا تھا اور ذیلاً مسلمانوں کا ایفائے عہد، کئے ہوئے معاہدوں کی پاسداری کا طویل تذکرہ کرتے ہوئے معاہدہ کی روح کا خاص تذکرہ فرمایا چنانچہ رقم طراز ہیں (ایسے معاہدہ کا موضوع صرف یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے اور کوئی کسی کی جان و مال و عزت و آبرو پر حملہ آور نہ ہو، ایذار دہی کو حرام سمجھے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہو دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے ہوئے ان پر دل آزار حملوں سے خود کو محفوظ رکھے) یہ ہیں وہ اساسی دفعات جو باہمی نفرت، خانہ جنگی اور بدمزگی کو روکنے کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ

> "مسلمان احکام اسلام اور حدودِ شریعتِ بیضاء میں رہتے ہوئے ایسے معاہدہ کا سب سے پہلے خیر مقدم کریں گے بلکہ اپنے مذہبی احکام کے بموجب وہ معاہد قوم کے جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظ ثابت ہوں گے۔"

عہ مولانا سلطان الحق ناظم کتب خانہ کی روایت ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کو اسی معاہدہ کی دفعات کا تجسس اور اس سے مستنبط نتائج و جزئیات کی تلاش ہوئی تو آپ نے اس خطبۂ صدارت سے خاص استفادہ فرمایا۔

تاریخِ عالم اسکے شواہد بہم پہونچاتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار و عہد سطوت و شوکت میں بھی معاہد اقوام کی پوری طرح حفاظت کی اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی کوئی دریغ نہیں کیا لیکن یہ سب کچھ مذہب کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے ہوا کسی غیر شرعی معاہدہ کو کبھی قبول نہیں کیا گیا۔ مرحوم نے بھی مسلمانوں کے اس کردار کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا۔

"میں یہ بھی صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹکر یا آگے بڑھکر کوئی معاہدہ کریں تو یہ ناممکن ہے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ

"اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت مذہب سے ناواقفیت یا مداہنت کی وجہ سے ایسا معاہدہ کرے بھی تو نہ وہ قابلِ قبول ہوگا اور نہ قدرتی طور پر اُس میں استحکام پیدا ہوسکتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب مسلمانوں کا ہر قول و فعل رضائے خدا کے لئے اور اسی کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے لئے ہے تو ان امور میں کوئی برکت و نورانیت پیدا نہیں ہوسکتی جسکی بنیاد خدائے تعالےٰ کی معصیت پر اٹھائی گئی ہے۔ آپ نے اس مقصد کے لئے وہ حدیث بھی سنائی جسمیں موجود ہے کہ جو شخص خدائے تعالےٰ کو ناراض کرکے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا تو خدائے واحد ان ہی لوگوں کو اسکی تباہی و بربادی کا ذریعہ بنادیں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ تصور بعض سیاسی جماعتوں نے ہندو عوام کو دینا شروع کیا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے مسلمان یہاں نہیں رہ سکتے اگر رہنا چاہتے ہیں تو اکثریتی تہذیب میں خود کو ممزوج کرکے۔ ہوش و خرد اور عقل و دانائی سے بیگانگی کے عالم میں ان مہلک نعروں کو فرقہ پرست جماعتوں کی جانب سے مسلسل بلند کیا جارہا تھا اور جن سنگھ کے "گرو والکر" نے اپنی تحریر و تقریر دونوں طاقتوں کو اسی مقصد کے لئے مصروف کردیا۔ حضرت شاہ صاحب نے نصف صدی قبل ان مہمل تخیلات کی جڑوں پر بھرپور حملہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"میں یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی۔ مسلمانوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور یہاں مکمل بود و باش اختیار کئے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انھوں نے اس ملک پر منصفانہ حکمرانی کی۔ یہاں کے گوشہ گوشہ میں ان کی شوکت و رفعت

کے آثار موجود ہیں جو اُن کے علم و ہنر اور ان کی بے لوث حبِّ وطن کی شہادت دیتے ہیں۔ ہماری موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان ہی کی آب و گل ہے اور ہماری یہاں مذہبی و تمدنی عظیم الشان یادگاریں ہیں، اربوں روپیوں کی جائدادیں ہیں۔ عالیشان تعمیرات اور وسیع قطعاتِ زمین کے یہاں لاکھوں مسلمان مالک ہیں۔ پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان سب چیزوں کے باوجود یہ ملک صرف غیر مسلموں کا ہے؟ بلاشبہ اکثریت اس بات کا جائزہ لے سکتی ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمان اپنے ملک کے وفادار اور حقیقی بہی خواہ ہیں تو جاننا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں بھی مسلمانوں کے پاس ان کے پیغمبر جلیلؐ کا ایک نمونۂ عمل ہے جس سے وطن کی محبت آشکارا اور اپنے ملک سے فطری تعلق کے مضبوط جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔"

شاہ صاحبؒ نے اس کا تذکرہ اسطرح فرمایا۔

"ہمیں ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے، جیسی کہ ایک سچے محبِّ وطن کو ہونی چاہیئے۔ ہمارے سامنے آقائے کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوۂ حسنہ موجود ہے کہ آپؐ نے کفار کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر بحکم خداوندی جب اپنے محبوبِ وطن مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ "اے مکہ خدا کی قسم روئے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اگر تیرے باشندے مجھے نہ نکالتے تو میں تجھے کبھی نہیں چھوڑتا۔"

وطن سے خواہ وہ مالوف ہو یا اختیار کر لیا گیا ہو محبت و تعلق ایسی چیز ہے کہ ایک پیغمبر جلیل بھی جس کا ہر اقدام خدائے تعالیٰ کے ارشاد کے تابع ہوتا ہے اپنے جذبات و میلاناتِ خاطر کو دبا نہیں سکتا۔ بوقتِ ہجرت مکہ معظمہ کے لئے اس وداعی محبت آمیز پیغام کو سننے کے بعد مدینہ منورہ سے بڑھتے ہوئے تعلق کو بھی شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

"اور جب مدینہ جو دار الہجرۃ تھا آپ کا وطنِ ثانی بن گیا تھا تو آپؐ نے مدینہ کی ترقی، خوشحالی، آب و ہوا کی خوشگواری، سامانِ معیشت میں عظیم برکتوں کیلئے مستجاب دُعاؤں میں ارشاد فرمایا۔ خدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنادے جیسا کہ ہم مکہ سے محبت رکھتے ہیں بلکہ مکہ کی محبت سے بھی زائد مدینہ کا تعلق عطا فرما اور مدینہ کی یہ برکات مکہ معظمہ کی برکات سے بھی کئی گنا زائد فرمادے۔

اے اللہ بیشک تیرے بندے ابراہیمؑ نے مکہ اور اہل مکہ کے لئے برکت کی دُعائیں
کی تھیں اور میں تیرا بندہ و رسول محمدؐ ہوں۔ اہل مدینہ کے لئے وافر برکات کی تجھ
سے دُعائیں کرتا ہوں ان دُعاؤں کو اپنے فضل و رحمت سے قبول فرما۔"

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ مدینہ کی سرسبزی و شادابی خیر و برکت کے لئے زبانِ نبوت سے ان مقبول دُعاؤں کا تکرار امت کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ جس جگہ مقیم ہوں وہاں کے خیر خواہ، کردار و عمل، قول و فعل بلکہ اپنی مخلصانہ دعاؤں سے بھی رہیں اور یہ کوئی منطق کا جذر اصم نہیں جس کی حقیقت تک رسائی کے لئے پاپڑ بیلنا پڑے۔ صاف بات ہے کہ ملک کی خوبی و فلاح، وہاں کی اچھائی و برائی سے ہر شہری کا سابقہ رہتا ہے۔ اگر ملک ترقی کرے گا اس کی معیشت مستحکم ہوگی، اسکے وسائل وسیع ہونگے تو اسکے فائدے سب ہی شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ اور اگر ملک طرح طرح کے بحران میں مبتلا کر دیا جائیگا تو وہ مضرتیں بھی کسی مخصوص فرقہ کے لئے نہیں بلکہ تمام باشندوں کے لئے ایک عام ابتلاء ہوگا۔ اسلئے کوئی مسلمان شہری اپنے ملک کا کبھی بدخواہ یا اسکے مفادات کا مخالف نہیں ہوسکتا۔ شاہ صاحبؒ نے بھی اسی خطبہ میں اعلان فرمایا۔

"سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حبِّ وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے
ہوئے ناممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبۂ حبِّ وطن سے خالی ہو۔"

یہی نہیں بلکہ

"یہ یقین رکھئے کہ مسلمانوں کے قلوب میں مذکورہ بالا اسوۂ حسنہ کی بنا پر
اپنے ملک ہندوستان کی پوری پوری محبت ہے۔"

ہنود فرقہ پرستوں کا تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم کے بعد یہ اندیشہ کہ جب کبھی ہندوستان پر کسی جانب سے حملہ ہوگا تو مسلمان ملکی مفادات سے غدر کرتے ہوئے حملہ آور کا تعاون اور خفیہ ریشہ دوانیاں کریں گے اس کا جواب یہ عنایت فرمایا۔

"رہا یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر
حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ بڑی پست خیالی ہے اس کا سیدھا و صاف
جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں سے مطمئن ہوں گے اور ان کے تعدی
کا شکار نہ ہوں گے تو مسلمانوں کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اسکے
گھر پر حملہ کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو

بلکہ ایک بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ جب مسلمانانِ ہند حفاظتِ جان و مال و عزت و آبرو کے ساتھ وقت گزار رہے ہوں اور ان کا غیر مسلم اقوام سے کوئی معاہدۂ امن و صلح بھی ہو تو ان حالات میں کسی مسلمان حکومت کو مذہباً اسکی اجازت نہیں کہ وہ معاہدہ کو توڑے اور اس ملک و قوم پر حملہ آور ہو جس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ میں ہدایات بالکل واضح ہیں۔"

غلام ہندوستان میں تو مسلمانوں کا ہندوستان کے اکثریتی فرقہ سے کوئی ایسا معاہدہ بدقسمتی سے نہیں ہو سکا لیکن تقسیم کے بعد چین و پاکستان کے جارحانہ حملوں کی صورت میں مسلمانانِ ہند کا کردار، اپنے ملک کے لئے ان کا اخلاص، ملک کے دفاع کے لئے ان کی قربانیاں آشکارا ہیں۔ بریگیڈیڑ عثمان نے محاذِ کشمیر پر جان دی لیکن کسی حملہ سے ہندوستان کو نقصان نہیں پہونچنے دیا۔ غازی پور کے ایک فوجی مسلمان نے محاذ پر پاکستانی حملہ آور ٹینک کو اپنی جان خطرہ میں ڈالکر جسطرح اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اپنے ملک کی حفاظت کے لئے صرف کیا وہ مسلمان کی روایتی وفاداری کا ایک تابناک کارنامہ ہے۔ ملک آج تک تین جارح حملہ آوروں کا مقابلہ کر چکا ہے لیکن ایک مثال بھی مسلمانوں کی غداری کی پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات پورے فخر اور ذمہ داری سے کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے خلاف کئی سازشوں کا انکشاف ہوا لیکن انمیں کبھی کوئی مسلمان ملوث نہیں تھا وہ وقت بھی گزر چکا کہ اگر پاکستان کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کا قضیہ کہیں اور کسی وقت اٹھایا جاتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے زیادہ ذمہ دار تنظیم جمعیۃ العلماءِ ہند، پاکستان سے اُٹھنے والی اس آواز کو اپنے آہنی پنجوں سے ان کے گلوں ہی میں دبا دیتی۔ ہر سال سعودی عرب موسمِ حج میں جانے والا مسلمانوں کا وفد پاکستان کے اس پروپیگنڈے کا مکمل جواب دے کر آتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان تباہ و پامال کئے جا رہے ہیں۔ پھر حیرت و استعجاب ہے کہ فرقہ پرست پارٹیاں آج ان مسلمانوں سے غیر مشتبہ وفاداری کا سرٹیفکٹ مانگتی ہیں۔

بہرحال علامہ نے ان احادیث و فقہی تصریحات کا مفصل ذکر فرمایا ہے جن سے مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ اگر معاہدہ کریں تو اس معاہدہ کا احترام دنیا میں موجود تمام مسلمانوں پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں کلکتہ میں ایک اتحاد کانفرنس کی گئی تھی جسمیں "ڈاکٹر مونجے" اور دوسرے زعماء کی جانب سے ان ہی فرسودہ اعتراضات کو دوہرایا گیا تھا جو عموماً فرقہ پرست مسلمانوں پر

کرنے کے عادی ہیں۔ صاحبِ خطبہ نے ان تمام اعتراضات کے بچے تلے جوابات دیئے ہیں جنہیں نصف صدی کی قدامت کے باوجود آج بھی حقائق کی جلوہ گری و تازگی موجود ہے۔ ملک کا یہی وہ دور تھا جبکہ سائمن کمیشن ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا اور یہاں کی ذمہ دار پارٹیوں کو اسکی آمد پر کچھ سیاسی حقوق ملنے کی توقع قائم ہو چلی تھی شاہ صاحبؒ نے ان تخیلات پر جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے بھرپور حملہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔ کمیشن آیا اور گیا اور سیاسی اصطلاحات وحقوق کا فریب کارانہ نعرہ برطانوی ڈپلومیسی کا ایک اور امتحان تھا جسیں برطانیہ نے حسبِ دستور ہندوستانیوں کے جوشِ آزادی کو اپنی چالاکیوں سے فرو کرنے کے لئے ایک وقتی ہتھیار استعمال کیا تھا۔"

انگریز ہندوستان کے تمام ہی صوبوں و ریاستوں پر اپنی گرفت سخت تر کر رہا تھا لیکن خاص طور پر سرحد کے غیور پٹھانوں کو مغلوب کرنے کے لئے تشدّد و استبداد کی کوئی مذموم روایت ایسی نہ تھی جسے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ اس صورتِ حال سے اس صوبہ کی جسور قوم پریشان تھی آزاد قبائل غیر مسلح ہونے کے باوجود دنیا کی ایک بڑی طاقت اور جدید آلاتِ جنگ سے لیس قوم کا پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ سرحد کے بعض علاقوں پر بمباری سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا اور بے گناہ پٹھانوں کے کشتے کے پشتے لگ رہے تھے۔ یہی حالات تھے جنکی بنا پر ۱۹۲۷ء میں جمیعۃ العلمائے ہند نے اپنا سالانہ اجلاس پشاور میں رکھا۔ صاحبِ خطبہ نے بھی اپنے طویل ترین ارشادات میں سرحد کی جغرافیائی اہمیت، پٹھانوں کی شجاعت، انگریز کے مظالم، آزاد قبائل کی مقاومت کے مفصل تذکرہ کے بعد پٹھانوں اور ان کے صوبے کے ساتھ ایک ناروا سلوک و اسباب کا جائزہ لیا ہے اور اس وقت برطانوی حکومت کی جانب سے اس صوبے کو آئینی اصلاحات ومراعات سے محروم رکھنے کی جو وجوہ و اسباب پیش کئے جا رہے تھے ان کی پادر ہوائی دلائل سے ثابت کی ہے۔ خطبہ کے یہ اجزاء ایسے قیمتی اور اہم معلومات پر مشتمل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خانقاہ نشین علماء کی نظر وقتی مسائل پر بھی کس قدر گہری و دبیز ہوتی ہے۔ وہ عام اعداد و شمار خطبہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو اس اہم مبحث کی روح ہیں۔ اگر خوفِ طوالت نہ ہوتا تو راقم السطور ان اجزاء کو پیش کرتا تاکہ موصوف کی سیاسی بصیرت اور مومنانہ فراست کے کچھ اچھوتے ثبوت قارئین

کے سامنے ہوتے۔ ذیلاً دہلی کی تجویز مفاہمت، سندھ کی علیحدگی، ہندو مہاسبھا کی آہ وزاریاں اور بلا وجہ کے شکوک وشبہات، آزادی کی راہ میں فرقہ وارانہ تنظیموں کی رکاوٹیں، حضرت شاہ صاحب نے ان وقتی وعصری مسائل پر کھل کر گفتگو کی ہے جو بجائے خود قابلِ مراجعت ہے۔ معلوم ہے کہ مغل سلطنت کے خاتمہ پر انگریز مظالم کے سب سے زیادہ شکار مسلمان ہی رہے ہیں۔ مسلم قوم میں اپنے مذہب سے فطری تعلق، احکامِ شرعیہ کے تحفظ کا جذبہ، آزادی کے لئے اسکی بیتاب جدوجہد انگریزوں کے لئے تشویش کا موجب تھی۔ ان تاریخی حقائق کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہزاروں علمائے ربانی سولی پر چڑھا دیئے گئے بہت سوں کو دریائے شور بھیج دیا گیا اور ہندوستان کے جیل خانے مسلم زعماء سے بھر دیئے گئے اور ان تمام رعایتوں کو یکسر ختم کر ڈالا جو ایک عدالت پسند حکومت اپنی رعایا کو دیتی ہے۔ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بہت سے گوشے ایسے ہیں کہ جہاں مسلمان اپنے مذہب پر عمل کرنے کے لئے ایسے اداروں کا واقعی محتاج ہے جنکے تحت دین کے بعض اہم تقاضوں کی تکمیل ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں ان نازک مسائل کو چھیڑتے ہوئے عام مسلمانوں سے دار القضاء شرعی کے قیام، امارتِ شرعیہ کی تنظیم کیلئے جدوجہد کا مطالبہ فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

> "سب سے زیادہ اہم مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ہے کہ ہندوستان میں دار القضا شرعی مفقود ہے۔ حالانکہ مذہبی احکام ومعاملات میں بہت سے امور ایسے ہیں جن میں قاضی کے شرعی فیصلہ کی ضرورت ہے اور بغیر اسکے فیصلہ کے نافذ بلکہ جائز العمل نہیں ہوتے۔ نکاح، طلاق، خلع، میراث بہت سے معاملات ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت نہ ہونے اور خواہشاتِ نفسانی کی اتباع کی وجہ سے اسطرح الجھ گئے کہ قوۃ نافذہ کے بغیر ان کا سلجھنا ممکن نہیں۔ علماء ومفتیانِ دین کا کام صرف حکمِ شرعی ظاہر کر دینا ہے لیکن اس حکم کو جاری کرنے کی کوئی طاقت ان علماء اور مفتیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

نتیجۃً مسلمان اپنے ان معاملات وخصومات کو ایسی عدالتوں میں لے کر پہونچ رہے ہیں جہاں کے فیصلے نہ شرعاً نافذ اور نہ ان پر عمل صحیح، پھر بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن میں انگریزوں کا مجوزہ قانون مسلمانوں کی ضرورت کے لئے ناکافی بلکہ منافی واقع ہوا تھا۔ ان حالات

میں کسی دارالقضاء شرعی کا قیام مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی ضرورت تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس ضرورت کی طرف عامۃ المسلمین کو خاص طور پر متوجہ کیا اور ان کی فرائض کی تذکیر فرمائی۔ بعد میں جمعیۃ العلماء کے اسی مجوزہ پروگرام کے تحت مولانا ابوالمحاسن سجاد نائب امیر شریعت کی کوششوں سے بہار واڑیسہ میں اسطرح کی امارتِ شرعیہ کا قیام ہوا جو اس وقت مولانا سیّد منّت اللہ صاحب امیرِ شریعت کی زیرِ قیادت ایک منظم ادارے کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ تاہم ضرورت ہے کہ اس نظامِ شرعی کو وسعت دے کر پورے ہندوستان میں بروئے کار لایا جائے تاکہ ناواقفیت کی بنا پر مسلم قوم اپنی مذہبی قوانین پر عمل کرنے سے محروم نہ رہے اور اس طرح مسلمانوں کا وہ بڑا سرمایہ جو باہمی جھگڑوں پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ وَالْاَمْرُ بِیَدِ اللّٰہِ۔

ہندوستان میں قضاءِ شرعی نہ ہونے کی بنا پر اور پھر اس بنا پر کہ جو قانون انگریزی عدالتوں میں "محمڈن لا" کے نام سے زیرِ عمل تھا وہ اس قدر ناقص تھا جس سے اسلامی شریعت کے مقاصد کی توفیر تو کیا ہوتی بلکہ وہ شریعتِ محمدی کی صریح توہین اور اسلام کے لئے شدید مضر تھا جس کا ایک خاص نتیجہ مسلمان عورتوں کے فتنۂ ارتداد کی شکل میں رونما ہو رہا تھا وجہ اسکی یہ تھی کہ وہ مسلمان عورتیں جو شوہر کے جور و ستم کا شکار یا خاوند کے مفقود اور لاپتہ ہونے کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا تھیں۔ اسکے سوا اور کوئی راہِ نجات نہیں پاتی تھیں کہ کسی دوسرے دین سے تعلق پیدا کر کے اپنے لئے کوئی مخلص پیدا کریں اور انگریز کی شہرۂ آفاق چالاکیوں و عیاریوں کے پیشِ نظر مستبعد بھی نہیں کہ عدالتوں میں نافذ شرعِ محمدیؐ کو دیدہ و دانستہ ایسی شکل دی گئی ہو کہ واقعی مظلوم عورتیں شوہر کے مظالم سے جب اسلام میں رہتے ہوئے نجات نہ پاسکیں تو وہ ارتداد کی راہ سوچیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس عظیم فتنہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا۔

"ایک مسلمان کا مرتد ہو جانا بھی مسلمانوں کے لئے مصیبتِ کبرٰی ہے۔ بالخصوص عورتوں کا ارتداد معاذ اللہ، معاذ اللہ بڑا مہلک ہوگا۔ خدا نہ کرے کہ عورتوں میں اس قسم کی تحریک سرایت کر جائے۔ ان کی مذہبی ناواقفیت و فطری نقصِ عقل کیا رنگ لائے اور مسلم قوم کو کس قدر تباہی و بربادی کے قریب ہونا پڑے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ اس وقت پر یہ ہے کہ

وہ ان بے کس و بے بس مظلوم عورتوں کی گلوخلاصی کا پہلی فرصت میں اہتمام کریں جس کی واحد سبیل "محکمۂ قضا" قائم کرنے کی جدوجہد ہے۔"

رہا یہ سوال کہ ہندوستان میں رائج الوقت فقہ حنفی کے ہوتے ہوئے بعض اسکی جزئیات مثلاً لاپتہ شوہر کی بیوی کے بارے میں ایسی ہیں جو موجودہ وقت میں ناقابلِ عمل ہیں۔ ممدوح نے ان مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد دوسرے فقہاء کے اقوال پر عمل کرنے کی راہ پیش کی یہی وجہ ہے کہ مفقود الزوج کے بارے میں علمائے ہند کے متفقہ فیصلہ سے امام مالک علیہ الرحمہ کے فتوی پر عمل ہوا۔ باوجودیکہ مرحوم کو حنفیت کے بارے میں اور اس فقہی مکتبۂ فکر کی صحت و جامعیت کے پورے وثوق کے ساتھ تطبیق بین الفقہاء کا خاص اہتمام پیشِ نظر تھا۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے مختلف اقوال میں اس قول کو زیادہ ترجیح دیتے جو دوسرے ائمہ سے اقرب ہوتا۔ اسکی کچھ مثالیں آپ کی تفردات علمی میں انشاء اللہ پیش کی جائینگی۔ تاہم آپ نے شدید ضرورت میں کسی دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنے کے مشورہ میں فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

سطور بالا میں عرض کیا گیا تھا کہ امارتِ شرعیہ کا قیام جو مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی ضرورت ہے اُسے منظم شکل میں قائم کرنے کا انتظام ہندوستان کے تمام صوبوں میں سے صوبۂ بہار کو نصیب ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی بہار کی اس خصوصیت و انفرادیت کو ان الفاظ سے سراہا۔

> ہندوستانی صوبوں میں سے صوبۂ بہار قابلِ مبارکباد ہے کہ اُس نے امارتِ شرعیہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے اور اسکے ماتحت بہت سے مفید قومی و مذہبی امور انجام پا رہے ہیں۔ اگر دوسرے صوبے بھی اس فریضہ کی اہمیت کا احساس کریں اور اس کی ادائیگی میں لگ جائیں تو انکی اجتماعی قوت سے ہر صوبہ کی مقامی حیثیت بھی قوی ہوگی اور ہندوستان میں ایک منظم محکمۂ شرعیہ قائم ہوجائے گا۔"

نصف صدی کے بعد شاہ صاحبؒ کی یہ تمنا و آرزو اسطرح بروئے کار آئی کہ جمعیۃ العلماء، امارت شرعیہ اور ازہر الہند دارالعلوم نے اس فریضہ کی جانب توجہ کی اور تینوں ادارے اب جابجا شرعی پنچایت کے نظام کو وسیع اور مضبوط بنیادوں پر پھیلا رہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سی غریب مسلمان بچیاں جو اپنے شوہر کے مظالم سے نیم جاں تھیں اور غربت و

نا داری کی بنا پر عدالتوں کے دروازے پر انصاف کے لئے دستک نہیں دے سکتی تھیں۔ ان شرعی پنچایت سے فائدہ اٹھا رہی ہیں لیکن ابھی اسکی ضرورت ہے کہ اس نظام کو ہمہ گیر اور اتنا قوی کر دیا جائے کہ بے بس عورتوں کے لئے نجات پوری طرح ممکن ہو۔ ساتھ ہی اسکی بھی ضرورت ہے کہ علماء وواعظین اپنی وعظ وخطابت میں قضاء شرعی کی اہمیت، اسکی ضرورت وافادیت، مسلمانوں کے جلسوں اور مجمعوں میں بقوت بیان کریں تاکہ وہ ان اداروں سے مکمل فائدہ اٹھا سکیں۔ آخر اسی ہندوستان میں لاکھوں کی رقم اور بڑا سرمایہ سیرت کے جلسوں، مناظرہ بازی، مشاعروں اور تفریحی پروگرام کے لئے خود مسلمان ہی ضائع کر رہے ہیں پھر اگر اس مذہبی وملی مقصد کے لئے عام جلسے کئے جائیں تو بلاشبہ ان کا سرمایہ بلند ترین مصرف میں صرف ہوگا۔

دنیا میں ہر مذہب کا ایک خاص مزاج ہے۔ صیہونیت اپنی تخریب کاری، عیاری، مسلم دشمنی کی ایک پوری تاریخ اپنی پشت پر رکھتی ہے۔ نصرانیت اپنی ڈگر سے ہٹ چکی اور اسکی مسخ شدہ شکل وصورت کچھ حدود وقیود رسوم ورواج میں گھر کر رہ گئی۔ اسلام بھی اپنے مذہبی دوائر میں ایک شستہ وشگفتہ مزاج کا حامل ہے اس مذہب کا بنیادی تقاضہ مذہب کی دعوت کو عام کرنا اسکی اشاعت میں بھر پور حصہ لینا اور تبلیغ کی راہ سے اس آفاقیت کو چھونا ہے جو اسلام کے رگ وپے میں پیوست ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وانذر عشیرتك الاقربین کے حکم کے ساتھ فاصدع بما تومر کا بھی حکم سنایا گیا تھا بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی پر رسالت کی ادائیگی موقوف ہے۔ ان ہی احکام کا نتیجہ تھا کہ ایک پیغمبرِ جلیل نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر مکہ و مدینہ اور انکے مضافات میں اسلام کی دعوت اپنے ہی حیات پاک میں عام کر دی تھی۔ قرنِ اول اس شان کے ساتھ ابھرا کہ اسلامی جیوش کا ہر عسکری صرف مجاہد ہی نہیں بلکہ دین کا پر جوش مبلغ وداعی بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے زیرِ قیادت کفر وفساد کی خاک اڑانے کے لئے جو جنگیں لڑی گئیں اُنکے مقاصد اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ مبلغینِ اسلام کے پاکیزہ جذبات کے آئینہ دار بھی تھے۔ ہر قدم پر بجائے ہوسِ ملک گیری کے اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبۂ بے پناہ اور داعیانہ طور وطریق کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ محمد بن قاسم ریگستانِ سندھ سے واپس ہوا تو وہ تمام جمع کردہ سرمایہ جو آبادی کے تحفظ کیلئے بطور ٹیکس وصول کیا تھا یہ کہکر واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے تو اس سرمایہ کو لینے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ اس فاتح سپہ سالار کی یہ داعیانہ ادا اس قدر دلنشیں تھی کہ سندھ کی مفتوح قوم نے اس کے جانے کے بعد اپنے تخیلات کے مطابق محمد بن قاسم کا مجسمہ تیار کیا اور اس کی

پرستش میں لگ گئے۔ عربی تجار اقصائے عالم تک پہونچے تو کاروبار ہی پیش نظر نہ تھا بلکہ اسلام کی دعوت بھی پھیلاتے ہوئے نکل گئے۔ صوفیاء اطراف وجوانب میں پھیل گئے تو اُن کے نفوسِ قدسیہ، انکی خانقاہیں، اُن کے "ھوحق" کے نعرے اسلام کے متحرک دعوتی پروگرام کے اجزاء تھے۔ غرضیکہ جب تک مسلمانوں کے پیش نظر اس مذہب کا خاص مزاج رہا اور وہ اس مقصد کی توفیر وتکمیل میں ہمہ تن مشغول رہے دین ان وسعتوں اور آفاقیت سے آشنا رہا جو اس کا مزاج ہے لیکن بدقسمتی سے جب اس جہاں گشت طائرِ اسلام نے جہاں نوردی وصحرا پیمائی کے بجائے آشیاں نشینی اختیار کی تو دین کا دائرہ بھی بتدریج سمٹنے لگا۔ علماء اسلام اپنے اس فریضہ کے احساس کو ہمیشہ دل ودماغ میں لئے رہے اور اسکی ادائیگی میں مستعد بھی لیکن افسوس کہ یہ کام منظم ومرتب انداز میں نہ ہونے کی بنا پر اتنا مؤثر وشاداب نہ رہا جتنا اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل مولینا محمد الیاس علیہ الرحمہ جو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے حلقۂ تلامذہ کے فرد ہیں کمربستہ ہوئے اور دہلی کی ایک مسجد سے اس کام کا پوری توانائی کے ساتھ آغاز کیا۔ مرحوم کی سوز وتڑپ، اخلاص وآگہی، فراست ورذانت نے اس تبلیغی مہم کو عالم آشکارا بنادیا اور مبلغین کی جدوجہد، ان کی تگ ودو، انکی مخلصانہ کاوشیں یورپ تک جا پہونچیں جمود وتعطل کے حلقے ٹوٹ رہے ہیں، حرکت وعمل اُن کی جگہ لے رہی ہے، بے عملی رخصت ہوا چاہتی ہے اور خزاں رسیدہ گلستاں ایک نئی بہار کے لئے سراپائے انتظار ہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند اپنے تاسیسی مقاصد کے اعتبار سے صرف ایک سیاسی ادارہ نہیں تھا بلکہ اُس کے بانی وہ ربانی علماء تھے جن کا دل ودماغ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کے احساسات سے معمور تھا وہ خوب جانتے تھے کہ اس پلیٹ فارم کو استخلاص وطن کی جدوجہد کے علاوہ اسلام کی خدمت کا بھی ایک مفید ذریعہ بنایا جائے چنانچہ امام العصر نے اپنے اسی خطبہ میں حلقۂ جمعیت کو اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے متوجہ کرتے ہوئے خاص اس موضوع پر بھی گفتگو فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ

> مسائلِ ضروریہ میں سے ایک اہم مسئلہ فریضۂ تبلیغ اسلام اور پیغام توحید ورسالت کا ہے جس کے بغیر بقائے دین متین کسی طرح متصور نہیں۔"

سطور بالا میں مفصل عرض کرچکا ہوں کہ دنیا میں دعوتی دین صرف اسلام ہی ہے جسے خدائے کائنات نے انسانی دنیا کے لئے منتخب فرمایا اور کل عالم کا ایک پسندیدہ مذہب قرار دیکر اسکی اشاعتی ذمہ داریاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک قرناً بعد قرنٍ ان پر ڈالدی گئیں جو دین کے اساسی تعلیم اور اسکے نازک تقاضوں کی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

آج اگرچہ دوسرے مذاہب اپنے دعوتی دین ہونے کے دعویدار ہیں لیکن تاریخ وحقائق کی روشنی میں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلام ہی نے ابتدا ءمیں ایک عالمی مذہب ہونے کا اعلان کیا تھا۔ سیدنا موسیٰؑ وحضرت عیسیٰؑ جو اس کائنات کے ایک بہت بڑے انسانی ہجوم کے پیغمبرِ جلیل ہیں وہ بھی کبھی اسکے مدعی نہیں رہے کہ ان کا لایا ہوا مذہب دنیا کا ایک عام مذہب ہے۔ انجیل ہی میں یہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ تشریف فرما تھے ایک یہود عورت نے حاضر ہو کر آپ سے رہنمائی چاہی تو اس پیغمبرِ جلیل نے موجود حوارئین سے خطاب فرمایا کہ

"میرا کام صرف گم کردہ راہ اپنے حلقہ کی بھیڑوں کی رہنمائی ہے مجھے دوسروں سے کیا سروکار اگر میں اپنے حلقہ کو چھوڑ کر دوسروں کی قیادت کرنے لگوں تو اسکی مثال ایسی ہوگی جیسا کہ کوئی باپ اپنی بھوکی اولاد کے سامنے سے کھانا اٹھا کر دوسروں کو دے ڈالے۔"

اس صاف وصریح اعلان کے بعد خدا جانے یہود اور عیسائی اپنے ادیان کو ایک مشنری دین ثابت کرنے کی کہاں سے کوشش کرتے ہیں۔ بنیادِ ظلم اپنی ابتداء میں محدود و مختصر تھی ہر آنے والا اس عمارت کو بھیانک رنگ وروغن دیتا رہا۔ یہود اور عیسائیت تو پھر بھی آسمانی مذہب ہیں حد تو یہ ہے کہ وہ مذاہب جو صرف انسانوں کی دماغی کاوشوں کے آئینہ دار اور خام خیالیوں کے عجوبے ہیں وہ بھی آج دعوت لے کر اقصائے عالم میں گشت کر رہے ہیں۔ صورتِ حال کے اس مہیب پہلو پر اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امام العصر نے اپنے اس دعوے پر بطورِ دلیل فرمایا

"دنیا کے مختلف مذاہب میں حق اور صحیح راہ کی تعلیم ایک ہی مذہب دے سکتا ہے اور جو مذہب اپنے میں سچائی وراستی رکھتا ہے اسکو یہ حق حاصل ہے کہ تبلیغ اور پیغامِ حق کا کام انجام دے۔"

ذیلاً موصوف نے اسلام کی ان تمام خوبیوں کو مختصراً بیان فرمایا جو اس مذہب کی جامعیت اور انسانی زندگی پر بھرپور احتواء کی آئینہ دار ہیں جن سے یہ واضح ہے کہ یہی مذہب اس کائنات کا حقیقی آخری اور ابدنشان دین ہے چنانچہ آپ نے ان مذاہب پر جو دعوتی وتبلیغی ہونے کے مدعی ہیں جچا تلا تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مذاہب عالمی مذہب بننے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے

فرسودہ روایات بلکہ مہمل خرافات کا ایک مجموعہ ہے جسے دین کا عنوان دیدیا گیا فرمایا۔

"نصاریٰ کس چیز کی تبلیغ عالم کے سامنے کریں گے کیا مسئلہ تثلیث کی جس کا حال یہ ہے کہ آج تک وہ اس کی حقیقت کو خود بھی نہیں سمجھ سکے۔ خیال یہ ہے کہ دانایانِ فرنگ نے جو فطرتاً نفعِ عاجل اور فوری نتیجہ کے طالب اور خواہشمند ہیں۔ جب یہ دیکھا کہ مفت تین خدا ملتے ہیں تو انہیں اسکی خریداری میں کوئی تأمل نہ ہوا اور کسی پس وپیش کے بغیر بمصداق "داشتہ آید بکار" خریدار بن گئے ورنہ انھوں نے جو تفننِ طبع اور جولانی اس مسئلہ کی تعبیر میں دکھلائی ہے اور تثلیث کی تنقیح میں وقت صرف کیا ہے اس سے تثلیث کا مسئلہ تو کیا حل ہوتا کچھ بے مغز اور غیر واقعی باتوں کا ایک طومار تیار ہوگیا۔ اگر سامعین میں سے کسی نے مشہور کتاب "العقائد الوثنیہ فی الدیانۃ النصرانیہ" کا مطالعہ کیا ہو تو وہ مطلع ہوگا کہ نصرانیت کے اکثر اصول عقائد بت پرستوں سے مستفاد ہیں بلکہ اس مسئلہ تثلیث کی تعبیرات تک بت پرستی کے گورکھ دھندے سے مستعار لی گئی ہیں۔"

جو مذہب انسان کی زندگی کے تمام گوشوں وشعبوں میں جچی تلی رہنمائی سے محروم وعاری ہے بلکہ اسکی بنیادی اساس یعنی تثلیثی خرافاتی کائنات مہمل ترین، غیر معقول، تعبیرات میں ژولیدہ ہے اسے کائناتِ انسانی میں امام مذہب کی حیثیت کیسے دی جاسکتی ہے اس سے آگے بڑھئے تو وہی اناجیلِ اربعہ جس پر عیسائیت کی خام عمارت کھڑی ہوئی ہے ان کتابوں کی بھی حیثیت یہ ہے کہ نہ ان کا مصنف معلوم، نہ سنِ تصنیف کا علم، نہ مندرجات کے صحت کی ضمانت، نہ ان کی تشریح وتفسیر میں خود عیسائی مترجمین ومصنفین متفق، بقول شاعر

ع دہاں کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

ادھر اسلام کا یہ عالم ہے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ محفوظ، ہر حرف تغیر وتبدل سے مصئون، ختمی مرتبت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس کتاب زندگی کا ہر صفحہ روشن، آپؐ کے مشاغل ومصروفیات کی تفصیلات مہیا، اکل وشرب، نشست وبرخاست، لباس وپوشاک، باہر کی زندگی، خانگی معاملات، اپنوں سے تعلق، غیروں سے روابط، عبادت اور عبودیت کے نقوش سب کچھ اس طرح واضح کہ نہ اُن میں کوئی اخفا، نہ ابہام نہ الجھاؤ، نہ ژولیدگی۔ اور تو اور آپؐ نے اپنی حیات پاک میں جن ایک لاکھ انسانوں کی صحیح تربیت فرماکر انہیں نجومِ ہدایت قرار دیا تھا ان کی زندگی بھی آفتاب وقمر

سے زیادہ روشن ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے اسی بنیادی فرق پر غور کیجئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ عالمی مذہب بننے کا حق کس کو حاصل ہے ؟ صاحب خطبہ نے عیسائیت کے کھوکھلا پن کو واضح کرنے کے بعد مادہ پرستوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اُن کے نظریات کا مدلل ابطال کرنے کے بعد مادہ پرستی کی جڑیں بلکہ بلا مبالغہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کاٹ کر رکھدیں خطبہ کے یہ چند صفحات خاصہ کی چیز ہیں اور بجائے خود اہلِ علم کے لئے مختصر ہونے کے باوجود ہزار ہا صفحات کے مطالعہ سے بے نیاز کرنے والا جوہری عنصر۔ بحث کے اختتام پر علمائے اسلام کو حضرت شاہ صاحب نے متوجہ کرتے ہوئے تبلیغ کے اہم فریضہ کی ادائیگی پر پُرسوز لب ولہجہ میں کچھ اہم اشارے دیئے ہیں غالباً سطور بالا میں راقم السطور ہی لکھ چکا ہے کہ تبلیغ ایسے اہم فریضہ کی ادائیگی سہل کام نہیں۔ انسانوں کی نفسیات سے واقفیت، عصری تقاضوں پر آگاہی، اصولِ تبلیغ پر اطلاع، متین ومہذب لب ولہجہ، شستہ وشگفتہ اندازِ دعوت پُرحکمت اسلوب اور آخری بات یہ ہے کہ مبلغ کے کردار وگفتار میں ایک پختہ کارانہ انداز اور قول وعمل کی مطابقت جو بات میں تاثیر، سخن میں دلنوازی، دعوت میں کشش اور تبلیغ میں تاثیر پیدا کرتی ہے مطلوب ہے اگر یہ عناصر بقوۃ موجود ہیں تو تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی باحسنِ وجوہ ہوسکے گی ورنہ تو یہ کہا جاسکتا ہے اور پورے اخلاص وتاسف کے ساتھ کہ خالی خولی دعوت اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہی ہوگی۔ قرآن حکیم نے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی بے لوث وبے غرض دعوتی زندگی کے چند باب سناکر کچھ رہنما اصول فریضۂ تبلیغ کے سلسلہ میں بھی امت کے سامنے پیش کئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن کریم کے اُن منتخب مقامات کو پیش فرماکر اسلام کے مخلص حلقۂ علماء کو ان ہی امام، تبلیغی آئین وضوابط پر کاربند ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام اپنے وطنِ اول مکہ معظمہ، مدینہ منورہ سے نکلا اور اقصائے عالم میں پہونچا، وہ جہاں جہاں پہونچا اسلامی تعلیمات سے دل ودماغ کی کائنات کو زیر وزبر کردیا، اعمال واشغال بدل گئے، زندگیوں میں تبدیلی آئی، اندازِ فکر بدلا، ذہنیتوں کے سانچوں میں ایک خوشگوار انقلاب برپا ہوا لیکن داخلی اثرات خارجی فضاؤں سے بہرحال متأثر ہوتے ہیں۔ انسان صحت افزا مقام پر پہونچتا ہے اس کی تندرستی انگڑائی لیتی ہے۔ جسم میں نمو، دماغ میں نشاط، قلب میں بالیدگی، خون میں تازگی روزانہ کے مشاہدے ہیں۔ انہیں صحت افزا مقامات سے ان جگہوں پر منتقل ہوجائے جہاں کی آب وہوا خوشگوار وسازگار نہیں، صحت پر مرتب

ہونے والے مذکورہ بالا اثرات ناخوشگوار تبدیلیوں کا رُخ اختیار کرلیں گے[ع] اس لئے اسلام اپنے مرکزِ اول سے منتقل ہوکر جب اقصائے عالم میں روشناس ہوا تو مسلمانوں کو اس ملک کے اثرات نے بہرحال متاثر کیا اس میں شک نہیں کہ اسلام سے بڑھکر کائنات میں کوئی سادگی پسند مذہب نہیں جسمیں رسوم وقیودات کا جواز تو درکنار ان کی شدید مخالفت اور سخت نکیر موجود ہے مگر اسکو کیا کیا جائے کہ وہی مسلمان جو دنیا میں امام بناکر بھیجا گیا تھا خواہی نخواہی مقتدی بن کر رہ گیا اور اپنے ساتھ اسلام کی جانب سے بھی مزاجِ اسلامی سے ناآشنا حلقوں میں بدگمانیاں پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ مسلمان ہندوستان آئے یہاں کی قدیم تہذیب وتمدن پر ان کی چھاپ پڑی لیکن خود ان کا تمدن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ پیدائش، موت، شادی، ختنہ، محرم، شبِ برات، بارہ وفات، فلاں

ع مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند جو حضرت شاہ صاحبؒ کے معروف تلامذہ میں تھے جنھوں نے غالباً تین بار شاہ صاحب کے درس حدیث میں بالاستقلال شرکت کی تھی۔ دارالعلوم دیوبند اسکے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں فاضلانہ تدریس بھی ایک زمانہ میں اُنکا شغل رہا۔ کلکتہ کی مساجد میں تفسیرِ قرآن اور اہم علمی شاہکار۔ ان کی وقادطبیعت اور بلندپایہ علمی خصوصیات کے مظہر ہیں۔ طبعاً بھی کم آمیز تھے اور پھر سیاسی مصروفیات نے تو انہیں کسی شغل کا بھی آدمی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ مسلسل جدوجہد تگ ودو، دوڑ دھوپ، سعی وکاوش، یہاں فساد کی اطلاع وہاں مرحوم کی سفر کی تیاری، جہاں آگ وہاں وہ پانی کے ذخیرے لئے ہوئے موجود یہ کسی مظلوم کا قتل وہ ہیں مولانا کے ہاتھ قاتل کی تلوار پر، اس عالم میں کس کی سنتے اور کہاں اپنی کسی دوسرے کو سناتے لیکن ان ہنگاموں سے دامن چھڑاکر کبھی دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ میں شرکت کیلئے آنکلتے تو فرصت کے کچھ لمحات میسر آنے پر لطف لے لیکر اکثر یہ واقعہ سناتے کہ حضرت شاہ صاحب کی درسگاہ میں کس کو بولنے کی ہمت تھی دورۂ حدیث میں مکرر شرکت کے بعد اپنے لئے میں نے یہ استحقاق سمجھکر کبھی کوئی سوال کرسکتا ہوں مشہور حدیث کہ "جہنّم دو سانس لیتی ہے ایک اندر کا اور ایک باہر کا۔ جب اندر سانس لیتی ہے تو دنیا میں سردی پھیل جاتی ہے باہر سانس لینے پر گرمی کا تسلط ہوتا ہے" اس پر میرا طالبعلمانہ سوال یہ تھا اگر سردی وگرمی جہنم کے داخلی وخارجی اثرات کا نتیجہ ہے تو پھر تمام دنیا میں یکساں موسم رہنا چاہیئے حالانکہ موسموں کے تفاوت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شاہ صاحب کی عادت تھی کہ جن سوالات کو مہمل سمجھتے اُن پر سکوت فرماتے۔ مجاہدِ ملت فرماتے تھے کہ میرے اس سوال پر حضرت شاہ صاحب نے قاری حدیث سے فرمایا۔

"چلو بھائی اندھیرا ہی اندھیرا ہے ہم نے جاہلین کو سمجھانے کا ٹھیکہ نہیں اٹھایا۔"

مولانا حفظ الرحمٰنؒ سے احقر نے دریافت کیا کہ آپ کا سوال تو معقول تھا پھر حضرت نے بجائے جواب کے یہ کیا فرمایا؟ مجاہدِ ملت فرماتے تھے کہ واقعتہً میرا سوال مہمل تھا داخلی اسباب کے ساتھ خارجی اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ خارج داخل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ راقم السطور اس واقعہ سے یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ حقیقی محرکات واسباب بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کے نام پر حلوہ اور پوریاں، فلاں کے نام کا مرغا، عرس اور قوالیاں تیزی کے ساتھ مسلم معاشرہ میں
داخل ہوگئیں، غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ خود مسلمانوں ہی کا ایک کندۂ ناتراشں طبقہ ان ہی مہلک
رسوم کے لئے اسطرح مصر ہے کہ ایک صدی گذرنے کے باوجود اہل سنت والجماعت سے اس کی
نبرد آزمائی و مقابلہ آرائی ختم نہ ہوئی حالانکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں انسانی
زندگی کے تمام مراحل سامنے آچکے تھے اور ہر مرحلہ کے لئے آپ کی واضح ہدایات موجود تھیں پھر
ان خرافات کو معاشرۂ اسلامی میں داخل کرنے کا کیا جواز تھا؟ کیا جنابِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے عہد میں خود آپ کے یہاں اور حضراتِ صحابہؓ کے یہاں بچوں کی ولادت نہیں ہوتی تھی پھر
کوئی بتا سکتا ہے کہ بچے کے کان میں اذان پر لڈّوں کی تقسیم، عقیقہ کے لئے لمبی چوڑی دعوت، ختنوں
پر طویل ضیافتوں کا کہیں سراغ ملتا ہے. آپؐ ہی نے اپنی لختِ جگر و نورِ نظر خواتین جنت صاجزادیوں
کی شادیاں کیں خود اپنی شادیاں کیں. کیا کسی حدیث میں موجود ہے کہ سہرا باندھا گیا ہو، نوشہ
بنایا گیا ہو، بھاری بھر کم جہیز دیا گیا ہو یا نوشہ کی جانب سے کوئی گراں قدر مطالبہ کیا گیا ہو۔ اموات
بھی پیش آئیں بلکہ کائنات کا محسنِ اعظم فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس عالم فانی کو چھوڑ کر
جاودانی عالم کو اختیار فرمایا پھر آپؐ ہی کی وفات پر جس سے بڑھکر دنیا کا کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا. تیجہ،
دسواں، بیسواں یا چالیسواں اہل بیت یا آپ کے جاں نثار صحابہؓ کی جانب سے کیا گیا؟ دریافت طلب
امر یہ ہے کہ العیاذ باللہ کیا اہل بیت یا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابہ کی آپ کے ساتھ
وفاداری مشکوک تھی یا آپ کے حادثۂ وفات پر وہ ملول و محزون نہ تھے. رنج و غم اور اسمیں صادق
خلوص بعد والوں ہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی کہکر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کہ قرنِ اول کی
غربت و مفلسی نے ان کو من مانی کارروائیوں سے محروم رکھا. جاننے والے جانتے ہیں کہ اصحاب النبی
صلی اللہ علیہ وسلم کے جمِ غفیر میں بلاشبہ بعض حضرات لکھ پتی سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں بلکہ تاریخ میں
یہ بھی موجود ہے کہ بعض اصحاب النبی کے متروکہ اموال میں سونے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو توڑنے
کے لئے ہتھوڑوں سے بھی کام لیا گیا تھا، غلاموں کو آزاد کرنے والی فہرست میں ان اصحاب کا بھی تذکرہ
موجود ہے جنھوں نے ہزاروں غلاموں کو خرید کر آزاد کیا ہے لیکن اُن کے یہاں بھی شادی، بیاہ،
موت و ولادت اور دوسری چیزوں میں ان خرافات کا دور تک نشان نہیں ملتا جنھیں ہندوستان
کا مسلمان اختیار کر بیٹھا اور نام نہاد اہل علم کا ایک طبقہ انکے جواز پر موشگافیوں سے کام لے رہا ہے
قصہ مختصر جمعیۃ العلمائے ہند کے تاسیسی مقاصد میں مسلم معاشرہ کی اصلاح، بدعات و محدثات

کے خلاف پرزور جد وجہد ہمیشہ سے داخل رہی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بھی تبلیغ کی اہمیت کے بعد تبلیغ کو صرف نماز روزہ کے دائرہ تک محدود رکھنے کے بجائے معاشرہ کی اصلاح کی حدود تک وسیع کرنے کا پرخلوص مشورہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"میں آپ حضرات کا کچھ وقت اور لوں گا مجھے ان رسوم قبیحہ ومہلکہ کی اصلاح کی طرف بھی آپ کو توجہ دلانا ہے جو مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر گھن کی طرح اندر ہی اندر انھیں کھائے جارہی ہیں اور افسوس کہ مسلمانوں کو اس تباہی وبربادی کا احساس بھی نہیں یہ رسوم ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں میں موجود ہیں علمار کا فرض ہے کہ انکو مٹانے میں پوری مستعدی سے متوجہ ہوں اور عامۃ المسلمین کو یہ سمجھائیں کہ وہ خدا اور رسول ہی کی صرف اطاعت کریں، آبار کی رسوم ورواج کے جاہلانہ گھروندوں سے باہر آئیں۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بعض رسمیں تو صاف شریعتِ اسلامی کے خلاف بغاوت ہیں مثلاً عورتوں کو میراث سے محروم کرنا یہ اتنا بڑا ظلم اور گناہ ہے کہ اس کی سزا سوائے جہنم کے اور کوئی نہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں مسلمانوں نے اسکو بطور قانون اختیار کیا ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ طرز خدا اور رسول کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ ہے۔"

بلاشبہ صاحب خطبہ نے اس پیراگراف میں اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا۔ جاہلیت کے دور میں والدین اپنی بچیوں کو میراث سے محروم کرتے اُن کا تخیل یہ تھا کہ میراث کا وہی مستحق ہے جو قومی، ملکی، قبائلی لڑائیوں میں شرکت کرے اور حاصل شدہ مال غنیمت میں حصہ دار ہے۔ صنفِ نازک یہ کام نہیں کرسکتی تھی اسلئے اپنے خیال کے مطابق اُسے میراث کا مستحق ہی نہیں سمجھا گیا اسلام آیا خدا کا کلام نازل ہوا تو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے ساتھ اس کھلے ظلم کو قطعاً حرام قرار دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ سیکھنے اور سکھانے کے قابل تین ہی علم ہیں۔ علم کتاب اللہ، علم احادیث رسول اللہ اور فریضۂ عادلہ۔ فریضہ عادلہ سے مراد یہی میراث کے حقوق اُن کی تفصیلات اور تشخیصات کا فن ہے۔ عجیب بات ہے کہ یورپ نے ہزاروں سال لڑکیوں کے ساتھ اس زیادتی کے بعد جب انصاف کی جانب کچھ التفات کیا تو بسلسلۂ میراث اسلام ہی کے احکام وقوانین سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا۔

"علمائے اسلام نے اس علم کا ایسا اہتمام کیا کہ میراث و فرائض مستقل فن بن گیا۔ کتاب "الفارق بین المخلوق والخالق" جو ردِ نصرانیت میں گراں قدر تصنیف ہے۔ اُسمیں موجود ہے کہ بعض اوقات یورپ کے لوگوں نے میراث سے متعلق ایشیائی مسلمانوں سے فتوے لئے اور شریعتِ اسلامی کے مطابق قانونِ میراث پر عمل کیا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز میں یورپین دانشور اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں خود مسلمان اس سے روگردانی کرتے ہوئے جاہلیت کی جانب لوٹ رہے ہیں اور موحّد ہونے کے باوجود شرک پسند معاشرہ کے رواج اور رسوم کو اپنا رہے ہیں"۔

حضرت مرحوم نے اس ذیل میں امام احمد بن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم وغیرہ مجموعۂ احادیث سے اُن احادیث کی نشاندہی کی جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کے ترکہ سے مظلوم لڑکیوں کا شرعی حصہ دلوایا اور یہ بھی بتایا کہ جو والدین تحفظِ جائداد کے عنوان پر لڑکیوں کو میراث سے محروم کر رہے ہیں کیا اُن کے لڑکے قیامت تک اُن کی جائداد کو محفوظ رکھ سکیں گے حالانکہ یہ بھی دنیا میں پیش آچکا کہ ماں باپ نے جن لڑکوں کی خاطر لڑکیوں کو محروم کیا تھا اُن ہی لڑکوں نے جائداد، اندوختہ اور جمع کردہ سرمایہ تباہ و برباد کیا، اسلئے اس سلسلہ میں احکامِ الٰہی ہی عمل کرنے کے قابل ہیں۔ محض اپنے وساوس اور اندیشوں کے تحت اسلامی شریعت سے روگردانی و انحراف مثمر و بار آور بھی نہیں پھر اس بد ترین رسم کی طرف بھی توجہ دلائی جو بعض صوبوں میں مسلمان معاشرہ میں "تِلک" کے نام پر قبولِ عام حاصل کئے ہوئے ہے چنانچہ رقمطراز ہیں۔

"کہ یہ رسم تو احکامِ شرعیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ شرافت و انسانیت کے بھی خلاف ہے اور اسلام و مسلمانوں کے لئے موجب عار و ننگ ہے۔ کس قدر غضب و ظلم کی بات ہے کہ جوان لڑکیوں کو اسلئے روکتے ہیں کہ جب تک اُن کے اوپر ایک معتدبہ رقم نہ لے لیں نکاح نہ کریں۔ مظلوم لڑکیوں کی جوانی کا بہترین زمانہ بسا اوقات اُن کے اولیاء کی حرص و طمع و ظلم و سنگدلی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور وہ بے زبان بے بس پڑی رہتی ہیں[ع]"۔

ع راقم السطور نے دیوبند میں یہ عبرت انگیز واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماں باپ نے اپنی دو نوجوان بچیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کی، نفسانی خواہشات و جنسی تقاضے خود لڑکیوں میں بھی موجود ہیں بالآخر یہ

اور یہ تو صورتِ حال کا صرف ایک ہی رُخ تھا، اسی ہمارے ظالم معاشرہ میں جو اسلام خلاف بنیادوں پر تشکیل پا رہا ہے۔ بعض صوبے کے مسلمانوں میں "تلک" کی اسی رسم نے دوسری اندوہناک صورت اختیار کی۔ یعنی لڑکوں کی جانب سے جہیز میں گراں قیمت اشیاء کا لڑکی والوں سے مطالبہ ہونے لگا۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، اسکوٹر، کار، بیش قیمت گھڑیاں بلکہ معتدبہ رقم اپنی تعلیم کو باقی رکھنے کیلئے یا کاروبار کی خاطر لڑکی کے والدین سے طلب کی جانے لگی اور اسطرح مردانہ غیرت وحمیت کو بھی کچل کر رکھدیا۔ قرآن حکیم نے تو صاف وصریح طور پر انفاق کی تمام تر ذمہ داریاں مرد پر ڈالی تھیں لیکن اس ظالم مرد نے قلبِ موضوع کرتے ہوئے لڑکیوں ہی سے اپنے پر خرچ کرانا شروع کردیا۔ یوپی کے مشہور شہر "بجنور" میں ایک شریف لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کی تعلیم کو جاری رکھنے کے مطالبہ پر خود بے پردہ ہو کر ملازمت کرنا پڑی۔ "بہار" میں شادی کے وقت ہی لمبے چوڑے مطالبوں کے بعد بھی دولہا پہلی مرتبہ سسرال جاتا ہے اور سسرال کی پوری مجبوری ومقہوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وقت کوئی ایسا مطالبہ کرتا ہے جس کا ان غریبوں کو پہلے سے احساس تک بھی نہیں تھا اور جس مطالبہ کی تکمیل طوعاً وکرہاً اسی وقت لازم ہوتی ہے۔ کیا یہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے اور جانے دیجئے اسلام کو خود اس بربریت کے لئے انسانیت میں کوئی گنجائش ہے^{عہ}؟ اسی موجودہ ہندوستان

ص۲۴۱ کا بقیہ: دونوں بچیاں ہوس ناک مردوں کا شکار ہو کر یکے بعد دیگرے گھر سے فرار ہوگئیں اور اس طرح پورے خاندان، اسلام اور انسانیت کے لئے موجب ننگ وعار ہوئیں مگر سوال یہ ہے کہ قصور کس کا تھا؟ ظالم ماں باپ کا یا مظلوم لڑکیوں کا؟ خدا شاہد ہے کہ عبرۃً للناس یہ دلدوز واقعہ قلم پر اسطرح آیا کہ واقعہ کی صورتِ حال کو مجمل بیان کرتے ہوئے بھی قلم کا سینہ وجگر شق ہوا جاتا ہے بمقصد کسی کا انکشافِ عیب نہیں اہانت وتذلیل محض صاحب خطبہ کے مضمون پر بطورِ دلیل وشاہد یہ دلدوز اجمال قارئین کو سنانا پڑا۔ وانما لکل امریٔ مانوی۔

عہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی۔ یہی صاحبِ سوانح حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جب کشمیر سے طویل تدریس کے بعد بہ نیت ہجرت دیوبند تشریف لائے اور اپنے استاذ الامام شیخ الھند طاب ثراہ سے ہجرت کی اجازت چاہی تو کہنہ سال استاذ نے جو اس تلمیذ کی غزارۂ علمیہ کو دار العلوم کی امانت اور اس امانت کی واپسی کی راہیں سوچ رہا تھا صاف انکار کردیا استاذی وشاگردی کی قدیم روایات سعادتمند تلمیذ نے واجب الاحترام مربّی کے اشارۂ چشم وابرو پر ارادوں کی دنیا یکسر بدل ڈالی اور حکماً دار العلوم میں تدریس کا آغاز ہوگیا مگر بشمولِ استاذ دیوبند کے سربرآوردہ اکابر نے پاؤں میں مزید بیڑیاں ڈالنے کے لئے شادی کی بھی تجویز سامنے رکھدی۔ نخواہی نخواہی اس حکم کی تعمیل کے لئے بھی تیار ہونا پڑا اور صرف دو شرائط اپنی جانب سے پیش کیں، لڑکی خاندانِ سادات سے ہو غریب وبیوہ ہو۔ ان شرائط کے پیشِ نظر قصبہ گنگوہ کے ایک سادات

(باقی آگے)

میں آمر بالمعروف وہی عن المنکر علماء کا طبقہ صدیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو اس ذلت آمیز و مہلک رسم کی قباحت وشناعت پر مسلسل متنبہ کر رہا تھا لیکن ہندوستانی رسوم ورواج کی گرفت اتنی شدید تھی کہ وعظ وتذکیر کی بھرپور کوششوں کے باوجود اس غیر ایمانی واسلامی رواج سے مسلمان خود کو آزاد نہیں کرا سکا۔ شر اٹھتا ہے تو کبھی اُسمیں خدائے تعالےٰ خیر کو بھی پنہاں فرماتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں یہ سطور نوکِ قلم پر ہیں تو تملک رسم وجہیز کی کثرت پر حکومتِ ہند کے

صـ۲۳۲ کا بقیہ:۔ خاندان میں ایک ایسی یتیم بچی کو تلاش کیا گیا جس کا گھرانہ واقعۃً نانِ شبینہ کا محتاج تھا اور دلہن کو دیوبند لانے کے بعد بادشاہِ اقلیم علم وکمال شوہر کی جانب سے گھر گرہستی کے لئے مٹی کا ایک بدھنا، سفالی کا ایک لوٹا، سفالی ہی کے ڈّدپیالے اور نیچے بچھانے کے لئے ایک چٹائی بہم پہونچائی گئی تھی۔ اس شادی کی تفصیلات بجائے خود دلچسپ وحیرت انگیز ہیں جو کسی مناسب موقعہ پر نظرِ قارئین ہو چکیں۔ کہنا یہ ہے کہ پھر الحمدللہ مکان بھی میسر آیا، کپڑے لتے بھی، زیورات اور اثاث البیت بھی۔ انتقال فرمایا تو ترکہ میں نہ زمین تھی نہ جائداد، نہ کوٹھیاں تھی نہ باغات، نہ فرم تھی نہ کارخانہ جات، پیرہنِ مبارک کے نیچے دھوتر کی بنڈی جو عموماً بنیان کے طور پر استعمال فرماتے اسکی جیب میں سے صرف چاندی کے دو روپے سکۂ رائج الوقت نکلے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ۳۵ سال والدہ نے اپنے یتیم بچوں کے ساتھ غریبانہ نہیں بلکہ پُر آسائش زندگی گزاری، کہاں سے آرہا تھا؟ بباطن وہابِ حقیقی دے رہا تھا اور بظاہر موصوف کے تلامذہ ہمہ جہت خدمت کے لئے مستعد، مولانا محمد میاں سملکی نے ۳۵ سال ماہ بماہ اور ہر چھوٹی بڑی ضرورت میں اس کشادہ دلی کے ساتھ خانوادۂ انوری کی خدمت کی کہ شاگردوں کی تاریخ میں سعادت مندی ونیاز کیشی کی یہ مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں پھر اس راقم السطور کی شادی کا وقت آیا تو والدہ کی خواہش واصرار پر بجنور کی ایک ایسی سید یتیم بچی کا انتخاب ہوا جس کے منہ کا نوالہ اور جسم پر پھٹے پرانے کپڑے کچھ جواد لوگوں کا عطیہ تھا۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اپنی سسرال سے نہ کبھی ایک وقت کی ضیافت حصہ میں آئی اور نہ کوئی پوشاک و ملبوس، غریب مرحومہ جہیز تو کہاں سے لاتی مگر وہ میرے گھر میں آئی خدا کا فضل اور اس کی رحمتِ جلیل اسکے ہم عنان تھی۔ الحمدللہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً۔ اس بے بضاعت کے پاس مملوکہ رہائشی مکان بھی ہے کپڑوں کے متعدد جوڑے بھی ہیں ہر دو وقت مکلف نہ سہی بہترین کھانے کیلئے میسر بھی ہے اور امیرانہ ٹھاٹ نہ سہی لیکن متوسط اثاثۃ البیت بھی۔ پھر سوال یہ ہے کہ بے غیرت وحمیت کش مسلمان لڑکے بجائے اسکے کہ ہونے والی بیویوں کے زر ومال پر نظر رکھیں اس منعم حقیقی پر کیوں توکل نہیں کرتے جو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اور جس سے بڑھکر کوئی دینے والا نہیں مگر واڑ گونی عقل اور اوندھا فکر وتدبر انسان کو خوفناک مغالطوں میں ہمیشہ الجھاتا ہی رہا۔

الا ماشاء اللہ۔

غالباً شاہ صاحب کی زندگی میں صرف لڑکی والے ہی لڑکے سے وصولیابی کرتے قضیہ پلٹا اور خود لڑکے نے بھی لڑکی کے والدین سے بھاری بھاری مطالبے شروع کر دیئے اس لئے حضرت شاہ صاحب کے خطبہ میں رسم و رواج کی یہ دوسری زیادتی و عدوان زیرِ بحث نہیں آیا۔ سطورِ بالا میں خطبہ کا جو اقتباس گزرا اسکے ذیل میں آپ نے فقہاء کا یہ متفقہ فیصلہ بھی سنایا۔

"اگر عورت کے اولیاء کچھ مال رخصتی کے وقت لیں تو شوہر کو واپس لینے کا شرعاً حق ہے کیونکہ جو کچھ لیا گیا تھا وہ کھلی ہوئی رشوت تھی۔

اس سے آگے آپ نے توجہ دلائی کہ لڑکے میں ریاست و امارت کی تلاش، ننگِ انسانیت و شرافت اقدام ہے شرعی نصوص واضح ہیں کہ لڑکے میں دین دیانت، اسلام و ایمان، شرافت و مروت، علم و عمل، صحتِ کردار و گفتار مطلوب ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں بہت سے مفلوک الحال لڑکے موجود ہیں جو اپنی فلاکت کی وجہ سے سسرال کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتے اور نتیجۃً لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں چونکہ اُن کے والدین کے طویل مطالبہ پورا کرنے والے امیر لڑکے مہیا نہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ دھیرے دھیرے ایک بھیانک مستقبل کی جانب قدم بڑھا رہا ہے۔ اہل علم کو توجہ دلاتے ہوئے تنبیہ فرمایا کہ معاشرہ کی اصلاح اُن کا فرضِ اولیں ہے انہیں مسلمان ماحول سے ان رسوم کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کر دینی چاہئیں۔

شادی میں مہلک رسوم کے ساتھ موت کے واقعہ پر بھی مسلمان ان رواجوں کی ادائگی میں

عہ گذشتہ چند سالوں میں مدراس و گورکھپور کے بعض دلدوز واقعات اخبار میں اشاعت پذیر ہوئے تھے جنہیں معصوم بچیوں نے خودکشی کر کے اپنے والدین کو گرانبار جہیز کی ادائگی کے فکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلائی تھی مگر شاباش ہندی مسلمان ان واقعات کا بھیانک پن بھی رواجی قیودات سے نکالنے کے لئے مؤثر نہیں ہوسکا جب تسلط حکومت کا ڈنڈا سروں پر پڑا تو عقلوں سے خالی دماغ ہوش میں آنے لگے چراغ تلے اندھیرا۔ یہاں دیوبند میں صدیوں سے لیلۃ البرارت کی مقدس گھڑیوں میں مسلمانوں ہی کے دو طبقے ایک شہر والے دوسرے کوٹلہ والے باقاعدہ جنگ کرتے۔ آتش بازی نہیں بلکہ آتش باری، خشت باری، باقاعدہ لاٹھیوں سے مقابلہ، سر پھٹول، لہولہان اور زخموں سے چور چور ہوتے۔ نامی گرامی علمائے دیوبند کی ناصحانہ شفقت کا جواب اسی قدیم جاہلانہ عتاب کے ساتھ پیش کیا جاتا "کہ ہم اس رسم کو کس طرح چھوڑیں" انّا وجدنا علیہ اٰبارنا۔ خدا جانے صالحین کا یہ عام طبقہ اپنی خلوتوں میں خدائے ہادی کے سامنے صورتِ حال کی سنگینی پر کس طرح گڑگڑایا کہ آزاد ہندوستان میں حکومت کے امتناعی آرڈر نے اس خرافات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جسے دیوبند کے یہ جیالے، ابرار و صالحین کے کہنے پر چھوڑنے کے لئے آمادہ و مستعد نہیں تھے۔

الجھ کر رہ گئے جن کا اسلام میں کوئی جواز نہیں حالانکہ یہاں بھی محمد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ، صاف اور واضح ہدایات موجود تھیں لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں اور چالیسواں ماحول پر اسطرح مسلط ہوا کہ موت مسلمان گھرانوں میں اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوئی ایک بدترین مصیبت بن گئی۔ مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون کے قریب ایک غریب مسلمان کاشت کار دوڑتا ہوا دیہات میں موجود طبیب کے پاس پہونچا اور حکیم سے بولا کہ اس بار میرے بڈھے باپ کو دوا دارو سے ضرور بچالو اگر آئندہ سال مرجائے تو کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ طبیب نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ وفات کی صورت میں برادری کو کھانا دینے کے لئے غلّہ نہیں آئندہ سال کاشت ہوگی تو غلّہ مطلوب مقدار میں جمع کرلیا جائے گا۔ یا اَسَفیٰ ——— یہ اسی ایک نوجوان کی ذہنیت تھی جسکے دین و مذہب میں ان خرافات کو ممنوعاتِ شرعیہ میں بقوۃ شمار کیا تھا۔ امامِ بریلویت نے اس اسلام خلاف رجحان کو اپنے قلم و زبان سے جو بھرپور توانائی دی اور جسطرح مسلمانوں کو تباہی کے غار میں دھکیلا کیا عنداللہ اس پر مواخذہ نہیں ہوگا؟ خود ان ہی امام صاحب نے اپنی وفات کے بعد بہ نیت ایصالِ ثواب کھانوں کی جو ایک طویل فہرست تیار کی ہے جسمیں پھریری دال ماش سے لے کر بریانی تک کا تذکرہ ہے اور ہضم کرنے کے لئے سوڈا واٹر اور ان نعمتوں کو گلے سے اتارنے کے لئے شربت خانہ ساز کی فرمائش! کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں بریلویت سے متأثر حلقہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں کوئی اس کا جواز پاتا ہے؟ لیکن طغیانی عقل و سکراتِ ہوش کا کسی بقراط و جالینوس کے پاس بھی علاج نہیں بات تو کڑوی ہے اور حق بات ہمیشہ کڑوی ہی ہوتی ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ اس ہندوستان میں اسلام کی رسوائی کا واحد سبب بدعات و محدثات کا وہ مکتبۂ فکر ہے جس نے سنت کو العیاذ باللہ کھیل کر اسلام کے ساتھ نادان دوست نہیں بلکہ کھلے دشمن کا معاملہ کیا ہے بقولِ شاعر

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

حضرت شاہ صاحب نے شادی سے متعلق غیر اسلامی رسوم پر اپنا دردِ دل سنانے کے بعد حاضرین کے روبرو غم موت پر رسم و رواج کے الم انگیز حوادث کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہماری بدقسمتی کی داستان بہت طویل ہے ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی شادیوں کو اپنے لئے پھانسی کا پھندا بنا رکھا ہے اور غم کی طبعی و وقتی مصیبت کو اس سے زیادہ خطرناک اختیاری و دائمی مصیبتوں سے گھیر رکھا ہے۔ اسراف و

فضول خرچی کی انتہا ہے برادری میں ناک کٹ جانے کے اندیشے سے سودی قرضہ لے کر تباہی و بربادی کو دعوت دی جاتی ہے۔ میں خود بہت سی ایسی مثالیں جانتا ہوں بڑے بڑے صاحبِ جائداد و ثروت نے اپنی اولاد کی شادی کر کے خود کو نان شبینہ کا بھی محتاج کر لیا اور پھر ان کی ساری عمر تباہی و فلاکت میں گزری حالانکہ فضول خرچی کو قرآن مجید نے اپنے بے لاگ انداز میں کارِ شیطان قرار دیا ہے۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ جل شانہ کو مساجد کے علاوہ دوسری جگہ زینت کا اہتمام مقصود نہ تھا اگر دوسرے مواقع پر زینت مطلوب ہوتی تو اسکو اصلِ اباحت پر نہ چھوڑا جاتا اور عند کل مسجد فرما کر عموم کے مزید اہتمام کو مؤکد فرمایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ زینت مساجد کے تو حقوق و آداب میں ہے ورنہ وہ بجائے خود مطلوب نہیں"۔

اس عالمانہ و فاضلانہ دقیق نکتۂ علمی کی جانب توجہ دلا کر موت کے موقعہ پر بھیانک رسموں کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا۔

"ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ بعض صوبوں میں یہ دستور ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین سے پہلے اہل بیت کو برادری کی دعوت کا سامان کرنا پڑتا ہے اور بستی کے مسلمان جب تک میت کے گھر پر سامانِ ضیافت نہ دیکھ لیں اس وقت تک جنازہ بھی اٹھانے کے لئے نہیں آتے العیاذ باللہ اس سے بڑھکر خدا اور رسول کی مخالفت کیا ہوگی۔ مسند امام حنبل میں بروایت جریر بن عبداللہ البجلی موجود ہے کہ حضراتِ صحابہ کے زمانہ میں اسطرح کے تمام اعمال کو نوحہ میں شامل سمجھا جاتا تھا جو شرعاً حرام اور جاہلیت پر عمل ہے۔ حافظ ابن ہمام نے فتح القدیر میں فقہاء کا فیصلہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اھل المیت لان الدعوۃ شرعت فی السرور لافی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ (اہل میت کا لوگوں کی دعوت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ دعوت خوشی کے مواقع پر ہوتی ہے نہ کہ مواقعِ غم میں۔ یہ ایک شدید بدعت بلکہ مہلک ہے۔)

بلکہ میں جہاں تک جانتا ہوں شوافع و حنابلہ کا بھی یہی مذہب ہے البتہ میت کے لئے ایصالِ ثواب کی نیت سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے بقدرِ

استطاعت صدقہ وخیرات ہر وقت جائز و مستحسن ہے اس پر کوئی پابندی نہیں
میرا اصل مقصد اسراف وفضول خرچی، بلاوجہ کی رسوم ورواج، نمود ونمائش
کی خواہش کے لئے زیر بار ہونا اور میانہ روی کو چھوڑنا اس پر نکیر ہے۔ حالانکہ رسولِ
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میانہ روی کو نبوت کے چوبیس حصوں میں سے ایک اہم حصہ
قرار دیا ہے۔ اس مضمون کی حدیث ترمذی شریف میں موجود ہے۔"

صاحبِ خطبہ نے ان مہلک رسوم پر طویل خامہ فرسائی کے بعد اس سودی کاروبار پر خاص توجہ
فرمائی جس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہوکر رہ گئی جیسا کہ سطورِ بالا میں گذرا یہ سودی قرضے
بالعموم شادی بیاہ، موت وپیدائش کی غلط رسوم کی ادائیگی کے لئے کئے جاتے اور اسطرح عمر بھر کے لئے
ایک بے درماں مصیبت کو خرید لیا جاتا۔ اسلام میں جن چند گناہوں کو کبائر میں شمار کیا ہے اور جن کی
سزا دخولِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ان میں سودی کاروبار ہے، سود لینا دینا، سودی کاروبار کی تحریر،
اس لین دین میں گواہ بننا، سب امورِ گناہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ راقم السطور کو یاد آتا ہے کہ
آج سے ۲۵، ۲۶ سال پہلے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی ایک تصنیف "زجر الشبان والشیبۃ عن
ارتکاب الغیبۃ" مطالعہ سے گذری تھی جو کچھ اس کے حوالہ سے لکھ رہا ہوں اپنے حافظہ کی کمزوری
کی بنا پر سوفیصدی صحت کا دعویٰ نہیں لیکن امیدِ غالب ہے کہ انشاء اللہ فی الجملہ بات صحیح ہوگی۔
اُس میں ایک حدیث موجود ہے کہ ماں کے ساتھ بدکاری میں جتنا گناہ ہے اُس سے ۳۶ گنا
زائد سود لینے دینے میں ہے والعیاذ باللہ۔

اس وعید کی گہرائی وگیرائی پر غور کیجئے نیک و بد اعمال کی حقیقت پر مطلع لسانِ نبوت وعید
کا پیرایۂ بیان اس سے زیادہ مہیب و مدہش کیا اختیار کرسکتی تھی اسلام نے ممانعت کے باوجود
سودی کاروبار کو خدا اور اسکے رسول سے اعلانِ جنگ کے ہموزن گناہ بتایا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے سودی قرضوں کو معاف کر کے امت کو اس راہ کی بہترین تعلیم دی تھی
مگر افسوس کہ امت ہی کے معاند طبقہ نے اپنے پیغمبر جلیل کی حکم عدولی کو اس شعبہ میں بھی ترک نہیں
کیا۔ ایک ملک سے "مجاہدین" کا طبقہ سروں پر خاص پگڑی، جسم پر نقش ونگار وکشیدہ کاری سے مزین
واسکٹیں اور کئی گز کی شلوار پہنے ہوئے ہاتھ میں سونٹا دبائے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوگیا
اور یہاں سودی قرضوں کو دینا اور بقہر اُن کی وصولیابی کے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا[عہ] اور

عہ مجاہدین کا یہ گروہ اپنے سودی قرضوں کی وصولیابی میں کس قدر تشدد پسند واقع ہوا تھا ایک تقرار دی (بقیہ)

تو اور ایک وقت ہندوستان پر ایسا بھی گذرا کہ بعض برخود غلط مسلمانوں نے مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی کا واحد سبب سودی کاروبار سے اُن کا کلیۃً اجتناب ویکسوئی کو قرار دیا اور ایک صاحب نے "سودمند" کے نام سے ایک جریدہ کی اشاعت کرکے سود خوری کے سب سے بڑے داعی بن گئے اور دارالحرب میں کفار سے سود لینے کا جواز قاضی ابویوسف کا فتوٰی اور اسطرح کی چیزیں بکثرت پیش کی جانے لگیں حالانکہ جس اسلام نے چودہ[۱۴۰۰] سو سال قبل اسکی کلی حرمت کا اعلان کیا تھا اس اسلام کے ربانی علماء اور قانون کے شارح اسلام سے کھلی بغاوت کے کیسے مرتکب ہوتے؟ بہرحال حضرت شاہ صاحب نے صورتِ حال کی تباہی وبربادی پر توجہ دلاتے

صـ۲۲۷ کا بقیہ:- اس فقیر حقیر کو سنایا سنبھل ضلع مرادآباد میں ایک مقروض کی وفات ہوگئی میت کا جنازہ اٹھاکر نماز کے لئے لے جانے لگے تو مجاہد اپنے سونٹے کے ساتھ اچانک ظہور پذیر ہوا بولا بلکہ غرایا۔ "ابا یہ ہمارا مقروض ہے ہم اس سے اپنا قرضہ وصول کرے گا"۔ شریکِ جنازہ لوگوں نے منت سماجت سے کہا کہ یہ تو غریب مرچکا اب اسے معاف کیجئے۔ لیکن سود خوری جس قساوت کو پیدا کرتی ہے وہ کہاں ماننے والی تھی۔ کوہ پیکر مجاہد نے کاندھوں پر سے جنازہ اتروا کر رکھ لیا۔ ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا اور اس وقت تک جنازہ نہیں اُٹھنے دیا تاوقتیکہ غریب مسلمانوں نے چندہ کرکے اس کے مطالبہ کی تکمیل نہیں کردی۔ اللھم احفظنا من ھذہ القساوۃ ونعوذ باللہ من الشقاوۃ ومن التجاوز علے اللہ ورسولہ۔

عـہ جس زمانے میں سود کے جواز وعدم جواز کی بحث زور وشور پر تھی حضرت شاہ صاحبؒ کو پنجاب کے سفر میں لاہور میں قیام کرنا ہوا لاہور کے علماء وزعماء فرد گاہ پر جمع ہوگئے جن میں "مولانا ظفر علی خاں" اخبار "زمیندار" والے بھی تھے موصوف بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے جو سود خوری کو مسلمانوں کے لئے سود مند سمجھتا اس نیت سے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے کوئی جواز حاصل کرلیا جائے سوال کیا تو حضرت نے ڈیڑھ دو گھنٹہ سود کی حرمت اسکی ہلاکت وبلاء انگیزیوں پر سیر حاصل گفتگو کی جو ظفر علی خاں کے مقصد کے بالکل خلاف پڑی وہ بھی جہاں دیدہ تھے اسلوب بدل کر پھر سوال کیا تو شاہ صاحبؒ نے اپنے خصوصی انداز میں فرمایا کہ "بھائی" ہم مسئلہ کشف کرچکے اب جس کو جہنم میں جانا ہو چلا جائے لیکن ہماری گردنوں کو پل نہ بنائے۔ یہ مختصر جملہ سود کی ان مضرتوں پر خوب پھیلا ہوا ہے جس کا سلسلہ دنیائے دوں سے چل کر جہنم تک دراز ہے۔ علامہ رشید رضا نے "المنار" میں ایک عبرت انگیز واقعہ سود سے متعلق آیات کے تحت اپنے مشہور وطن "مصر" کا چشم دید لکھا ہے کہ ایک زاہد و پاکباز مصری متموّل اپنی دولت سے غریبوں کی بھرپور مدد کرتے کوئی قرض لیتا تو بے تکلف رقم دیتے جس کی نہ کوئی تحریر ہوتی اور نہ کتابت۔ مقروض خود ہی توجہ دلاتا کہ اطمینان کے لئے کچھ لکھ لیجئے اس پر ان کا جواب یہ ہوتا کہ بھائی لوٹا کر دیدوگے تو تمہارا احسان نہیں دوگے تو خدائے تعالےٰ احسن الجزاء عنایت فرمائینگے۔ بہرحال میں تو نفع میں ہوں پھر تحریر لکھ کر اپنے ثواب واجر کو کیوں کم کروں۔ حالات ومزاج نے رُخ پلٹا تو

(باقی آگے)

ہوئے ارشاد فرمایا۔

"سود کی مثال جذام کے مرض جیسی ہے جو بڑھتا ہی جاتا ہے اور کم نہیں ہونے پاتا۔ حسبِ قواعدِ شرعیۂ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سود ایک لعنت ہے جو دینے والے، لینے والے، کھانے والے، کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے اور اس کی تحریر لکھنے والے پر مساوی طور پر تقسیم ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں روحانی و اخلاقی جذام ہے اور آخرت میں جہنّم کا موجب ہے۔"

بلکہ صاحبِ خطبہ نے بعض اسلامی ریاستوں کی تباہی کا سبب نصاریٰ سے بھاری بھاری رقوم بطور سود لینا اور عدمِ ادائیگی کے نتیجہ میں ریاستوں کا ہاتھ سے نکل جانا قرار دیا ہے۔ حضرت

ص کا بقیہ:- یہی صاحب بدقسمتی سے سود لینے لگے اور پھر وہ وقت آیا کہ اپنے بیٹے کو بھی رقم دی تو سود ہی پر دی۔ ہمارے اس ہندوستان میں مہاجنی استبداد اور سودی کاروبار نے لاکھوں انسانوں کو جسطرح تباہ کیا اسکی ایک مختصر تفصیل یہ ہے کہ یوپی کے مشہور شہر "گورکھپور" میں ایک صاحب نے مہاجن سے ڈیڑھ ہزار روپے سود پر لئے چار سال کے عرصہ میں پچاس ہزار بمد سود ادا کرنے کے باوجود زرِ اصل کی ادائیگی بدستور قائم ہے۔ شہر "گیا" میں ایک اسکول کے ٹیچر نے ۱۵ برس پہلے پانچسو روپے سود پر لئے ماہانہ مسلسل ادائیگی کے باوجود جب کہ وہ اصل رقم سے بہتر گنی رقم یعنی چھتیس ہزار دے چکا ہے لیکن پھر بھی اصل رقم کی ادائیگی ہنوز نہیں ہوسکی۔ کانپور اور صنعتی شہروں میں فیکٹری کے ملازم جو مہاجنوں کی گرفت میں مبتلا ہیں ان کا تناسب ستّر فیصدی ہے اُن کی تنخواہیں مہاجن وصول کرتے ہیں اور ان غریب مزدوروں کو ایک کوڑی بھی مشاہرہ سے نہیں ملتی جو بربریت، بہیمیت اور درندگی سود خوروں میں پیدا ہوتی ہے اس کا تازہ المیہ جاسنالہ میں اسطرح پیش آیا کہ حال ہی میں اس شہر کی کوئلہ کان میں سینکڑوں مزدور پانی بھر جانے کی وجہ سے غرق ہو گئے حکومت نے بطور امداد رقم دی جسے بالا ہی بالا مہاجنوں نے وصول کرلیا اور پسماندگان کو انسانوں کی موت کے ساتھ اس امداد کو بھی بطورِ حسرت دیکھنا پڑا جو حکومت نے پیش کی تھی۔

ان چند واقعات سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی نظر اس مہاجنی نظام کی ہلاکت انگیزیوں پر کس قدر دقیق و دوررس تھی کہ اُس نے اسلامی معاشرہ میں سود کے لئے کوئی خفی و جلی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ مظلوم طبقہ کی آہ و بکا پر حکومتیں متوجہ ہوئیں تو زیادہ سے زیادہ شرح سود کم کرنے کی طرف رُخ رہا لیکن سرے سے اس کی ممانعت یا اس ملعون پیشہ پر مکمل پابندی بجز اسلام کے اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی ——————

لیکن

اسکو کیا کیا جائے کہ متعصب دنیا اسلامی قوانین کی خوبیوں اور فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔

شاہ صاحب نے اس مہلک مرض سے نجات پانے کے لئے جمیعۃ العلماء کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مبلغین کے ذریعہ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں مسلمانوں کو سودی کاروبار کی ہلاکت پر مطلع کریں اور خدا اور اس کے رسول سے اعلانِ جنگ کی تباہی و بربادی ذہن نشین کرائیں بیت المال قائم کئے جائیں اور مسلمانوں کو ان کی حقیقی ضرورتوں میں بطورِ قرض بلاسود رقم مہیا کی جائیں۔ الحمد للہ کہ اس تجویز کی سب سے پہلی تکمیل قصبہ دیوبند میں بروئے کار آئی اور یہاں مسلم فنڈ قائم کیا گیا جس کی ابتدا اسطرح ہوئی کہ ایک حجرہ میں ایک محرّر چند رجسٹر لیکر بیٹھ گیا کچھ رؤسا نے اپنی رقوم بطورِ تعاون یا بطورِ امانت فنڈ کے سپرد کر دیں۔ دس سال کے عرصہ میں اس مسلم فنڈ نے مادی ترقی کی تو اس اعلےٰ پیمانہ پر کی کہ آج دیوبند میں اس کی ذاتی ایک وسیع ترین خوبصورت مضبوط عمارت ہے۔ اندرونی نظام کسی ترقی یافتہ اعلیٰ بینک سے کم نہیں پندرہ۱۵ بیس۲۰ آدمیوں کا عملہ مصروفِ خدمت اور دس سال کے عرصہ میں ڈیڑھ کروڑ کی رقم ابتک ضرورتمندوں کو دی جا چکی جس سے ہزاروں مسلمانوں کو رہائش، کاروبار، لین دین اور خوانگی ضرورتوں میں عظیم مدد ملی خود راقم الحروف کا مکان اسی مسلم فنڈ سے حاصل کئے ہوئے قرضہ سے تکمیل کو پہونچا۔

اب سوچئے کہ اگر غریب مسلمان ڈیڑھ کروڑ کی رقم سود پر لیتا تو کتنی بڑی رقم ادائگی سود میں نکلنے کے باوجود زرِ اصل بدستور باقی رہتا جس سے ان کی اقتصادیات کا ڈھانچہ شکست و ریخت ہونے کے ساتھ ابدی عذاب کا پیش خیمہ بن جاتا۔ دیوبند کے اس مسلم فنڈ کو دیکھ کر اور اسکی طویل افادیت کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان میں ابتک مختلف مقامات پر تقریباً سو مسلم فنڈ قائم ہو چکے بلاشبہ یہ کارنامہ جو جمیعۃ العلماء کے پروگرام کی ایک تکمیل ہے بانیوں کے لئے ذخیرہ آخرت اور انشاء اللہ بہترین اجر کا ذریعہ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے اسی خطبہ میں تحفظِ اوقافِ مسلمین پر بھی توجہ دلائی۔ ممالکِ اسلامیہ کا تو کیا ذکر خود ہندوستان میں کروڑوں کی جائداد و اوقاف مسلمانوں کی نااہلی سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں سینکڑوں خانقاہیں ہزاروں اہل اللہ کی قبور اور ان قبرستانوں کے ساتھ لمبے چوڑے اوقاف ان نااہل مسلمانوں کے قبضہ میں پھنسے ہوئے ہیں جنھیں نہ قرآن کا علم، نہ حدیث سے واقفیت، نہ فقہ کی شدھ بد، نہ مسائل کی معلومات، نہ ان میں دیانت نہ امانت، نہ ثقاہت و متانت۔ اوقاف کی گراں بار آمدنی کو بے تحاشا اپنی رنگ رلیوں پر بلکہ عیش کوشیوں پر ضائع کر رہے ہیں اور غرا رہے ہیں مسلمان بادشاہوں نے اپنی عقیدتوں میں ہزاروں اوقاف کئے جن کی

آمدنی لاکھوں مسلمانوں کے کاروبار، دینی درسگاہوں اور مساجد کے کام آتی. لیکن بدقسمتی سے یہ ایسے ہاتھوں میں الجھے ہوئے ہیں جو حاصل شدہ سرمایہ کلیتہً برباد کرتے ہیں. جمعیۃ العلماء کے مقاصد میں ان اوقاف کا تحفظ اور غلط کاروں سے واگزاری بھی ہے اس سلسلہ میں فرمایا۔

"اس وقت جن مسائل کی طرف مسلمان راہنماؤں کی توجہ ضروری ہے اُن میں خاص مسئلہ اوقاف کی صحیح تنظیم کا ہے اس لئے کہ مشاہد ہے اسلامی اوقاف کی کڑوڑوں روپئے کی سالانہ آمدنی صحیح مصارف میں صرف ہونے کے بجائے خودغرض متولیوں کے تنور شکم کی آگ بن رہی ہے یا امورِ خیر کی جگہ خواہش و معاصی میں بے دریغ صرف کی جارہی ہے حالانکہ علماءِ اسلام نے تصریح کی ہے کہ وقف اسلام کی خصوصیات میں سے ہے جاہلیت میں اسکا نام ونشان نہ تھا۔"

پھر آپ نے وقف کی حقیقت اور اسکے مصارف کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا

"وقف کا مطلب یہ ہے کہ واقف اپنی مملوکہ جائداد کو خدائے تعالےٰ کے پاس امانت رکھدے اور اس کی آمدنی کی مدد سے مسجد کی تعمیر، خانقاہیں، مہمان خانے، مسافرخانے، اسلامی درسگاہیں، پانی کی بہم رسانی پل وغیرہ، غرضیکہ رفاہِ عام کی چیزیں بنائی جائیں۔ اس فائدہ رسانی کے ساتھ واقف کو مسلسل ثواب بھی پہونچتا رہے گا بلکہ علماء نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ اوقاف کی حفاظت میں نصوصِ شرعیہ کی حفاظت کی طرح سرگرم رہنا چاہیئے۔"

مگر علماء اور ان کی تنظیم نے اوقاف کے سلسلہ میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار نہیں کیا نتیجتہً یہ اوقاف ایک ہی نسل کے بعد آنے والی نسل کی ذاتی جائداد بن کر رہ گئے اور متولیوں کی ایسی مملوکہ شئے جس میں کسی دوسرے کو مداخلت کا حق ہی باقی نہ رہا. غضب تو یہ ہے کہ ان اوقاف کے حساب کی جانچ بلکہ حساب فہمی کی راہیں بھی بقوۃ مسدود کردی گئیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے صحیح فرمایا کہ متولیوں کی تبدیلی، سال بسال انتخاب، حساب فہمی اور انکی ذاتی جائداد بننے سے روکنا، نیز اوقاف کا تحفظ، اس سارے مفسد کا واقعی علاج ہے. یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"اوقافِ مسلمین ایک مذہبی مسئلہ ہے چونکہ اس میں عبادت وصدقہ کی حیثیت ہے اس لئے یہ مذہبی حیثیت رکھتا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے

انتظام میں مسلمان اور ان کے علماء کے سوا کوئی طاقت دخیل نہ ہو تاکہ اسلام کے احکام کی مخالفت کا اندیشہ باقی نہ رہے۔"

خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ہندوپاکستان کے نام سے دو سلطنتیں وجود پذیر ہوگئیں اور جمعیۃ العلماء کو قدرے فرصت میسّر آئی تو اس نے اپنی توجہات اس جانب بھی مبذول کیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر سابق وزیر ہندوستان، یونس سلیم صاحب اور دوسرے حکومتی ارکان نے بھرپور تعاون دیا اور بیشتر اوقاف خود غرض متولیوں کے قبضہ سے واگزار ہوگئے لیکن ابھی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں مسلسل جدوجہد جاری رکھی جائے تاکہ کروڑوں روپے کی یہ آمدنی مسلمانوں کی حقیقی ضرورتوں کے لئے صرف ہو۔ وَالامرُ بیدِ اللہ۔

خاتمۂ کلام پر صاحبِ خطبہ نے اس سب سے بڑی ضرورت کی جانب امت کو متوجہ کیا جس مقصود کی دریافت میں اگر یہ امت اپنا تمام وقت اور اپنی تمام توانائیاں، اپنا علم اور اپنا فہم، اپنی تدبیر و تدبر، ریاستیں اور سلطنتیں، دولت اور امارت، عزت و عروج صرف کرنے کے بعد اس کو حاصل کرے تو امت کی فلاح اور بقا کی ایسی راہ سامنے آئے جس کے لئے قرآن و حدیث، مذہب و دین اور محمد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے پناہ توجہ کی اور دلائی جس کے مسدود ہونے سے یہ امت تباہیوں کے گڑھے اور ہلاکتوں کے غار میں جا پڑی۔ یعنی مسلمانوں کا باہمی اتحاد، تعاون، اتفاق مرکزیت واجتماعیت اور دلی توافق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصدِ جلیل کو حاصل کرنے کے لئے بڑی سعی و کاوش فرمائی اور امت کو امتِ متحدہ بنانے کے لئے وقت کا سب سے بڑا یہ گر سمجھایا اور سکھایا مگر اسی موقف کو چھوڑنے پر امت کا شیرازہ جسطرح منتشر ہوا اور جو اس کے تلخ نتائج سامنے آئے اسکی داستان بڑی دلدوز ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ امت کو درپیش اس ہائلہ کی اطلاع النبی الصادق ؐ نے چودہ سو سال پہلے سنادی تھی کہ یہ امت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہوکر رہیگی لیکن اسکے باوجود آپ نے اپنی مقدس حیات کے قیمتی لمحات اس اعلیٰ وارفع مقصد کو حاصل کرنے کے لئے صرف فرمائے۔ آخر روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان بیمار ہوتا ہے حاذق اطباء، وڈاکٹر اسکی موت کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن پھر بھی نہ مریض اور نہ اسکے اعزہ واقارب اُسے مایوس العلاج سمجھتے بلکہ تمام ناکامیوں کے باوجود گئی ہوئی صحت کو حاصل کرنے کیلئے مسلسل تگ و دو جاری رہتی ہے معاشرہ کے کسی فرد پر مسلسل ناکامیوں کا بوجھ، ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہوتا ہے لیکن یاس انگیزیوں کے باوجود وہی فرد اپنی دوڑ دھوپ میں کمی نہیں آنے دیتا۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ حرماں نصیبی کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں کے

پیچھے سے امید کا آفتاب اپنی شعاعیں زمین پر ڈالتا ہے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ خاص امت میں پیدا شدہ داخلی انتشار کو ایک ایسا حادثہ سمجھ لیا گیا جس کے علاج اور تدارک کو سب سے بڑی مشکل سمجھا جارہا ہے حالانکہ اگر ایک جانب جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے انتشار و عدم مرکزیت کی پیشین گوئی فرمائی تھی تو دوسری جانب قرآن و حدیث کی نصوص اس مقصد کے حصول کی راہیں بھی ہموار بتاتی ہیں اگر یہ مقصد دریافت کرنا اور اس کی بازیافت قطعاً ممکن نہ ہوتی تو حدیث و قرآن میں اسطرح کے اشارے خاکم بدہن مہمل ہونگے۔ اس طبیب کے متعلق آپ کیا فیصلہ کرینگے جو مریض کو بازیابیٔ صحت سے مایوس کرنے کے باوجود پھر تدابیر حصول صحت میں بھی مصروف ہے یہی ناکہ وہ ایک دیوانہ و جنون میں مبتلا طبیب ہے جسے دانش و بینش سے کوئی سروکار نہیں[عہ] مقصد ان سطور کا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ اتحادِ امت میں پڑے ہوئے شگاف کو دور کرنے کے لئے امت کے ہر فرد کو بہترین کوششیں بہر حال کرتے رہنا چاہیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان آیات قرآنی و احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیکر،

عہ سیر کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہے کہ انصار کے دو طبقے یعنی اوس و خزرج، بنو قریظہ و بنو نضیر کی چیرہ دستیو کا مسلسل شکار رہے اور صیہونیت کی مشہور عالم دسیسہ کاریاں اس سب سے بڑے فرقے کو آپس ہی میں دست و گریبان کئے ہوئے رہیں اسلام آیا تو اسکی پاکیزہ تعلیمات کے نتیجہ میں شکر رنجیاں ختم ہوئیں اور تلخیوں کی جگہ خوش کامیوں نے لی اور بچھڑے ہوئے شیر و شکر ہوگئے۔ یہود مسلمانوں کے اس توافق کو برداشت نہ کرسکے اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان کی فریب کاریوں کے نتیجہ میں قریب تھا کہ انصار کے یہ دو بازو پھر ایک دوسرے سے متصادم ہوجائیں۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پیش آنے والے حادثہ کی اطلاع ہوئی تو آپ اس تیزی سے اٹھے کہ ردائے مبارک دوش مبارک سے گرگئی اور برسر جنگ دونوں فریق کے درمیان کھڑے ہوکر یہ اعلانِ حق فضا میں بلند ہوا کہ...

"لوگو کیا جاہلیت کی جانب لوٹ رہے ہو درآنحالیکہ میں تمہارے درمیان ہوں" والقصۃ بطولہا۔ مولانا حسین احمد مدنی جو استخلاص وطن کی جنگ میں مجاہدانہ حصہ لیتے دوسری جانب ان کی مقدس راتیں تسبیح و تہلیل سے لبریز رہتیں ان ہی کے فیض یافتہ سلہٹ میں موجود ایک عالم کا بیان ہے کہ ہندوستان کے آخری انتخابی مہم میں حصہ لیتے ہوئے مرحوم سلہٹ تک جا پہونچے۔ ایک رات سفر کی مسلسل صعوبت کے بعد فرودگاہ پر آرام فرمایا اور رات کے آخری حصہ میں خدا کا یہ مقدس و فرمانبردار انسان ادائیگی تہجد کے لئے اُٹھ بیٹھا تو اپنے ان ہی مسترشد سلہٹی سے فرمایا کہ آج عالم بالا میں ہند کی تقسیم کا فیصلہ ہوکر پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کا بھی فیصلہ ہوچکا مسترشد نے عرض کیا کہ جب یہی سب کچھ ہے تو اب پاکستان خلاف مہم میں حصہ لینے سے کیا فائدہ؟ حضرت مرحوم کا جواب تھا کہ یہ فیصلہ تقدیر کا ہے ہم اپنی تدبیر میں مسلسل لگے رہیں گے۔ کچھ سمجھے آپ تدبیر و تقدیر کے یہ وہ شرعی حدود ہیں جنہیں عباد الرحمن کو کام کرنا ہے۔ حاصل یہ کہ عذرِ تقدیر سعیٔ تدبیر کیلئے موت کا اعلان نہ ہونا چاہیئے۔

دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"ان نصوصِ قرآنیہ وحدیثیہ سے صاف ثابت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اسلام اور ایمان کا ایسا مضبوط رشتہ قائم ہے جس نے تمام مختلف افراد واشخاص کو جسم واحد کے حکم میں کر دیا اور جس قدر یہ تعلق قوی اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اسی قدر جسم واحد کے آثار اس پر متفرع ہوتے ہیں۔"

ذیلاً یہ بھی واضح کیا کہ اصل حاکم ایمان واسلام کو ہونا چاہئے اور پھر اسلامی قومیت کے تمام اعضاء وارکان انہیں کے ماتحت کام کریں اسطرح امت کی شیرازہ بندی بلاشبہ قائم و باقی رہے گی اور اس اتحاد واتفاق میں کوئی شگاف نہیں پڑ سکے گا جو اسلام مسلمانوں کے درمیان چاہتا ہے اسکے لئے ضرورت ہوگی کہ وہ تمام اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ اختیار کئے جائیں جو مرکزیت کو وجود میں لانے اور باقی رکھنے کے ضامن ہیں۔ مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے بعد اور مقصد وہی جمعیت و اتحاد ہے تو پھر مسلمان موجودہ نکبت، ذلت، تباہی و بربادی سے نکل کر اپنی قدیم رفعت و عروج ترقی واستحکام حاصل کر سکتے ہیں۔ صاحبِ خطبہ کی بھی بشارت ہے کہ

"اگر آج بھی مسلمان ان صفاتِ ایمانیہ کے ساتھ متصف ہوں تو انکو وہی عروج و ترقی، وہی رفعت و بلندی نصیب ہو جو قرونِ اولیٰ میں حاصل تھی۔"

فیضِ روح القدس او باز مدد فرماید

دیگراں نیز کنند آنچہ مسیحای کرد

اختتامِ خطبہ پر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند کی دقیع خدمات کا کھلے جذبات سے اعتراف کرتے ہوئے "جمعیۃ" کے وجود میں روح، بالیدگی اور استحکام کا ہر دو کو ذمہ دار قرار دیا ہے اسطرح یہ طول وطویل خطبہ جو اسّی صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور جس کے جا بجا اقتباسات خاکسار نے نظرِ قارئین کئے اس سے حضرت موصوف کے سیاسی خیالات وافکار اور اس راہ میں بصیرت اور وادیٔ سیاست کے پر پیچ راہوں پر ان کی واقفیت آشکارا ہے۔ یہ خطبہ جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبوں میں اس لحاظ سے بلاشبہ ممتاز و منفرد ہے کہ عام خطبات میں صرف وقتی مسائل کا ذکر و تذکار ہوتا ہے لیکن شاہ صاحب نے جمعیۃ العلماء کے تاسیسی مقاصد، ملی حقیقی مشکلات کا واقعاتی حل جس عالمانہ وفاضلانہ انداز میں تجویز کیا ہے اس سے دوسرے صدارتی خطبات خالی ہیں اور یہی وجہ ہے اس خطبہ کے مضامین کو دلیل کے طور پر بلکہ ایک ماخذ

علمی کے انداز میں استعمال کیا گیا اور انشاء اللہ کیا جاتا رہے گا۔ حال ہی میں پاکستان کے مشہور مجلّہ "الرشید" نے جو اپنا تاریخی و مثالی دارالعلوم دیوبند نمبر شائع کیا ہے اُسمیں مولانا مفتی محمود؏ سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے اس خطبہ کے متعلق تحریر فرمایا۔

"حضرت علامہ انور شاہؒ آپ نے پشاور جمعیۃ العلماء ہند کی عظیم الشان خطبہ میں جو خطبۂ صدارت دیا ہے اور جس میں حضرت شیخ الہند کے مقاصد کی وضاحت اور ترکِ موالات پر دلائل و براہین کے انبار لگائے ہیں وہ حضرت شاہ صاحب کا مخصوص حصہ ہے۔" صفحہ ۴۶۵

مفتی صاحب ہی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ حضرت شاہ صاحب ہی کے دلائل کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء نے پشاور میں "سائمن کمیشن" کے بائیکاٹ کا متفقہ فیصلہ کیا تھا۔ بہرحال اگرچہ شاہ صاحب نے سیاسیات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا لیکن اس کے باوجود وہ نظریاتی طور پر جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ اور اپنے استاذ الامام شیخ الہند کی تحریک استخلاص وطن کے باضابطہ رکن تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض رجال کار کے نمایاں کارنامے منظرِ عام پر نہیں آئے لیکن کسی بھی گوشہ میں اُن لوگوں کی بصیرت، دور رسی اور مآل اندیشی پر گہری نظر انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے جنہ ۱۸۵۷ء کے فرنگی استبداد کے استحکام کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسی بدیشی اقتدار کو

؏ جنرل ایوب سابق صدر پاکستان کے اقتدار کو اہلِ پاکستان کی ابلہ فریبیوں کے نتیجہ میں ختم کرنے کے بعد وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے عہد اقتدار میں جو صوبائی وزارتیں منظرِ عام پر آئیں اُن میں "فرنٹیر" کی وزارتِ اعلیٰ کچھ عرصہ کے لئے مفتی محمود صاحب کے زیرنگیں رہی۔ اس خانقاہ نشین عالم نے چند ہی ماہ کے اقتدار میں سرحد میں مسکرات پر قطعی پابندی، پردہ کا اہتمام، رمضان المبارک کا حقیقی احترام، قمار بازی کا انسداد، قحبہ گری کی ممانعت اور اسی قبیل کے جو اسلامی احکام بشدت و بکامیابی نافذ کئے تو یہ بیچارہ غریب مولوی پس پردہ سیاسیات و سازشوں کا شکار ہو کر رہ گیا اور جس طرح ان کی وزارت کا تیا پانچہ کیا گیا وہ سازشی سیاست کا ایک بہیمانہ اقدام تھا مگر تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکے گی کہ اگر مولوی کو اقتدار نصیب ہو تو پھر وہ کس انداز پر کام کرے گا ان الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ الخ انہیں لوگوں کے بارے میں وارد ہے۔ مفتی صاحب کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل نہیں بلکہ "جامعہ قاسمیہ مراد آباد" سے فارغ اور مولانا سید فخر الدینؒ کے ارشدِ تلامذہ میں ہیں۔ یہ بات خود مفتی صاحب نے راقم الحروف کو حجاز میں بتائی تھی اگرچہ اس غلط فہمی کے شکار خود دارالعلوم سے شائع شدہ بعض تذکروں کے مصنف بھی ہوئے ہیں کہ انھوں نے مفتی صاحب کو دارالعلوم کا فاضل سمجھ لیا ہے۔

اکھاڑ پھینکا گیا اور انگریز اپنی طاقت کا پشتارہ اٹھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے رخصت ہوا۔ جس حکومت کے حدودِ اقتدار اس قدر وسیع تھے کہ بقولِ عام افراد "اس کی جہانبانی میں آفتاب نہیں ڈوبتا تھا۔" اور جس کی تدبیر و تدبر، فکر و حزم، مآل اندیشی اور عاقبت بینی کی خصوصی صلاحیتیں دنیا میں موجود تمام اقوام میں فائق ہیں۔ وہ ہندوستان سے اپنے اقتدار کے طویل و عریض سلسلہ کو سمیٹنے کے لئے کیوں مجبور رہوا۔ کیا تحریک آزادی کے تابڑ توڑ حملوں نے اسے اس کے لئے مجبور کر دیا یا آنجہانی گاندھی جی کے اہنسائی فلسفہ نے اس کو پا بزنجیر بنا ڈالا یا پھر سردار ٹپیل کی خاص کوششوں کے نتیجہ میں "بحریہ" میں بغاوت کے آثار بلکہ باغیانہ تحریک کے پھیلنے و بڑھنے کے خطرہ نے انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کی راہ سُجھائی یا پھر ۱۹۳۹ء سے شروع ہونے والی خوفناک جنگ عظیم نے برطانیہ کے اقتصادی و معاشی ڈھانچے کو اسطرح تباہ کیا کہ وہ اپنی گرفت ہندوستان پر کچھ اور عرصہ کے لئے باقی نہیں رکھ سکتا تھا ہمارے اس دور کے اصحاب فکر و اربابِ نظر فرنگی اقتدار کے اسبابِ زوال پر جب کچھ لکھتے ہیں تو اُن کی خیال آفرینیاں مذکورہ وجوہ سے آگے نہیں جاتیں۔ یہ خاکسار اس سے انکار نہیں کرتا کہ عروج کے بعد زوال کا جو واقعہ پیش آیا ہو سکتا ہے کہ اس کے اسباب وہی ہوں جنہیں آپ کے سامنے ذکر کیا ہے لیکن آپ ایک گوشہ نشین عالم کی اس حقیقت پسندی کا بھی مطالعہ کیجئے جسکی بنا پر انھوں نے ٹھیک اس وقت فرنگی زوال کی پیش گوئی کی تھی جب اس طرف اہلِ بصیرت متوجہ بھی نہیں تھے اور اپنی اس پیش گوئی کے لئے ایک ایسا استدلال تلاش کیا جس کے واقعاتی ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ شاہ صاحب درس اور عام مجالس میں عموماً فرماتے۔

> "ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیا ہے۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس غرضکہ جن چیزوں کو قدرت نے آزاد کیا تھا ان پر پابندی قدرت کا کھلا مقابلہ ہے اور قدرت سے مقابلہ کرنے والی طاقتیں بہت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہتیں۔"

یہ استدلال بہت سوں کو چونکا دینے والا ہو گا لیکن جو ربوبیتِ اعلیٰ کے مظاہر ان کے لگے بندھے انتظام اور ایک خاص در و بست پر نظر رکھتے ہیں وہ اس کو تسلیم بھی کریں گے اور اس کی ندرت کو سراہیں گے بھی۔ بہرحال اس سے تو انکار نہیں کہ حضرت ممدوح کی شخصیت

کا اصل کمال علم و فن کی جلوہ گری و جلوہ نمائی ہے تاہم سیاسی نشیب و فراز میں ایک گہری بصیرت اور حقیقت شناسی کے جوہر سے آپ پوری طرح متصف تھے اس موضوع کو یہیں ختم کرنے کے بعد اب حضرت شاہ صاحبؒ کی شاعری سے متعلق کچھ تفصیلات قلم بند کیجاتی ہیں۔

شعر گوئی:۔ عجیب بات ہے کہ اس کائناتِ رنگ و بو میں اسلام کے قدم استوار ہونے کے بعد قرآنِ کریم کے بعض بیانات کی روشنی میں شعر و شاعری سے متعلق ایک رسواکن چرچا عام ہو گیا وہ یہ کہ اسلام شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ اسمیں شک نہیں کہ قرآنِ کریم کے محکم، معجز، فصیح و بلیغ اسلوب پر دورِ اول ہی میں جو شاعری کی پھبتی کسی جا رہی تھی اور مخالف حلقہ اس سراپائے اعجاز کلام کو شعر کہہ کر اس کی حقیقی تاثیر کو مجروح کر رہا تھا ان بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ جیسے حقیقت طراز نغمے قرآن ہی کے سرچشمۂ فصاحت و بلاغت سے ابل رہے تھے اور جس وقت پیغمبرِ جلیل کو صرف ایک شاعر سمجھانے کی مذموم کوشش کی جا رہی تھی تو الشعراء یتبعھم الغاون کے صداقت آمیز نعرے سے اس پردۂ فریب کو چاک کرتے ہوئے اور شعراء کی عام زندگی کا وہ کمزور پہلو نمایاں کیا گیا جس میں اُنکی قوالیت جو فعالیت سے یکسر محروم ہے پیش کی گئی یہ سب کوششیں قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی واقعی حیثیت کو محفوظ رکھنے کے لئے تھیں ان سے یہ سمجھنا کہ اسلام سرے سے شاعری ہی کا مخالف ہے اسلام کے جمالیاتی ذوق کو نظر انداز کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے صحابہ میں کچھ وہ بھی تھے جو شعر گوئی میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے بلکہ آپؐ نے انکی شاعری کی داد دی اور وقتاً فوقتاً ان کے اس لطیف ذوق کو اسلام کی حمایت کے لئے استعمال کیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر شعر گوئی شجرِ ممنوعہ تھی جیسا کہ سمجھ لیا گیا تو پھر ان حقائق کا کیا جواب ہوگا؟ بلاشبہ اسلام میں اس شاعری کی کوئی گنجائش نہیں جس کے ڈانڈے فحش گوئی، فحاشی، جذبات میں ہیجان انگیزی اور حسن و عشق کے ناروا مراحل کی عکاسی سے جا ملتے ہیں۔ لیکن اگر واقعی جذبات و خیالات حقیقت پسندانہ مضامین کی ترجمانی شعری لب و لہجہ میں کی جائے تو اسلام اس کا مخالف نہیں۔ اہلِ علم جنکی ثقاہت و متانت، علمی رزانت، تقدس و تقویٰ، تورع اور پرہیزگاری کے پاکیزہ قصے تاریخ کی امانت ہیں ان میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شاعری میں رسوخِ تام رکھتے بلکہ اسلام کے جلیل القدر امام محمد بن ادریس الشافعیؒ نے تو اپنی شعر گوئی کو مشہور شاعر "لبید" سے بھی فائق گردانا تھا۔ بہرحال یہ ایک پائمال موضوع ہے اور اس سلسلہ کے حقائق بارہا سامنے

آ چکے اس لئے شعر گوئی پر کچھ لکھنے کے بجائے صاحبِ سوانح سے متعلق عرض کرنا ہی بہتر ہوگا۔
معلوم ہے کہ ان کا آبائی وطن کشمیر ہے جہاں کے اونچے اونچے کوہسار، شاداب مرغزار، حسین وادیاں، بہتے ہوئے دریا، گرتے ہوئے آبشار، اودے اودے بادلوں کا ہجوم، نرم و نازک نسیمِ سحر کے جھونکے، وادی میں بکھرا ہوا حسن، جمالیاتی ذوق کو اگر طبیعت موزوں ہے بے اختیار ڈھلے ڈھلائے اشعار اور حسین ترنم کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مرحوم کی موزونیٔ طبع بلکہ شعری ذوق نے انہیں بھی شاعر بنا دیا۔
راقم الحروف کے جد امجد مولانا معظم شاہ صاحب ان کے بڑے جوانمرگ صاحبزادے یٰسین شاہ صاحب دوسرے اور تیسرے صاحبزادے عبد اللہ شاہ صاحب، سلیمان شاہ صاحب زود گو شعرا میں تھے جو بیشتر فارسی میں اشعار کہتے مرحوم نے بھی ہمیشہ فارسی میں زائد اور عربی و اردو میں بھی کلام موزوں کیا ہے۔ خود فرماتے کہ عہدِ طفلی میں زود گوئی اور کثیر گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ شعر کہتے اور ان کے بڑے بھائی یٰسین شاہ قلم بند کرتے تو غریب کاتب لکھنے سے عاجز ہوتا۔ عربی میں کہنا شروع کیا تو عرب جاہلیت کے کلام کے ہموزن و ہم پایہ شاعری[ع]

ع مشہور محدث و عالمِ اسلامی کی جلیل القدر شخصیت "شیخ علی یمنی" جو واقعۃً حافظِ حدیث اور حنبلی المذہب تھے خدا جانے کس طرح ہندوستان آنکلے دلی پہونچے اور سوءِ قسمت کہ مسجد اہلِ حدیث میں نماز پڑھی، اوقاتِ صلوٰۃ پر یہیں مصلیوں سے کچھ گفتگو ہوگئی تو ان ظالموں نے شیخ کی "مزاج پرسی" کر ڈالی۔ یمنی عالم ہندوستان کی اس پہلی ضیافت سے کبیدہ خاطر ہوکر اپنے ہی وطن لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اتفاقاً دار العلوم دیوبند کے کسی عقیدتمند سے ملاقات ہوگئی جس نے دار العلوم کی زیارت کا باصرار مشورہ دیا۔ شیخ کے اس سوال پر کہ یہ مدرسہ کس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے"، حنفی مکتبۂ فکر سے وابستگی کا تذکرہ آیا تو یمنی محدث چلایا کہ جب اہلِ حدیث نے میرے ساتھ باوجود اشتراکِ خیال کے یہ معاملہ کیا تو حنفیہ کیا کچھ کریں گے۔ لیکن دلی کے تاجر نے کھینچ تان کر انھیں دیوبند روانہ کر دیا۔ دیوبند پہونچے تو یہاں کے پرتپاک خیر مقدم نے فی الجملہ مطمئن کیا۔ اس زمانہ میں دار العلوم میں یمنی طلبا بھی تحصیلِ کمال کرتے وہ شیخ کے اردگرد جمع ہوگئے۔ ایک دو روز کے بعد خلوت میں انہیں یمنی طلبار سے شیخ نے اکابر دار العلوم کے مکارمِ اخلاق، مہمان نوازی اور خوش خلقی کا وقیع تذکرہ کیا طلبہ نے موقعہ غنیمت سمجھ کر علمائے دیوبند کے علمی کمالات کا ذکر چھیڑ دیا تو محدث یمنی نے فرمایا کہ "علم و دانش سے ان غریبوں کو کیا سروکار ھم اعجام" یعنی یہ عجمی ہیں۔ سرِ شام شیخ یمنی اپنے وطنی طلبار کے ہمراہ گورستانِ قاسمی کی طرف جا رہے تھے۔ یہی وہ وقت تھا کہ خانقاہِ رائپور کے آفتابِ ولایت حضرت شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا جس پر حضرت

(باقی آگے)

یادگار چھوڑی لیکن جو کچھ کہا اُس میں گل و بلبل، ساقی و مُل، جام و مینا، حسن و عشق کی کشمکشوں کے بجائے یا ثنائے خدا ہے یا ثنائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے یا پھر علمی اہم حقائق کو شعر کی زبان میں پیش فرمایا ہے۔ مسئلۂ تقدیر و تدبیر، تکلیف اعمال، سزا و جزا، برزخ، تشکلِ اعمال ایسے ہی اہم مضامین شعر میں قلمبند کئے گئے ہیں بلکہ حدوثِ عالم پر تو ایک مستقل رسالہ ہی اشعار میں کہہ ڈالا، جسے مصر کے مشہور فلسفی عالم شیخ مصطفیٰ صبری نے دیکھ کر کہا تھا۔

"میں اس رسالہ کو صدر شیرازی کے اسفارِ اربعہ پر ترجیح دیتا ہوں اور مجھے اس کا شبہ تک بھی نہ تھا کہ کسی ہندی عالم کی نظر ان خشک فلسفیانہ مضامین پر اس قدر عمیق ہوگی۔"

دارالعلوم دیوبند جو طلبا کی ہمہ جہت صلاحیتوں کا امین و مربی ہے، یہیں "نادیتہ الادب" کے نام سے عربی شاعری سے متعلق ایک انجمن بنگرانی حضرت مولانا اعزاز علی صاحب موجود

صفحہ ۲۴۸ کا بقیہ:۔ شاہ صاحب کا عربی مرثیہ دارالعلوم کے آرگن "القاسم" میں شائع ہوا تھا حسنِ اتفاق کہ اسکا تازہ شمارہ بمبئی طالب علم کے ہاتھ میں تھا۔ برسرِ راہ یمنی عالم نے لیکر ورق گردانی کی تو وہی مرثیہ سامنے آگیا چند بند پڑھے تو یہ شعر شناس دانشور بولا کہ ان اشعار سے تو عرب جاہلیت کے اشعار کی خوشبو آتی ہے۔ بتایا گیا کہ مرثیہ گو فاضلِ جلیل ہی اس وقت دارالعلوم کی صدارتِ تدریس پر ہیں۔ یمنی دانشور نے تمنا ظاہر کی کہ مجھے بھی کل آئندہ ان کے سبق میں لے جایا جائے صبح آئی تو یمنی محدث حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ بخاری شریف میں جا پہونچے اب اسے اتفاق کہئے کہ اس روز سبق میں حافظ ابن تیمیہؒ کے بعض نظریات پر زبردست تنقید ہو رہی تھی شیخ کی رعایت سے تقریر عربی میں تھی۔ ادھر شیخ ابن تیمیہؒ کے غالی معتقد بجائے سماعت حدیث کے رد و قدح کا باب کھل گیا جس کا سلسلہ ایک ہفتہ تک دراز رہا۔ ایک ہفتہ کے بعد سنا گیا کہ شیخ علی طلبا میں اعلان کر رہے تھے کہ لو حلفت انہ اعلم بابی حنیفۃ لما حنثت۔ بعد عصر حضرت شاہ صاحبؒ نے مسجدِ دارالعلوم میں تردیدی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ان صاحب نے ہماری تعریف میں مبالغہ کیا ابوحنیفہؒ کے مدارجِ اجتہاد اسقدر اونچے ہیں کہ ہماری وہاں تک رسائی نہیں۔"

عرض یہ کرنا ہے کہ یمن کا یہی جوہر شناس جو عجمیوں کے کمالاتِ علمی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا اسی کا یہ بیان کہ شاہ صاحب کے اشعار سے عرب جاہلیت کے شاعری کی بو آتی ہے آپ کے بلند پایہ کلام، قدرتِ سخن، نزاکتِ خیال، محاکات اور جملہ اصنافِ شعر پر یکساں قدرت و دسترس کی بڑی سند ہے۔

تھی جس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ کسی مشہور عربی شاعر کا کوئی اہم مصرعہ دے دیا جاتا اور اسی پر بلکہ اسی زمین، ردیف و قافیہ میں شعر کہنے کی فرمائش ہوتی۔ نادیۃ الادب کے اجلاس ہر جمعہ کو نودرہ کی عمارت میں ہوتے جس میں طلباء کے ساتھ اساتذۂ دار العلوم کی بھی شرکت رہتی۔ حضرت شاہ صاحب بھی اس مجلس میں شرکت فرماتے اور اپنا کلام ایک خاص ترنم کے ساتھ سامعین کو سناتے۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی جو حضرت کے ارشدِ تلامذہ میں سے ہیں جب دیوبند پڑھتے تو مشہور طبیب حکیم اجمل خاں صاحب کا حادثۂ وفات پیش آیا قاضی صاحب نے اس پر مرثیہ لکھا اور حضرت شاہ صاحب کی رہائش گاہ پر پہونچکر ایسے وقت میں اصلاح کے لئے پیش کیا کہ آپ کسی کشمیری مہمان سے مصروفِ گفتگو ہونے کے ساتھ دار العلوم سے متعلق اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں اخباری نمائندوں کو بیان دے رہے تھے مرثیہ میں نہ صرف اصلاح فرمائی بلکہ بعض اشعار تک بدل ڈالے۔ یہ اصلاح شدہ مرثیہ ایک علمی یادگار کی حیثیت سے قاضی صاحب کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ نظام حیدر آباد ۱۹۲۷ء میں دہلی ورود فرما ہوئے تو اخبار "مہاجر" کے مدیر صاحب کی فرمائش پر ایک طویل قصیدہ ارتجالاً کہا جو "مہاجر" کی اشاعت ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء میں موجود ہے۔ مونگیر (بہار) میں حضرت مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جنہیں تردیدِ قادیانیت اور اس فتنۂ عمیا کی سرکوبی کا ایک بیقرار جذبہ تھا، کوششوں سے قادیانیوں سے مناظرہ کے لئے تاریخ تجویز ہوئی اس اہم اور تاریخی مناظرہ میں شرکت کے لئے اکابرِ دار العلوم کا ایک وفد روانہ ہوا جسمیں شاہ صاحبؒ نے بھی شرکت کی۔ قادیانی مبلغین نے یہ سمجھ کر کہ علماء عربی میں گفتگو سے عاجز ہوتے ہیں شرائطِ مناظرہ کے طور پر عربی میں مناظرہ کی بات شروع کی اس پر مرحوم نے اس فرقۂ ضالہ کے ذمہ داروں تک پیغام پہونچایا کہ مناظرہ نہ صرف عربی میں بلکہ عربی اشعار میں جو ارتجالاً کہے جائیں گے ہوگا۔ اس کڑی شرط پر قادیانی گروہ کے لئے بجز راہِ فرار کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ شعر گوئی کے علاوہ آپ کو ہزاروں کی تعداد میں عربی و فارسی اشعار یاد تھے۔

مولانا مناظر حسن گیلانی نے اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ حدیث میں کسی خاص لفظ کو لغوی حیثیت سے حل کرتے ہوئے بطورِ استناد حضرت شاہ صاحب شعر پڑھتے تو صرف ایک لفظ حل کرنے کے لئے کئی کئی شعر سنا دیتے۔ مرحوم نے یہ بھی تحریر کیا کہ مسلسل تقریر کے املا کرنے والوں کے لئے یہی وقت فرصت کا ہوتا جب ان کی تھکی ہوئی انگلیاں کچھ راحت

پاتیں۔آپ اشعار ایک خاص ترنم سے پڑھتے آواز میں رسیلاپن اور اثر انگیزی ہوتی۔راقم الحروف کی بچپن کی حماقتوں میں سے یہ حماقت قابل ذکر ہے کہ والدِ مرحوم کو ایک خاص نشست پر شعر گنگناتے ہوئے دیکھ کر یہ ظلوم وجہول اسکی نقل اتارتا۔بلکہ مدتوں آپ کی وفات کے بعد بھی اس جاہلانہ شغل کا سلسلہ جاری رہا۔غرضیکہ موصوف نے تقریباً پندرہ ہزار سے زائد اشعار کہے ہیں۔اگرچہ آپ کا یہ تمام کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔"ضرب الخاتم علےٰ حدوث العالم" جو اشعار میں ہے اسکے علاوہ بہت مختصر حصہ یادگار کے طور پر محفوظ رہا۔عربی اشعار گیارہ سو پچپن ہیں جن میں بارہ نظمیں، بارہ قصائد، تین نعت و مرثیے وقطعات وغیرہ ہیں۔

آپ نے شعر میں کبھی کوئی رکیک لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ کلام میں حسنِ ادا، سلاست، بے ساختگی، برجستگی، لطافت انسجام، الفاظ کی مناسب نشست وبرخاست، تراکیب کی بندش، وہ سب جوہری عناصر موجود ہیں جو اعلیٰ شاعری کی جان وروح ہیں۔سب سے پہلے عربی اشعار کے نمونے نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں۔نعت گوئی جو ایک مزلۃ الاقدام فن ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف، شعر میں پاسِ ادب، مضمون کو رکاکت سے محفوظ رکھنا، نہ اسقدر غلو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت سے نکال کر الوہیت کے مقام پر پہونچا دیا جائے اور نہ اتنا ہبوط کہ آپ کی حقیقی توصفات واوصاف کا حق بھی ادا نہ ہو۔پھر اس میں بھی شک نہیں کہ نعت گوئی اس امت کی انفرادی روایت ہے کسی امت نے اپنے پیغمبر سے متعلق شاعری کی اس خاص صنف پر طبع آزمائی نہیں کی۔مگر چودہ سو سال کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات سے مسلمانوں کی شیفتگی ووالہانہ تعلق میں الحمد للہ کوئی کمی نہیں آئی۔حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر آج تک اس امت کا دامن عربی شعراء کے علاوہ جامی، نظامی، قدسی، عرفی، نظیری، سعدی، رومی، امیر خسرو اور ہزار ہا نغز گو مداحینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز ہے۔اردو میں محسن کاکوروی کا نعتیہ کلام اردو شاعری کا بانکپن ہے اور زائرِ حرم حمید صدیقی لکھنوی نے تو خاص اس صنف میں لازوال شہرت حاصل کی۔حضرت شاہ صاحب نے بھی نعت پر کافی اشعار کہے ہیں جنمیں حدودِ شریعت کے ساتھ عشق کی سرمستی پاسِ ادب کے دوش بدوش فرطِ اشتیاق کا حسنِ منظر اپنی بہار دکھاتا ہے۔ذیل میں آپ کے کچھ نعتیہ اشعار "مشتے از خروارے" پیشِ خدمت ہیں۔

برق تالق موھنا بالوادی　　　　فاعتاد قلبی طائف الانجاد

اسفاً علے عہد الحمی وعہادہٗ — تولی علی الابراق والارعاد

راھم تناوح تارۃ دیم لہا — حتے غدا الایام کالاعیاد

ھب النسیم علے الربا فضاحکت — بشری العمید عرارھا والجادے

لعبت صباھا والشمال وتارۃ — لعب الغصون بعطفھا المیّاد

ومکارم الاخلاق مھد والھدی — اضحے علے علم رفیع طاد

وبوجھہٖ تستنزل البرکات من — فوق السماء فایدہ بایاد

وبہ النجاۃ وعصمۃ من ازمۃ — وبہ حیاۃ طیبۃ لبلاد

سبحان من صرف الامور وماانثنت — غیر علیہ علے مد الآباد

ثم الصلاۃ مع السلام علی النبی — ی والہ مع صحبہ الامجاد

ایک دوسری نعت جس میں چوبیس اشعار ہیں شیخ سعدیؒ کے ردیف وقافیہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمارِ مبارک ذکر کئے گئے ہیں چند اشعار اس مشہور نعتیہ کلام سے ملاحظہ کیجئے۔

شفیعٌ مطاعٌ نبیٌ کریمٌ — قسیمٌ جسیمٌ نسیمٌ وسیمٌ

صبیحٌ ملیحٌ مطیب النسیم — مفاض الجبین کبدر مبین

غیاث الوری مستغاث الھضیم — احیدٌ وحیدٌ مجیدٌ حمید

وخیر البرایا بفضلٍ جسیم — واسری بہ ربہ فے السماء

کنور تجلّے بلیل بھیم — وآتاہ ما شاء من علاء

وعزّ عزیزٍ حیاۃ قویم — فیا ربّ صلّی وسلم علیہ

آپ کا مشہور قصیدہ "صدع النقاب عن جساسۃ الفنجاب" ستر اشعار پر مشتمل ہے جس میں آپ نے متنبی قادیان کے فتنۂ ضلالت کو نمایاں کرکے اسکی باطل نبوت کا ابطال کیا ہے اس قصیدہ کے بھی چند اشعار سُن لیجئے۔

الایاعباد اللہ قوموا وتوموا — خطوباً ألمّت مالھن یدان

وقد کاد ینقض الھدی ومنارہ — وزحزح خیر ما الذاشدان

یسب رسول من اولی العزم فیکم   تکاد السماء والارض تنفطران
وحارب قوم ربهم ونبیهم   فقوموا النصر الله اذهودان
وقد عیل صبری فی انتهاک حدوده   فهل ثم داع او مجیب اذان
واذ عز خطب جئت مستنصرا بکم   فهل ثم غوث یالقوم یدانی
لعمری لقد نبهت من کان نائما   واسمعت من کانت له اذنان
ونادیت قوما فی فریضة ربهم   فهل من نصیر لی من اهل زمان
دعوا کل امر واستقیموا لما دهی   وقد عاد فرض القوم عند عیان

سابق میں عرض کیا جا چکا کہ نعت کے علاوہ انھوں نے بیشتر کلام مشتمل بر تفسیر آیاتِ قرآن یا مسائلِ علمیہ و شرعی حقائق کی ترجمانی میں فرمایا ہے۔ آپ کی ایک نظم جس کا عنوان "مستمر ترغیب تحصیل علم" ہے جو کہ انیس ۱۹ اشعار پر مشتمل علم کے فضائل اسکی حصول کی راہ میں مسلسل جہد اور تحصیلِ کمالات کے لئے ترغیبی مضامین کا دل نشین اسلوب ہے چند اشعار یہ ہیں۔

الا یا قوم عهدا بالدیار   دیار قد الفتم لان دیار
فلا تنسی اذا حییت بقاع   فقار منه الدیم الغزار
وابدوا عن سنا قمر منیر   بانوار علی راس المنار
فاضحی الناس فی علم ونور   وقد وضح الطریق عن التوار
فدس الدهر تدلیسا علیها   وارسل بالخفاء علی النهار

طویل ترین نظم آپ کی "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" ہے یہ کل چار سو ۴۰۰ اشعار پر مشتمل ہے جس میں حدوثِ عالم، وحدت الوجود، ثبوتِ واجب، بیانِ صفات، جعلِ بسیط، جعلِ مؤلف وغیرہ کے اہم مباحث جن پر فلاسفہ و حکماء نے موشگافیوں کا انبار لگا دیا۔ ان ہی مضامین کو اس طویل ترین نظم میں قلمبند فرمایا ہے۔ آپ کی یہی وہ نظم ہے جو کہ رسالہ کی شکل میں مجلسِ علمی ڈابھیل نے شائع کیا اور آپ نے شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال عہ کو بھیجا۔ اس کے مطالعہ

عہ ڈاکٹر محمد اقبال:- عرصہ گزرتا ہے کہ مشہور علمی شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کی وفات حسرت آیات پر علمی و ادبی حلقوں، اخبارات و رسائل نے تعزیتی اداریوں میں اسکا خصوصی ذکر کیا تھا کہ مولانا شروانی سے مولانا ابو الکلام آزاد کے خصوصی مراسم اور مودّت و یگانگت کے دبیز تعلقات تھے اور یہ کہ "غبارِ خاطر"
(باقی آگے)

سے ڈاکٹر صاحب نہ صرف محظوظ بلکہ متأثر ہوئے انھوں نے واضح اعتراف کیا کہ موجودہ علماء میں
جن اہم علمی مباحث اور حقائق پر گہری نظر فلاسفۂ یورپ کی بھی نہیں شاہ صاحبؒ کو ان پر

ص۲۵۳ کا بقیہ:۔ "کاروانِ خیال" کے مکاتیب کے مخاطب مولانا حبیب الرحمٰن ہی ہیں۔ ان عامیانہ خیالات کے اظہار میں ایک منفرد صدا مدیر "برھان" مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تھی جنھوں نے اپنے تند و تیز لب و لہجہ میں لکھنے والوں کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مولانا شروانی خود ایک علمی مقام اور جلیل حیثیت کے انسان تھے ان کے مفاخر میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہ وہ مولانا آزاد کے یارِ غار اور ان کے مکتوب الیہ ہیں۔ یہ بر وقت تنبیہ دل کو ایسی بھائی کہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کے ارتسامی نقوش دل و دماغ پر کندہ ہیں۔ ابتداء میں خیال تھا کہ علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال کے مراسم و روابط پر مفصل لکھا جائے اور غالباً اسی سوانح میں قارئین سے کہیں اسکا وعدہ بھی کیا تھا لیکن مولانا اکبر آبادی کے قلم نے جس تخم کی کاشت کی اسکے برگ و بار اس عنوان پر کچھ لکھنے سے اب آبی ہیں بلاشبہ "ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری" ہر دو اپنے دائرہ علم و عمل میں انفرادی خصوصیات کے مالک ہیں اور دونوں کا تعارف اس قدر وسیع ہے کہ نہ ڈاکٹر اقبال کو اس فخر کی تلاش کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ان کے مراسم تھے اور نہ شاہ صاحبؒ کی سوانح اپنی تکمیل میں ڈاکٹر اقبال سے خصوصی روابط کے عنوان و تفصیلات کی منتظر۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اسے مستقل عنوان بنانے کے بجائے اسی طرح ذیلی گفتگو بنا رہا ہے جیسا کہ حضرت شاہ صاحب کے دوسرے معاصرین کے سوانحی خد و خال ذیلاً قلم پر آئے۔

ڈاکٹر اقبال ہندوستان کے ان خوش نصیب چیدہ و چنیدہ اشخاص میں ہیں جنکے فکر و فن پر لٹریچر کا انبار ہے اور "اقبالیات" کے موضوع پر اس قدر لکھا جا چکا کہ اب اگر کچھ لکھا جاتا ہے تو اسمیں ندرت مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ آپ کے حالات و سوانح، زندگی اور اسکے نشیب و فراز، شاعری اور شعر گوئی، سیاسی فکر و نظر، علم دوستی و علم پژدھی، سیاحت و سفر، علالت و وفات غرضیکہ کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہیں اسلئے بہتر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے انکے تعلقات کی مختصر تاریخ ہی زیرِ قلم ہو۔

مولانا محمد انوری لائلپوری کی روایت ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاہ صاحبؒ سے سب سے پہلی ملاقات "امرتسر" میں ہوئی: اس وقت شاہ صاحبؒ کسی کشمیری تاجر کے یہاں مقیم تھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ڈاکٹر صاحب امرتسر میں مقیم تھے یا لاہور سے ملاقات کی غرض سے امرتسر کا سفر کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے ان کے ہمراہ کچھ ممتاز دانشور اور مشہور ارباب سیاست بھی تھے، آنے کو تو آگئے لیکن کلین شیو ہونے کی بنا پر محجوب تشریف فرما ہوئے ان کے طویل سکوت کو شاہ صاحبؒ ہی نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے ختم کیا۔

"ڈاکٹر صاحب میں اور آپ دونوں فکرِ شکم کے مریض ہیں مجھے چند

(باقی آگے)

کامل اور فاضلانہ واقفیت ہے۔ مولانا اکبرآبادی کا بیان ہے کہ اقبال اس رسالہ کے بعض مباحث ومقامات کو سمجھ نہ سکے اور انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ ہی سے تشریح وتسہیل کے لئے

لقے ڈاڑھی کے بغیر میسّر نہیں آتے اور آپ کا معاملہ اسکے برعکس ہے۔ اسلئے محجوب نہ ہوئیے، میں جن چند شعراء کے اشعار اور ان کا کلام پسند کرتا ہوں ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔"

اس پر ڈاکٹر اقبال نے اپنا کچھ تازہ کلام سنایا۔ لیکن ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی روایت کے بموجب شاہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے تعلق کا آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ئہ سے ہے لاہور کے "بریڈلا" ہال میں جمعیۃ العلماء کی دعوت پر کوئی عظیم سیاسی کانفرنس تھی جسمیں ہندوستان کے چند علماء شرکت کر رہے تھے اسی جلسہ میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ

"میں نے مولانا انورشاہؒ اور ڈاکٹر اقبال کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا پھر یہ تعلق برابر بڑھتا اور مستحکم ہوتا رہا جسکا اختتام حضرت شاہ صاحب رح کی وفات ہی پر ہوا۔"

سر اقبال جویائے علم، علم دوست، اور متجسس فطرت کے مالک تھے۔ لاہور ادیبوں، انشاپرداز ارباب سیاست اور دانائے روزگار اشخاص کا ہمیشہ سے مخزن رہا لیکن اقبال جس طرح کے اہل علم اور وسیع النظر دانشور کی تلاش میں تھے اس زمانہ کا لاہور ایسی ہستیوں سے خالی تھا چنانچہ انھوں نے ایک مکتوب میں مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کو اس قحط الرجال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں، یہاں انجمن، کالج اور فکر منصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر ان میں اسلامی سیرت کی متاع نہیں دکھتی۔"

اس یاس انگیز صورت حال نے ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھا کہ لاہور میں کسی ایسے بالغ النظر وعبقری انسان کا قیام کرایا جائے جو اسلامی فقہ کی اس جدید تشکیل میں صحیح معاون ہو جسکا خاکہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن وفکر میں تھا۔ اس اہم اور جلیل منصب کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت موزوں ترتھی چنانچہ ۱۹۲۳ئہ میں ڈاکٹر صاحب لاہور میں شاہ صاحبؒ کے مستقل قیام کی تجویز کی تحت دپژ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ

"ایک مرتبہ علامہ سید انورشاہ صاحبؒ لاہور تشریف لائے اور تکیہ

(باقی آگے)

ؔ؎ یہ روایت اگر صحیح ہے تو اسے ڈاکٹر صاحب کی دلجوئی پر ہی محمول کیا جائیگا ورنہ ظاہر ہے کہ ڈاڑھی کی حیثیت صرف اتنی نہیں جو گفتگو میں آئی بلکہ وہ ایک شرعی مطالبہ ہے اور اسکے شرعی مطلوب ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

رجوع کیا۔ راقم الحروف کو بعض تلامذہ نے بتایا ہے کہ تسہیل کے لئے طویل ترین فارسی مکتوب جو کئی کئی صفحات پر مشتمل تھے ڈاکٹر صاحب کو لکھے بلکہ علامہ نے دوران درس طلباء کو اپنے یہ جوابی خطوط سنائے اور اقبال کے علمی ذوق وشغف وطالب علمانہ دلچسپیوں کو سراہا۔

ساڈھوال اندرون موچی دروازہ میں پیر عبدالغفار شاہ کے یہاں مقیم ہوئے تو ڈاکٹر اقبال نے بعض انجمنوں سے طے کر لیا کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ لاہور میں قیام کے لئے آمادہ ہو جائیں تو انہیں بادشاہی مسجد کا خطیب اور اسلامیہ کالج میں شعبۂ اسلامیات کا سربراہ بنایا جائے۔ مختلف انجمنیں اس تجویز کے لئے رضامند بھی ہو گئیں"۔

لیکن ڈاکٹر اقبال کی یہ تجویز وتحریک شاہ صاحبؒ کے لئے قابل قبول نہ تھی تاہم عالم اسلام کی دونوں شخصیتوں کے درمیان یہ مخلصانہ روابط برابر بڑھتے رہے اور ڈاکٹر صاحب حضرت شاہ صاحب کے فن وکمال، علمی جلال کے قدر شناس اور بڑے معترف ہوئے وہ وقت بھی آیا کہ کشمیر کمیٹی جو مہاراجہ کشمیر کے ایماء پر بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کی قیادت میں تشکیل کی گئی اور جسکا ڈاکٹر اقبال کو بھی ایک رکن بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تک قادیانیت، نبوت باطلہ اور اس فرقہ کے جعل وفریب پر قریبی واقفیت نہیں رکھتے تھے حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کو "متنبی قادیان" کے پر فریب اقدام، نبوت کے غلط دعوے اور اس کے کھوکھلے پن پر تفصیل سے مطلع کیا جسکے بعد ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا بلکہ متنبی قادیان کے نظریات وافکار پر بھرپور تنقید کی اور بعض اہم علمی مقالات اس سلسلے کے انکے علم ریز قلم نے تیار کئے اور بلاشبہ انکی نگارشات جدید حلقہ کو قادیانیت کی سمیت سے واقف کرنے میں کارآمد ثابت ہوئیں۔ مقدمۂ بھاولپور میں شرکت کے بعد واپسی پر شاہ صاحب کا چند روز کے لئے لاہور میں قیام ہوا تو آسٹریلیا مسجد میں آپکے مسلسل مواعظ کا اہتمام کیا گیا ان مجالس میں ڈاکٹر صاحب بھی باقاعدہ شرکت کرتے، دنیائے اسلام کی ان دونوں شخصیتوں میں پھر اس مخلصانہ یگانگت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار انجمن خدام الدین کے جلسہ میں شرکت کے لئے شاہ صاحبؒ پہونچے اور آپ کے ہمراہ دیوبند کے بعض اکابر علماء بھی تھے تو ڈاکٹر اقبال نے اپنی قیام گاہ پر ضیافت کا اہتمام کرتے ہوئے یہ دعوتی مکتوب حضرت شاہ صاحبؒ کو روانہ کیا۔

۷۸۶

۱۳ر مارچ ۱۹۲۵ء

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ مولانا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے ماسٹر عبد اللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف

(باقی آگے)

افسوس کہ یہ اہم ترین علمی یادگار یعنی خط وکتابت جو ڈاکٹر اقبال سے ہوئی ہم پسماندگان کے پاس موجود نہیں ممکن ہے کہ اقبال کے لائق فرزند جاوید اقبال صاحب سے اس کا کچھ سراغ

صـــ کا بقیہ :۔ لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے، میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا کہ اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے یہاں کھانا کھائیں، حضرت کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی، حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضہ کو شرفِ قبولیت بخشیںگے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیجدی جائیگی۔

اس مکتوب سے واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قلب میں شاہ صاحبؒ کی کیا قدر و منزلت تھی اور وہ خود کو شاہ صاحب کے علم وفضل سے ایک مستفید کی حیثیت دیتے چنانچہ "مسئلہ مکان وزمان" جو ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع تھا اس پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ڈاکٹر صاحب نے بھرپور استفادہ کیا جسکی تفصیلات خود ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی قلمبند کی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے "عراقی" کا اس موضوع پر معرکۃ الآراء رسالہ ڈاکٹر صاحب کو بہم پہونچایا تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ "نیوٹن" نے جو کچھ "زمان ومکان پر لکھا ہے وہ "عراقی" کے اسی رسالہ سے ماخوذ ہے خود ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۸ء میں" اورنٹیل کالج" کے شعبہ عربی وفارسی کے صدارتی خطبہ میں جو "حکماء اسلام کے عمیق تر مطالعہ" کے نام سے دیا گیا تھا لکھتے ہیں کہ :۔

> "یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو "عراقی" کی تصنیف غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث "لاتسبوا الدھر لان الدھر ھو اللہ" میں "دھر" بمعنی "Time" کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق "مولانا انور شاہ صاحب" سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثینِ وقت میں سے ہیں میری خط وکتابت ہوئی اس مراسلت کے دوران مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطہ کی طرف رجوع کیا اور بعد ازاں میری درخواست پر ازراہِ عنایت مجھے اسکی ایک نقل ارسال کی۔"

اسی جلسہ میں علاوہ مشہور دانشوروں کے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی بھی شرکت کر رہے تھے مندوبین کو ڈاکٹر اقبال نے یہ بتا کر حیرت واستعجاب میں ڈال دیا کہ شاہ صاحبؒ نے مجھکو بتایا کہ "نیوٹن" نے "زمان ومکان" پر جو کچھ لکھا ہے وہ اسکی اپنی تحقیق نہیں بلکہ علامہ عراقی کے اسی رسالہ کا سرقہ ہے۔ علامہ اقبال نے اس انکشاف کو یورپ کے اخبارات میں بھی شائع کرایا۔ غالباً کسی جگہ اسی تصنیف کے صفحات پر راقم الحروف نے یہ بھی بتایا تھا کہ چند سال پہلے سندھ کے کسی سجادہ نشین بزرگ کے نام ڈاکٹر اقبال کے خطوط شائع ہوئے ہیں جسمیں ڈاکٹر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ "زمان ومکان"

(باقی آگے)

ں سکے کاش کہ پاکستان میں موجود دانشور طبقہ اس علمی یادگار کو بہم پہونچانے میں اپنی بہترین کوششیں صرف کر کے علمی حلقوں کی جانب سے دلی شکر گذاری کا مستحق ہو۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم کے چند وہ اشعار جو حدوثِ عالم پر ہیں نمونے کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔

وماضی قدیمیات من غیر حاضر	ومستقبل بالطبع لم یقف انتھی
فمن استحالت للوری ازلیہ	وبعد حدوث فالدوام قد انبقی
ووضع حدیث مع قدیم کماتری	بمعناہ یقضی ان ھنا موطن خلا

موصوف نے مرثیہ گوئی پر بھی طبع آزمائی کی اور اپنے اکابر اساتذہ میں سے اکثر کے سانحۂ ارتحال پر اپنے قلبی صدمہ کا اظہار مرثیہ کی زبان میں کیا ہے۔ آپ کے استاذِ اکبر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب المتوفی ۱۳۳۹ھ کا انتقال ہوا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے استادِ اکبر کے اس سانحہ کو خاص طور پر محسوس فرمایا[1] اور سینتالیس اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ ایسا قلمبند فرمایا جس میں قلب وجگر کی قاشیں، مصرعہ کی شکل میں رکھ دی گئی ہیں مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں:۔

قفا نبک من ذکری ھزار فند معا	مصیفا ومشتے ثم مرآی ومسمعًا
قد احتفہ الالطاف عطفا وعطفۃً	وبورک فیہ مربعًا ثم مربعًا

صفحہ ۲۵۷ کا بقیہ:۔ کے مسئلے پر میں نے شاہ صاحبؒ سے استفادہ کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے وہ مشہور چھ خطبات جو انگریزی زبان میں دیئے گئے تھے ان میں "ختم نبوت" قتل مرتد اور مسئلہ زمان ومکان کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے علامہ کشمیریؒ سے خاص استفادہ کیا۔ بہرحال علامہ کشمیریؒ کا یہ کارنامہ ان کی حیات کا زریں باب ہے کہ ڈاکٹر اقبال ایسی جاندار، توانا اور مضبوط شخصیت کو قادیانیت کے خلاف محاذ پر لانے کی تمام تر سعی وکاوش حضرت شاہ صاحب نے کی اور یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس طول وعرض کے انسان تھے انکو متأثر کرنے کے لئے علامہ کشمیری ہی کی عبقریت وعلمی غزارت کارآمد ہوسکتی تھی خود ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت سے اپنے تأثر کو "وادی لولاب" نامی نظم میں ظاہر کیا ہے۔ کشمیر کے سیاسی مفکر وبصر مولانا محمد سعید مسعودی نے ایک ملاقات میں مجھ سے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا موصوف سے فرمایا کہ "میری یہ طویل نظم حضرت شاہ صاحب ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ غرضیکہ سوانح کی تکمیل کے لئے وقت کے دو مشہور عالم، فاضل اور دانشوروں کے گہرے مراسم کی یہ ایک مختصر تفصیل ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں ان تعلقات کی استوار بنیادوں کی تنقیح کچھ اور تفصیلات کا ذریعہ ہو۔

[1] افسانوی واقعات اور دیومالائی داستانوں میں فرہاد کا شیریں کی موت کی اطلاع سُن کر اپنے سر پر جنون ...

(باقی آگے)

وقدکان دھرًا ثم دھرًا طریقتی — طریقۃ غر ثم اولی فاوقعا
یجاوبنی دار وجار علے البکے — ولم أر الا باکیا ثم موضعا
وان کان ما الیس یشفے ویشتفی — بشئ ولکن خل عینیك تدمعا
نھضت لارثی عالما ثم عالما — حدیثا وفقھا ثم ماشئت اجمعا
ولما حسبت العام عند قضائہ — وجدت وکان اللہ قدر مسمعا
سقے اللہ مثواہ کرامۃ ربہ — وکان غدا الی شافعا ومشفعا

۱۳۳۹ھ

صفحہ ۲۵۵ کا بقیہ :- تیشہ زنی ایک دلچسپ داستان ہے۔ حسن و عشق کے قصوں میں ایسے واقعات کی کمی نہیں کہ محبوب کے صدمہ جانکاہ نے عاشق کی زیست کی عمارت اپنی بنیادوں پر گرا ڈالی۔ مشہور زلیغ پسند وامام ضلالت ابوالفضل جو اکبر کے الحاد و گمراہی کا واحد ذمہ دار ہے جہانگیر کی کوششوں سے جب اسکا جسد سر بریدہ اکبر کے دربار میں پیش کیا گیا تو لکھا ہے کہ اکبر دہاڑیں دیتا اور یہ شعر ورد زبان تھا

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ
زاشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

اور یہ بھی موجود ہے کہ بار بار فرطِ حسرت سے کہتا کہ "جہانگیر کو جان ہی لینا تھی تو میری جان لیتا شیخ (ابوالفضل) کو اپنے غیظ و غضب کا شکار کیوں کیا"۔

ان داستانوں پر شک وارتیاب کے کانٹے خلش بن کر دل و دماغ میں چبھے لیکن چند سال پہلے "تامل ناڈ" کے محبوب لیڈر اور وزیر اعلیٰ "اناڈرائی" کی موت پر اس کے پرستاروں میں سے اخباری اطلاعات کے مطابق کئی نے اپنی جان دے دی بلکہ یہ بھی خبر آئی تھی کہ ریل گاڑی پوری رفتار سے لائن پر دوڑ رہی تھی اسکے دیو ہیکل انجن میں موجود ڈرائیور نے جب اپنے اس محبوب رہنما "انا" کی موت کی خبر سنی تو ایک جست انجن سے زمین پر لگائی اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی "اناڈرائی" کے غم میں اس نئے نرالے ماتم نے ان تمام داستانوں کو قابلِ قبول بنا لیا جو جانباز عشاق سے متعلق زیبِ عنوان تھیں مگر یہ بھی سننے کہ اسی ہمارے اور آپ کے ہندوستان میں ایک فاضلِ جلیل استاذ نے اپنے ہونہار اور فخرِ روزگار شاگرد کے غم میں جان دے دی۔ ہندوستان کے تذکرے اسی نادر واقعہ سے آج بھی مزین ہیں۔ آج جب کہ استاذ اور شاگرد کے مابین مشفقانہ و مخلصانہ تعلقات نہ صرف مضمحل بلکہ شکست و ریخت ہو چکے ہیں تو ان وثائق کو باور کرنا بھی مشکل ہو گیا جن میں ان مقدس و پاکیزہ رشتہ کے حسین تذکرے ہیں۔ صاحبِ سوانح حضرت شاہ صاحبؒ کا علم و متانت وقار و تحمل شہرۂ آفاق حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنی مرحومہ والدہ سے مسلسل سنا کہ جب دیوبند حضرت شیخ الہندؒ کی شدید علالت کی اطلاع پہونچی تو آپ عاجلاً دیوبند سے دہلی عیادت کے لئے روانہ ہوئے دیوبند سے روانہ ہونے کے ساتھ ہی دوسری خبر حضرتؒ کے سانحۂ وفات کی آگئی۔ شاہ صاحبؒ غازی آباد اسٹیشن پر پہونچے تو استاذِ اکبر کا جسدِ خاکی تابوت کے ذریعہ دیوبند

(باقی آگے)

کلامِ فارسی:- مرحوم کا وطنِ مالوف کشمیر ہے اور باوجودیکہ کشمیر کی مستقل زبان ہے لیکن اس زبان میں پنجابی کی آمیزش کے ساتھ فارسی کا امتزاج بھی کچھ کم نہیں اسلئے آپ کا خصوصی ذوق فارسی میں کہنے کا تھا بلکہ نجی مراسلات میں بھی بیشتر فارسی ہی کو استعمال فرماتے۔ فارسی اشعار کی تعداد تیرہ سو چھبیس ۱۳۲۶ ہے جسمیں پانچ ۵ نظمیں، تین ۳ نعتیں، ایک قصیدہ، تین ۳ قطعات کے علاوہ کچھ خصوصی مواقع پر کہی ہوئی تاریخ بھی موجود ہے۔ فارسی کی لطافت وشیرینی، نفاست وحلاوت، شوکت وحشمت جو اس زبان کا مخصوص حصہ ہے وہ مرحوم کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے مگر فارسی میں بھی جو کچھ فرمایا اس میں بھی علمی ذخیرہ کو قلمبند کیا گیا ہے۔ "النور الفائض علے نظم الفرائض" بانوے ۹۲ اشعار پر مشتمل علمِ میراث میں ایک مستند وفاضلانہ رسالہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث اور آپ کے تلمیذِ رشید مولانا سید فخرالدین علیہ الرحمہ نے آپ سے سراجی سبقاً سبقاً پڑھی اسی زمانہ میں آپ نے یہ اشعار قلمبند فرمائے مسودہ کی ایک نقل مولانا فخرالدین کو بھی عنایت فرمائی۔ مولانا مرحوم علمی حلقوں کے واقعی محسن ہیں کہ آپ نے اپنے استاذ کی وفات کے بعد اس رسالہ کو اپنی زیرِ نگرانی کتب خانہ فخریہ مراد آباد سے شائع فرماکر ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا۔ اس رسالہ کے کچھ اشعار بطور نمونہ سن لیجئے۔

بحمدِ خدا و نعتِ رسول — بشنو از انور ظلوم و جہول
مال نہ بود چوں مستحق العین — بعدِ تجہیز و دفن و دادن دین
ہم پس از عزل ثلث موصی بہ — ذی فروض و مقدرہ رادہ
عصبہ بعد ازاں بردہمہ مال — بعد ازاں رد بر فروض سگال
بعد ازیں دو فریق اے منعام — وارث مال داں ذوی الارحام

اسی رسالہ میں موانعِ ارث کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

صفحہ ۲۵۹ کا بقیہ:- لایا جا رہا تھا حضرت کی تدفین کے بعد جب شاہ صاحب گھر تشریف لائے تو ازدحام کی کثرت کی بنا پر پاؤں کا جوتا اور سر کی ٹوپی دونوں غائب تھے اور گھر میں بیٹھکر اپنے مرحوم استاذ کی وفات پر زار و قطار اس طرح گریہ کناں ہوئے کہ دیکھنے والوں کو بھی رحم آتا۔ مرحومہ نے یہ بھی بتایا کہ ایک عرصہ تک حضرت شاہ صاحب پر ربودگی کی کیفیت رہی اور یہ تو استاذ کا معاملہ تھا آپ نے تو اپنے معاصر بزرگ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے بھی سانحۂ ارتحال کو بشدت محسوس فرمایا اور بے ساختہ زبان پر یہ تاثر آیا کہ "اس حادثہ نے کمر ہی توڑ دی۔"

مانعِ ارث آمدہ اند ایں چہار | رِقؔ و قتلؔ اختلافؔ دین و دارؔ
لیک قتلے کہ بالسبب باشد | مانعِ ارث کس نمی باشد

اہلِ علم جانتے ہیں کہ حسن وعشق سے متعلق معاملات اوران کی آزاد ترجمانی میں شاعر کا فکر و ذہن آزاد رہ کر نازک خیالی کے حسین منظر وشاداب مناظر بخوبی پیش کرسکتا ہے لیکن کسی ایک موضوع اور گئے بندھے مضمون کو شاعری میں پیش کرنا شاعر کی اعلیٰ قدرت اور فنی دسترس کی حقیقی علامت ہے۔ ردیف و قافیہ، ترکیب و ترتیب، حسنِ ادا اور برجستگی کو باقی رکھتے ہوئے موضوع سے جدا نہ ہونا اور بھرت سے کام نہ لینا کوئی فن پر قابو یاب ہی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ اس رسالہ میں شاعری کی نزاکتوں کو باقی رکھتے ہوئے طبع آزمائی کے جو جوہر دکھائے ہیں اسکی حقیقی قدر فن شناس ہی کر سکتے ہیں۔

نعت گوئی جسکے نمونے بزبانِ عربی گزر چکے آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے والہانہ تعلق ایمان کی معراج ہے یہ سعادت بھرپور آپ کے حصہ میں آئی تھی۔ فارسی ہو یا عربی اسمیں آپ کی نعتیں پُر جوش ہونے کے ساتھ خروشِ عشق کی مظہر ہیں چنانچہ ایک طویل نعت جو اٹھتر ۷۸ اشعار پر مشتمل ہے اور جسمیں مستدرک حاکم کی ایک حدیث کو مسلسل پیش کیا گیا ہے نذرِ قارئین ہے۔ ارشاد ہے۔

اے آں کہ ہمہ رحمتِ مہداۃ قدیری | باراں صفت و بحر سمت ابر مطیری
معراجِ تو کرسی شدہ سبع سماوات | فرش قدمت عرش بریں سدرہ سریری
بر فرقِ جہاں پایۂ پائے تو شدہ ثبت | ہم صدر کبیری و ہمہ بدر منیری
ختم رسل و نجم سبل صبح ہدایت | حقا کہ نذیری تو والحق کہ بشیری
آدم بصفِ محشر و ذریت آدم | در ظلِ لوایت کہ امامی و امیری
یکتا کہ بود مرکزِ ہر دائرہ یکتا | تا مرکزِ عالم توئی بے مثل و نظیری
ادراک بختم است و کمال ست بخاتم | عبرت بخواتیم کہ در دورِ خبیری
امی لقب و ماہِ عرب مرکزِ ایماں | ہر علم و عمل را تو مداری و مدیری
عالم ہمہ یک شخص کبیر ست کہ اجمال | تفصیل نمودند دریں دیر سدیری
ترتیب کہ ربطے است چو وا کردہ نمودند | در عرصۂ و اسرار تو خطیبی و سفیری
حق ہست و حقے ہست چو ممتاز ز باطل | آں دین نبی ہست اگر پاک ضمیری

آیاتِ رسل بودہ ہمہ بہتر و برتر — آیاتِ تو قرآن ہمہ دانی ہمہ گیری
آں عقدۂ تقدیر کہ از کسب نشد حل — حرفِ تو کشودہ کہ خبیری و بصیری
کانرا کہ جزا خواندۂ آں عینِ عمل ست — بگذر ز خفاف و نگر آنچہ پذیری
اے ختمِ رسل امتِ تو خیرِ امم بود — چوں ثمرہ کہ آید ہمہ در فضل نضیری
کس نیست ازیں امتِ تو آنکہ چو انور — با روئے سیہ آمدہ و موئے زریری

ایک دوسری نعت مربع اڑتیس ۳۸ اشعار پر پھیلی ہوئی ہے جس میں دو دو شعر کے قطعات ہیں۔ یہ نعت اپنی روانی، برجستگی، تیزی و تندی اور سلاست کے اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ چند قطعات نمونہ کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔

دوش چوں از بے نوائی ہم نوائے دل شدم — عہدِ ماضی یاد کردہ سوئے مستقبل شدم
از سفر واماندہ آخر طالبِ منزل شدم — کز تکاپو سو بسو شامِ غریباں در رسید

قبلۂ ارض و سما محرابِ نورِ کبریا — سیّد و صدرِ علیٰ شمس الضحےٰ بدر الدجیٰ
شافعِ روزِ جزا وانگہ خطیبِ انبیاءؑ — صاحبِ حوض و لواظلِ خدا رازِ عقید

مولدش ام القریٰ ملکش بشام آمد قریب، — خاکِ راہِ طیبہ از آثارِ وے بہتر ز طیب
شرق و غرب از نشرِ دیں مستطابش مستطیب — امتش خیر الامم بر امتاں بودہ شہید

قصائد:۔ مبدأ فیاض شاعر کو ایک نرم و نازک و حساس قلب سے سرفراز فرماتا ہے وہ اپنے ماحول و گرد و پیش سے عام انسانوں سے کچھ زیادہ ہی متأثر ہوتا ہے اور پھر اس کا تأثر شعری لب و لہجہ میں ڈھل کر دوسروں کے لئے اثر انگیز و اثر آفریں ہوتا ہے۔ محبوب کی بے التفاتی، رقیبوں کی عداوت، پھولوں کا حسن، نسیمِ سحر کی نزاکت، کہساروں کی رفعت، پانی کی اچھل کود یہ اور سب چیزیں شاعر پر ایک اثر چھوڑتی ہیں اسی طرح وہ کسی کی موت کی شدت کو بھی محسوس کرتا ہے یہی اثر مرثیہ بن جائے گا۔ اُسے جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے والہانہ تعلق نعت کی طرف متوجہ کرے گا۔ خدائے تعالیٰ کی صناعی اور اس کے انعامات کی بارش حمد کی روپ دھارے گی۔ کسی شخص کے کارنامے دامنِ دل اس کا کھینچیں گے تو

وہی قصیدہ بن جائے گا غرضکہ غزل ہو یا نظم، مسدس ہو کہ رباعی، قطعات ہو یا مخمس ہر ایک کا پسِ منظر شاعر کو اپنے تاثرات وانفعالات کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ کسی کی جود وسخا اسے قصیدہ پر مجبور کرے گی یا ملک وملت کے لئے تابناک کارنامے قصائد کی زبان بن جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحب ہوں یا علمائے ربانی ان کے قصیدے کرم طرازیوں یا امراء کی عنایتوں کا مظہر نہیں ہوں گے یہ کام تو قاآنی وخاقانی کا ہے انھوں نے جو کچھ قصیدوں میں کہا وہ ان رجالِ کار کی تعریف جن کے عزم اور حوصلے سے دین کی عمارت نے استحکام اور ملت نے فروغ حاصل کیا ہے۔ امیرِ کابل جن کی ابتدائی زندگی کابل کے جمود وتعطل کو توڑ کر کابل کے عوام میں ایک حیاتِ تازہ کا پیغام بن رہی تھی اور جن کے عزم کی صرصر فقدانِ عمل کے خس وخاشاک کو حدودِ کابل سے نکال رہی تھی اسی کی داستان جب ہندوستان پہونچی تو اس پر درجِ ذیل قصیدہ صاحب سوانح کا بہترین قصیدہ تھا۔ ارشاد ہے۔

حامیٔ ملت امیر بن الامیر بن الامیر — والی اقلیم دل آں شاہ کیواں پائیگاہ

جبذا وادار گیتی شہر یار دیں پناہ — غازیٔ اسلام امیر المؤمنین ظل الٰہ

کوکبِ اوج ایالت ثانیٔ صاحب قراں — بندہ درگاہِ ایں بیت سعادت مہر وماہ

اس بلند پایہ مدح سرائی کے بعد دین خیر خواہیٔ مسلمین کا نام ہے آپ نے امیرِ کابل کو اسکے ملوکی فرائض پر متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

بادشاہا حفظِ ملت بہتر است از ہر چہ ہست — خدمت قوم ووطن ان ترا از تخت وکلاہ

عالمِ اسلام را ایں سیروی مسعود باد — سیرت وے مہر ملت باد دائم شاہ را

سلطنتِ آصفیہ کے تاجدار میر عثمان علی خاں جن کی سلطنت وفرماں روائی اب تاریخ پارینہ کا ایک گلدستۂ طاقِ نسیاں ہے اپنے عہد عروج میں ملت کی آماج گاہ، اہلِ علم کا مرکز آرزو، شہرستانِ علم وفن اور مرجع اہلِ سخن تھی، جہاں کی قدر شناسیوں اور اہلِ کمال کی قدر دانی کی شہرتوں نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے باکمال لوگوں کو دکن کی دور دراز حدود میں لا ڈالا تھا۔ جسکی شہرت سلطنتِ مغلیہ کے زوال ہی کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ بہادر شاہ کے استاذ ذوق دہلوی نے بھی بطور اعتراف کہا تھا۔

آجکل دکن میں ہے گو بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اور اردو شاعری کے آخری میر و امیر فانی بدایونی کا شعر ہے۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہے آج ہندوستاں میں رہتے ہیں ہم ہندوستاں سے دور

پہونچنے والوں میں اہلِ علم بھی تھے اور قادر الکلام شعرا بھی، حاذق پیشہ طبیب بھی تھے اور بلاغت التیام انشار پرداز بھی، ادھر نظام حیدر آباد کی شاہانہ فیاضیاں دکن میں پہونچنے والے حلقۂ علم و فن کی قدر افزائی میں مصروف تھیں اور ریاست کا حسن وجمال وہاں کی جاذبیت وکشش دامنِ دل کو بڑھکر تھامتی، مگر شہرستانِ حسن وجمال و معمورۂ فن و کمال انحطاط و زوال کی گرفت میں آیا تو بقولِ نظیر اکبر آبادی

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نہ سلطنت رہی نہ بادشاہ کج کلاہ نہ امارت و ریاست رہی اور نہ کوئی حامیِ دین پناہ، موجودہ حیدر آباد دیکھنے والے یہی کہتے ہوئے لوٹتے ہیں۔

جائے کہ بود آں دلستاں در بوستاں با دوستاں
شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن

نظام حیدر آباد ایک بار دہلی نزول فرما ہوئے اس تقریب سے دیوبند سے شائع ہونے والے جریدہ "مہاجر" نے ۳۰ اگست ۱۹۲۸ء کو سلطان العلوم نمبر شائع کیا جسمیں حضرت شاہ صاحب کا یہ طویل قصیدہ بعنوانِ "در قدوم میمنت لزوم" شائع ہوا۔

مرحبا بر سرِ ما ظلِ خدا آمدۂ حبذا آبِ بقا ابرِ سخا آمدۂ
وصفِ تو ظلِ الٰہی و نظامِ اسلام سایہ ات باد ہمیشہ کہ ہما آمدۂ
میر عثمان علی خاں شہِ دیں پرور ما مردے از غیب بکارے تو فرا آمدۂ
سر بسر سبز ز گلگشتِ تو شد روئے زمیں آرے از بہر جہاں فیضِ صبا آمدۂ
مہرِ فرجام و مہِ تام و شہِ آصف جاہ صبحِ امید دمید است شہا آمدۂ

مزید ارشاد ہے۔

خلد اللہ ظلال الملک الشہم مدے اے کہ ز انفاس بقا روح فزا آمدۂ
برگ و سامان جہانے بتو وابستہ شدہ است باش دائم کہ پے جملہ بقا آمدۂ

مسجد و خانقہ و مدرسہ از تو آباد
باز گویم کہ بلی ظلِ خدا آمدۂ

مصطفیٰ کمال پاشا جدید ترکیہ کے بانی اپنی ابتدا میں ایک طوفان بنکر اُٹھے اور انکی عزائم کی ضرب مغربی طاقتوں و استعمار کیلئے بھونچال ثابت ہوا۔ خلافت کے خاتمہ پر ترکی سلطنت یورپ کے استعمار پسندوں کے خیال میں ایک "مرد بیمار" تھا اور خلافت کے استحکام کو شکست و ریخیت کرنے کے بعد اس سلطنت کو قاشوں کی طرح تقسیم کی تجاویز کی جارہی تھیں۔ سلطان عبدالحمید کے خلاف وہ ناپاک سازش کی گئی جسکا تار و پود متعفن دماغ ہی تیار کرسکتا تھا۔ مصطفیٰ کمال اُٹھے تو عالم اسلام بیم ورجا کی کیفیت میں ڈوب کر سلطنت ترکیہ پر نظریں لگائے ہوئے تھا اگر کوئی خوشخبری ملتی تو مسلمان بے پناہ مسرور ہوتے اور اگر کوئی دلآزار اطلاع آتی تو عالم اسلام کی سکراتی کیفیات میں اضافہ ہوتا۔

مصطفیٰ کمال کے عزائم نے استعمار پسند قوتوں کو شکستِ فاش دی اور "مرد بیمار" بستر مرگ سے جیتا جاگتا کھڑا ہوگیا لیکن افسوس کہ کمال پاشا کے تجدد اور اس مشہور اتاترک کی قلابازیوں نے یورپ کی نقالی ہی کو سب سے بڑا کامیابی کا راز سمجھا اور جدید ترکیہ کے احیاء میں ترکی اقدار کو اس قوت سے اپنایا گیا کہ عربی کو دیس نکالا ملا عربی اذان موقوف کی گئی پردہ ختم کردیا گیا اور خدا جانے کن کن خرافات کو اپنا کر خدائے تعالیٰ کے اس عطیہ اور موہبتِ عظمیٰ کی حرمت ختم کردی گئی۔ اتاترک کے بعد "عصمت انونو" ان کے جانشین اسی ڈگر پر چلتے رہے بظاہر سلطنت کھڑی رہی لیکن اسلام سے بُعد کی بنا پر بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ مضیٰ مامضیٰ۔

اب یہ خبریں سننے میں آتی ہیں کہ "انقرہ" گورنمنٹ نے کروٹ لی اتاترک کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور اسلام کی جانب دھیرے دھیرے قدم بڑھنا شروع ہوئے "گیا" میں جو بہار کا مشہور شہر ہے۔ بصدارت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند دسمبر ۱۹۲۲ء میں جمعیتہ العلماء کا سالانہ اجلاس ہورہا تھا جسمیں اکابر دارالعلوم بھی شریک تھے یہ وہ وقت تھا کہ مصطفیٰ کمال کی مسلسل کامیابیوں کی اطلاع بلکہ ان کی آخری فتح کی خبر اخبارات سے ہندوستان پہونچی۔ دورانِ سفر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی فرمائش پر صاحب سوانح نے یہ طویل قصیدہ مصطفیٰ کمال، ان کی بلند حوصلگی اور قائدانہ کارناموں پر کہا۔ مطبع قاسمی دیوبند سے خطبۂ صدارت کی اشاعت ہوئی تو اس کے ساتھ یہ قصیدہ بھی شائع کیا گیا جس پر مولانا محمد طاہر صاحب دیوبندی مرحوم کا نوٹ ہے۔ ہم اس قصیدہ کی ابتدا میں اس

سے حافظ محمد احمد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی دارالعلوم

(باقی آگے)

تعارفی نوٹ کو بھی نقل کرتے ہیں۔

"یہ قصیدہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے گیا کے سفر میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی فرمائش پر گاڑی میں بے ساختہ اور قلم برداشتہ تحریر فرمادیا جسے جمعیۃ العلماء کے اجلاس چہارم بمقام گیا عام جلسے میں حضرت شاہ صاحب ممدوح نے پڑھا اور اہلِ علم نے نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا حضرت شاہ صاحب نے اس قصیدہ میں بے ساختگی اور سلاست کی داد دی ہے فصاحت وبلاغت کا منظر دکھایا ہے۔ خطبۂ صدارت شائع ہورہا ہے تو بندے نے مناسب سمجھا کہ اس گوہرِ گرانمایہ کو بھی طبع کردیا جائے کہ حضرات اہلِ علم محظوظ ہوں۔"

قصیدے کا عنوان الشعار فی فتح اللہ المتعال علی مجدد الخلافۃ الغازی

ص۲۶۵ کا بقیہ:- دیوبند کے فاضل، حضرت علامہ کشمیری کے تلمیذ تھے دارالعلوم میں معین المدرس، نیابت اہتمام، نظامتِ کتب خانہ اور آخر میں دارالصنائع کے منتظمِ اعلیٰ رہے۔ ذکی وذہین، انشار پرداز منجمسم، سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر، استعداد کے مضبوط، شوخ وچنچل طبیعت کے مالک تھے۔ جود وسخا، مہمان نوازی وسیر چشمی میں فائق، قلب اسقدر صاف کہ ابھی آگ اور ابھی پانی، کینہ وحقد، بغض وعناد سے قلب صاف تھا۔ ان کی وفات کے بعد راقم الحروف نے خواب میں دیکھا کہ کہتے ہیں "میری نجات ہوگئی اور قلب کی صفائی اور سینۂ بے کینہ میرے کام آیا" تدریس پر بیٹھے تو قدوری کے درس میں ھدایہ اولین کے مصنف پر اعتراضات کی بھرمار کرڈالی۔ اہتمام میں پہونچے تو اپنے استاذ مولانا اعزاز علی صاحب علیہ الرحمہ کی درخواست رخصت نامنظور کرکے طلبہ میں ناراضگی کا ہنگامہ کھڑا کردیا۔ لیگ سے قریب اور کانگریس کے جانی دشمن تھے جوڑ توڑ میں پوری مہارت رکھتے لیکن تلون مزاجی نے ترقی کے قدم روک دئے۔ قرآن سے بڑا شغف تھا خاص انداز پر تفسیر لکھ رہے تھے عقائد میں عقائد قاسمی ان کا مطبوعہ رسالہ موجود ہے اور کئی تصانیف ان کے قلم سے نکلیں پچاس سال کی بھی عمر نہ ہونے پائی تھی کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا موت کے وقت اس قدر ہوشیار رہے کہ موجود اقرباء کو سانس کہاں کہاں ہے یا جان کس حصہ کی نکل چکی اور کہاں باقی ہے کی مفصل اطلاع دیتے رہے۔ ریڈیو پاکستان کے مشہور قاری محمد ظاہر صاحب، مولوی آصف صاحب، شاکر میاں، فاخر میاں بلکہ کئی بچے پسماندگان میں ہیں۔ مشہور تلامذہ میں انور صابری اور مولانا سلطان الحق ناظم کتب خانہ موجود ہیں۔

اللھم برد مضجعہ واکرم مثواہ۔

المجاهد مصطفےٰ کمال پاشا دام عزہ پر قصیدہ یہ ہے۔

الملك للہ الرفیع الشان	ذی الطول والتصریف فی الازمان
کم من بعید قربتہ ھباتہ	ومنی رجونا مالھن تدان
غیر الزمان وانہا عبر متی	دارت علی الیقظان والوسنان
فبقدرہ خیر وشر لازب	وبامرہ یتقلب الملوان
وقضاءہ فی ارضہ وسمائہ	خفضا ورفعا کفۃ المیزان
نفع وضر یبتغیہ مؤمل	وھما لمن قدحی یبتغیان
کل لہ والیہ یرجع کلہ	غیض وفیض نال الثقلان
ولربما خال امرء عسرا لہ	وبعسرہ ھذا لہ یسران
فالکون تحت قضائہ ورضائہ	ولہ الغنی فی کل شأن شان
ولہ البقاء وما عداہ فھالك	سبحانہ الباقی وکل فان
ولربما اخفی لقوم ھلکھم	حتی عتوا فی الشر والطغیان

ولربما ابدی لقوم نعمتہ
ایمان والاسلام والاحسان

تاریخ گوئی: شناسائے فن اور اصنافِ شاعری سے واقف کار بخوبی جانتے ہیں کہ تاریخ گوئی ایک مشکل ترین صنعت ہے اگر تاریخ کی فکر کیجئے تو سلاست کو کھوئیے سلاست اور روانی کو تھامئے تو فکرِ تاریخ ناکارہ بن جاتا ہے پھر مکمل اشعار واقعہ سے یک گونہ مناسبت رکھتے ہوں، ابتدار انتہار میں ربط ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آمد ہو آورد کا نام ونشان نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ باکمال شعراء بھی اس صنعت پر جوہرِ طبع نہ دکھا سکے خال خال ہی وہ شاعر ہیں جن کی تاریخ گوئی میں مشاقی تسلیم رہی۔ حضرت شاہ صاحب کو مبدأ فیاض نے اس صنعت کی نزاکتوں سے بھی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ آپ نے بہت سے مواقع پر تاریخ کہی ہے جس وقت آپ کے خصوصی شاگرد "مولانا محمد میاں سملکی" کے الطاف وعنایات سے محلہ خانقاہ دیوبند میں رہائشی مکان تیار ہوا تو یہ تیرہ سو پینتالیس ۱۳۴۵ھ ہجری تھی۔ اس موقعہ پر آپ نے حسب ذیل تاریخ تعمیرِ مکان ارشاد فرمائی۔

حبذا بیتِ شرف صحنِ قضا دارِ رجا — حسبِ سعی مولوی حاجی محمد شد بنا
ہمتِ مردانِ حق کار آید و بار آورد — ہر کہ آید ہست از آں سو بہر دبانگِ درا
طالبِ مرضاتِ حق را نامِ کس درکار نیست — از محمد انورش خوانند در شاہ و گدا
باید اورا و مرا از این و آں یک مدعا — ختم من بر خیر اورا از خدا نعم الجزا

سالِ تعمیر از سروش ہوش اندر گوش ہوش
"فتح باب" طالبِ خیر آمد و آمد مدعا

مدرسہ امینیہ واقع دہلی جس کا ذکر پہلے گذرا یاد ہوگا کہ اسکی تاسیس میں حضرت شاہ صاحب معمارِ اول کی حیثیت سے شریک ہیں اس مدرسہ کے قیام کی تاریخ آپ نے سینتیس اشعار میں کہی چند شعر درجِ ذیل ہیں۔

چوں بسوئے مفیض کرد نظر — بہر تاریخ سال او انور
دستگیر نمود فیض سروش — مظہر العلیم آمدم در گوش
۱۳۱۶ھ

اس مدرسہ کا قیام ۱۳۱۲ھ میں ابتدائی صورت میں ہو چکا تھا لیکن مدرسہ کی حقیقی شکل و صورت اور درسگاہی نظم و انضباط ۱۳۱۶ھ ہی سے ہوا۔ اسی سال کے تقسیم انعامات کے جلسہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے خود یہ اشعار پڑھ کر سنائے۔ مدرسہ مذکور کی تاریخ سے متعلق ایک دوسرا قطعہ یہ ہے۔

ہاتف غیب از مکارم و انس — بہر تاریخ او زعالم قدس
گفت کہ ایں مدرسہ بحق طلبی — باد بہر فیوض علم نبی

مدرسہ امینیہ دہلی کے سر پرست منشی الف خاں کا سانحۂ وفات پیش آیا تو آپ نے چودہ اشعار پر مشتمل تاریخِ وفات تحریر فرمائی بطورِ نمونہ دو شعر پیشِ خدمت ہیں۔

خان خاناں چو الف خاں صاحب — راہِ جنت گرفت و دنیا ماند
در دعائش سروش غیب بگوش — رضی اللہ امرہ بر خواند
۱۳۲۲ھ

اُردو شاعری:- آپ کی تحریر و تقریر بلکہ نجی خط و کتابت کی زبان بھی عربی یا فارسی تھی اردو میں برائے نام گفتگو فرماتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کی تنگ دامنی کی ہمیشہ شکایت کرتے بلکہ طلبار کو اردو لٹریچر کے مطالعہ سے مجتنب رہنے کی تاکید کی جاتی۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی تفسیر بیان القرآن کو دیکھنے کے بعد اردو سے متعلق ان تاثرات میں تبدیلی ہوئی پھر تو اپنے ایک شاگرد کو جنھوں نے عربی میں مقالہ لکھ کر برائے اصلاح پیشِ خدمت کیا تو کسی اصلاح کے بغیر یہ کہکر واپس فرما دیا۔

"مولوی صاحب اگر ہندوستان میں دین کی خدمت کا جذبہ ہے تو اردو میں لکھئے۔"

تاہم کبھی کبھی اردو میں کچھ اشعار موضوع فرمائے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ نذرِ قارئین ہیں۔ ارشاد ہے۔

شاہ جاں باز اگر ہمارا ہے — کیا ہے غم جب کہ وہ سہارا ہے
خار میرا ہے گل اگر وہ ہے — اسکے بن لعل مثل خارا ہے
میرے نہیں وہ تو کچھ نہیں میرا — وہ اگر ہے تو میرا سارا ہے
وصف تیرا زباں کی زینت ہے — بزم کو اس نے کیا سنوارا ہے
دونوں جگ میں ہے وہ بآسانی — جس کے اوپر تیری مدارا ہے
اپنے در سے نہ کھیدا انورؔ کو — حلقۂ درگوش جب تمہارا ہے

فوقؔ کشمیری نے حسبِ ذیل ناتمام اشعار بھی اپنی تاریخ "اقوام کشمیر" میں حضرت شاہ صاحب سے منسوب کئے ہیں۔

سفر کی منزل ہے دارِ دنیا — ذرا تو اس کا خیال سا کر
صدا نہیں ہے یہ دیس تیرا — ضرور جانا ہے دن نبھا کر

مزید یہ۔

کبھی تامل سے داہنے بائیں اور آگے پیچھے کو دیکھ لینا
کدھر کو جاتے ہیں دوست پیارے کہاں وہ رہتے ہیں یاں سے جاکر
وہ چل بسی ساری باری باری یہ باقی دنیا بھی چل بسے گی
تو چشمِ عبرت سے دیکھ غافل کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھب
کسی کا آنا کسی کا جانا کبھی ہنسا کر کبھی رلا کر
کبھی نکل کر تو جنگلوں میں خدا کی قدرت کا دیکھ جلوہ

کہیں ہے اونچا کہیں ہے نیچا کہیں اندھیرا ہے جگمگا کر
کسی کا اقبال زور پر ہے کسی پہ ادبار چھارہا ہے
کوئی ہے آتا کما کما کر کوئی ہے جاتا لُٹا لُٹا کر
کوئی ہے دُکھیا کوئی ہے سکھیا کوئی ہے خندہ کوئی ہے گریاں
یہ غم گھٹا گھٹا کر وہ خوش ہے خوشیاں منا منا کر
غرض یہاں ہیں سب آتے جاتے دن اپنے نبھاتے جاتے
نہیں ہے رہنا یہاں کسی کو کہ کوچ اک دن ہے مٹ مٹا کر
اگر ہوں اعمال اپنے اچھے بری نہیں تب یہ زندگانی
فرشتے اعمال نیک والے نکال لیں گے بچا بچا کر
نماز پڑھنا، قیام کرنا، رکوع کرنا، سجود کرنا،
کبھی کھڑے ہو کے گاہ جھک کر زمیں پہ ماتھا ٹکا ٹکا کر

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا تھا حضرت شاہ صاحب فطری شاعر تھے لیکن علم و دانش کے تقاضوں کے تحت انھوں نے اپنے اس ملکہ کا رخ علمی مسائل، حقائق و معارف، عبرت انگیز مضامین، حمد و ثنا، نعت و منقبت اور بعض خاص واقعات و اشخاص کے مؤثر کارناموں کی ترجمانی کی طرف کر دیا تھا اور اپنی شاعری کو رکیک مضامین، فحش واقعات، غیر ثقہ تعبیرات تہذیب و متانت سے محروم اسلوب سے محفوظ رکھا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کی یہ صنف نہ اسلام میں ممنوع ہے اور نہ مذموم۔ اس عنوان کے تحت مرحوم کا تمام کلام پیش کرنا مقصود نہ تھا سوانح کی تکمیل کے لئے اس صنف کے کچھ نمونے پیشِ نظر تھے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کے تمام کلام کو یکجا شائع کیا جائے لیکن نہ مرحوم ہی نے اپنے اشعار کا کوئی مجموعہ مرتب کیا اور نہ متعلقین کو کبھی اس طرف توجہ ہوئی۔ اب اس غیر مرتب ذخیرہ کو بہم پہونچانا اور پھر اسے یکجا کرنا ظاہر ہے کہ بہت دشوار ہے۔ خدائے تعالےٰ نے اگر توفیق عنایت فرمائی تو اس سوانحی خاکہ کی ترتیب کے بعد آپ کی تصانیف کے اردو تراجم اور کلام کی ترتیب پیشِ نظر ہے۔ ہند و پاکستان میں پھیلے ہوئے تلامذہ و معتقدین سے باادب درخواست ہے کہ صاحبِ سوانح کا کلام جن کے پاس موجود ہو وہ خاکسار کے پاس روانہ فرما کر اجرِ جزیل کے مستحق ہوں۔

اعترافِ کمال:۔ مرحوم کے ایک مشہور و نمایاں شاگرد سابق رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند مفتی محمود صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ نے ایک بار خاکسار سے حیرت و استعجاب سے کہا تھا کہ عجیب بات ہے شاہ صاحب دار العلوم سے پہلے دہلی میں کچھ وقت تدریس کا گذار چکے تھے دہلی اور دیوبند کے مابین فاصلہ ہی کتنا ہے اور پھر طلبا، ایک درس گاہ کے دوسری درس گاہ سے ملتے ہی رہتے ہیں ان کی ملاقاتوں میں کوئی اہم عنوانات، عصری مسائل، حوادث روزگار اور ان کے علل و اسباب پر بحثیں بھی نہیں ہوتیں۔ مرغوب خاطر ان کے موضوع اور اس کے دوائر اپنی درس گاہ کی خصوصیات اور اپنے اساتذہ کے ممیزات ہی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب کے غیر معمولی تبحر، بے نظیر قوت حافظہ اور علمی تفوق کا تذکرہ کبھی سننے میں نہیں آیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اچانک دیوبند میں ان کا ورود، ذمہ داران مدرسہ کی جانب سے تدریس پر ان کی ماموری اور پھر ایک استاذ وقت کے یہاں کی زیر درس کتابیں ایک نووارد کے یہاں منتقل کئے جانے پر طلبہ کے لئے تشویش انگیز تھا^ع^ حالانکہ مولانا حسین احمد صاحب حجاز سے واردِ ہندوستان ہوئے اور پھرتے پھراتے دیوبند نکل آئے تو انہیں بھی کچھ کتابیں اہتمام سے درس کے لئے دی گئیں طلبہ میں نہ کوئی تشویش تھی نہ جذبات میں کوئی برہمی۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا مدنیؒ سے پہلے ان کی شہرت اور حضرت شیخ الہندؒ سے وابستگی ان سے بھی پہلے ہندوستان پہنچ چکی تھی لیکن پھر کیا ہوا چند ہی روز میں اس نووارد کے تفوق کے چرچے دار العلوم دیوبند ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں اس طرح پھیل گئے کہ نہ کوئی اخبار اس مہم میں شریک تھا اور نہ تشہیر کا کوئی باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا۔

ع اس تشویش انگیز ماحول کی روایت راقم الحروف کو مرحوم مفتی صاحب اور مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ دونوں سے اس طرح پہونچی کہ ہدایہ آخرین استاذ الاساتذہ مولانا غلام رسول ہزاروی کے یہاں ہو رہا تھا اوّل تو یہ قدیم الایام استاذ پھر ان کی علمی دسترس مسلّم مستزاد یہ کہ سال کا معتدبہ حصہ گذر چکا تھا جس کے نتیجہ میں معلم و متعلمین میں مناسبت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ اچانک ایک صبح اہتمام کی جانب سے اعلان آویزاں ہوا جس میں اسی ہدایہ آخرین کو شاہ صاحب کے یہاں منتقل کرنے کی اطلاع تھی۔ یہ شاہ صاحب طلبہ کے لئے غیر متعارف اور نہ ان کی خصوصیات و امتیازات طلباء میں شائع و ذائع، قدرتی طور پر طلباء میں اضطراب پیدا ہوا اور احتجاج و فدقا ذان کے ایک مستعد

(باقی آگے)

مفتی محمود صاحب کا حیرت انگیز تاثر اس حقیقت سے نقاب کشائی کرتا ہے کہ شاہ صاحب کے فضل و کمال اور ان کی جامعیت و تبحر کو روزِ اول ہی سے ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر قبول کیا گیا تجربہ بتاتا ہے کہ اس گئے گذرے دور میں طلباء کو اپنے اساتذہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق رہتا ہے خصوصاً دینی درس گاہ کے طلباء کا دلچسپ موضوع دوسری درس گاہوں کے طلبہ کے مقابل اپنے اساتذہ کا وقیع تذکرہ اور ان کے امتیازاتِ علمی کو بیان کرنا ہے لیکن مرحوم کے فضل و کمال کے معتقد صرف آپ کے تلامذہ ہی نہیں بلکہ غیر تک ہیں۔ متنبی مشہور شاعر نے اپنے حکیمانہ کلام میں ایک موقع پر اس شہادت کو وقیع شہادت قرار دیا ہے جو مخالفین کی زبانوں پر آئی ہو۔ اس خاکسار کی رائے یہ ہے کہ اس مشہور مصرعہ میں اعتدال پسند مخالفین کا اضافہ کیا جائے اور مشہور یہ ہے کہ "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

صہ۲۷۱ کا بقیہ:۔ طالب علم کی قیادت میں اہتمام پہونچا اور بقوت یہ مطالبہ رکھا کہ ہدایہ آخرین اس نئے اور نو وارد مدرس کے یہاں منتقل نہ کی جائے لیکن اہتمام اس زمانہ میں اپنے احکام کے نفاذ اور ان کو قبول کرانے کی غیر معمولی قوت سے مسلح تھا وفد ناکام لوٹا اور محاذ بدل دیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ ان نو وارد مدرس کو درس گاہ میں جمنے نہ دیا جائے طلبہ نے بھرپور تیاریاں کیں اور ہدایہ آخرین کی متداول شروح ہی نہیں بلکہ فقہ کی مستند کتابوں کا بھی مطالعہ کر لیا گیا۔ حضرت شاہ صاحب درس گاہ میں تشریف لائے پہلا تاثر تو شکل و صورت، وجاہت و وقار نے ذہنوں پر ڈالا پھر مسندِ تدریس پر تمکین و تمکنت کے اطوار طلبہ کے لئے حیرت انگیز رہے عبارت شروع ہوئی ابھی تقریر کا آغاز ہی تھا کہ قاذانی طالب علم نے تعاقب کی جد و جہد شروع کر دی ایک مترنم آواز میں ارشاد ہوا کہ "پہلے سبق سنئے پھر بھی اگر کوئی اشکال رہے تو دل کھول کر دریافت کیجئے۔" عبارت کا حل شارحین کی تحقیقات، فقہاء کے اختلافات ہر مکتبۂ فکر کا استدلال، احناف کی جانب سے جوابات کے بعد مسئلہ کا پس منظر و پیش منظر اور ان اصول کی تعیین جن پر وہ مسئلہ متفرع تھا اور سب سے آخر میں لہجۂ بلند جس سے پوری درس گاہ گونج گئی اگر کسی صاحب کو اشکال ہے تو بیان کیجئے لیکن، درس گاہ میں ایک کامل سکون تھا شاہ صاحب روانہ ہو گئے اور اگلی صبح دار العلوم کی دیوار پر اسی جنگ جو قاذانی طالب علم کی جانب سے نو وارد مدرس کی مدح و منقبت میں ۲۶ اشعار کا قصیدہ بزبانِ عربی آویزاں تھا۔ عہ داستان گو حلقہ سے یہ روایت چلی جس نے ان واعظین کے یہاں بھی بار پالیا جو عوام کے ذوق کو اپنے وعظ کا رہنما بنا کر رطب و یابس کو بیان کرنے کے عادی ہیں کہ پچھلے زمانے کے بادشاہوں میں سے کسی نے اپنے حجام کی فنی چابک دستیوں پر مسرور ہو کر اسے پورے حجام برادری کا سردار بنا ڈالا۔ حجام بیچارہ اس اعزاز پر پھولا نہ سمایا۔ بھاگتا دوڑتا گھر پہونچا اور بیوی کو اپنی زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشخبری سنا ڈالی لیکن یہ رفیقۂ حیات بھی عجیب و غریب

(باقی آگے)

جوہر شناس حلقہ کی داد اور ان کا اعتراف کسی کے فضل و کمال کو تسلیم کرنے کی سب سے بڑی سند ہے۔ صوفیا ر نے بھی عوامی رجوع کو چنداں حیثیت نہیں دی ہے بلکہ کسی شخص کی جانب خواص اور انسانوں کے لب لباب حلقہ کے التفات کو مرجعیت کی سب سے بڑی علامت بتایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے یہ سب سے بڑا فخر ہے کہ ان کے اساتذہ بھی ان کی وسعتِ علمی اور تبحر کے قائل تھے مسلسل سننے میں آیا ہے کہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کسی حدیث کی نئی توجیہ بیان کرتے یا زبانِ مبارک پر کوئی علمی دقیقہ آتا تو عموماً ارشاد ہوتا کہ

"خیال میں تو یہ بات آرہی ہے البتہ یہ شاہ صاحب ہی بتائیں گے کہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے یہ بات کہی ہے یا نہیں"

فخرِ روزگار شاگرد اپنی شاگردانہ سعادتوں کے ساتھ عرض کرتا کہ

"حضرت یہی بات فلاں عالم نے لکھی ہے"

کیا عرض کیا جائے ہمارے اس دور میں جب اپنے دور از کار خیالات کو سب سے بڑی علمی تحقیق و کاوش کی حیثیت میں پیش کرنے سے چوکا نہیں جاتا اپنے وقت کا یہ امام یعنی حضرت شیخ الہند خود اپنے علمی انکشافات کو کسی اہلِ علم کی تائید کے بغیر پیش کرنا گناہ ہی سمجھتا رہا۔ بات تو بہر حال یہ چل رہی تھی کہ شاہ صاحب کے کمالات علمی و عملی کو ممتاز دانشور حلقے نے کھلے دل سے قبول کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اہلِ علم کے قلم سے لکھے ہوئے وہ الفاظ خاص طور پر کار آمد ہیں جو ان کے محتاط اساتذہ نے استعمال فرمائے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے قلمِ مبارک سے جو خصوصی سندِ حدیث عنایت فرمائی تھی اس میں تحریر فرمایا۔

"ان اللہ قد جمع لہ العلم والعمل والسیرۃ والصورۃ والورع والزھد والرأی الصائب والذھن الثاقب"

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب علیہ الرحمہ نے جو آپ کے دوسرے استاذ تھے

صہ کا بقیہ:- روایت کی مالکہ تھی صنف نازک کی روایتی "اونھ" کے ساتھ بولی کہ "بیچارہ بادشاہ اس فن کے دقائق اور واقعی خوبیوں کو کیا جانے اگر یہی اعزاز تمہیں اپنی برادری کی طرف سے ملے جو اس فن کی حقیقی شناسا ہے واقعی مسرتوں کا جبھی موقعہ ہوگا"۔ "دروغ برگردنِ راوی" لیکن سمجھدار عورت کا بیان کردہ اصول حقیقت آمیز ہے اس اصول کے پیشِ نظر شاہ صاحب کے قائل صرف عوام نہیں بلکہ اخص الخواص ہیں۔

چند سال گذرتے ہیں کہ ایک مطبوعہ تصنیف میں بدقسمتی سے جس کا نام اس بے بضاعت کو محفوظ نہیں رہا دیکھا کہ بعض مسائل میں مستفتی کو کوئی جواب دینے کے بجائے شاہ صاحب سے رجوع کا مشورہ دیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی محقق عالم کی جانب سے جب کہ وہ استاذ بھی ہو اپنے شاگرد کے تفوق پر یہ سب سے بڑا اعتماد ہے۔ اور آپ کا سفرِ حجاز جس کا پہلے ذکر آچکا اس سفر میں شیخ حسین طرابلسی صاحب رسالہ حمیدیہ وحصون الحمیدیۃ نے اپنی اسانید کی اجازت دیتے ہوئے جو وثیقہ اپنے قلم سے لکھ کر عنایت فرمایا تھا اسمیں آپ کے نام کیساتھ تحریر تھا۔

"الفاضل الشیخ محمد انور شاہ ابن مولانا معظم شاہ الکشمیری"۔

بات رہی جاتی ہے جس ذاتِ گرامی کا تذکرہ مقدم ہونا چاہیئے تھا سہوِ قلم وہی مؤخر ہوگیا کہ سید الطائفۃ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ سے صاحبِ سوانح نے بزمانۂ قیام گنگوہ صحاح ستہ بالاستیعاب پڑھیں اور فراغت پر جو وثیقہ بلند بالا القاب کے ساتھ حاصل کیا وہ انشاء اللہ عنقریب بعنوانِ "اسنادِ شیخ" سامنے آتا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح دیوبند کے ان اکابر میں ہیں جو سن و سال میں حضرت شاہ صاحبؒ سے بڑے خانقاہ تھانہ بھون کے امیرِ کارواں، زبان و بیان میں محتاطؔ اطرایِ مادح اور مبالغہ آرائی سے محفوظ۔ اس کے باوجود انھوں نے صاحبِ سوانح کے کمالات کا جسطرح اعتراف کیا وہ ان کی منصفانہ طبیعت اور مجتہدانہ بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اپنے بزرگوں سے خوب سنا ہے کہ مرشد تھانویؒ اکثر فرماتے کہ

"جو شاہ صاحب کی اقتدار میں نماز پڑھ لے گا مجھے رحمتِ حق سے
اس کے نجات کی توقع ہے۔"

اور یہی وجہ ہے کہ اگر صاحبِ سوانح تھانہ بھون تشریف لے جاتے تو مرشد تھانوی رح اپنی جگہ انہیں کو امام بناتے۔ یہ دلچسپ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے کہ مرحوم شاہ صاحب "المغضوب والضالین" کی صحیح ادائیگی کا اہتمام اس طرح فرماتے کہ سامعین کو محسوس ہوتا کہ ادائیگی صحیح نہیں ہو رہی ہے۔ جناب قاری عبد الوحید صاحب جو الہ آبادی مکتبۂ قرارت کے ممتاز رکن تھے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کو قرارت کی تعلیم دینے کے لئے منتخب کئے

گئے تھے دیوبند پہونچے اور بالآخر یہیں دارالعلوم میں شیخ القراء کے ممتاز عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔ نہ صرف یہ کہ قاری[ع] صاحب، صاحبِ سوانح کی غزارتِ علمیہ کے معتقد بلکہ ان کی روزانہ کی مجلس کے حاضر باش تھے اغلباً حضرت تھانوی علیہ الرحمہ سے بیعت کا تعلق تھا۔ ایک مکتوب میں قاری صاحب نے مرشد تھانوی سے دریافت کیا کہ حضرت شاہ صاحب محسوس ایسا ہوتا ہے کہ ضاد کی صحیح ادائیگی نہیں فرماتے کیا میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ جوابِ باصواب یہ تھا کہ

"اگر حضرت مولانا انورشاہ کی امامت میں بھی کوئی تردد ہے تو پھر کس کی امامت میں نماز ادا کیجئے گا؟"

اور حضرت والا ہی کی مجلس میں جب ایک روز مستشرقین میں سے کسی کا ایک حاضر مجلس نے یہ مقولہ سنایا کہ "اسلام کی حقانیت کی علامت امام غزالی کا وجود ہے۔" تو حکیم الامت نے بروایت علامہ عثمانی مرحوم و سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرمایا کہ

میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کے دلائل میں سے موجودہ وقت میں مولانا انورشاہ کا مسلمان ہونا ہے یہ اتنے بڑے عالم ہیں کہ اگر اسلام میں کہیں اور کسی جگہ بھی کجی ہوتی تو اسلام کو چھوڑ دیتے اور جب یہ اسلام پر ہیں تو یقیناً یہ اسلام کی صداقت کی ایک دلیل ہے۔"

اللہ اکبر اپنے وقت کے ایک ممتاز و مرشدِ حق آگاہ کی زبانِ مبارک سے شاہ صاحب کے کمالاتِ علمی و عملی پر اتنی مضبوط شہادت شاہ صاحب ایسے ہی عبقری اور اسعد انسان کو میسر آسکتی ہے تھانہ بھون کی ان ہی عارفانہ مجلسوں میں اس معرفت آگاہ درویش نے برسبیلِ تذکرہ ایک روز یہ بھی فرمایا کہ

[ع] بچپن کی بات ہے راقم الحروف سن و سال میں دس سے متجاوز نہ ہوگا کہ قاری صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا کشیدہ قامت دراز کرتا جو ٹخنوں تک آتا، گندمی رنگ، گھنی ڈاڑھی، سر پہ چہار گوشہ ٹوپی دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں ایک درس گاہ کا اندرونی حصہ ان کی قیام گاہ اور اسی کا بیرونی حصہ ان کی تعلیم گاہ تھی۔ اپنے فنِ قراءت میں جس مہارت کے حصہ دار تھے اس کا ثبوت تو اسی سے ملتا ہے کہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کی اپنے لختِ جگر کی تعلیمِ قراءت کے لئے قاری صاحب پر ہی

(باقی آگے)

"مولانا انور شاہ عالم با عمل ہیں۔"

اس پر کسی نے یہ سمجھ کر کہ شاہ صاحب کی غزارتِ علمی کی یہ بھرپور تعریف نہیں عرض کیا کہ

"حضرت وہ تو بہت بڑے عالم ہیں۔"

جواباً ارشاد فرمایا کہ

"بھائی میری بات سمجھو علم تو ان کا مسلّم ہی ہے میں کہہ رہا ہوں وہ عالمِ با عمل ہیں۔"

وسیع علم اور غیر معمولی تبحّر کے ساتھ حسنِ عمل کے پیوند اور اعلیٰ کردار کے امتزاج پر ظاہر ہے کہ التھانوی علیہ الرحمہ کی شہادت سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے پھر یہ بھی سنئے کہ بیان القرآن یعنی قرآن حکیم کی تفسیر جسے مولانا تھانویؒ کے علم ریز قلم نے تیار کیا جب اس کا مطبوعہ نسخہ دیوبند پہونچا اور شاہ صاحبؒ نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا تو طلباء سے درس بخاری میں ارشاد فرمایا کہ

"میں نے اپنے ذوقِ علمی کو محفوظ رکھنے کے لئے اردو سے مطالعہ میں ہمیشہ پرہیز کیا تا آنکہ اپنی نجی مراسلت کی زبان بھی عربی اور فارسی ہی رکھی اور ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ اردو کا دامن علم و تحقیق سے خالی ہے لیکن مولانا تھانویؒ کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی اور اب سمجھتا ہوں کہ اردو بھی بلند پایہ علمی تحقیقات سے بہرہ ور ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ "بیان القرآن" جیسی چست تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی۔"

درس کی یہ روایت کسی نے حضرت تھانویؒ تک پہونچادی اسے سننے کے بعد ممدوح کا یہ تأثر تھا کہ

"حضرت شاہ صاحبؒ ایسے بڑے عالم کی تعریف و توثیق کے بعد میں "بیان القرآن" کے لئے کسی اور توصیف کا منتظر نہیں ہوں۔"

صـــ۲۷۵ کا بقیہ:۔ نظرِ انتخاب پڑی اور آج تک دار العلوم میں قاری صاحب کا فیضِ علمی ان کی تیسؔ سال سے زائد وفات کے باوجود بقوۃ جاری ہے۔ دیوبند میں ذُور ہانشی مکان کی تعمیر کی اور بوقتِ موت دونوں دار العلوم کے لئے وقف کر دیئے حالانکہ صاحبِ اہل وعیال تھے۔ نہایت نازک مزاج اور نفاست پسند تھے دیوبند ہی کے مرقدِ قاسمی میں فنِ قرارت کا یہ امام ابدی نیند سوتا ہے۔

بخدمت جناب فیض مآب مولانا اشرف علی صاحب ادام اللہ علوہ

عبارت فتح القدیر این است وان قتله عمدا بعد القضاء ثم وجد الشهود عبیدا الی ان قال لانه لما ظهرت الشهود عبیدا تبین ان القضاء لم یصح ولم یصر مباح الدم والی ان قال فصار کمن قتل انسانا علی ظن انه حربی وعلیه علامة منهم ثم ظهر انه مسلم فعلیه الدیة فی ماله لانه عمد والعاقلة لا تعقل العمد وتجب فی ثلاث سنین الی آخره قال صبیر فعلیه الدیة فی ماله راجع بسوئ قاتل مقضی علیه بالرجم است نه بسوئ قاتل مسلم بظن حربی بهتر آن بود که وعلیه علامة گفتندے چنانکه در عبارت ہدایہ ازینجا وعبارت عامهٔ کتب واقع شده معہذا نه چنان است که صورتے ندارد ولہذا بسوئ وتجب فی ثلاث سنین تعرض کرده که مسئله تمام شود ورنه در مجرد تنظیر حاجت بدین تتمیم نبود عبارت تبیین الحقائق وغیره اظہر است ودر تبیین فرق صورتین ہم ذکر کرده

قتل مسلم بظن حربی نزد حنفیه خطأ فی القصد است ودر تقسیم اقسام قتل چون آنرا داخل خطأ فی القصد داشته اند ہمین تسمیه که مبنای احکام است زیاده یاد داشتنی است تا در احکام از وجوب دیة بر عاقله یا در مال قاتل تہافت واختلاف نبود سبب تعدد الخطأ در شیئ ذی شعبتین وزنے ندارد ونیز عمدیکه بشبہه قصاص از ان ساقط شود ازین قبل کلیهٔ آن ذکر کرده اند وآنچه در ہدایه وکنز قبیل فصل جنین است مجموع استقراء جزئی جزئی است سیاق عبارت روشان اند بدین کافی در ترجیح نیست فی الجمله تشتت عبارت در شیئ ذی شعبتین وزنے ندارد ودر احکام ہرچه جزئی جزئی نوشته اند قابل اعتبار است

محمد انور عفا اللہ عنہ

[illegible]

کیا عرض کیا جائے راقم الحروف الحمد للہ اپنے اکابر میں سے ہر ایک کے ساتھ عقیدت کے رشتے قلب و دماغ میں مستحکم محسوس کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس سلسلۃ الذہب میں جس ذاتِ گرامی سے مفرط عقیدت کی نسبت قائم ہے وہ مرشد تھانوی ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ احتیاط و تقویٰ، اعتدال و تورع، صفائیِ معاملات و پاکیزگیٔ نیت جیسی بلند پایہ خوبیاں جس کثرت سے حضرت کی ذات گرامی میں موجود تھیں عصری علماء میں ان کا دور دور تک پتہ نہیں، انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی علمی تحقیقات پر ہر شخص کو کھلی تنقید و تبصرہ کی اجازت تھی۔ بے مغز تنقیدات میں اگر کبھی کوئی منصفانہ بات نکل آئی تو حضرت اپنی تحقیق سے بے تکلف رجوع فرماتے اس کے لئے "ترجیح الراجح" کا ایک مستقل و مسلسل عنوان تھا۔ بظاہر یہ بات معمولی ہے لیکن جہل مرکب میں مبتلا کیا اس طرز کے لئے خود کو تیار کر سکیں گے۔ تمام لوگوں کا تو ذکر کیا اپنا خیال تو یہ ہے کہ بہت سے دیندار علماء میں بھی اس منہاج پر مستقیم کم ہی نظر آئیں گے اور پھر اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی شہرت کے مالک، جس کے حلقۂ بیعت میں عوام نہیں بلکہ خواص، رؤساء اور امراء تا آنکہ بعض ریاستوں کے سربراہ بلکہ امیرِ کج کلاہ سب ہی شامل تھے جس کا "بیان القرآن" علماء کے یہاں مستند اور جس کے قلم سے نکلا ہوا "بہشتی زیور" گھر گھر میں باریاب اور جس کی ہزار سے زائد تصانیف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنی شہرت کے پھریرے اڑا رہی ہیں۔ وہی علمی مشکلات میں اپنے سے عمر میں صغیر کو ان الفاظ سے مخاطب کر رہا تھا۔

از ناکارہ و آوارہ اشرف علی عفی عنہ

بخدمتِ بابرکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب

——————— دامت انوارہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی امید ہے کہ معاف فرمائیںگے ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا اسکے متعلق جداگانہ تکلیف دیتا ہوں الخ۔

مکتوبِ سامی کا خاتمہ ان الفاظِ مبارکہ پر ہے

"اس میں روایت یا درایت سے کچھ حکم فرمائیں۔"

ایک بار پھر سطورِ بالا میں حضرت حکیم الامت مرحوم کی خصوصیات و ممیزات کے ان

اجمالی بیان پر نظر کیجئے جو راقم الحروف کے ہیچ پوچ قلم سے حضرت کے تعارف میں بالاختصار ہی نکلیں۔ پھر اس مکتوبِ گرامی کے مندرجات پر توجہ کیجئے اگر اس میں صاحبِ سوانح کے کمالاتِ علمی کا اعتراف ہے تو خود حضرت کی انصاف پسند علم دوستی کا اظہار ہے کہ اپنے معاصر نہیں بلکہ ایک خورد سے مسائلِ علمیہ میں اس انداز سے رجوع کیا جارہا ہے۔ جس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے ترکِ تعلق کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مقیم تھے تو ہدایہ کی کسی عبارت سے پیدا شدہ تضاد اور اس کی مشہور شرح "فتح القدیر" بقلم حافظ ابن ہمام کی تصریحات و وضاحتوں سے جو علمی اشکالات اور الجھنیں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کو پیدا ہوئیں اس کے لئے ایک طویل مکتوب حضرت کی جانب سے مولانا حبیب احمد کیرانوی نے قاری محمد یامین صاحب استاذِ جامعہ ڈابھیل کو ان الفاظ میں لکھا۔

"مکرمی السلام علیکم۔ برائے مہربانی امور مذکورہ کے جواب حضرت شاہ صاحبؒ سے لیکر روانہ فرمائیں عنایت ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو براہِ راست اس لئے نہیں لکھا کہ معلوم ہوا ہے کہ موصوف کے مزاج میں بجوابِ خط بہت تساہل ہے آپ کے توسط سے یہ فائدہ ہے کہ اگر وہ زبانی جواب بھی دیں گے تو آپ اس کو ضبط کرکے روانہ کرسکتے ہیں سوالات کے جوابات بے حد ضروری ہیں کیونکہ "اعلاء السنن" کا مضمون بلا ان سوالات کے حل کے مکمل نہیں ہوسکتا"۔

اسی مکتوب پر حضرت حکیم الامت مرحوم نے اپنے دستِ مبارک سے یہ اضافہ فرمایا۔

از اشرف علی

"بشفقتم قاری مولوی محمد یامین صاحب۔ السلام علیکم۔

یہ خط مولوی حبیب احمد صاحب نے میرے کہنے سے لکھا ہے۔ "اعلاء السنن" کا ایک مقام اٹکا ہوا ہے ان سوالوں کے حل کے ساتھ اس بات کے لکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ ان صورتوں میں حنفیہ کا مذہب کیا ہے۔ آیا یہ عمدٌ ہیں اور شبہ کے سبب قصاص ساقط ہوگیا اور دیت خاص مالِ قاتل میں واجب ہے یا یہ صورتیں خطا میں داخل ہیں اور اس کے لئے دیت و کفارہ دونوں واجب ہیں اور دیت عاقلہ پر ہے۔ ان سوالوں کا جواب حضرت شاہ صاحب سے

لے کر فوراً بھیج دیا جائے جواب کے لئے پیڈ اور لفافہ دونوں ارسال ہیں اگر آپکو
براہِ راست حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں دینے کا موقعہ نہ ملے تو مولانا احمد
بزرگ صاحب یا میاں الحاج محمد بن موسیٰ کو دید یجئے۔"

اس عالم آب وگل میں خدائے علیم وعلام کی جانب سے نازل کردہ آسمانی کتابوں میں سب سے سچی وپکی کتاب جو آج تک بجنسہ موجود ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گی۔ یعنی قرآن حکیم۔ اس میں ارشاد ہے دفوق کل ذی علم علیم اس مراسلت سے جس کے کچھ اقتباسات پیش کئے گئے جہاں قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کی مکمل تصدیق حاصل ہے وہیں مولانا شبیر احمد عثمانی کی تعزیتی تقریر بر وفات شاہ صاحب جو ڈابھیل میں کی گئی تھی جس میں اشک بار طلباء سے خود مصروفِ بکا مقرر نے کہا تھا۔

"تم کیوں روتے ہو تمہاری علمی مشکلات کو تو انشاء اللہ حل کرنے
کے لئے ہم موجود ہیں رونا تو اہلِ علم کو ہے کہ وہ اپنی علمی مشکلات میں حضرت
شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد کس سے رجوع کریں گے؟"

● عرض یہ کرنا ہے کہ اس مراسلت کو دیکھنے کے بعد کیا مولانا عثمانی کے ان الفاظ کو مبالغہ پر محمول کیجئے گا یا اظہارِ مادح کے ذیل میں شمار کیجئے گا اور حضرت مولانا تھانویؒ تو حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذانہ نسبت رکھتے ہیں۔ براہِ راست حضرت شمس الاسلام مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ کے شاگرد جناب مولانا حکیم رحیم اللہ؏ صاحب بجنوری نے جن کے

؏ مرحوم اس مقدس صفِ تلامذہ سے تعلق رکھتے جسے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی علیہ الرحمہ سے براہِ راست شرفِ تلمذ ہے شاہ صاحب کے رفیقِ خاص مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری کے حقیقی ماموں تھے۔ زمیندارانہ ثروت کے باوجود اور اس پایہ کے حاذق طبیب ہونے کے باوصف کہ ٹی بی کے مریض ہندوستان کے نامی وگرامی طبیب حکیم اجمل خاں صاحب بجنور آپ ہی کے پاس بھیجدیتے۔ نفاست پسندی کے ساتھ سادگی وعلم دوستی کے مرقع تھے۔ حکیم صاحب عمر کے آخری مرحلہ سے گذر رہے تھے اور شاہ صاحب بے ریش وبروت لیکن ان کے تبحر کے ایسے قائل ہوئے کہ ایک نوجوان عالم کا غیر معمولی احترام کرتے گھر پر ٹم ٹم تھی جسے دو گھوڑے کھینچتے۔ سر شام اسی میں بیٹھکر تفریح کے لئے نکلتے لیکن آخرِ عمر تک دیوبند سے عشق وتعلق کا یہ عالم تھا کہ اگر سن لیتے کہ دار العلوم کا کوئی طالب علم بجنور میں کسی جگہ آیا ہے تو اس سے ملاقات کے لئے وہیں پہونچتے۔ مولوی سلطان الحق ناظم کتب خانہ کا بیان ہے کہ ان کے رفیقِ درس مولوی محمود بنارسی جو

(باقی آگے)

سامنے حضرت شاہ صاحب عمر میں بہت ہی چھوٹے تھے اپنی کتاب "امتناعِ نظیر" پر جو تقریظ
شاہ صاحب سے لکھوائی تھی اس کا عنوان ان گرامی القاب سے شروع کیا۔

"ھوالحبر الکامل المحقق المدقق فخر الاقران وابناء الزمان۔"

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ کے شاگرد ہیں اور صاحبِ سوانح کے بزرگوں میں بجائے خود ایسے عالم ربانی تھے جن کے نفسِ قدسی سے ظلمت کدۂ ہندوستان علم وعرفان کی روشنی حاصل کرتا شاہ صاحبؒ کی رخصتِ علالت کے دوران عارضی طور پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بخاری شریف کا سبق دینے کے لئے پہونچے تو پہلے روز کی ابتدائی تقریر میں فرمایا کہ

" خدائے تعالیٰ اپنے فضل ورحمت سے شاید مجھے محدثین کی جماعت میں اٹھانا چاہتے ہیں ورنہ حضرت شاہ صاحب کی زندگی میں حدیث پڑھانے کا حق کسے حاصل ہے۔"

گویا کہ اس مردِ حق آگاہ کی نظر میں تیرہویں صدی میں ہندوستان کا درسِ حدیث اور اس کا مکمل استحقاق صاحبِ سوانح ہی کے لئے محفوظ تھا جو لوگ حضرت مفتی صاحب کی عارفانہ وزاہدانہ زندگی پر واقف ہیں اور اس حقیقت کے رمز شناس ہیں کہ مرحوم ان پاکباز لوگوں میں سے تھے جن کی زبان غلط تعریف وتوصیف تو درکنار مبالغہ آرائی کو بھی گوارا کرنے

صت۲۷۹ کا بقیہ:- اس وقت دار العلوم کے سفیر ہیں عید کرنے کے لئے مولوی سلطان الحق صاحب کے گھر گئے حکیم صاحب نور اللہ مرقدہ کو اس کا علم ہوا تو عید کی نماز سے فراغت پر بجائے اپنے گھر تشریف لے جانے کے سیدھے مولوی سلطان صاحب کے گھر پہونچے تاکہ دار العلوم کے طالب علم سے شرفِ ملاقات حاصل ہو یہ تھا قدیم دار العلوم کے فضلاء کا دار العلوم سے بے نظیر تعلق اور عدیم المثال وابستگی۔ صاحبِ تصانیف ہیں خصوصاً "امتناعِ نظیر" پر فاضلانہ کتاب ان کے علم ریز قلم سے تیار ہوئی۔ بجنور ہی میں وفات ہوئی اور وہیں دفن کئے گئے۔

عہ دار العلوم کے قدیم استاذ پختہ استعداد، خصوصاً قدیم ادب میں ایک مستند شخصیت، صاحبِ زہد وتقویٰ تلامذہ میں بابا کے نام سے شہرت، بہت جلد جلد بولنے کی عادی اور گفتگو کے کچھ حصہ کو اشارات سے ادا کرنے کے خوگر، صاحبِ سوانح سے خصوصی تعلق۔ اس کاروانِ علم وفن کے ایک شریک جو دار العلوم کو چھوڑ کر ڈابھیل (گجرات) پہونچا گجرات کی سرزمین باباؔ کے دل کو ایسی بھائی کہ ابدی نیند کے لئے وہیں کا ایک گوشہ انتخاب کیا۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

کے لئے تیار نہ تھی ان کے ذہنِ مبارک میں موجود۔ حقیقت ترجمان زبان سے صاحبِ سوانح
کی عبقریت کا یہ اعتراف کس قدر وقیع ہے۔ مفتی صاحب کے برادرِ اصغر جو فہم و دانش، تدبیر و
تدبّر میں بے مثل تھے۔ جن کا چالیس سالہ دار العلوم کا طویل اہتمام مدارسِ اسلامیہ میں نظم وضبط
خوش سلیقگی و خوش قرینگی میں ممتاز تھا جو ہر شناسی اور مردم سازی میں اپنی نظیر آپ تھے یعنی
مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، شاہ صاحب کو

"چلتا پھرتا کتب خانہ"

قرار دیتے۔ کتب خانہ کس چیز کا علم وفن کی وہ معرکۃ الآراء لائبریری جس میں جملہ علوم
وفنون کی نادر و بیش بہا کتابیں اسطرح جمع کی گئی ہوں کہ مستفیدین کے لئے ہمہ وقتی استفادہ
کی راہیں کبھی مسدود نہ ہوں۔ مرحوم مولانا عثمانی کی نظر میں شاہ صاحب کی یہی حیثیت تھی کہ
ان کے کتب خانۂ علم سے ہر فن کا طالب ہر وقت استفادہ کرتا۔ بڑے آدمی کی بات بھی بڑی
ہوتی ہے۔ کتب خانہ ساکت وصامت ہے متکلم نہیں اس میں جمود ہے حرکت کا نام ونشان نہیں
سبحان اللہ تشبیہ میں "چلتا پھرتا" کا اضافہ تشبیہ کے اس نقص کو بھی بھرپور دور کر رہا ہے۔
عرض کر چکا ہوں کہ یہ تاثرات نہ صاحبِ سوانح کے تلامذہ کے ہیں نہ معاصرین کے بلکہ ان اکابر
کے ہیں جن کی نظریں اپنے عہد کی اُن ممتاز شخصیتوں کو دیکھنے والی تھیں جس کے بعد
کسی شخص کا غیر معمولی فضل وکمال ہی انہیں متاثر کر سکتا تھا انہیں اکابر میں مولانا سراج احمد
صاحب میرٹھی بھی ہیں جو ہمیشہ شاہ صاحب کو شیخ زمن یا شیخ عالم کہکر پکارتے اس کو پھر
تازہ کر لیجئے کہ موصوف صاحبِ سوانح کے شاگرد نہیں بلکہ ان کے معاصر تھے۔ مولانا شبیر احمد
عثمانی جن کا مفصل تذکرہ عاجز ہی کا قلم آپ کو حاشیہ میں سنا چکا ہے جن لوگوں کو علامہ عثمانی سے
درسی استفادہ یا مجمع عام میں ان کی معرکۃ الآراء خطابت سے اپنے سامعہ کو لطف اندوز کرنیکا
براہِ راست موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ موصوف حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں منفرد
خصوصیات وممیزات کے مالک تھے۔ علم کلام، فقہ الحدیث، تفسیرِ قرآن، پرزور انشاء اور دلاویز
خطابت میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا عثمانی ایک زمانہ تک صاحبِ
سوانح سے معاصرانہ چشمک رکھتے لیکن دار العلوم کے ہنگامے کے بعد جب ڈابھیل میں یکجائی
و انتہائی قرب ہوا تو مولانا عثمانی نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ پر جو بلند پایہ فوائد قلمبند فرمائے
ہیں ان میں حضرت شاہ صاحبؒ سے طویل استفادہ کیا اور فنِ حدیث میں بھی مسلسل مستفید

ہوتے رہے بلکہ صاحبِ سوانح کے ان افادات کو کشادہ قلبی کے ساتھ فوائد قرآن اور اپنی شاہکار تصنیف "فتح الملہم" میں انہیں کے حوالہ سے جا بجا نقل کیا۔ صاحبِ سوانح کے خاتمۂ عمر پر اب معاصرانہ بُعد کی جگہ عقیدت و اخلاص نے لی تھی۔ خود شاہ صاحب بھی اپنی خصوصی مجالس میں فرماتے کہ

"مولانا شبیر احمد صاحب کو حدیث سے مناسبت ہوگئی۔"

بہرحال صاحبِ سوانح کی وفات پر جو تعزیتی جلسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ہوا اور جس میں علامہ عثمانی نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ ایک تعزیتی تقریر فرمائی جس کا طویل اقتباس سابق میں نظرِ قارئین کیا گیا اسمیں یہ تاریخی جملہ بھی فرمایا تھا کہ

"دانشوروں کی نظر نے بعہدِ شاہ صاحب ان کا کوئی نظیر نہیں دیکھا اور نہ خود مرحوم نے اپنے عہد میں کوئی اپنا نظیر پایا۔"

مولانا عثمانی کی یہ تعزیتی تقریر مفصل گذر چکی اسلئے راقم الحروف ان کے تاثرات و اعترافِ کمال کی مزید تفصیل ضروری نہیں سمجھتا۔

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ جمعیۃ العلمائے ہند کے مؤسس جن کے فہم و دانش کے خود استاذِ اکبر حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ بھی معترف تھے شاہ صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے بلکہ قلبی اتحاد اس درجہ تھا کہ اکثر اسفار کی صورت میں شاہ صاحب کا قیام مدرسہ امینیہ میں مفتی صاحب کے پاس ہوتا۔ دارالعلوم دیوبند میں ہنگامہ سے پہلے صاحبِ سوانح نے جو چند مطالبات اہتمام کے سامنے رکھے تھے اُن میں ایک مطالبہ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ میں بعض امتیازی شخصیتوں کو لینے کا تھا جس میں مفتی صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد جمعیۃ العلماء ھند کے آرگن "الجمعیۃ" میں ۷ صفر ۱۳۵۲ھ مطابق یکم جون ۱۹۳۳ء کو خود مفتی صاحب کے قلم سے یہ ایک درد انگیز تعزیتی مضمون اشاعت پذیر ہوا۔

"آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامہ الفاضل الکامل اکمل العلماء افضل الفضلاء النحریر القدام البحر الطمطام حلۃ العصر قدوۃ الدہر استاذ الاساتذہ رئیس الجہابذہ محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر العلوم العقلیہ والنقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کو آغوشِ رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جنکی نظیر مستقبل میں متوقع نہیں طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر وکمال، فضل وورع، تقویٰ وجامعیت، استغناء مسلّم تھا مخالف وموافق ان کے علم کے سامنے تسلیم وانقیاد سے گردن جھکاتا تھا۔"

مفتی صاحب ہی نے دہلی کے اس تعزیتی جلسہ میں جو دارالسلطنت کی مختلف جماعتوں کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا تعزیتی تقریر میں فرمایا۔

"امام العلماء ربانیین، محدث کامل، فقیہ مفسر ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ جن کی نظیر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ موجودہ عالم اسلامی بھی اس پایہ کی شخصیت سے خالی ہے یعنی حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رح کی وفات ایک قیامت ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے نہیں بلکہ یہ قیامت پورے عالم اسلامی کے لئے ہے افسوس کہ آج ہندوستانی مسلمان ان برکات وانوار کے سرچشمہ سے محروم ہوگئے جو حضرت مرحوم کی ذات گرامی سے جاری تھا۔ موتُ العالِم موت العالَم ہمیشہ سنا اور معاصر علماء کی وفات پر ہمیشہ ہماری زبان پر آیا لیکن اس کے حقیقی مصداق حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات ہے۔"

کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی لوحِ مزار پر چند سطور ان ہی مفتی صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود اپنی جامعیت میں بے نظیر ہیں

اسی طرح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے وقیع تاثرات اور ان کے متعلق تفصیل اس تعزیتی تقریر میں گزرچکی جسے وفات شیخ کے عنوان کے تحت مفصل پیش کرچکا ہوں۔

مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی فرماتے کہ

"مجھے جب کوئی علمی اشکال پیش آتا تو اس کے لئے ممکن جدوجہد کرتا پھر بھی نہ حل ہوتا تو حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا وہ جو کچھ فرماتے اسے آخری وقطعی بات سمجھتا۔

علامہ سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء کے ان اساسی شخصیتوں میں سے ہیں

جن پر ندوہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی علمی تاریخ فخر کر سکتی ہے۔ سید صاحب غزارۂ علمی کے ساتھ جس طبعی شرافت و متانت، احتیاط و اعتدال اور متوازن تبصرے و موازنہ کے خوگر تھے اس سے ہندوستان کی ادھر پچاس سالہ تاریخ بخوبی واقف ہے دار المصنفین کے آرگن "معارف" میں وفیات کے عنوان سے سید صاحب کا قلم اساسی شخصیتوں کی وفات پر جو دل فگار تاثرات لکھتا وہ اردو ادب کا خاص سرمایہ ہے۔ صاحبِ سوانح کی وفات پر آپ نے حسب دستور ایک تعزیتی مضمون لکھا جسمیں یہ الفاظ تھے۔

مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو

عہ بہار نے جن فخر روزگار شخصیتوں کو اپنے خشک زار علاقہ سے پیدا کیا ان میں سید سلیمان علیہ الرحمہ کا وجود گرامی علم و فن کی ایک تاریخ، ادب و انشاء کا ایک کارواں، فضل و ادب کا ایک قافلہ ہے جو سید صاحب کے تنہا وجود سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ "دیسنہ" میں پیدا ہوئے اور زندگی کے مختلف مرحلوں سے گذرنے کے بعد ندوۃ العلماء پہونچکر شبلی نعمانی کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے پھر مرحوم نے اپنے استاذ کے علم و فن کو اس طرح چمکایا جیساکہ قدیم عہد میں ابنِ قیم نے ابنِ تیمیہ، سخاوی نے ابن حجر، قاسم بن قطلوبغا نے حافظ ابن ہمام کے علوم و معارف سے دنیا کو آشنا کیا شبلی مرحوم کی "سیرۃ النبی" کی تکمیل اس اچھوتے انداز پر کی کہ اگر استاذ اس کارنامہ کو دیکھتے تو اس کی انفرادیت کا اعلان کرتے سیرتِ عائشہ، سیرت عمر بن عبد العزیز، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، عمر خیام وغیرہ مرحوم کی وہ شاہکار تصانیف ہیں جنھیں اردو ادب کا بے تکلف خاصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وجیہ، درمیانی قامت، گھنی ڈاڑھی، شرعی لباس، سر پر دستار فضیلت، حسین چہرہ، پر نور آنکھیں، کشادہ پیشانی اور انوارِ ولایت و آثارِ تقویٰ ان کے چہرے بشرہ سے نمایاں تھے۔ علم کی طویل غواصی کے بعد سلوک و تصوف کی جانب متوجہ ہوئے اور اپنے وقت کے امام حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور بڑے مختصر عرصہ میں مجازِ طریقت ہوئے شیخ نے بھی اپنے اس مسترشد کے بارے میں بڑے وقیع کلمات ارشاد فرمائے بلکہ بعض اشعار مرشد کی زبانِ حق ترجمان پر ایسے آئے جو مرید کے علوشان کو ظاہر کرتے ہیں۔ علمی تمکنت فاضلانہ ثقاہت شہرتِ عام اور امتیاز کامل کے باوجود طبیعت نہایت ہی مسکین اور انداز متواضعانہ تھا صاحب سوانح ہی نے جمعیۃ العلماء کے کسی جلسہ میں دیکھا کہ سید صاحب خاک بستر پر آرام کرتے ہیں۔ مولانا احمد رضا بجنوری کا بیان ہے کہ شاہ صاحب اس منظر کو دیکھ کر اسقدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ اپنی مجالس میں سید صاحب کی حیاتِ طیبہ کے اس متواضعانہ رخ کا تذکرہ فرماتے دار المصنفین اعظم گڈھ سے طویل وابستگی کے بعد ریاست بھوپال میں قیام کیا اور وہاں ایک اہم ذمہ دارانہ منصب پر کچھ وقت گذار کر نئی سلطنت پاکستان کے مشہور شہر کراچی پہونچے اور یہیں خلاقِ عالم کو اپنی متاعِ زندگی جسے امانت کے طور پر صبحِ ولادت میں لیکر آئے تھے بنا سنوار کر اسی مقتدر ہستی کے سپرد کی۔

اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں"۔

یہ مختصر جملہ جو وقت کے ادیب اور اپنے عہد کے ایک انشار پرداز کے قلم کی تراوش ہے صاحبِ سوانح سے متعلق تاثرات کے انبار پر ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

ہندوستان کی چیدہ اور منتخب اشخاص کے یہ کچھ تاثرات تھے جو راقم السطور نے یہاں جمع کئے خاص اس عنوان کے تحت صاحبِ سوانح سے متعلق ان تاثرات کا استقصاً پیشِ نظر نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ صاحب ان خوش نصیب اہلِ علم میں ہیں جن کے سانحۂ وفات پر نصف صدی کا عرصہ گذرنے کو آتا ہے لیکن ان کی علمی مقبولیت روز افزوں ہے اور اس مختصر عرصہ میں ان کی شخصیت اہلِ کمال کا تعارف اور ممتاز شخصیتوں کے لئے ایک سند بن گئی۔

عرب و عجم کی کشمکش ہماری تاریخ کا ایک ایسا منحوس باب ہے جس کی تفصیلات بھی قلم سے لکھی نہیں جاسکتیں۔ عربوں کی نخوت و غرورِ علمی نے عجمی کمالات کو قبول کرنے سے ابار کیا اگرچہ اس تلخ داستان میں ان عناصر سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستانی علمار کا اکثر سرمایۂ کمال فارسی اور اردو ہی میں محدود ہو کر رہ گیا اور عربی میں منتقل نہ ہونے کی بنا پر دین و دانش کی یہ بہترین بضاعت عربوں کے لئے ناآشنا رہی لیکن جو کچھ عربوں تک پہونچا بھی تو عجم کے لئے حقارت آمیز رجحانات نے اسے عربوں کے لئے قابلِ قبول بننے نہیں دیا ان احوال و ظروف میں کچھ ہی ایسی شخصیتیں ہیں جن کے غیر معمولی فضل و کمال تبحر اور جامعیت کو عربوں نے فراخدلی سے قبول کیا۔ ان گنی چنی شخصیتوں میں صاحبِ سوانح ہیں جنھیں بلادِ عرب میں نمایاں اشخاص ہندوستان کا ایک "راسخ العلم" انسان باور کرتے ہیں۔

صاحبِ رسالہ حمیدیہ کے ان تاثرات کا کہیں تذکرہ گذر چکا ہے جو اس نامور عربی دانشور نے صاحبِ سوانح کو دئے ہوئے وثیقہ میں خود اپنے قلم سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دئے۔

مصر کی معروف شخصیت علامہ رشید رضا صاحب المنار جن کے علم و فن اور خصوصی نگارشات سے ایک عالم واقف ہے۔ شیخ عبدہ کے ان ممتاز تلامذہ میں سے ہیں جنھیں عالمِ اسلامی کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔ ندوۃ العلمار کے جشنِ علمی میں علامہ رشید رضا کو مدعو کیا گیا تو ایک مختصر وقت کے لئے دیوبند بھی تشریف لائے۔ مصر کے اس دانشور نے دار العلوم کا معائنہ کیا اس کے منہاج علم اور فکری سرمایہ سے قریبی واقفیت حاصل کی۔ معلوم ہے کہ علامہ رشید رضا شافعی المذہب تھے اور احناف سے اس عام بدگمانی کے شکار تھے جو دنیائے اسلام

ین سیدنا امام ابو حنیفہ سے قصداً پیدا کی گئی ہے۔ خیر مقدمی اجلاس میں شاہ صاحب نے جو اس وقت دار العلوم کی صدارتِ تدریس پر فائز تھے ایک ارتجالی تقریر دار العلوم کے اندازِ فکر مختلف فقہی مکاتیب میں فقہ حنفی کا تفوق، حدیث و قرآن، فقہی سرچشمہ کی آبیاری، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مجتہدانہ درس اور ان خصوصیات و ممیزات کا مختصر بیان کیا جن کا حامل یہ عظیم اسلامی ادارہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی یہ علمی و تاریخی تقریر آپ کے علمی تبرکات میں مفصل دی جارہی ہے۔ رشید رضا کرسی پر جلوہ افروز تھے اور شاہ صاحب کا بحرِ علم تلاطم پذیر تھا دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ رشید رضا عربوں کے خصوصی انداز پر داد دیتے ہوئے کرسی سے کھڑے ہوتے اور بار بار ان کی زبان پر یہ آتا۔

"واللہ ما رأیت مثل ھذا العالم الجلیل قط۔"

یہی نہیں صاحبِ سوانح کی تقریر کے اختتام پر رشید رضا نے جوابی تقریر کی اس میں فرمایا کہ

"اگر حنفیت وہی ہے جس کا ذکر ابھی میرے سامنے مولانا انور شاہ نے کیا تو پھر میں واضح اعلان کرتا ہوں کہ عمل کے لئے حنفیت کافی ووافی ہے۔"

اور پھر یہ تأثر وقتی بھی نہیں تھا مصر پہونچنے پر انھوں نے اپنے شہرۂ آفاق رسالہ "المنار" میں غیر مبہم الفاظ میں لکھا تھا۔

"اگر میں ہندوستان میں دار العلوم دیوبند نہ دیکھتا تو یقیناً اس ملک سے مایوس واپس آتا۔"

یہی نہیں بلکہ ان کا یہ حقیقی تأثر ان کے قلم سے تیار تصانیف میں بار بار صفحۂ قرطاس کو مزین کرتا رہا۔

عالم اسلام کی دوسری مشہور و معروف شخصیت علامہ زاہد الکوثری جو اصلاً ترکی النسل تھے اپنے حریت پسندانہ جذبات کی وجہ سے جلاوطنی کی طویل زندگی قاہرہ میں گذار کر اپنے وطن سے بہت دور غریب الوطنی کے عالم میں جان دیکر اس شعر کا مصداق بن گئے ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

ان فخرِ روزگار شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں کے الٹ پھیر پر بطنِ عالم سے ظہور

پذیر ہوتی ہیں. مولانا یوسف بنوری ایسے محقق کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بعد اس پایہ کی شخصیت اگر عالمِ اسلامی میں دیکھنے میں آئی تو وہ "زاہد کوثری" کی تھی دفاع عن الاحناف کے سلسلہ میں ان کا قلم شمشیر برّاں تھا. خطیب بغدادی کے مظالم کو شیخ ہی نے اپنے علم ریز قلم سے اس مدلل انداز میں صاف کیا ہے کہ اگر خود "خطیب" ہوتے اور ان کی اس تردیدی کتاب کا مطالعہ کرتے تو بشرطِ انصاف پسندی اپنے خیالات سے رجوع کے علاوہ ان کیلئے کوئی راہ نہ تھی متعدد شاہکار تصانیف ان کے قلم سے نکلیں اور ممتاز تلامذہ کی ایک جماعت انھوں نے تیار کی. شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ ان ہی کے معروف تلامذہ میں ہیں. یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ صاحبِ سوانح کوثری سے واقف اور کوثری صاحبِ سوانح کے شناسا لیکن ایک دوسرے کو متوفی اشخاص میں شمار کرتے رہے. ۱۹۳۷ء میں مولانا یوسف بنوری نے "مجلسِ علمی" کی جانب سے بسلسلۂ کتابت وطباعت "فیض الباری" قاہرہ کا سفر کیا اور ایک مدت وہاں پر مقیم رہے تو علامہ کی غزارتِ علمیہ سے قریبی واقفیت کا انہیں موقعہ ملا. شیخ کوثری نے اسی زمانہ میں شاہ صاحب کی تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور پھر اپنی متعدد تصانیف میں صاحبِ سوانح کے علوم اور ان کے تبحّر کا کھلے دل سے اعتراف کیا. ایک موقعہ پر کوثری نے صاحبِ سوانح کے بارے میں ارشاد فرمایا.

"لم یات بعد الشیخ الامام ابن الھمام مثلہ فی استثارۃ الابحاث النادرۃ من ثنایا الاحادیث وھذہ برھۃ طویلۃ من الدھر." (حافظ ابن ہمام مصنف فتح القدیر کے بعد مولانا محمد انور شاہ جیسی کوئی شخصیت حدیث کے انبار سے نادر و کم یاب موتیوں کے برآمد کرنے میں عالمِ اسلامی میں گذری نہیں حافظ اور شاہ صاحب کی درمیانی مدت کچھ مختصر بھی نہیں."

عالمِ اسلام کی اس مشہور شخصیت اور حکیم مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کا اعترافی توارد حیرت انگیز ہے. ڈاکٹر اقبال نے بھی شاہ صاحب کے متعلق لاہور کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"اسلام کی ادھر پانچسو سالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے."

جس وقت ڈاکٹر اقبال یہ بات کہہ رہے تھے ابن ہمام کی وفات پر کم وبیش پانچ صدیاں گذر چکی تھیں۔

علامہ کوثری نے اپنے مطبوعہ مقالات کے صفہ ۲۵۵ پر قادیانیت کی تردید میں جو ایک پر مغز مقالہ تحریر کیا ہے اس میں شاہ صاحب کی تردید قادیانیت میں مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اعلے اللہ سبحانہ منزلۃ العلامۃ فقید الاسلام المحدث الحجاج الشیخ محمد انور الشاہ الکشمیری فی غرف الجنان وکافاہ مکافاۃ الذابین عن حریم دین الاسلام فانہ قمع القادیانیۃ بحجج الدامغۃ۔"

پیش کردہ اس اقتباس میں کوثری ایسے ناقد و مبصر کے قلم سے صاحب سوانح کیلئے "علامہ" "فقید الاسلام" "المحدث الحجاج" وغیرہ کے الفاظ نہ صرف باوقعت بلکہ ہندی عالم کے فضل وکمال سے ایک عربی فاضل کے غیر معمولی متاثر ہونے کے آئینہ دار ہیں۔

اور یہی نہیں بلکہ عربی اہل علم نے جب صاحب سوانح سے مشافہتہً ملاقات کی اور ان کی وسعتِ علم و تبحّر سے بلا واسطہ آشنا ہوئے تو ان کے تاثرات نہ صرف عجیب وغریب بلکہ ہندوستان کے علماء کی تاریخ میں قطعاً نادر ہیں۔

مولانا محمد انوری لائلپوری کا بیان ہے کہ جس سال وہ دیوبند میں دورۂ حدیث شاہ صاحب سے پڑھ رہے تھے تو علامہ علے الیمنی ثم المصری جنہیں بے تکلف حافظِ حدیث کہا جا سکتا ہے ہندوستان کی سیاحت کے لئے بمبئی وہاں سے سورت اور راندیر پہنچے، راندیر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری سے ملاقات ہوئی "علامہ علی" حنبلی المذہب تھے اور اپنے فقہی مسلک میں جمود و تصلب کے حامی، دار العلوم اور اکابر دار العلوم کے تذکرہ کو مفتی صاحب سے کچھ بشاشتِ قلبی سے نہ سن سکے۔ اسی سیاحتی سفر میں دلّی آنکلے اور صدر بازار میں مولوی عبد الوہاب صاحب مشہور عالم اہل حدیث کے پاس فروکش ہوئے۔ لیکن عجیب اتفاق کہ اوقاتِ صلوٰۃ کے بارے میں مہمان ومیزبان میں "جدلی گفتگو" کا آغاز ہو گیا۔ شیخ علی صورتِ حال سے اس درجہ متاسف ہوئے کہ مولوی عبد الوہاب سے دل برداشتہ ہو کر دہلی میں کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور عام طور پر اس کا شکوہ کیا کہ مجھ مہمان کے

ساتھ یہ معاملہ کیا گیا۔ کسی صاحب نے انہیں "دیوبند اور دارالعلوم" دیکھنے کا مشورہ دیا لیکن شیخ علی کا خیال تھا کہ حنبلیت و مسلکِ اہلِ حدیث میں یکسانیت اور قرب کے باوجود جب اہلِ حدیث ہی مجھے برداشت نہ کر سکے تو احناف کس طرح گوارا کریں گے شدید اصرار پر "دیوبند" کا قصد کیا۔ دارالعلوم پہونچے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے پذیرائی میں کوئی تقصیر نہیں ہونے دی۔ اس زمانہ میں یمن کے کچھ طلباء بھی دارالعلوم میں پڑھتے تھے مولانا عثمانی نے نووارد مہمان کی دل بستگی کے لئے ان یمنی طلباء کو بھی شیخ کی دل جوئی و میزبانی کی خاص تاکید کی۔ دو ایک روز کے بعد یمن کے اس محدث و علامہ نے اپنے رفقاءِ وطن سے کہا کہ

"علمائے دارالعلوم مکارم اخلاق کے حامل ہیں دیکھئے مجھ نووارد سے درآنحالیکہ سابقہ کوئی آشنائی نہ تھی کس قدر فراخدلی و فراخ حوصلگی کا معاملہ کیا اور اختلافِ مسلک کے باوجود میزبانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو سکا۔"

مولوی محمد یحییٰ یمنی طالب علم نے مناسب تقریب سے یہ دیکھکر کہ علامہ علماءِ دارالعلوم سے متاثر ہیں عرض کیا کہ

"علمائے دیوبند کے جس طرح اخلاق وسیع و بلند ہیں ایسے ان کا علم و فضل بھی مستند اور دانش و بینش بے نظیر ہے۔"

شیخ اس پر بولے کہ

"خیر اسے تو جانے دیجئے یہ غریب عجمی علم و تبحر کو کیا جانیں۔"

حسنِ اتفاق کہ اسی زمانہ میں دارالعلوم کے ترجمان "القاسم" میں شاہ صاحب کا وہ مرثیہ شائع ہوا تھا جو عارف باللہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری خلیفۂ ارشد حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ وفات پر کہا گیا تھا۔ مولوی یحییٰ کے ہاتھ میں موجود اسی رسالہ کو لیکر شیخ علی نے مطالعہ کیا تو فرمایا کہ

"ان اشعار سے عرب جاہلیت کے ادب و اسلوب کی بو آتی ہے۔"

اور یہ معلوم ہونے پر کہ موجودہ وقت میں مرثیہ گو ہی دارالعلوم دیوبند میں "بخاری و ترمذی" کا درس دے رہے ہیں۔ شیخ علی نے سبق میں شرکت کا خیال ظاہر کیا اگلے روز وہ

یمنی طلباء کے ساتھ درس میں تشریف فرما ہوئے سوءِ اتفاق کہ درس میں آج کسی مسئلہ پر ابن تیمیہ ہی پر رد ہو رہا تھا شاہ صاحبؒ نے شیخ علی کی رعایت کرتے ہوئے عربی میں تقریر کی شیخ ابن تیمیہ کے غالی معتقد، رد و قدح، جواب وجواب الجواب کا دروازہ کھل گیا مصری محدث ایک ہفتہ درس میں شرکت کرتے رہے پہلا تاثر یمنی طلباء کے سامنے یہ آیا کہ

"میں نے شام سے ہندوستان تک کا سفر کیا اکثر بلاد اسلامیہ کی سیاحت کر چکا ہوں خود مصر میں صحیحین کا درس دیا لیکن اس شان کا عالم میری نظر سے نہیں گذرا میں نے انہیں خاموش کرنے کی بہت کوشش کی مگر ان کا ضبط و اتقان تبحر و جامعیت بے نظیر ہے۔"

اور جس روز شیخ دیوبند سے روانہ ہونے لگے تو طلباء کے مجمع میں اعلان کر رہے تھے کہ

"لوحلفت انہ اعلم بابی حنیفۃ لماحنثت۔"

مگر شاہ صاحب کا انکسار و فروتنی اس وقیع تعریف کو برداشت نہ کر سکی شیخ کے ان تاثرات کا علم ہوا تو بعدِ عصر طلباء کو روک کر مسجد میں فرمایا

"شیخ علی مصری نے ہمارے بارے میں مبالغہ سے کام لیا امام اعظم کے مدارکِ اجتہاد اس قدر بلند ہیں کہ ہماری وہاں تک رسائی بھی نہیں۔"

اور وہی قاہرہ کا سفر جس میں مولانا یوسف بنوریؒ "فیض الباری" کی طباعت کے سلسلہ میں عالمِ اسلام کے اس مشہور شہر میں مقیم تھے تو آپ کی ملاقات دوسرے جلاوطن شیخ الاسلام "مصطفےٰ صبری" سے ہوئی۔ صبری ردّ ملاحدین و دہریین میں خصوصی حیثیت رکھتے۔ فلسفہ کے شناور اور قدیم و جدید علوم پر انہیں پوری بصیرت تھی مولانا بنوری نے شاہ صاحبؒ کی مشہور تالیف "مرقاۃ الطارم فے حدوث العالم" صبری کو دی۔ چند روز کے بعد ملاقات میں شیخ صبری نے شاہ صاحبؒ کی اس تصنیف کے بارے میں فرمایا کہ

"میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں ہے۔"

یہی نہیں بلکہ اس وقت مرحوم کے سامنے صدر شیرازی کی "اسفار اربعہ" رکھی ہوئی تھی شیخ نے مرقاۃ الطارم کو ہاتھ میں لیکر صدر شیرازی کی "اسفار اربعہ" کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے فرمایا۔

"انی افضل ھذہ الوریقات علی جمیع المادۃ الذاخرۃ فی ھذا الموضوع وانی افضلہا علی ھذہ الاسفار الاربعۃ للصدر الشیرازی۔"

پھر شیخ نے اپنی مشہور تالیف "القول الفیصل" میں شاہ صاحب کے فلسفہ و کلام سے گہرے شغف، اس پر مبصرانہ نظر اور ان فنون میں دقتِ نظری کی فراخدلی سے تعریف کی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ جن کا تذکرہ آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ وہ شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری کے قابلِ فخر تلامذہ میں ہیں دو بار غالباً ہندوستان کا سیاحتی دورہ بھی کر چکے انھوں نے نہ صرف عجمی علماء کے کمالاتِ علمی و عملی کو تسلیم کیا بلکہ مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی ظفر الامانی کو باقاعدہ ایڈیٹ کرنے کے بعد بیروت و دمشق وغیرہ سے شائع کیا ان ہی کے علم ریز قلم سے شاہ صاحب کی ردّ قادیانیت میں مشہور تالیف "التصریح بما تواتر المسیح" فاضلانہ حواشی کے ساتھ منظرِ عام پر آچکی۔ "شیخ ابوغدہ" نے اس کتاب کے آغاز میں شاہ صاحب کی سوانح بحوالۂ مولانا یوسف بنوریؒ مولانا بدر عالم صاحب قلمبند کی ہے مولانا یوسف بنوری نے شاہ صاحب کے تذکرے میں کچھ بلند و بالا تعظیمی القاب کا ذکر کیا ہے جس پر شیخ ابوغدہ لکھتے ہیں۔

"یقول عبدالفتاح ابوغدہ ملخص ھذہ الترجمۃ وناسجہا لیست ھذہ الالقاب من قبیل المدیح والاطراء ولا المبالغۃ والتفخیم انما ھی من الحقائق الذی تحلی بہا الامام الکشمیری یعلم ذلک من اطلع علی تالیفہ ونزاخر علومہ ولست الحمد للہ ممن یکیل المدیح جزافا الثناء اعتسافاً۔ (میں اس کتاب کو ایڈیٹ کرنے والا ابوغدہ کہتا ہوں کہ یہ القاب مبالغہ اور غلط تعریف پر محمول نہ کئے جائیں جن لوگوں کی نظر سے حضرت شاہ صاحب کی بلند پایہ تصانیف گذر چکیں وہ ان القاب کو حقیقت پر محمول کریں گے)۔"

بلکہ شیخ غدہ ہی کے قلم نے اس کتاب کے انتخاب اور اس پر عملی کاوشیں صرف

کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ بھی سنایا ہے۔

"ولقد تلقت کتب الامام الکشمیری رواجا منقطع النظیر وحاذت ثناء العلماء وتقدیرهم العزیز فی مشارق الارض ومغاربها وذلك لما امتازت به من وسیع العلم وعمیق التدقیق وبالغ الحجج والبراهین التی تمسح الباطل و الشبهات محاً فلا تبقی ولا تذر مع یلمسه قاریها من فیض الاخلاص والتواضع فیها رشاہ صاحب کی تصانیف بے نظیر ہیں اور علمائے روزگار ان کی عزارت کے ثناخواں ہیں۔ عالم اسلام میں یہ تصانیف شائع وذائع ہیں چونکہ شاہ صاحب ایک وسیع العلم، دقیق النظر عالم ہیں اور ردّ قادیانیت میں ان کا قلم شمشیر براں ہے جنھوں نے اپنے تبحّر سے کام لے کر اس فرقۂ ضالہ کی بیخ کنی اس انداز پر کی کہ اب کوئی شبہ قادیانیوں کی گمراہی میں باقی نہیں رہا اور قاری اس کتاب کے مطالعہ کے وقت مصنف کی حسنِ نیت اور اس کے دبیز اخلاص کا بہار بدوش منظر بھی دیکھے گا۔"

پھر اس فاضلِ روزگار عالم نے شاہ صاحب کی طویل سوانح اس تاثراتی شعر پر ختم کی۔

بحر العلوم فما بحر یشاکله
لونقبوا الارض لم یوجد له شبه

اعترافِ کمال کے اس مضمون کے اختتام پر مولانا محمد منظور نعمانی کے مقالہ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے دورِ طالب علمی میں عالمِ اسلام کی کوئی مشہور شخصیت دارالعلوم پہونچی جن کے اس طویل سفر کا پسِ منظر یہ تھا کہ شاہ صاحب کی عقیدة الاسلام فی حیاة عیسےٰ علیہ السلام کے مطالعہ کے بعد انھوں نے ضروری سمجھا کہ اگر اس جامعیت وعبقریت کا عالم دنیا میں موجود ہے تو پھر مجھے اس کی زیارت وملاقات کے لئے ضرور سفر کرنا چاہیئے۔

خاکسار نے ہندوستان کے نامی گرامی علماء کے ساتھ عالمِ اسلام کے ان منتخب اشخاص کے تاثرات اس لئے پیش کئے کہ صاحبِ سوانح کے مسلّمہ کمالاتِ علمی وعملی کا رُخ سامنے آئے جیسا کہ سطورِ بالا میں عرض کرچکا ہوں کہ عجمی کمالات کو تسلیم نہ کرنے کا بھرپور جذبہ عربوں میں صدیوں متوارث رہا اس میں ہندوستان کے چند ہی اشخاص وہستیاں

ہیں جن کے اعترافِ کمال میں عالمِ اسلام نے بخل نہیں کیا ممکن ہے کہ ہندوستانی علمار کے آثرِ علمیہ عربوں تک پہونچے ہی نہ ہوں اور اگر پہونچے ہوں تو وہ اس قدر بے لطف ہوں جسکے بعد ان کا وہی تاثر کہ عجم فضل وکمال سے یکسر بے بہرہ ہے مضبوط ہوتا چلا گیا ورنہ تو جاننے والے جانتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ جیسی بلند قامت شخصیت کو ایک ہندی عالم نے نہ صرف چیلنج کیا بلکہ حافظ کو ان سے یہ بھی سننا پڑا کہ

ما انت یا ابن تیمیہ الا کالعصفور تفر من هنا الى هنا (ابن تیمیہ تم ایک چڑیا کی طرح مسلسل پھدکتے رہتے ہو اور کسی ایک شاخ پر جمنے کا نام نہیں لیتے)

اور اہل علم اس سے بھی واقف ہیں کہ ہندوستان کے نامی گرامی صوفی وصافی، مفسرِ قرآن "شیخ علی مہائمی" جو سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی زماناً مقدم ہیں شیخ محی الدین ابن العربی المعروف بشیخ الاکبر کے ایک مخصوص نظری فلسفہ سے شدۃ تاثر کی بنا پر ایک عرب دانشور کے شیخ اکبر پر اعتراضات برداشت نہ کرسکے اور تاریخ علمار میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعہ کس قدر عجیب وغریب ہے۔ المہائمی رحمۃ اللہ علیہ بستر بدوش عرب جا پہونچے اور اس دانشور کو اپنے دنداں شکن جواب سے مغلوب بنا کر غالب لوٹے۔ راقم الحروف ان واقعات کی بنا پر علمی کمالات ورذانت کو عربوں کی مخصوص جاگیر نہیں سمجھتا۔ بہرحال یہ تو ذیلی تاثرات تھے جو نوکِ قلم سے بے اختیار نکلے اصل میں تو صاحبِ سوانح کے متعلق ان اعترافات کو جمع کرنا تھا جن سے ان کے غیر معمولی تبحّر اور جودتِ علمی کی تسلیمی لہر از ہند تا عرب پھیلی ہوئی ہے۔

ان تاثرات کو بھی چند ہی اشخاص کے لئے مخصوص کیا ورنہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ سے متعلق ان کے کمالات کا اعتراف ہند وعرب میں بہت وسیع ہے خود حکیمِ مشرق ڈاکٹر اقبال جس طرح معترف رہے اس کی کچھ داستان تعزیتی جلسوں کے ذیل میں مجھ ہی سے آپ سُن چکے ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی نامی گرامی شخصیتیں اربابِ علم وارباب طریقت وادیِ کشمیر کی اس حیرت انگیز شخصیت کو تسلیم کرنے میں پیش پیش ہیں۔

تصنیفات و تالیفات

کسب و وہب ہماری بہت پرانی اصطلاحات ہیں اور مسلمان ہی نہیں تقریباً ہر ملت کے افراد اس حقیقت کے معترف ہیں کہ انسانی خوبیوں میں سے کچھ تو وہ ہیں جنھیں انسان محنت وجد وجہد سے اپنے میں پیدا کرتا ہے اور بعض ایسی صفات ہیں جس میں محنت و مجاہدہ کو کوئی دخل نہیں وہ از اول تا آخر خدا تعالیٰ کا عطیہ و انعام ہوتی ہیں۔

میں نے ہی آپ کو بتایا تھا کہ صاحبِ سوانح کے ایک نامور شاگرد مفتی محمود صاحب^ع نانوتوی نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

"ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے زیادہ کامیاب کوئی مصنف اور حضرت شاہ صاحب کشمیری سے بڑھکر کوئی مدرس پیدا نہیں ہوا۔"

واقعہ یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کا سلیقہ یا معمولی بات کو بھاری بھر کم بنا دینا اور اثر آفریں انداز میں اسے پیش کرنا ایک وہبی چیز ہے محنت و ریاضت سے اس میں جلاء تو پیدا

ع نانوتہ ضلع سہارنپور کے اس مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ایک نامی گرامی فرد حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ ہیں۔ دار العلوم دیوبند تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے اور بعض ذاتی پریشانیوں کے نتیجہ میں یہاں تکمیل نہ کر سکے غالباً ان کی تکمیل اجمیر کے کسی مدرسہ میں ہوئی لیکن حضرت شاہ صاحب سے کچھ عرصہ استفادہ کا موقعہ ملا عمر کا بڑا حصہ مہو چھاؤنی مالوہ کے علاقوں میں گزرا۔ اس ریاست میں افتاء نویسی کے معزز عہدہ پر ہمیشہ فائز رہے۔ وسیع المطالعہ اور وسیع النظر عالم تھے اور نزاکتِ مزاج بھی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی اپنے اساتذہ اور ان کے متعلقین کے احترام و رعایت میں بے نظیر واقع ہوئے تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب سے ان کا تعلق عشق کے درجہ میں تھا بیٹھ جاتے تو گھنٹوں ان کا تذکرہ کرتے خود روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے دار العلوم کی شوریٰ کے رکن رہے اور کچھ عرصہ دار العلوم ہی کے دار الافتاء میں بعہدۂ صدر مفتی کام کیا۔ عمر ستر کے قریب تھی کہ صبائے اجل نے گردِ حیات سے دامن کو فارغ کیا اب زندگی کے بار سے سبکدوش ہو کر آغوشِ لحد میں یکسوئی کی زندگی گذار رہے ہیں۔

ہوتا ہے لیکن فقدانِ صلاحیت، ریاضتی تحریروں میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے ہندوستان کے مشہور انشار پرداز و مورخ مولانا شبلی نعمانی کے متعلق سنا ہے کہ کسی شاگرد نے کوئی مضمون برائے اصلاح ان کے سامنے پیش کیا مولانا نے مطالعہ کے بعد فرمایا کہ تم اس میدان کے آدمی نہیں ہو اس لئے اس طرف قطعاً توجہ نہ کرو۔ اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ وفورِ علم، وسعتِ مطالعہ اور غیر معمولی تبحر کے باوجود صاحبِ سوانح تصنیف و تالیف کے معروف اسلوب کے خوگر نہیں تھے قدیم زمانے میں اغلاق پسندی، مبہم عبارتیں، پیچیدہ طرز بیان ہماری درسگاہوں اور دانشور طبقہ کا خصوصی اسلوب رہا ہے آج تک ہمارے نصاب میں بعض ایسی کتابیں شریک چلی آتی ہیں جو اپنی شانِ خاص میں قدیم روش کی آئینہ دار ہیں۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں اس کی وجہ اغلباً یہ ہے کہ قدیم عہد میں حصولِ علم، پختگی استعداد اور متعلقہ عنوانات سے ہر کس و ناکس کی تفصیلی واقفیت اس قدر عام تھی کہ مصنفین اس پر بھروسہ کر کے بجائے سہل نگاری کے پر پیچ تعبیر اختیار کرتے اگر چہ قدیم مصنفین کے یہاں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ وہ اپنے عہد کے عام روش سے ہٹ کر سہل نگاری میں طاق ہیں انقلابات زمانہ نے انحطاطِ قوی و استعداد کے پیشِ نظر اس عام طرز میں تبدیلی کے لئے مصنفین کو مجبور کیا اور اب تصنیفی کمال دقت پسندی میں نہیں بلکہ اہم اور دقیق مباحث کو بھی آسان اور سہل بنا دینا امتیاز ہے۔ بہر حال صاحبِ سوانح تصنیفی و تالیفی لائن میں قدیم روش پر گامزن ہیں۔ سنا ہے کہ مرحوم نے کوئی اپنی تالیف اپنے استاذ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو سنائی تو مرحوم نے سنکر عجیب تبصرہ فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ

"شاہ صاحب اس کی شرح بھی لکھ دیجئے تاکہ اساتذہ بھی اس سے استفادہ پر قادر ہو سکیں۔"

لیکن معلوم ہے کہ دنیا کی کونسی وہ تصنیف ہے جسکے فہم کے دروازہ پر نہ کھلنے والے قفل پڑے ہوں۔

خدائے تعالےٰ کے کلام سے بڑھکر کس کا کلام معجز ہوگا لیکن انسان اپنی پرواز کے مطابق اس کلام کے سمجھنے سے بھی قاصر نہ رہا پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ فلاں مصنف کی تالیفات و تصنیفات ناقابلِ استفادہ ہیں ہر شخص اپنے ہی مقام و منصب کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ

"میں نے کسی بلیغ کو نہیں دیکھا جس کے الفاظ مختصر نہ ہوں اور اس سے
معانی بے پناہ نکلتے نہ ہوں"
یہ ذیلاً گفتگو تو ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے بعض اہلِ علم کی تصانیف کو یہ کہکر
متروکاتِ سخن میں سے بنادیا ؎

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہایہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

حالانکہ ابن ندیم مشہور مصنف نے خوب لکھا ہے کہ
"سننے والے نتائج کے منتظر رہتے ہیں نہ کہ مقدمات کے اور طبائع
مقصود کی تلاش کرتی ہیں جبکہ طویل عبارتوں سے گھبراتی ہیں"
خلیل بن احمد کا یہ مقولہ بھی نظر سے گذرا کہ
"ہم اگر چاہتے تو ایسی شرح کر سکتے تھے کہ اس سے ناقص و کامل
یکساں فائدہ اٹھاتے لیکن ہم نے بعد میں آنے والوں کے لئے بھی کچھ چھوڑ دیا"
شرحِ مفصل میں ابن یعیش کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ
"جو شخص کلام کو مختصر کر سکتا ہے وہ اسے کھینچ کر دراز بھی کر سکتا ہے"
لیکن علمائے ربانی کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا کہ وہ جو کچھ لکھتے ضرورت سمجھ کر
پوری حسنِ نیت سے عبارت آرائی مرصع انشار، دیدہ زیب ترتیب اور بھاری بھرکم عبارتیں انکے
پیشِ نظر نہ رہتیں۔ خود صاحبِ سوانح کے درس میں ایک بار حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح
نے شرکت فرمائی سبق سے اٹھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ
"شاہ صاحب کے ایک ایک لفظ کی شرح میں مکمل رسالہ تصنیف
کیا جا سکتا ہے"
آپ کی تصنیفی و تالیفی آثر کی حقیقی حیثیت سامنے لانے کے لئے کلیتاً گوئی سے کام
لینا پڑا ورنہ تو بات آپ کی تصانیف ہی کے بارے میں چل رہی تھی معلوم ہے کہ فتنۂ قادیانیت
سے پہلے ہندوستان کی فضا میں حنفیت کو رسوا کرنے کے لئے ایک خاص مکتبۂ فکر کی جانب
سے جوجد وجہد کی جارہی تھی۔ حالانکہ اسے بقوت روکنے کے لئے ہندوستان کی ایک
معروف شخصیت کا یہ تنبیہی ارشاد بھی موجود تھا کہ

"مجھے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خاص طور پر تقلید اور خصوصاً ہندوستان میں حنفیت پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی گئی"۔

مگر جو کچھ ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ علمی انداز میں اس پھیلائے ہوئے فتنہ کی بیخ کنی کی جائے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ تقریباً ایک صدی سے ہندوستان کے درس کا ایک بڑا حصہ حدیث سے حنفیت کی تائید واستحکام کے مقصد میں صرف ہو رہا ہے اس پس منظر میں اگر ہمارے قدیم علماء کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے جن کا بیشتر تعلق اختلافی مسائل سے ہے تو پھر ان کی قلمی کاوشیں بے معنی نظر نہیں آئیں گی اور جب ہندوستان میں فرنگی اقتدار کی ڈھکی چھپی سازشوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے بالمقابل قادیانی نبوت کا بُت تراش کر کھڑا کر دیا گیا تو حق پرست علماء کو اپنی علمی توانائیاں اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال میں صرف کرنا پڑیں۔ صاحبِ سوانح زندگی بھر انہیں دو موضوع پر اپنے علم کا اکثر سرمایہ صرف کرتے رہے، ان اہم مقاصد سے کچھ وقت بچتا تو اپنا پسندیدہ عنوان "مسئلۂ تقدیر" جبر و قدر، مسئلۂ خلق افعال عباد، جزا و سزا، معاد و معاش، کی اہم گتھیاں سلجھاتے۔ بہر حال اب ان کی تصانیف کا تفصیلی تذکرہ نظرِ قارئین ہے۔

راقم الحروف ترتیب میں سب سے پہلے ان کی قلمی تصنیف

مُشکلاتُ القرآن

کو لیتا ہے۔

قرآن مجید سے ان کا شغف غیر معمولی تھا اگرچہ یہ بھی عجیب و غریب لطیفہ قدرت ہے کہ بے مثال قوتِ حافظہ[عہ] اور بے نظیر یادداشت کے باوجود وہ قرآنِ مجید حفظ نہ کر سکے جس کی وجہ خود ایک بار بیان فرمائی کہ

عہ آپ کے حفظ و ذکا، حافظہ و یادداشت کی داستانیں شہرۂ آفاق ہیں مبصرین نے تو یہاں تک کہا کہ اگر ہم حضرت شاہ صاحب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو متقدمین کے حفظ و یادداشت کی داستانیں ہمارے لئے افسانہ ہی ثابت ہوتیں لیکن اب کہ یہ حاشیہ زیرِ قلم ہے نہ دہی روز پہلے یعنی ۱۸ رجب ۱۳۹۶ھ

(باقی آگے)

"قرآن کھول کر بیٹھتا ہوں تو اس کے بلاغت واعجاز، معانی وجزالت
شوکت و در وبست میں محویت اس قدر ہوتی ہے کہ ایک آیت سے بھی آگے
بڑھ نہیں پاتا۔"

لیکن اس کے باوجود قرآن مجید سے خصوصاً اعجازِ قرآن سے مجتہدانہ تعلق تھا درس میں یہ مشہور مقولہ نقل کرتے کہ

"لم یدر اعجاز القرآن الا الاعرجان احدھما من
زمخشر وثانیھما من جرجان۔"

تو بے اختیار زبان پر آجاتا۔ وانا ثالثھما۔

اور چونکہ قرآن اور اس کی کوئی تفسیر عموماً آپ کے زیر درس نہ رہی بلکہ تدریسی دائرہ ہمیشہ حدیث ہی میں سمٹا رہا حدیث ہی کی تقریر وتبیین میں قرآن سے متعلق ان کے خصوصی افکار ونظریات طلبہ کے سامنے آتے لیکن مشکلات القرآن ان کے قلم سے نکلی جو مفسرین کے لئے ایک راہنما وامام کتاب ہے اسمیں آپ نے پورے قرآن پر اس انداز سے کام کیا کہ جہاں جو آیت یا قرآن کا کوئی موقعہ ہمیشہ سے مشکلات میں سمجھا گیا اس کی صحیح نادر ونایاب و واقعی تفسیر کی تفسیری کتب میں نشاندہی کی ہے خود بھی کچھ لکھا ہے لیکن زیادہ تر یہی طرز پیشِ نظر رہا کہ اہم تفسیری کتب کی نشاندہی فرمائی آپ کی وفات کے بعد مجلسِ علمی ڈابھیل نے اسکو مکمل شائع کر دیا اور مولانا احمد رضا بجنوری نے حواشی میں ان تمام کتابوں کی مراجعت کر کے جن کے آپ نے حوالے دئے تھے اصل عبارت نقل کر دی ہے اسطرح یہ تالیف علماء ودانشور طبقہ کے لئے ایک نایاب ذخیرہ ہے جس کی روشنی میں کسی بھی مشکلات قرآن کی حقیقی وصحیح تفسیر کو معلوم کرنا ممکن ہو گیا۔ دو سو بیس صفحہ کی یہ طویل کتاب آپ کے نامور

صـ کا بقیہ :۔ کو مولانا منظور نعمانی رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند نے سنایا کہ ایک بار دورانِ درس شاہ صاحبؒ نے اپنے حافظہ پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"اب سے چند سال پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر ایک ہی مضمون کو بیس کتابوں
میں دیکھتا تو تین روز کے بعد تک ان سب کتب کی عبارات کو بعینہٖ نقل کر سکتا تھا
لیکن ادھر چند سال سے یہ حال ہے کہ اگر صبح کو مطالعہ کروں تو صرف شام کو ان عبارات
کو من وعن نقل کر سکتا ہوں"

قیام گاہ حضرت امام العصر کشمیریؒ در جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

شاگرد مولانا محمد یوسف البنوریؒ کے طویل مقدمہ کے ساتھ دو بار شائع ہو چکی مولانا بنوریؒ نے چوراسی صفحات کے طویل مقدمہ میں صاحبِ کتابؒ کی مختصر سوانح، قرآن سے اُن کا غیر معمولی شغف، حقائقِ قرآن مجید پر مجتہدانہ بصیرت، اعجازِ قرآن کے بارے میں مرحوم کے خصوصی نظریات کو بیان کرنے کے ساتھ قدیم وجدید تفاسیر پر واقف کارانہ گفتگو کی ہے بلکہ عصر حاضر کی بعض فتنہ انگیز تفسیری کتابوں پر متوازن تبصرہ آگیا کاش کہ مجلسِ علمی اگر اسے پھر شائع کرے تو اس مقدمہ میں نئے اضافہ کی ضرورت سامنے آئیگی۔ کتنی ہی تفاسیر ہیں جو اس دور میں لکھی گئیں اور جنہیں کچھ خاص مکاتیبِ فکر نے تیار کیا ہے۔ مولانا بنوریؒ ہی کا قلم ان کی حقیقت بیان کرسکتا ہے اور اس سے امتِ مرحومہ کو عظیم رہنمائی ملے گی۔ اس طویل مقدمہ کا نام "یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن" ہے۔ یہ مجلسِ علمی کی بیسویں تالیف ہے جسے جمال پریس دہلی سے ۱۳۵۶ھ میں شائع کیا گیا ہے۔

صاحبِ سوانح کے قرآن کریم سے متعلق آثارِ علمیہ کا مفصل تذکرہ ان کے تفرداتِ علمیہ میں تفصیل سے آرہا ہے۔

فیضُ الباریُ

مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے بعد حدیث کی خدمت اور اسی کی شرح وتفصیل میں گذار دیا۔ درسی خصوصیات میں تفصیل سے گذرا کہ حدیث کے درس میں ان بیش قیمت مضامین اور علمی مباحث کا انبار لگا یا جس سے ان کے عہد تک امت صرفِ نظر کرتی رہی تقریباً نیٔہ عمر صرف اس مقصد کے لئے صرف کی کہ حنفیت حدیث کے مطابق ہے یا نہیں پھر فتنۂ قادیانیت نے انہیں اس طرف متوجہ کر دیا کہ حدیث وقرآن اور امت کے اساسی علوم سے اس ہالۂ عظیم کا استیصال بقوۃ کیا جائے۔ اسمیں شک نہیں کہ اسطرح کے فتن وحوادث دانشوروں کے لئے بنیادی علوم میں ان مستور حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں جن کی جانب پہلے سے گوشۂ خیال بھی نہیں ہوتا پھر ان کی ہمیشہ اس طرف بھی توجہ رہی کہ درس میں طلبہ کو اس حد تک مسلح کر دیں کہ وقت کے کسی بھی فتنہ کے مقابلہ کی توانائی ان میں موجود ہو خاص اس مقصد کے لئے انھوں نے درسِ حدیث میں نت نئے علوم پیش کئے۔ اس پر اس کا بھی اضافہ کیجئے کہ وہ ہمیشہ علم وتحقیق کی سنگلاخ وادیوں

میں مسافرانہ بڑھتے رہے۔ جس قدر ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا طلبہ کے سامنے اسے بیان کرنے میں بخل بھی نہیں تھا۔ وہ غریب مدرسین جنھیں بخاری شریف کی تدریس کے لئے آج صرف اردو شروحات کا بھی مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں۔ جن کے معلومات میں نہ گہرائی ہے نہ گیرائی، نہ تحقیق وکاوش کی جولانگاہوں میں ان کا کوئی حصہ۔ ظاہر ہے کہ وہ تدریس میں کسی مجتہدانہ باب کا تو کیا آغاز کریں گے اسلاف کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلنا بھی انکے لئے مشکل ودشوار ہے۔ ایک موقعہ پر خود ارشاد فرمایا کہ

"میں بعض اوقات طویل مجلدات اور ضخیم وعریض کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن کوئی علمی نکتہ میرے ہاتھ نہیں لگتا۔ اگر مطالعہ کے دوران ایک آدھی بات بھی میرے ہاتھ لگ جاتی ہے تو پھر مجھے اپنی طویل محنت وکاوش پر افسوس نہیں ہوتا شیخ عبدالحق محدث الدہلوی کی بھی میں نے جملہ تصانیف کا مطالعہ کیا لیکن افسوس کہ کوئی مفید یا نئی بات میرے ہاتھ نہیں لگی۔"

ظاہر ہے کہ جو شخص علم وتحقیق کی ان بلندیوں اور رفعتوں پر پہونچ چکا ہو اس کے درسی افادات، ژرف نگاہی کا شاداب گلشن اور دیدہ وری کا حسین مرغزار ہوگا پھر وہ عام مدرسین کی طرح اس کے بھی خوگر نہیں تھے کہ جو کچھ صبح کو پڑھانا ہو شب بھر رو پیٹ کر اس کی تیاری کر لی جائے اور رات کی تاریکیوں میں جو کچھ نگلا تھا صبح کو درس میں اسے اگل دیا جائے ایک موقعہ پر خود ارشاد فرمایا کہ

"میں حدیث کی متداول کتب اور ان کی متعلقہ شروحات کے مطالعہ سے طالب علمی میں فارغ ہو چکا تھا مجھے پھر ان شروحات کی جانب مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔"

اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا ہر سال کا درس گذشتہ سال کے مقابلہ میں کافی بدلا ہوا ہوتا ان کے انکشافات واکتشافات میں جو کچھ اضافے وتبدیلیاں ہوتی رہتیں اس کا بدیہی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ درس کا کوئی لگا بندھا منہاج متعین نہ ہوا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انکی تدریس کافی مشکل وگرانبار تھی جس سے کم سواد طلبہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ قصہ کوتاہ۔ درس حدیث میں ابوداؤد ومسلم شریف وغیرہ کی تدریس کے بعد زیادہ تر ان سے متعلق ترمذی

شریف اور بخاری شریف رہیں۔ وہی بخاری شریف ادیم ارض پر قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح و سچی کتاب جسکے مؤلف نے اتنا ہی کارنامہ انجام نہیں دیا کہ لاکھوں حدیث کے انبار سے ایک صحیح ترین مجموعہ تیار کر دیا بلکہ اپنی مجتہدانہ بصیرت، غزارتِ علمی اور غیر معمولی تبحر سے کام لیکر حدیث کو ایک خاص انداز میں جمع کیا جس کے عنوانات اس عظیم امام ہمام کی دقیقہ سنجی و نکتہ آفرینی پر مضبوط شاہد ہیں۔ پچھلوں کی بد قسمتی کہ جب ترجمۃ الابواب کا حق ادا نہ ہو سکا اور اسکے حق کی توفیر کرنیوالے بھی باقی نہ رہے تو بڑی "دانشمندی" سے بخاری شریف کے ترجمۃ الابواب متروکاتِ سخن قرار دیدئے گئے اب شاید درسگاہوں کے وسیع و عریض سلسلہ میں کوئی خدا کا بندہ ایسا ہوگا جو بخاری کے عنوانات کتاب پر اگلوں ہی کے علوم کو نقل کر سکتا ہو۔ ابن خلدون نے تو ایک موقعہ پر یہ لکھ کر دنیا کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

"بخاری کی شرح امت پر ایک قرض ہے جس کی ادائیگی نہیں ہو سکی"۔

اگرچہ حافظ سخاوی تلمیذِ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے ابن خلدون کی اس رائے کو یہ کہہ کر مضمحل کرنا چاہا کہ

"ہمارے استاذ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر اس بارِ قرض سے امت کو سبکدوش کر چکے ہیں"۔

کچھ بھی ہو لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ترجمۃ الابواب بخاری کے اب تک مدفون خزینے ہیں جنہیں بر آمد کرنے سے عام علماء عاجز ہیں۔ صاحبِ سوانح خود بحسرت فرماتے۔

"کاش ابن تیمیہ ترجمۃ الابواب پر کچھ لکھتے تو امت کے ہاتھوں ایک عجیب و غریب خزانہ لگتا"۔

الشاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے ترجمۃ الابواب پر مختصر لکھا اور اپنے شایانِ شان لکھا یہ بخاری شریف کے مطبوعہ نسخوں کے ساتھ منسلک ہے۔ صاحبِ سوانح کے استاذِ اکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ترجمۃ الابواب کے نام سے بخاری علیہ الرحمہ کی دقیقہ سنجیوں کو حل کرنے کے لئے خاص الخاص نکتہ آفرینیوں سے کام لیا۔

بہرحال عرض تو یہ کرنا تھا کہ ہماری درسگاہوں میں امام ہمام کے اس خاص شاہکار یعنی ترجمۃ الابواب کو بالکل ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن مرحوم شاہ صاحب فقہی مکاتیب کے

خلافیات، اختلافی مسائل، حنفیہ کی وجوہِ ترجیح وغیرہ سے ترمذی میں فراغت حاصل کرتے بخاری شریف میں زیادہ تر توجہ ان ہی ترجمۃ الابواب پر رہتی اور پھر بخاری کی ان اہم خصوصیات کو اجاگر کرتے جس کے لئے اس کامل ومکمل مجموعہ نے کائناتِ علم میں شہرت حاصل کی ہے مثلاً

(۱) سب سے پہلے ان خفی واخفی گوشوں پر طلباء کو متوجہ کرتے جن کی جانب امام نے اشارے کئے ہیں اس ذیل میں نادر تحقیقات کا آپ انبار لگاتے۔

(۲) شارحینِ بخاری کے اقوال، حافظ ابن حجر عسقلانی کی زیادتیوں کا شافی جواب بدر عینی کے تعقبات پر حافظ ابن حجرؒ کا تذکرہ اور پھر ان دونوں جلیل القدر ائمہ میں محاکمہ عہ

(۳) شرحِ حدیث میں اپنے حنفی تصلب کے باوجود انصاف کے ساتھ ان تشریحی اقوال کو ترجیح دیتے جو حدیث سے قریبی مطابقت رکھتے ہیں۔

(۴) ذیلاً ان نکات کی جانب خاص توجہ رہتی جن سے سلف وخلف نے اعتناء نہیں کیا۔

(۵) پھر یہ صرف حدیث کا درس نہیں تھا بلکہ وہ حدیث کے ذیل میں امہاتِ علوم کا بھی تذکرہ کرتے اور بتاتے کہ حدیث بھی قرآن کی طرح اساسی علوم پر مشتمل ایک فن ہے خصوصاً عصری فتنوں کی بیخ کنی کیلئے حدیث سے کام لینے کا گر طلباء کو سکھاتے اور ان مواقع کی تعیین وتشخیص فرماتے جو نت نئے فتنوں کے لئے بہترین ہتھیار ہیں۔

(۶) شارحینِ حدیث خصوصاً مخالف حنفیہ مکتبۂ فکر کی جلیل القدر شخصیتوں کی زلات پر ان کی جلالتِ شان کا پورا احترام رکھتے ہوئے طلباء کو مطلع کیا جاتا۔ مولانا بدرِ عالم نے مظاہر العلوم سے فراغت کے بعد شاہ صاحب کے درس میں مکرر شرکت کی اور سالہاسال کی تدریسی زندگی اور مشکلاتِ علوم پر تام اطلاع کے ساتھ غالباً آپ کے بخاری شریف

عہ مرحوم حافظ بدر عینی کی علمی کوششوں وکاوشوں سے زیادہ مطمئن نہیں تھے بلکہ حافظ ابنِ حجر کا انہیں صحیح جواب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار سبق میں فرمایا کہ میں نے حافظ بدر عینی کو خواب میں دیکھا تو ان سے کہا کہ آپ کی دفاعی کوششوں سے امت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا۔ بدر عینی نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ظالم ابن حجر ہیں انھوں نے ابتداء کی میں صرف دفاع کرنے میں مصروف رہا اور اپنے موقف کے جواز میں "البادی اظلم" والی حدیث بھی پڑھی۔

انور بلڈنگ | دارالاہتمام برائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، تاسیس از دست مبارک حضرت امام العصر المغفور۔
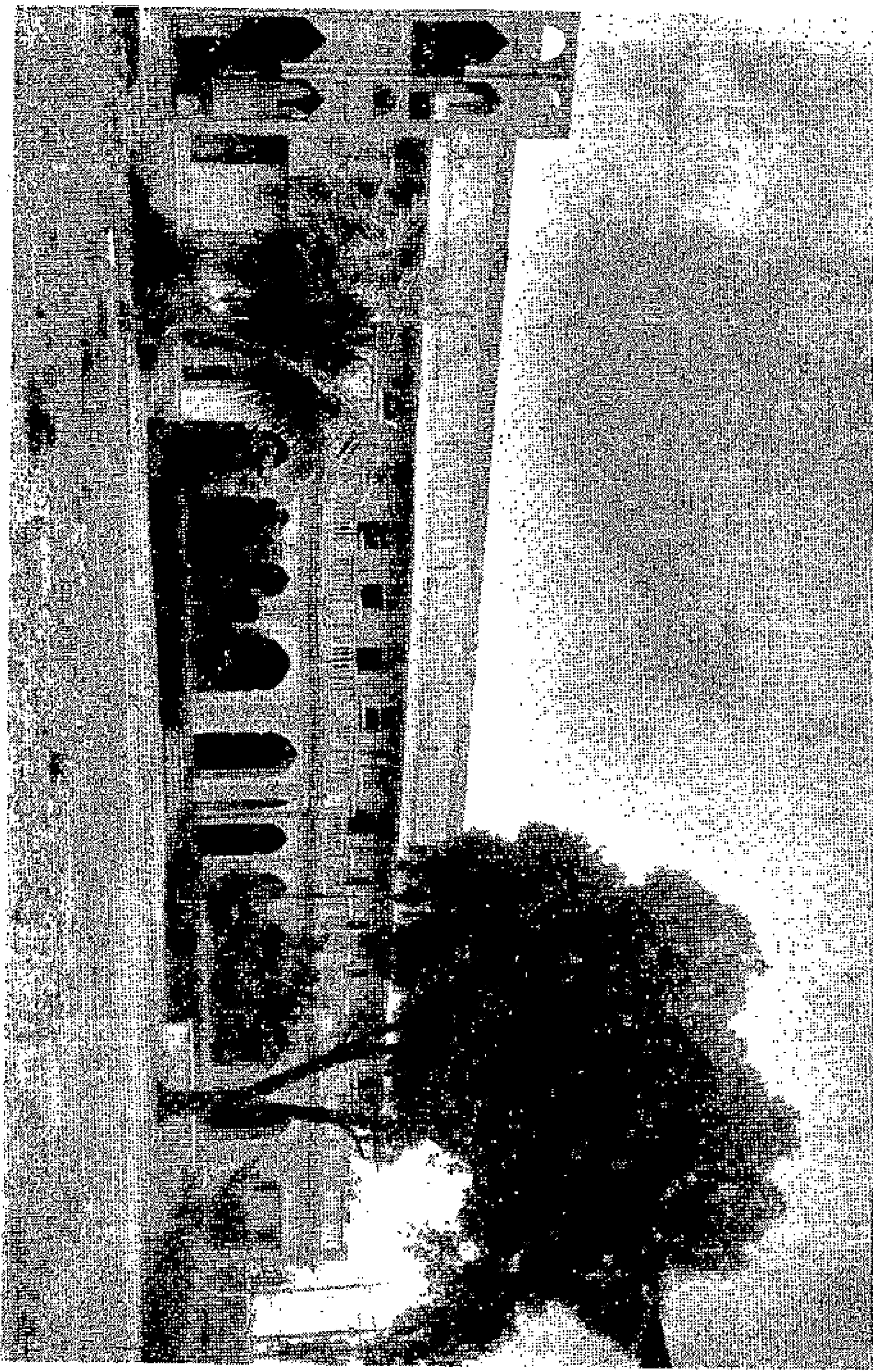
کے سبق میں چار مرتبہ سے زیادہ شریک رہے ساتھ ہی شاہ صاحب کے مستند تلامذہ سے
ان سے لکھی ہوئی املائی تقریروں کو "فیض الباری" کی ترتیب کے وقت سامنے رکھا اس سے
بڑھکر یہ کہ جب تک شاہ صاحب بقیدِ حیات رہے تو ان ہی کے علمی فیوض میں پیدا اشکالات
کے لئے مسلسل مراجعت کرتے رہے اس "فیض الباری" پر مولانا بدرِ عالمؒ نے حواشی بھی
لکھے ہیں جن میں شاہ صاحب کے دوسرے درسی افادات کو ان کے تلامذہ کے حوالے سے
نقل کیا ہے۔ "فیض الباری" کا بھی عجیب و غریب معاملہ ہے مرحوم کے بعض تلامذہ کا اصرار ہے
کہ ان املائی تقریروں میں کچھ ایسی باتیں بھی آگئیں جنہیں ان کے قدیم تلامذہ نے درس میں
نہیں سنا۔ عرض کرچکا ہوں کہ مسلسل مطالعہ کے نتیجہ میں شاہ صاحب کی تحقیقات میں خود
تغیر ہوتا رہتا ممکن ہے کہ "فیض الباری" میں یہ نقص جو نظر آرہا ہے اسی کا نتیجہ ہو پھر اسکے علاوہ
مؤلف نے بکمالِ دیانت بار بار حواشی میں بے تکلف اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں حضرت شاہ
صاحب کے کلام کو سمجھ نہیں سکا یا آپ سے مراجعت کے باوجود میں بات سمجھنے سے قاصر رہا۔
ظاہر ہے کہ اس دیانت پسندی کے باوجود مؤلف پر یا اس کی نیت پر کوئی شبہ نہیں
کیا جاسکتا کچھ بھی ہو لیکن راقم الحروف کا یہ تأثر ہے کہ شاہ صاحب کے علمی تعارف
میں اس تالیف کو بڑا دخل ہے۔ مولانا بدرِ عالم کی سہل نگاری، عربی تحریر پر قدرت، دلنشیں
اسلوب اور شگفتہ انداز نے کتاب کی قیمت کو بلند و بالا کیا ہے لیکن افسوس کہ یہ تراز خانی اس
شدّ و مد سے کی گئی کہ "فیض الباری" کے سب سے پہلے ناشرین کتاب کو دوبارہ شائع کرنے
کرنے کے لئے تیار نہیں اور غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ہند و پاکستان کے متعدد ناشرین
نے اس قیمتی علمی اثاثہ کو شائع کرنا چاہا تو ناخدایانِ مجلسِ علمی نے اپنے قانونی حق کو استعمال
کیا جس کے نتیجہ میں غریب ناشرین حوصلہ ہار بیٹھے۔ اس طرح علماء و مستفیدین
شاہ صاحب کے علوم و معارف سے دھیرے دھیرے محروم کئے جارہے ہیں۔ کاش!
مولوی ابراہیم میاں سملکی ثم افریقی صورتِ حال پر غور کریں یا خود شائع کریں یا دوسروں
کے حق میں دست بردار ہوجائیں۔ ان کے والد نے شاہ صاحب کے علوم کو زندہ جاوید
بنانے کی مستحسن کوششیں کیں پسماندگان بھی کم از کم اس راہ پر گامزنی کرکے علمی دنیا
سے اپنے لئے تبریک کا حق پیدا کرسکتے ہیں۔

عرف الشذی

صحاح ستہ میں ترمذی شریف اگرچہ اپنی ثقاہت وصحت، درستگی وانضباط، محدثانہ اصول وضوابط کے پیش نظر کوئی خاص حیثیت کی مالک نہیں مگر مصنف نے فقہی مذاہب کا اہتمام، اقوالِ فقہاء کا انضباط، حدیث کی حیثیت پر جو گفتگو کی ہے اس سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دینی درسگاہوں میں سب سے زیادہ اعتناء ترمذی ہی سے کیا گیا۔ مرحوم بھی ترمذی کے درس میں علوم متعلقہ حدیث کے علاوہ زیادہ توجہ حنفیت کی وجوہِ ترجیح پر فرماتے اس ذیل میں امام ابوحنیفہ کے افکار وعقائد کی تفصیل، انکے ماخذ کی نشاندہی، باقی ائمہ کے اقوال کی تفصیل، ذیلاً شارحین حدیث کے نوادرات کا بیان، متقدمین اور اکابر علماء کے منتخب اقوال کا تذکرہ حدیث کی تائید میں مختلف احادیث کا بیان اور وہ سب کچھ مباحث جو فنِ حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں ترمذی کے درس کی ابتداء آپ کے عہدِ شباب سے ہوئی اس وقت حافظہ بیدار، یادداشت تلاطم پذیر، انتقالِ ذہنی حیرت انگیز تھی اس لئے اقوالِ علماء کی تفصیل جامع انداز میں فرماتے سینکڑوں کتابوں کے حوالے بقیدِ صفحات اور غیر مطبوعہ کتب کی نشاندہی ہوتی۔ ایک نامور شاگرد مولانا محمد چراغ صاحب عہ نے دورانِ درس ان بیش بہا افادات کو ضبط کیا۔ درس ہی میں عام اساتذہ کے افادات کو بھی محفوظ کرنا دشوار ہوتا ہے چہ جائیکہ حضرت شاہ صاحب ایسے متبحر عالم کی درسی تقریروں کو ضبط کرنا معلوم ہے کہ جامع کبھی متکلم کی مراد بھی نہیں سمجھتا اور اسکی تمام توجہ انضباط ہی کی طرف رہتی ہے اس حالت میں کیسے ممکن ہے کہ استاذ کی مراد ومنشاء کو

عہ مولانا پنجاب کے علاقہ کے باشندے دورِ طالب علمی میں ایک ممتاز ومستعد طالب علم کی حیثیت سے مشہور اور فراغت کے بعد ایک فاضلِ محقق کی حیثیت سے متعارف ہوئے مگر افسوس کہ جماعتِ اسلامی سے متاثر ہوئے اور واقف کاروں کا بیان ہے کہ مودودی صاحب کی اکثر تحریروں ونگارشات کا مسالہ مولینا ہی کے زنبیلِ علم کا اندوختہ ہے اس پر بہزار غم وتاسف اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے

ع ربودی گوہرے از ما ونثار دیگراں کردی

ابھی بقیدِ حیات ہیں لیکن راقم الحروف کو کبھی شفاہی ملاقات کا موقعہ نہیں ملا۔

طالب علم صحیح طور پر محفوظ کر سکے پھر جبکہ درس اردو میں ہو رہا ہے اور جامع لگے ہاتھ اسکی عربی کر رہا ہے کس قدر باتیں نظر انداز ہو جائیں گی۔ کتنے ضروری مباحث لکھنے سے رہ جائینگے حوالوں میں کیا کچھ غلطیاں ہوں گی یہ کوئی جزر اصم نہیں ہے جسے سمجھا نہ جا سکے مستزاد یہ کہ جامع طالب علم ہزار صاحب سواد و مستعد لیکن طالب علمانہ خامیاں، تصنیف و تالیف، ضبط و انضباط کے قرینوں و سلیقوں سے ناواقفیت کیا کچھ گل کھلائے گی اسے سمجھنا بہت آسان ہے اس پر اس کا اور اضافہ کیجئے کہ جن ناشرین نے بار بار اس کتاب کو اسی شکل و صورت میں طبع کیا وہ نشر و اشاعت میں کسی خاص اہتمام نہ کرنے کے ہمیشہ سے خوگر رہے پھر یہ خود حضرتِ مرحوم کا کوئی قلمی کارنامہ نہیں بلکہ درسی تقریروں کا ایک مجموعہ ہے مگر حیرت ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری مشہور اہلِ حدیث عالم نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں عرف الشذی کے مندرجات کو خصوصی تختۂ مشق بنایا ہے وہ جابجا عرف الشذی پر تعاقب کرتے ہیں اور پھر اپنی دانست میں شاہ صاحب کے علوم پر دل کھول کر نکتہ چینی[عہ] کرتے ہیں حالانکہ وہ اگر مرحوم کی خود اپنے قلم سے لکھی ہوئی چیزیں اور نوادرات کا مطالعہ کرتے تو غالباً اس طعن و تشنیع بلکہ ناروا و نا ملائم تنقید کا ان کو موقعہ نہ ملتا بلکہ دیانتاً اگر اس پر بھی نظر رہتی کہ ایک طالب علم کا طالب علمانہ کارنامہ ہے جس نے خود اس کتاب کے دیباچہ و آغاز میں حضرت شاہ صاحب کی برارت کرتے ہوئے اس تصنیف کی پوری ذمہ داری اپنے پر لی تو بھی مولانا عبدالرحمٰن کا قلم محتاط رہتا بہر حال عرف الشذی دو جلدوں میں شائع ہوئی اور ناشرینِ کتب نے بار بار اس کو شائع کیا اور اپنی موجودہ حیثیت میں بھی مشکوٰۃ

عہ دہلی میں ایک مشہور اہلِ حدیث عالم جو بخاری کے شارح و مترجم بھی ہیں۔ ایک بار گنج ڈونڈوارہ میں خاکسار کے ساتھ رفیق سفر ہوئے تعارف ہونے پر یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے کہ

"علمائے دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری ایک بحرِ ناپیدا کنار ہیں"

اگرچہ ان کو یہ شکایت بھی تھی کہ

"حنفیت کے اثبات میں ان کا قلم تلوار سے زیادہ تیز ہے"

اس کے علاوہ ہندوستان ہی کے منتخب و چیدہ علماء اہلِ حدیث نے شاہ صاحبؒ کے کمالاتِ علمی اور ان کے تبحر کو دل سے تسلیم کیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا داؤد غزنوی نے تو بار ہا ان سے استفادہ بھی کیا۔

سے لے کر دورۂ حدیث تک تمام اساتذہ کے لئے ایک راہنما کتاب ہے۔ شاہ صاحب اگر کبھی عرف الشذی پر تنقید سنتے تو بحسرت فرماتے کہ "الشعیر یوکل ویذم" اسی عرف الشذی کو بنیاد بنا کر حضرت شاہ صاحبؒ کے شہرۂ آفاق شاگرد مولانا یوسف بنوری نے

مَعَارِفُ السُّنَن

لکھی۔ یہ کتاب متعدد جلدوں میں آچکی ہے اور باقی اجزاء طباعت کے منتظر ہیں۔ مولینا موصوف ہندو پاکستان کے ان علماء میں ہیں جن کے گرامی وجود، متنوع علوم، ذہن ثاقب، بے نظیر حافظہ، تبحر اور جامعیت پر ہندوستان کی چودھویں صدی فخر کر سکتی ہے۔ ان کی کوئی تقریر و تحریر، درس و تدریس اپنے مرحوم استاذ کے تذکرہ سے خالی نہیں۔ عرف الشذی کی خامیوں پر ان کی نظر تھی اسلئے انھوں نے ترمذی پر حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات کو خود ترتیب دینا شروع کیا۔ معارف السنن اپنی طوالت کے باوجود نہ صرف ترمذی کی متداول شروحات بلکہ حدیث کی بہت سی مستند کتابوں سے بے نیاز کر دینے والی کتاب ہے۔ ہندو پاکستان ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں یہ تصنیفی شاہکار اپنا ایک مقام پیدا کر چکا ہے اور بلاشبہ درسگاہیں اب اس سے استفادہ کئے بغیر کسی کامیاب تدریس کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ مؤلف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے پیش کردہ حوالوں کو مأخذ سے نکالا اور مفصل انہیں ذکر کیا ہے۔ ترمذی کے دوسرے شارحین کے اقوال کا تذکرہ بلکہ محدثین کی نادر تحقیقات کا یہ ایک قیمتی مجموعہ ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف کا یہ ایسا تعارف ہے جو انشاء اللہ ابد نشان ثابت ہوگا۔ کتاب حضرت مؤلف کی زیرِ نگرانی مسلسل شائع ہو رہی ہے اور خدا کرے کہ اس کے باقی اجزاء بھی جلد منظرِ عام پر آئیں۔

انوار المحمود

یہ اصلاً صحاح ستہ میں مشہور سنن ابی داؤد پر علامہ کے ان درسی افادات کو جمع کیا گیا ہے جن کا تعلق حدیث کی اس مشہور کتاب سے ہے۔ حضرت نے دار العلوم میں

سالہاسال ابوداؤد کا درس دیا اور یہ درس بھی اپنی ایک انفرادیت لئے ہوئے تھا۔ مولانا صدیق[عہ] مرحوم نجیب آبادی استاذ مدرسہ صدیقیہ دہلی نے ان تقریرات کو جمع کیا اور ذیلاً حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ، مولانا شبیراحمد عثمانی اور بذل المجہود کے منتخبات کا اضافہ کیا۔ یہ طویل وعریض مسودہ جو ایک ہزار سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے شاہ صاحب کی حیات میں قلمبند کیا جاچکا تھا اور آپ نے مطالعہ کے بعد اسکی توثیق بھی فرمائی بلکہ اسکی اشاعت کیلئے مؤلف کو توجہ بھی دلاتے رہے جیساکہ آپ کے ان مکاتیب سے ظاہر ہے جو مؤلف کے نام ہیں اور اس مجموعہ میں شائع کئے گئے ہیں۔ کتاب اب نایاب ہوتی جاتی ہے راقم الحروف کے پاس بھی کچھ افادات متعلقہ ابوداؤد موجود ہیں جنھیں انشاء اللہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ ہے وماتوفیقی الا باللہ۔ اسکے علاوہ حضرت شاہ صاحب کے وہ درسی افادات جو دستبرد زمانہ ہوگئے ان میں مسلم شریف کی مکمل وہ تقریر بھی جسے آپکے نامور شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی نے دورانِ درس قلمبند کیا تھا۔ مولانا ذکی و ذہین، وقارطبیعت کے مالک اور حافظہ کے بادشاہ تھے انھوں نے جس انداز میں یہ افادات مرتب کئے تھے ان کی افادیت وجامعیت پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر افسوس کہ یہ گنجِ گراں مایہ ضائع ہوگیا۔ اسی طرح صحاح ستہ میں داخل مشہور کتاب ابن ماجہ پر خود شاہ صاحب کا قلمی حاشیہ موجود تھا ظاہر ہے کہ یہ حواشی خود آپ کے اپنے قلم سے تھے اور جس مرتبہ وحیثیت کے ہوں گے انہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عہ نجیب آباد ضلع بجنور کے باشندے، پست قامت، رنگ کافی حد تک سیاہ، ہمیشہ سر گھٹا ہوا رکھتے، گرمیوں میں دوپلی ٹوپی اور موسم سرما میں بھاگلپوری عمامہ، لباس وپوشاک کے اعتبار سے قدیم روایتوں کے مولوی تھے اور مضبوط استعداد کے مالک، دہلی میں پھاٹک حبش خاں میں مشہور رئیس حاجی محمد صدیق صاحب پنجابی کا قائم کردہ مدرسہ بنام "صدیقیہ" میں صدر مدرس تھے اور دہلی ہی کی کسی مسجد میں امام بھی۔ جس زمانے میں راقم السطور دہلی میں زمانۂ طالب علمی گذار رہا تھا تو مرحوم کی عنایات سے خاص طور پر سرفراز رہا۔ نجیب آباد میں وفات ہوئی خدا تعالےٰ مغفرت ورحمت کے مرغزاروں میں انہیں داخل فرمائے۔

آثارُ السُّنَن

عجیب بات ہے کہ چار فقہی مکاتیب نظر وجود پذیر ہوئے تو حضرات شوافع کی علمی ہمتیں احادیث کی جمع و ترتیب میں مصروف رہیں چنانچہ آج عالم اسلام کی کوئی بھی درسگاہ ایسی نہیں جسمیں یہی حدیثی مجموعے زیرِ درس نہ ہوں. مالک علیہ الرحمہ کے قلمِ مبارک سے ان کا مشہور موطا مالکی فقہ کے لئے آج اساسی کتاب ہے۔ احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کا مسند حنابلہ کے لئے کافی وشافی ہے۔ احناف ہی کا ایک ایسا فقہی اسکول ہے جس کے پاس خود کسی حنفی امام کی تیار تالیف نہیں امام محمد علیہ الرحمہ کا موطا امام طحاوی کی معانی الآثار ثانوی درجہ میں داخل کی گئیں اور خود احناف ان سے وہ استفادہ نہ کرسکے جس کی یہ دونوں کتابیں مستحق تھیں۔ تاریخی اعتبار سے اسکے کچھ علل واسباب ہیں جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں. بہرحال یہ ایک کمی وکوتاہی تھی جس کے تدارک کے لئے متاخرینِ احناف ہمیشہ متوجہ رہے۔ حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ نے اپنی زیرِ نگرانی اعلاء السنن کئی جلدوں میں تیار کرائی جسمیں ان احادیث کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا گیا جس سے حنفی فقہ کی تائید وتصویب حاصل ہو۔

عہ مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم سے سنا ہے کہ بعہدۂ صدر مدرسی حضرت شاہ صاحب نے مولانا موصوف کو ابن ماجہ پڑھانے کے لئے سپرد کیا مولانا نے رہائشی کمرہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں اس کتاب کو پڑھانے سے عاجز ہوں کتاب اپنی ترتیب کے اعتبار سے بے نظیر اور بعض اس کے ابواب عام محدثین کے طرز سے جدا اس پر مستزاد یہ کہ کوئی شرح یا مددگار کتاب بھی موجود نہیں۔ یہ سب کچھ سنکر علامہ کشمیری نے ایک کتاب اٹھا کر دی فرمایا کہ اس کتاب کا مطالعہ کرکے پڑھاؤ. مولانا کا بیان ہے کہ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ خود حضرت شاہ صاحب کے قلمی حواشی ہیں جنھیں پوری کتاب پر درج کیا گیا ہے میں نے اگلے روز عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو ان حواشی کی پوری نقل لے لوں اجازت ملی اور شیخ الادب نے حواشی کو نقل کیا. شاہ صاحب کی وفات کے ایک عرصہ بعد خود مولانا نے کتب خانہ اعزازیہ دیوبند کو یہ نسخہ دیا کہ ایک گنج نایاب ہے اسے شائع کیا جائے جس کا مدتوں پھر پتہ نہ چل سکا سنا ہے کہ حال ہی میں یہ پاکستان سے شائع ہوا جس پر حضرت شاہ صاحب کا نام نہیں حضرت شاہ صاحب کا اصل نسخہ کہاں گیا؟ اور اس منقول حاشیہ نے

(باقی آگے)

بہار کے مشہور عالم مولانا ظہیر احسن شوق نیموی نے دو جلدوں میں آثار السنن کے نام سے ان احادیث کو یکجا کیا جو فقہ حنفی کی مؤید ہیں۔ مولانا نیموی نے اسے نظر ثانی کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا اور حضرت کی وساطت سے علامہ کشمیریؒ کی نظر سے گذرا علامہ نے اس کارنامہ کی داد اسطرح دی کہ دو قصیدے مولانا نیموی اور ان کے شاہکار کی ستائش میں لکھے جو آثار السنن کے ساتھ طبع پذیر ہوئے پھر آپ نے اسی آثار السنن پر مکمل حاشیہ کا اضافہ کیا جس میں احناف کے مؤیدات کو اس کثرت سے جمع کیا گیا کہ وہ حواشی خود ایک خزانۂ علم ہیں جنھیں دیکھ کر مشہور شامی عالم شیخ ابو الفتاح ابو غدہ نے ان ناقدر حلقوں کو ان الفاظ میں خطاب کیا جو اب تک ان حواشی کو منظرِ عام پر نہیں لا سکے لکھا ہے کہ

"عبد الفتاح کہتا ہے کہ علم کے بہت سے خزانے سینوں اور سفینوں میں مدفون ہو کر رہ گئے جن کی گم کردگی میں ان ابنائے روزگار کا ہاتھ ہے جو سب کچھ کر سکتے تھے اور کچھ نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ خصوصاً مولانا یوسف بنوری پر امت کا یہ ایک ایسا قرض چلا آتا ہے

صـــ کا بقیہ:۔ از ہند تا پاکستان مسافت کس طرح طے کی؟ یہ بھی معلوم نہیں۔ سنانے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ ایک بلند قامت مجلس میں طحاوی شریف کی تدریس سے متعلق مشکلات کے بیان میں جب یہ عرض کیا گیا کہ اس کی کوئی شرح نہیں تو اس پر کچھ بلند پایہ انسان دیر تک لطف لیتے رہے اور اس عذر کو صرف لنگ نہیں بلکہ مہمل قرار دیا گیا کیا مولانا اعزاز علی صاحب ایسے کہنہ مشق منجھے ہوئے استاذ الاساتذہ کا وہ عذر جو ابن ماجہ پڑھانے سے پیش کیا اور جس کی تفصیلات ابھی قلمبند ہوئیں ان اکابر کے لئے کسی خاص توجہ کا مستحق ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ بعض علمی مشکلات کو تجربوں سے ہٹ کر جب صرف علمی انداز میں سوچا سمجھا جائیگا تو دوسروں کی تجہیل بہت آسان ہو جائے گی۔
عــہ پچھلے سالوں میں صدقِ جدید میں ایک بحث یہ چل نکلی تھی کہ شوق نیموی کے شاہکار پر علامہ کشمیریؒ نے نظرِ ثانی کی ہے یا نہیں؟ افسوس کہ اب مولانا نیموی کے پسماندگان اس سے منکر ہیں۔ حالانکہ بات صاف ہے کہ اگر نظر ثانی کی تو اس سے علامہ کی عظمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور مولانا شوق کی علمی رفعتوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ درانحالیکہ مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے خود حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے درج کیا ہے کہ انہیں آثار السنن نظر ثانی کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پہونچی۔

جس کی ادائیگی بغیر ادائیگی ممکن نہیں۔ میں بار بار مولوی ابراہیم میاں سملکی ثم افریقی کو توجہ دلا چکا ہوں کہ وہ اس اہم علمی کام کی جانب توجہ کریں۔ اگر یہ حواشی منظرِ عام پر آ گئے تو حنفیت کو وہ استحکام پہونچے گا جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔"

شاہ صاحب نے ان حواشی میں جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں بلا شبہ ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ مولانا محمد میاں سملکی ثم افریقی جو شاہ صاحب کے علوم کے خاص قدر دان تھے ان کی سعی وکوشش سے اس قلمی نسخہ کی چند عکسی نقول لندن میں لی گئیں اور خاص خاص تلامذہ کے ساتھ ہندوستان کی مشہور دینی واسلامی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں میں بھیجدی گئیں۔ اس طرح اس گنجِ گراں مایہ کی فی الجملہ حفاظت ہوگئی لیکن بقول شیخ ابوغدہ امتِ مرحومہ کے اساطینِ علماء کو خاص کر حضرت شاہ صاحب کے موجودہ تلامذہ کو اس بارِ قرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہونا ہے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔

فصلُ الخطابُ

معلوم ہے کہ علامہ کا تمامتر ذوق اور ان کی پوری زندگی حنفیت کے استحکام وتائید میں گذری اس لئے جب کبھی تصنیف وتالیف کے لئے قلم اٹھا تو بیشتر انہیں مسائل پر توجہ رہتی جو احناف اور دوسرے فقہی مکاتیب میں نزاعی ہیں جن کے بارے میں عام تاثر یہ دیا گیا کہ احناف ان مسائل میں قیاسی موشگافیوں کا سہارا لیتے ہیں حدیث وقرآن سے انہیں کوئی تائید نصیب نہیں۔ مرحوم کا خاص ذوق یہ بھی تھا کہ اختلافی مسائل میں زیادہ تر اساطین احناف کے ان اقوال کو اختیار فرماتے جن سے دوسرے فقہاء سے قرب واتحادِ خیال ثابت ہو اگر مختلف فیہ مسائل میں ایسے جامع اقوال نہ ملتے تو پھر ایک طریقِ فکر یہ بھی رہا کہ استحباب مندوب، افضل وارجح کی تعبیرات میں اختلاف کی شدت کو کم کرتے۔ خود فرماتے کہ چند ہی ایسے مسائل ہیں جن میں اختلاف شدید نوعیت کا ہے انہیں میں سے ایک قراءۃ خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے فصل الخطاب تالیف فرمائی جو ایک سو چھ صفحات کا رسالہ ہے جسے ۱۳۳۱ھ میں لکھا گیا اور مجلسِ علمی نے آب وتاب سے شائع کیا اسکی

ابتدا اس طرح ہے۔

"اللهم لك الحمد حمدا دائما مع خلودك ولك الحمد حمدًا لا منتهى

له دون علمك الخ۔"

وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"یہ فاتحہ خلف الامام کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق کی روایت کے

بعض اسنادی طریقے ہیں جن میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کا سیاق کیا ہے

بنیادی حقیقتوں کو ظاہر کرتے ہوئے حقائق و معانی کی وضاحت کی گئی ہے

اگرچہ میں جس انداز کی وضاحت چاہتا تھا کر نہیں سکا اور بحث کو اس انداز

میں سمیٹنا بھی ممکن نہ رہا جسطرح سمیٹنے کی خواہش تھی تاہم کچھ ایسی بحثیں

اسمیں ضرور آگئیں جن کے بغیر اس مسئلہ کی تحقیق ممکن نہیں اور جن سے

فکر و نظر کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔"

آخر میں تحریر فرمایا کہ

"ثم لم اخرج عن اقوال اصحابنا وان نزلت عن بعضهم

الى بعض ولا ينبغي لعاقل ان يفسد دينه بدنياه ويجعل عاجلة

على عقباه وما توفيقي الا بالله وهو حسبي ونعم الوكيل۔"

خاتمہ پر مقصدِ تالیف اس منصفانہ انداز میں بھی زیر قلم آیا۔

"یہ سطور شوافع کے خیالات کی تردید میں نہیں لکھی ہیں صرف اتنا

چاہتا تھا کہ ترک قرارت خلف الامام کے سلسلہ میں احناف کا نقطۂ نظر

سامنے لے آؤں اس لئے میں بحث کے دروازے کو بند کرنے والا ہوں

قیل و قال کے سلسلہ کو دراز کرنے والا نہیں اگر قاری اس فرق کو

ملحوظ رکھ سکے تو میں اپنے حق میں دُعائے خیر اور موت کے بعد ایصالِ ثواب

کا طالب ہوں اگرچہ یہ ایصالِ ثواب صرف سورۂ فاتحہ ہی سے ہو۔ فانه

لاصلوٰة لمن لم يقرأ بها۔"

مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام خاتمہ پر سورۂ فاتحہ کا تذکرہ درآنحالیکہ یہ

تالیف اسی سورۃ سے متعلق خلافیات کو نمٹانے کے لئے ہے معنی خیز نگارش کی ایک جمیل تصویر ہے۔

خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب

قرارت خلف الامام ہی کے مسئلہ سے متعلق یہ آپ کی پہلی تالیف ہے جسے آپ نے ایک دن میں قلم بر داشتہ تحریر فرمایا اس کی زبان فارسی ہے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تقریظ تحریر فرمائی ہے اس رسالہ کا اختتام اس رباعی پر ہے۔

واذا کنت فی المدارک غرًا ثم ابصرت حاذقا لا تماری

واذا لم تری الھلال فسلم لا تأس رأوہ بالابصار

عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام

متنبّی پنجاب غلام احمد قادیانی جس کی بدترین تحریک دعوائے نبوت نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور جس ہائلہ کی شدت پر آپ بہت کچھ سن چکے اسی شخص نے نت نئے دعوے اور روزمرہ اپنے منصوبوں میں جو تبدیلیاں کیں ان کی داستان تو طویل و تلخ ہے۔ یہاں تو یہ بتانا ہے کہ قادیانی نے اپنے متعلق مسیح موعود کا دعویٰ کیا اور خدا کے برگزیدہ پیغمبر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے صراحۃً اعلان کیا کہ ان کی وفات ہوگئی۔ قرآن میں مذکور حضرت عیسیٰ کے رفعِ آسمانی کو حقائق کو افسانہ قرار دیا اور نزولِ عیسیٰ کی بنیادی حقیقتوں کو داستان پاستان بتایا کبھی کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور وہ کشمیر کی راجدھانی سری نگر میں دفن ہیں۔ گاہے مدعی ہوا کہ مقبرۂ عیسیٰ مکہ یا مدینہ میں ہے۔ زادھما اللہ شرفا بلکہ اس دشنام طراز بدبخت نے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدۂ ماجدہ مریم عذراء کی جو گستاخانہ دل آزار توہین کی ہے وہ اس کی شقاوتوں وقساوتوں کا بدترین نمونہ ہے۔

علامہ کشمیری کو اپنی حیاتِ مستعار میں اس فتنہ کی شدت اور اس کے تعاقب کا جو اہتمام رہا اس کی تفصیلات بھی پیش کی جا چکیں۔ آپ نے خود بھی لکھا اہل علم اور دانشوروں کو بھی متوجہ کیا جا بجا تردیدِ قادیانیت کے لئے خود بھی تشریف لے گئے اور اپنے تلامذہ کو

بھی بھیجا۔ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰے علیہ الصلوٰۃ والسلامٌ ہے۔ یہ ڈھائی سو صفحات کا رسالہ ہے جسے رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ میں تصنیف فرمایا۔ رسالہ کے مضامین حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کے دلائل، قربِ قیامت میں ان کا نزول وغیرہ ہیں اس کی ابتدا میں ارشاد ہے:۔

> الحمد للہ الذی جعل الحق یعلو ولا یعلے وجعل کلمتہ ھے العلیا وترك الباطل نبذًا ساَبیا یذھب جفاءً وھواء وکلمتہ ھے السفلے وھے عاقبتہ ھے السوأی۔

مقدمہ میں ارشاد ہے:۔

> "حیاتِ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے متعلق میں نے طلباء کے سامنے ارتجالاً ایک تقریر کی تھی مقصد یہ تھا کہ وہ اس سلسلہ میں مسلّح رہیں اور قادیانیت کی تردید کے لئے مستعد ہوں۔ بعد میں ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے تالیف کی شکل دوں تاکہ امتِ محمدیہ زیغ وضلال سے محفوظ رہے اور قرآنی حقائق کی منکر ہوکر عذابِ الٰہی کی مستحق نہ بنے۔"

حضرت شاہ صاحب نے اس کا ایک نام اپنے قلم سے "حیاۃ المسیح بمتن القرآن والحدیث الصحیح" بھی تحریر فرمایا ہے۔

تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام

آٹھ سال بعد اور اپنے سانحۂ وفات سے ایک سال پہلے ۱۳۵۱ھ میں بزمانہ قیام ڈابھیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی حیات سے متعلق ڈیڑھ سو صفحات کا یہ رسالہ تصنیف کیا جسکی ابتدا یہ ہے۔

> "الحمد للہ الذی ایّد الحق وشیّدہ واعلے منارہ ورفع رأیاتہ بحیث صفقت بین اجنحۃ الملائکۃ ونصر انصارہ والصلوٰۃ والسلام علے نبی الھدی۔"

مقدمہ میں تحریر فرمایا کہ

"قرآن وحدیث سے حیاتِ عیسیٰ کے جو دلائل صراحتہً واشارۃً
مہیا ہیں ان پر اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں لیکن کچھ بحث کے گوشے
باقی رہ گئے تھے جن پر اس جدید تالیف میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔"

شقی قادیانی سے جو ان کی نفرت اور اس کے تذکرہ سے پاکیزہ جذبات میں جو ہیجان پیدا ہوتا اسی کا نتیجہ ہے کہ اس تالیف کا نام بیان کرتے ہوئے بے اختیار ان کے قلم سے یہ غضب آلود فقرے ٹپک پڑے لکھا ہے۔

"وسمیتھا تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰی علیہ السلام تضمنت
تفسیر ایات فی افحام ذلك الملحد العنید والشیطان المرید
القادیانی الکذاب المتنبی الکافر عند الاقاصی والاوانی واخراجہ
من العلم والفہم والدین والاسلام والہدی والحاقیہ بالشیطان
الرجیم وایقاعہ فی ھوۃ الردی۔"

اصلاً یہ کچھ حواشی ہیں جو عقیدۃ الاسلام پر اضافہ کئے گئے۔ مجلس علمی نے حال ہی میں ان دونوں کتابوں کو یکجا شائع کیا ہے اور غالباً یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ عقیدۃ الاسلام میں صرف عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات ہی سے متعلق دلائل کا استقصار نہیں کیا بلکہ ذیلاً علاماتِ قیامت پر گفتگو کرتے ہوئے ذوالقرنین، یاجوج ماجوج، سدِ ذوالقرنین، توفی کی حقیقت اور قرآن کی ان آیات پر جن میں خروجِ یاجوج ماجوج کا تذکرہ ہے اور جنھیں مشکلات القرآن میں سے سمجھا گیا ان سب پر فاضلانہ بحث کی ہے جو نکات قرآن، اس کے ایجاز واختصار، بلیغ تعبیرات اور نادر اسلوب پر ایک ایسی متوازن گفتگو ہے جسے بے مثال کہا جا سکتا ہے افسوس کہ یہ اہم علمی ذخیرہ عربی میں ہونے کی بنا پر عام اردو داں طبقہ کی نظر سے مستور ہے کاش کہ اس کا اردو ترجمہ ہو تو فتنۂ قادیانیت کی تردید میں مؤثر و کار آمد ذخیرہ کے ساتھ ایک فاضلِ روزگار کی علمی پرواز کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ ان ہر دو تالیفات کے بعد علامہ خود فرماتے تھے کہ میں نے عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے دامنِ نبوت کو قادیانی دستِ درازی سے محفوظ رکھنے کی جو بلیغ کوشش کی ہے اسکے نتیجہ میں اُمید ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میری شفاعت فرمائیں گے۔ؑ

ؑ یہاں فاضلِ روزگار مولانا یوسف بنوری کا ایک رؤیائے صادقہ بھی قابلِ ذکر ہے جسے انھوں نے (باقی آگے)

اکفارُ الملحدینؑ

فتنۂ قادیانیت کے شبابی دور میں جب امت کا معتبر طبقہ جن کا علم و فہم، دین و دانش، ثقاہت و دیانت ٹکسالی ہے قادیانیت کے کفر پر متفق ہو گیا تھا تو کچھ ایسے بھی اشخاص تھے جو دعویٰ علم رکھنے اور اپنے تنوّر بلکہ تجدّد میں ڈوب کر صرف اسوجہ سے کہ قادیانی توحید کے قائل اور بظاہر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے مقر ہیں قبلہ کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں انہیں کافر نہیں سمجھتے تھے شاہ صاحب نے اس وقت اکیسوا ٹھائیس صفحہ کا یہ رسالہ تحریر فرمایا جس میں ضروریاتِ دین کی اہمیت اور ان کے انکار و اقرار پر کفر و ایمان کا فیصلہ کرتے ہوئے ضروریاتِ دین کا حقیقی مصداق متعین کیا اور واضح فرمایا کہ چند چیزوں کو ماننے اور دین کی اہم و بنیادی حقائق کا انکار کرتے ہوئے کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ ضروریاتِ دین کا آپ کے خیال میں مطلب یہ تھا کہ اسلام کے وہ بنیادی حقائق جنھیں عام و خاص اسلامی حقیقتیں سمجھتے ہیں اس رسالہ میں اسے بھی صاف کیا گیا کہ جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہدینا بدترین کفر ہے ایسے ہی کسی کافر کو کافر نہ کہنا اور نہ سمجھنا کفر جلی ہے۔ یہ رسالہ حسبِ دستور قیمتی حوالوں اور بہت سے مراجع و مصادر کی نشاندہی پر مشتمل ہے۔ چند سال گذرتے ہیں کہ آپ کے ایک خصوصی شاگرد مولانا محمد ادریسؑ

ع نفحۃ العنبر فی ھدی شیخ انور میں اس تفصیل سے تحریر فرمایا کہ ایک سبز و زرنگار قالین ہے جس پر دو حسین گاؤ تکیے قرینے سے لگے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک تکیہ سے حضرت شاہ صاحب نے پشت لگا رکھی ہے اور دوسرے سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں چہرے کیا ہیں چودھویں کے چاند بلکہ آفتاب نصف النہار کی طرح منور و تاباں ہیں کبھی حضرت عیسیٰ کے چہرۂ انور پر نظر ڈالتا ہوں اور گاہے اپنے شیخ انور کے روئے انور پر۔ یہ رؤیائے صادقہ حضرت شاہ صاحب کی توقعات اور عقیدۃ الاسلام کی تالیف سے وابستہ امیدوں کا مظہر ہے۔

ع تقسیم ہند سے پہلے یعنی ۱۹۴۲ء سے تا ۱۹۴۷ء راقم السطور مولانا محمد ادریس صاحب کا شاگرد ان کی علمی مجلسوں کا باریاب بلکہ کچھ عرصہ کے لئے ہم پیالہ وہم نوالہ رہا ہے۔ پست قامت، گٹھا ہوا بدن، آنکھوں پر چشمہ، گاندھی کیپ، چست شیروانی، تنگ مہری کی شلوار یہ تھا مولانا کا لباس و حلیہ۔

(باقی آگے)

میرٹھی الدہلوی ثم الکراچوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور ممکنہ حد تک اپنے استاذ کے ان افادات کو سہل المآخذ بنانے کی کوشش کی ہے۔

رسالہ کا آغاز اس طرح ہے۔

الحمد للہ الذی جعل الحق یعلو ولا یعلی حتی یاخذ من مکانۃ القبول مکانا فوق السماء۔

اور یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ اس تالیف سے میرا مقصد مؤمنین کی خیر خواہی نیز کفر و ایمان کے الجھے ہوئے مسئلہ میں صراط مستقیم کی نشاندہی ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اپنی کتاب

صہ ۳۱۵ کا بقیہ ۱ :۔ دیوبند سے فراغت حاصل کی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے عہد میں دورۂ حدیث میں نمبر اوّل آئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ کے بعض امتحان دیئے تو کامیابی کا ریکارڈ توڑ دیا۔ ذہین و ذکی، مستعد، شب و روز کی محنت میں انہیں ایک جن ہی قرار دیا جا سکتا ہے ان کا دماغ بلا مبالغہ فولاد کی ایک کھرل تھی جس قدر کوٹتے اس ہاون پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مدرسۂ صدیقیہ میں ابو داؤد وغیرہ کا کامیاب درس دیتے یہ وہ دور تھا کہ جرمنی اور متحدہ طاقتوں کی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا دسویں پاس دھڑا دھڑ دفتروں میں ملازم رکھے جا رہے تھے پنجاب یونیورسٹی سے اردو فارسی کے امتحان دینے کے بعد صرف انگریزی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں مولانا ادریس صاحب نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شبینہ مدرسہ کھولا جس کا نام ادارۂ شرقیہ تھا اس کے ساتھ ایک مدرسۃ البنات بھی۔ یہ مولانا کا دورِ عروج تھا جس میں انھوں نے ہزاروں کمائے اور خرچ کر ڈالے۔ مدرسۃ البنات میں کچھ روز راقم السطور نے بھی کام کیا اور ان کی خاص عنایت سے سبزی منڈی میں ایک ٹیوشن بھی مگر افسوس کہ یہ عروج چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ثابت ہوا اپنی آنکھوں سے مولانا کے اس زوال کو بھی دیکھنا پڑا جس کی کہانی بڑی بھیانک اور تفصیلات زہرہ گداز ہیں دہلی اجڑ چکی تھی مجلسیں درہم برہم ہو چکیں تھیں سکون ختم ہو چکا تھا اور یہاں کی رونقوں پر موت کا سناٹا طاری تھا راقم السطور دیوبند آ گیا اور اچانک سننے میں آیا کہ مولانا اپنے اہل و عیال کے ساتھ کراچی پہونچ گئے کراچی میں ان کے شبینہ مدارس کا منصوبہ اس قدر ناکام ہوا جس سے ان کا دماغی توازن و سکون ہل گیا ۱۹۶۵ء میں پاکستان کا سفر ہوا تو وہ اب مولانا یوسف بنوریؒ کے مدرسہ میں ایک عربی استاذ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ملے یہ مولانا ادریس نہیں تھے بلکہ ماضی کی ایک مٹی مٹائی تصویر اور پرانے قالب میں کچھ پھیکے رنگوں کی آمیزش، اب ان کی دید دیدۂ عبرت کے لئے سراپائے عبرت ہے۔ دوسری ملاقات جوارِ کعبہ میں ہوئی جبکہ وہ زیارتِ حرمین کے لئے تشریف لائے تھے۔

دلی مرحوم کے واقعات اور ان کی شفقتوں کے لمحات جب یاد آتے ہیں تو سینہ پر سانپ لوٹ

(باقی آگے)

کا نام اکفار الملحدین و المتأولین فے شیٔ من ضروریات الدین رکھ رہا ہوں اس نام کا ماخذ قرآن مجید کی یہ آیت ہے ان الذین یلحدون فے آیاتنا لا یخفون علینا افمن یلقی فے النار خیر ام من یاتے آمنا یوم القیٰمۃ اعملوا ماشئتم انہ بما تعملون بصیر۔

التصریح بما تواتر فی نزول المسیح

سابق میں گذر چکا کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کے مختلف رخوں کو قرآن و احادیث کی روشنی میں ایک حقیقتِ ثابتہ ظاہر کرنے کے لئے آپ نے عقیدۃ الاسلام وغیرہ کی تالیف کی لیکن آپ کا منشاء یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات اور ان کے قربِ قیامت میں نزول سے متعلق احادیث جو حدیث کے مختلف مجموعوں میں منتشر ہیں انہیں یکجا کیا جائے۔ قاضی شوکانی مصنف نیل الاوطار نے اپنے دور میں اس موضوع پر ایک رسالہ جس کا نام "التوضیح بما تواتر فے المنتظر والمھدی والمسیح" ہے تصنیف کیا جس میں وہ کل انتیس۲۹ احادیث اس سلسلہ کی پیش کر سکے حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس رسالہ میں ستّر احادیث اس باب کی جو تمام کی تمام صحیح وحسن ہیں جمع کیں اور ان کے ساتھ ان اقوالِ صحابہ کا بھی اضافہ کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حیات و نزول سے متعلق ہیں۔ یہ رسالہ بہت سے مصادر و مراجع کی جانب طویل مطالعہ و مراجعت کے بعد تالیف کیا گیا اور اپنے موضوع پر ایسا بے نظیر و بے مثال ہے کہ مشہور شامی عالم شیخ ابوالفتاح ابوغدہ نے اس کو حال ہی میں بیروت سے نہایت آب و تاب کے ساتھ اڈیٹ کر کے شائع کیا ہے بلاشبہ یہ تعلیقات وحواشی نہایت گراں قدر و خاصہ کی چیز ہیں۔

ص۳۱۶ کا بقیہ:- جاتا ہے اور شاہ نصیر کے لہجہ میں کہنا پڑتا ہے ؎

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر ✤ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

یہ اپنے ایک شفیق استاذ مربی محسن و کرم فرما کا ارتجالی تذکرہ تھا جس کے کچھ اجزاء اشکبار قلم پر اس طرح آئے کہ بیتے ہوئے دنوں اور یادِ ایام کا ایک طویل سلسلہ سامنے آ کھڑا ہوا جس کا تصور بھی وحشت ناک ہے۔

نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین

رفع یدین کا مسئلہ ابتدا رسے مختلف فقہار کے مابین نزاعی و اختلافی رہا ہے درحقیقت احادیث میں ترک ورفع دونوں کا ثبوت ہے اور یہ سب احادیث اپنے اسنادی سلسلہ کے اعتبار سے معتبر ہیں اب قرائن وشواہد کی موجودگی یا روایات کے ساتھ درایات کی قوت نے فقہار کو کسی ایک جانب مائل کر دیا۔ احناف ترک رفع کے قائل ہیں اور ان کا مسلک بجائے خود قوی و مضبوط ہے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فقہی اختلاف اور اجتہادی موشگافیاں تعصب وتحزّب کا پیش خیمہ نہیں تھیں بلکہ رواداری وتوسع سے کام لیا جاتا۔ تاریخ ایسے واقعات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ شوافع کی مسجد ہے دن غروب ہوا چاہتا ہے اور مؤذن صدائے صلاح وفلاح کے لئے تیار ہے اچانک ایک حنفی عالم مغرب کی نماز کے لئے اسی مسجد میں پہونچ گئے امام مسجد جو شافعی فقہ کے عالم و فاضل ہیں ان حنفی محقق کو دیکھ کر مؤذن کو اشارہ کرتے ہیں کہ آج اذان احناف کے طرز پر دی جائے۔ اقامت ہوتی ہے اور شافعی عالم ہاتھ پکڑ کر حنفی عالم کو امامت کے لئے آگے کر دیتا ہے پھر اس توسّع کی داد دیجئے کہ اس حنفی علامہ نے نماز شوافع کے انداز پر پڑھادی۔ یہ اس اسلام کی صحیح تصویر تھی جو سرزمینِ حجاز کے ایک مقدس ترین انسان عبد اللہ البطحائی یعنی محمد مصطفٰے روحی فداہ کل کائنات کے لئے لے کر مبعوث ہوئے تھے مگر افسوس کہ صدیاں آگے کو بڑھیں اور لیل ونہار کی گردشوں نے علم وتحقیق کی جگہ جہل وتحمیق، توسع ورواداری کے بجائے عصبیت اور فرقہ بندیوں کو کھڑا کر دیا بدقسمتی سے ہندوستان جہاں بدعات ومحدثات کے جھمیلوں میں اہل سنت والجماعت کیلئے اسلام کو اس کے واقعی خدوخال میں پیش کرنے کی ضرورت تھی اہلِ حدیث کا ایک فرقہ کھڑا ہوگیا ان حضرات نے تقلید کے پرخچے اڑائے فقہار سے بدگمانیوں کے طومار کھڑے کئے اور حنفیت کو خاص نشانہ پر رکھا۔ کہیں عرض کر چکا ہوں کہ دیوبند کی طرزِ تعلیم میں کچھ خصوصی اضافے اہلِ حدیث ہی کی زیادتیوں کا دفاعی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی نادان حلقے اس طرزِ تعلیم کی طوالت، طویل وعریض تقریروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں لیکن انہیں اس پسِ منظر کا علم نہیں کہ آج بھی ہندو پاکستان میں احناف کے خلاف کیا

زہر چکانیاں کی جارہی ہیں بھلا کوئی تک ہے اس حماقت کی کہ فقہ حنفی کا موسس اول نعمان بن ثابت الکوفی الملقب بامام اعظم کے علم کی تمام وسعتیں یا طول وعرض چند حدیثوں تک محدود تھا غور کیجئے کہ جس شخص کی دقیقہ سنجیاں ہزاروں ہزار مسائل کے استنباط واستخراج کے ذمہ دار ہیں اور جو کلیات سے لیکر تا جزئیات بالفاظ دیگر اصول وفروع میں قرآن وحدیث کے حصار بندیوں کے پھلانگنے کا مجرم نہیں اس کی معلومات کیا چند ہی حدیثوں تک ہوسکتی ہے بہرحال جو ہنگامہ برپا کر دیا گیا ہے اس میں بہتر طریق کار یہی تھا کہ علمی وتحقیقی بنیادوں پر حنفیت کا استحکام کیا جائے۔

علامہ کشمیری جو اپنی نیمہ عمر حنفیت کی پختہ بنیادوں کی تحقیق وتلاش میں گذار چکے تھے اور جنھیں اس مسلک کی اصابت پر شرح صدر تھا تیرھویں صدی کے اختتام پر خدائے تعالےٰ نے ان سے یہ خاص کام لیا۔ اہم اختلافی مسائل پر درسی افادات کے علاوہ یہ آپ کی قلمی نگارشات ہیں جن میں آپ نے خاص خاص مسائل پر کلام کیا ہے اس سلسلہ کی پہلی کڑی یہی کتاب ہے۔ یہ رسالہ اکیس ۴۱ پینتالیس صفحات پر مشتمل ہے ابتدا میں فرمایا۔

"الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی العلم ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیرا۔"

اس تالیف میں آپ نے رفع یدین کی تمام صورتوں کو مثلاً رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دونوں سجدوں کے درمیان اور دو رکعتوں کے بعد زیر بحث لاکر مسئلہ کی تحقیق شافی بنیادوں پر کی ہے اور ابتدا میں لکھا ہے کہ تالیف کا مقصد رفع وعدم رفع کسی ایک جانب کو ترجیح دینا ہے یہ ہرگز پیش نظر نہیں کہ احناف کے نقطۂ نظر کے مطابق عدم رفع کو ثابت کرتے ہوئے رفع کا قطعاً انکار کیا جائے حالانکہ رفع یدین بھی احادیث سے ثابت ہے۔ الحاصل مسئلہ کا مدار ثبوت وعدم ثبوت پر نہیں بلکہ راجح ومرجوح پر ہے۔ خاتمۂ کلام پر یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ بحث حدیث کے طویل مطالعہ، فقہاء کے اصول متابعات وشواہد پر موقوف ہے اور ہر شخص اس پر گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جبکہ ہندوستان میں ایک فرقہ کی جدوجہد سے یہ مسئلہ خواص سے نکل کر عوام میں پہونچ گیا اور وہ بھی خود کو ان نازک مسائل پر گفتگو کا مجاز سمجھنے لگے۔

بسط الیدین

مرحوم کی عادت ایک یہ بھی تھی کہ کسی موضوع پر کچھ لکھنے کے بعد برابر اس پر تحقیق کرتے اور جب کوئی تحقیقی ذخیرہ سامنے آتا یا نئی علمی دریافت کی جاتی تو اسے بھی تالیف کی شکل دیتے۔ اسی رفع یدین کے مسئلہ پر سابقہ تالیف کے بعد یہ تازہ تالیف قلم سے نکلی۔ وجہ تالیف میں تحریر فرمایا۔

"جعلت علے عادتے احدق احداقی فے اوراقہا واقلب اجفانی فے اغصانہا واقید ما یسنح من شئ بعد شئ اوید ور بالبال ما بین الغیمۃ والفئ حتے حصلت عدۃ اوراق وعدۃ اسباق لا انکاد وتلقی تلک الفوائد بدون امعان وایغال ونص فوق العنق وتقریب وار قال فوقع العزم علے اشاعتہا ایضاً واذاعتہا خشیۃ ان تلحق بالعدم کالاثار فے وطأ القدم۔"

آغاز تالیف میں یہ بھی ہے کہ

"عام طور پر راوی روایات اور متعارض روایات میں تطبیق دینے والے کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا راوی صرف روایت کرتا ہے اور جتنی روایتیں اسے دستیاب ہوتی ہیں ان کی اشاعت اس کے پیش نظر ہوتی ہے اسکی بھی کوشش نہیں کرتا کہ ان روایات میں کچھ ایسی قطع و برید کرے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو بلکہ بسا اوقات اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری روایات کے الفاظ کیا ہیں کہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنی روایت کے الفاظ ان دوسری روایات کے مناسب وضع کرے لیکن متاخرین ان متعارض روایتوں میں توفیق کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ترتیب اس انداز پر قائم کرتے ہیں گویا کہ یہ اسی شخص واحد کی مرویات ہیں۔ یہ کام بہت دشوار ہے ایک عبارت کی خصوصیات دوسرے اسلوب سے اس درجہ مطابق ہو جائیں کہ ان میں کوئی فرق ہی نہ رہے امر شاق ہے موافقت

پیدا کرنے والا ٹھیک مؤرخ کے درجہ میں ہے کہ مؤرخ متعدد روایتوں
کو ایک سلسلہ کی کڑی بنالیتا ہے اور اپنی رائے سے ان میں ایک ترتیب
پیدا کرتا ہے۔ اس جد وجہد کے باوجود عبارتی خصوصیات سابق کی طرح
ایک دوسرے کے مغایر رہتی ہیں۔"

آخر میں یہ بھی واضح کیا کہ

"متاخرین کسی ایک احتمال کی تعیین کرتے ہیں اسے فقہی مذہب قرار
دینا صحیح نہیں ہوگا مثلاً شیخ ابن ہمام الحنفی نے قرارت خلف الامام کو
مکروہ کہا ہے۔ یہ احتمالاتِ متعددہ میں سے ایک احتمال کی تشخیص ہے
اس لئے اسے مذہب احناف نہیں کہا جاسکتا۔ الحاصل فقہاء شارع علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی ذوجہات گفتگو سے امر واحد کو متعین کرتے ہیں اسی طرح متاخرین
فقہائے مجتہدین کے متعدد اقوال سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو جسطرح
فقہاء کو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں صاحب شریعت نہیں
کہہ سکتے ایسے ہی متاخرین کو ائمہ مذاہب کے باب میں مستقل فقہ کا
مؤسس قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔"

کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر

وتر کا مسئلہ بھی فقہاء کے مابین اختلافی ہے۔ جس کے وجوب وعدم وجوب ادائیگی
کا طریقہ اور تعداد رکعات میں کافی اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں وتر واجب
ہے اور اس کا وجوب اس قدر قوی کہ اگر کسی نے شب میں بعد عشاء ادا نہ کیا ہو اور صبح کی
نماز کی ادائیگی کے وقت وتر کا چھوٹنا یاد ہو تو امام ہمام اسے وتر کی ادائیگی کا مکلف قرار
دیتے ہیں۔ پھر امام ہمام کے مذہب کے مطابق وتر میں تین رکعات ہیں جنھیں ایک ہی سلام
سے ادا کرنا ہے دوسرے فقہاء کے یہاں اس کی ادائیگی کے دوسرے طریقے ہیں۔ علامہ کشمیری
نے حنفیہ کے مذہب کے استحکام واصابت پر ۵۰ صفحہ کا یہ رسالہ تالیف فرمایا جسکا افتتاحیہ
بھی مضمون تالیف کے لئے مؤثر تعبیر ہے چنانچہ فرمایا۔

"الحمد للہ الواحد الاحد الوتر الفرد الصمد الذی لم یلد و

لم یولد ولم یکن لہ کفوا احد۔"

مرحوم نے اس تالیف میں اس مسئلہ کی اہمیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"وتر کا فیصلہ کرنے کے لئے تفقہ کامل، روایت و درایت پر مکمل عبور،

حدیث کی مراد کو سمجھنے کی صلاحیت اور فقہاء کی مجتہدانہ بصیرت پر اطلاعِ تام

ضروری ہے۔"

خاتمہ پر یہ بھی ارشاد ہے کہ

"ولنقم عن المجلس بکفارتہ سبحانك اللھم وبحمدك اشھد

ان لا الہ الا انت استغفرك واتوب الیك۔"

ضرب الخاتم علی حدوث العالم

یہ چار سو اشعار پر مشتمل ایک تالیف ہے جس میں آپ نے وجودِ باری کا اثبات، خدائے تعالےٰ کا علمِ محیط، اس کی بے پناہ قدرت اور ارادۂ ازلی کو ثابت فرمایا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہے۔

"سبحان الذی تعطف بالعز ولہ العظمۃ والکبریاء

کتب علی کل شئ غیرہ حکم الدثور والفناء واستکثر لنفسہ با

لقدم والبقاء سبحانہ ما اعظم شأنہ واکبر سلطانہ وانار برھانہ

وان کان وراء الوریٰ۔"

یہ بھی فرمایا کہ

"میرا مقصود اس تالیف سے اثباتِ باری ہے لیکن یہ عنوان غیر مہذب

ہے اس لئے میں نے حدوثِ عالم کا عنوان اختیار کیا حالانکہ دونوں عنوانات

کا مفاد ایک ہے۔ فلسفۂ قدیم و سائنس جدید میں الٰہیات و طبعیات سے متعلق

جو کچھ مل سکتا ہے ان سب کو میں نے ان اشعار میں سمولیا اس موضوع پر

قدیم و جدید ذخیرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو میری نظر سے نہ گذری ہو

بلکہ اس عنوان پر جو مستقل تالیفات ہیں ان کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کیا مگر افسوس قدیم و جدید میں مجھے کوئی شافی چیز نہیں مل سکی بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ جلال دوانی نے اسی عنوان پر "الزورۃ" نامی ایک کتاب لکھی لیکن وہ نہایت بے مغز ہے۔ یہ خود میرے افکار ہیں بلکہ مجھے اس دعوے میں بھی تردد نہیں کہ میں کچھ ایسے علوم کی جانب اشارہ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے کسی قلم سے نہیں نکلے"

اس تالیف کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

تعالی الذی کان ولم یك ماسوی	واول ما جلّی العمی بمصطفی
اسباب ومالك ملكه	فمن اخذ مهوی ومن اخذ هدی
فسبحان من برهانه كل آیة	وفی كل شأن منه شأن قد اختفی
وسلسلة الاسباب سلسله هوت	ربطنا بها شیئاً فشیئاً الی المدی

خاتمہ پر یہ اشعار ہیں۔

فخذ فی حدوث العالم البحث موعبا	ومالك نكات فیه لم تلقها فها
وتوهیة الاسباب والمادة التی	یغالط فیها الناس بادئ ما بدا
فصورت فی الابیات تمثال فكرتی	وذكرت معنیاً بامثالها الحمی
انا الاحقر المدعو انور شاه من	مضافات كشمیر جزی الله من جزی

مرقاۃ الطارم لحدوث العالم

سابقہ رسالہ کا یہ تتمہ ہے اور اس میں ضرب الخاتم ہی کے مقاصد کو شواہد وبینات سے مدلل کیا گیا ہے۔ یہ کل باسٹھ صفحہ کا ہے جس میں علامہ نے تحریر فرمایا کہ حدوثِ عالم کا مسئلہ قدیم زمانہ سے مختلف فیہ بنا ہوا ہے قیل وقال کے باوجود کوئی شفا بخش حقیقت سامنے نہیں لائی جا سکی۔ یہ میرے ذاتی افکار ہیں جو میں نے اس موضوع پر اپنی حیاتِ مستعار کا بڑا حصہ صرف کرنے کے بعد حاصل کئے ہیں اس سے پہلے میں ضرب الخاتم علے حدوث العالم لکھ چکا ہوں اس کی تسہیل کے لئے یہ کچھ اور صفحات قلمبند کر رہا ہوں یہی وہ رسالہ ہے

جیسے مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے ۵۷ھ میں شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری متکلم مصر کو قاہرہ میں پیش کیا۔ مطالعہ کے بعد شیخ کے تاثرات یہ ہیں۔

"لقد تحیرت من دقۃ نظر صاحبہا وثلج صدرہ بھذہ العلوم وکان لی رأی فی مسئلۃ کلامیۃ ظننت انی لم اسبق الیہ فرأیت ان الشیخ قد سبقنی الی مثلہا وانی افضل ھذہ الوریقات علی "اسفار الاربعۃ" للصدر الشیرازی"۔

"میں مصنف کی دقتِ نظری سے متحیر ہوں اور اس سے کہ انہیں ان علوم پر کیسی حیرت انگیز بصیرت حاصل ہے۔ مسائلِ کلامی میں میری خود کچھ تحقیقات ہیں جن کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ مجھ سے پہلے کسی عالم کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوا لیکن ان دونوں رسالوں کے مطالعہ کے بعد میں دیکھ رہا ہوں کہ شیخ انور بہت پہلے ان حقائق پر مطلع ہوتے ہیں میں ان مختصر تالیفات کو صدر شیرازی کی طویل وعریض اسفارِ اربعہ پر بھی ترجیح دیتا ہوں"۔

یہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے اس متکلم اسلام نے اپنی تالیف موقف العقل والعلم میں علامہ کشمیری کی جلالتِ علم اور ان کی عبقریت کا واضح اعتراف کیا ہے اور بلاشبہ اس کتاب کی حقیقی قدر شناسی صبری مرحوم ہی کے شایانِ شان ہے۔

سہم الغیب فی کبد اہل الریب

دیوبند اور بریلویت کی قدیم آمیزش یا بدعت وسنت کی پرانی کشمکش جس کی داستان طویل بھی ہے اور تلخ بھی۔ کم از کم ہندوستان میں اس کے برگ و بار فرنگی سازشوں کا بدیہی نتیجہ ہیں جسطرح کہ قادیانیت کے پسِ منظر میں غیر ملکی استبداد کی کرشمہ کاریاں رہیں لیکن اہلِ حق بھی اپنے قلم وزبان کی قوت ان ابلتے ہوئے فتنوں کے مقابلوں میں ہمیشہ صرف کرتے رہے اور الحمد للہ کہ یہ سعادت دیوبند کو خاص طور پر حاصل ہے کہ بریلویت کے مقابلہ میں پامردی واستقامت اسی نے دکھائی۔ ہر دار العلوم دیوبند کا فارغ بدعت کے قلع قمع کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے اور یہاں کی تعلیم کے وہ اثرات جو اسکے رگ وریشہ

میں سرایت کرتے ہیں محدثات کی بیخ کنی اور بدعات کا بھرپور تعاقب ہے۔ بہرحال ابھی علامہ کی عمر کا بیسواں ہی سال تھا اور آپ دہلی میں مدرسہ امینیہ میں تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے کہ بریلی کا ایک دریدہ دہن مناظر دہلی پہونچا اور حسب دستور دیوبند پر اعتراضات، اہل حق کو سب وشتم اور انہیں فرسودہ عنوانات پر ڈیڑھ دو ورقی رسالوں کی اشاعت شروع کر دی جو اس مکتبۂ فکر کے محبوب عنوانات ہیں۔ ایک رسالہ اسی مناظر نے تصنیف کیا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب ہر طرح ثابت کیا بلکہ خدائے تعم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم میں عرضی وذاتی کے سوا کوئی فرق نہ رکھا۔ یہ رسالہ عبدالمجید دہلوی کے نام سے شائع ہوا درآنحالیکہ دہلی میں عبدالمجید دہلوی کے نام سے کوئی مصنف نہیں تھا شاہ صاحب نے جواب میں سہم الغیب اردو زبان میں بائیس ۲۲ صفحہ کا تصنیف فرمایا اور مناظرے کے رنگ میں عبدالمجید بریلوی کے نام سے اسے شائع کیا اسمیں مذہب حق کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے دیوبندی نقطۂ نظر کی مدلل وکالت کی گئی ہے۔ آخیر میں ایک عربی قصیدہ بھی ہے جو اکابر دار العلوم کی منقبت سے تعلق رکھتا ہے۔

کتابُ فِی الذّبِ عَن قرۃ العینین

یہ ایک سو چھیانوے صفحات کا رسالہ ہے۔ فارسی میں تصنیف کیا گیا یہ تالیف بھی دہلی کے زمانۂ قیام میں ہوئی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور رسالہ جس میں شیخین ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کو ختنین عثمان وعلی رضی اللہ عنہما پر ترجیح دی گئی ہے رسالہ کا نام قرۃ العینین فے تفضیل الشیخین ہے۔ ایک شیعہ مصنف نے اس کی تردید میں رسالہ لکھا جس میں حضرت علیؓ کی نفضیلت شیخین پر بھی ثابت کی گئی تھی۔ علامہ کشمیری نے کتاب فے الذب عن قرۃ العینین اسی شیعہ تالیف کی تردید میں تحریر فرمائی کتاب کے خاتمہ پر لکھا ہے۔

"این است کلام آخر معترض کہ بغایت مصارحہ ومکافحہ جواب دنداں شکن وے دادہ شد قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا اما باشد کہ دراثنائے مطارحہ گاہے سخن بطور مجارات مع الخصم گفتہ

ومسایرت وے وارخاءِ عنان درالزام افہام اونمودہ باشیم امید از ناظرین آں کہ ہر مقامے را برمحل خود فرود آرند ولکل مقامٍ مقال توفانا اللہ تعالٰی علٰی حقیقۃ الدیانۃ والاطاعۃ وطریقۃ السنۃ والجماعۃ واحشرنا معہم آمین ثم آمین۔

امام الدہلوی اور شیعہ مصنف کی تالیفات چونکہ فارسی میں ہیں اسلئے علامہ نے بھی فارسی ہی میں یہ تالیف فرمائی۔

خَاتَمَ النَّبِیّٖن

فرنگی سیاسی حکمت عملی کا خود کاشتہ پودہ اسلام کے دامنِ صافی پر بدنما داغ یعنی قادیانیت جس نے ختمِ نبوت کے پرخچے اڑائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توہین و تذلیل میں مہیب نمونے تیار کئے جس سے اسلامی کاخِ شریعت کے کنگرے ہل کر رہ گئے اور جس کی تردید واستیصال کشمیر کے اس دانشور اور فاضلِ روزگار کا خصوصی شغل رہا جب اس متعفن قادیانیت کے اثرات حدودِ کشمیر میں پہونچے اور وادی کا سادہ دل ومفلوک الحال مسلمان روپہلی سازشوں میں مبتلا ہوکر اپنی متاعِ ایمان کو بے تکلف قادیانی مارکیٹ میں فروخت کرنے لگا تو مرحوم نے بسترِ مرگ پر آخری کروٹ لی اور یہ رسالہ تصنیف فرمایا۔ اپنے وطن کی رعایت سے اس کی زبان فارسی اختیار کی جس میں ختمِ نبوت، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا قادیانی دجل وفریب سے نقاب کشائی بھرپور انداز میں کی گئی درحقیقت یہ رسالہ قرآنِ مجید کی آیت ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ کی عالمانہ تشریح ہے۔ یہی وہ آپ کی آخری تالیف ہے جسے آپ اپنے لئے زادِ آخرت فرماتے وہ بھیانک شام جس کی ابتداء اس فخرِ روزگار انسان کی موت کی تمہید تھی اور جس تاریک شب کے درمیانی حصہ میں زمین پر خدائے تعالٰی کی بے پناہ قدرتوں کی یہ زندہ نشانی عالمِ فانی سے عالمِ باقی کی جانب پابہ رکاب تھی۔ سرِ شام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم تشریف لائے تو ایک مسافر زندگی کے قلم کا سفر دو چار ساعت ہی پہلے منزل پر پہونچکر آسودۂ منزل ہوا تھا۔ مہتمم صاحب سے حضرت شاہ صاحب نے

یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ

"مولوی صاحب میں اس دنیا سے خالی دامن جاتا ہوں میرے
پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں امید ہے کہ میری یہ تالیف میرے لئے زادِ
آخرت ہوگی میں نے ارادہ کیا ہے کہ اسے اپنے مصارف پر طبع کراکر اپنے
برادرانِ وطن کو ہدیہ کروں گا۔"

مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہیں ہوئی اور اسی شب کے بارہ بجے پیکِ اجل پیغامِ اجل نے پہونچا بعد میں مجلسِ علمی کو اس رسالہ کی اشاعت کی سعادت نصیب ہوئی جسبِ دستور رسالہ دقیق بیان، عالمانہ تعبیر اور شاہ صاحب کے منفرد اسلوب پر مشتمل ہونے کی بنا پر عام فہم نہیں ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اردو ترجمہ شروع کیا جو تکمیل کو نہیں پہونچ سکا۔ ایک نامور بہاری شاگردِ حضرت شاہ صاحب یعنی مولانا عزیز الحق بہاری نے اردو ترجمانی کی ابتداء کی مگر وہ بھی انجام سے محروم رہی۔ دار العلوم دیوبند کے شعبۂ طب کے استاذ جناب حکیم عزیز الرحمن صاحب اب اردو ترجمانی کر رہے ہیں خدا کرے کہ یہ اہم علمی خدمت پایۂ تکمیل کو پہونچے۔ یہ رسالہ چھیانوے (۹۶) صفحہ کا ہے جس کی ابتداء اس طرح ہے

"حمد و شکر نامحدود مر رب معبود را کہ خالق کون و مکاں و زمین و زمان
ست و صلوۃ و سلام نامعدود بر سرورِ کائنات و ہر موجود کہ رسول اللہ و
خاتم النبیین و غایتِ کن فکاں ست و بر آل و اصحاب وے و کافۂ امتِ
مرحومہ و انجاب وے۔"

ابتدائیہ میں ان سطور کے بعد یہ اشعار بھی درج فرمائے ہیں۔

خدائے کہ داورِ روزِ جزا است — بخود آئی خویش نامش خدا ست
بدست وے ایں ہست بالا و پست — بوے ہست شد ہر چہ موجود ہست
وگر نیک بینی ہموں ذات او ست — دگر جملہ ایں دفتر آیات او ست
بایں بارگاہ اینکہ بانگِ درا ست — پس از نوبتِ خواجۂ دوسرا ست
محمد کہ مُبدِ فتح دختم پیام — علیہ الصلوۃ و علیہ السلام
وجودش کہ خود آیت و رایت است
ہمہ بود تمہید او غایت است

خاتمہ پر فرمایا۔

حق تعالےٰ برامتِ مرحومہ رحم کناد وازالحاد وزندقہ ایں لعین نجات دہاد۔

دعوتِ حفظِ ایمان

فتنۂ مرزائیت اور قادیانیت کا خوفناک ہائلہ حضرت شاہ صاحب کی صحت کی عمارت کے لئے گھن کا کام کررہا تھا اور جس نے اس نفسِ قدسی کو بساطِ حیات کے جلد جلد لپیٹنے پر مجبور کیا۔ اس فتنہ کی شدت کا احساس اس آخری صدا کی شکل میں آپ کی زبان سے کائنات میں موجزن ہوا۔ جمعہ کا روز آپ کی سانحۂ وفات سے کل تینؔ دن پہلے جب کہ جاں گسل بیماری سے آپ نیم جان ہورہے تھے اور نشست وبرخاست بھی آپ کے لئے دشوار تھی بسترِ مرگ سے یہ چارؔ صفحہ کا پیغام آپ نے اپنے قلم سے تیار کیا بعدِ جمعہ دیوبند کی جامع مسجد میں "انجمن امداد الاسلام" کی جانب سے ایک عام جلسہ ہوا یہ مرحوم کی آخری زیارت تھی عامۃ الناس نے پھر اس نفسِ قدسی کو احاطۂ مولسری میں کفن پوش ہی دیکھا۔ جامع مسجد کے صدر دروازہ میں آپ دیوار سے سہارا لئے ہوئے تشریف فرما تھے اور آپ کے تلمیذِ خصوصی مولانا سید احمد رضا بجنوری مؤلفِ انوار الباری آپ کی جانب سے اس پیغام کو سنا رہے تھے۔ سانحۂ وفات کے بعد امداد الاسلام انجمن نے اس کو شائع کیا۔ پھر ہزاروں کی تعداد میں آج تک اس کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔

ان پیغام میں آپ نے فتنۂ قادیانیت کی شدت اور اس کی ہلاکت انگیزیوں کا دلِ دردمند وسوزِ دروں کے ساتھ طویل تذکرہ کیا اور امت کو اپنے سرمایۂ ایمان کی حفاظت کی دعوت دی چونکہ قادیانیت ریاستِ کشمیر میں ڈوگرا شاہی کے پسِ پردہ امداد پر برگ وبار نکال رہی تھی اس لئے آپ نے اس پیغام کے اختتام پر ریاست کشمیر کو انتباہ دیتے ہوئے فرمایا۔

> "یہ عاجز بحیثیت رعیتِ ریاستِ کشمیر ہونے کے ریاستِ کشمیر کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ قادیانی عقیدہ کا آدمی عالمِ اسلام کے نزدیک مسلمان نہیں ہے۔ لہٰذا حکومتِ کشمیر جمیع اہلِ اسلام اور مذہبِ اہلِ قدیم کشمیر کی رعایت کرتے ہوئے قادیانیوں کو اسکولوں، محکموں میں بھرتی نہ کرے۔"

اسی پیغام کا جزِ دوم جو سولہ^[16] صفحات پر مشتمل ہے اور جسے مدینہ پریس بجنور نے شائع کیا اس میں آپ نے عقائدِ صحیح، ادیانِ سماوی، صابئین، ختم نبوت، الحاد و زندقہ، نیز غلام احمد قادیانی کے مختصر حالات و عقائد، ضروریاتِ دین اور کفر و ایمان کے حدِ فاصل پر جچی تلی گفتگو کے بعد ارشاد فرمایا۔

"قادیانیوں نے علاوہ دعوتِ نبوت کے دعوتِ وحی قرآن کی برابری ایک نئی شریعت کی دعوت انبیاء علیہم السلام کی توہین اور امت کی تکفیر کرتے ہوئے غلام احمد کیلئے خصائصِ انبیاء کا اثبات اور ضروریاتِ دینیہ کا صریح انکار کیا ہے۔ یہ قادیانی دینِ متواتر میں تحریف اور شریعت میں تمسخر کے مرتکب ہوئے ہیں اس لئے ان کا کفر قطعاً ثابت ہے جس میں کسی مسلمان کو شبہ نہ ہونا چاہیئے۔"

رسالہ کے اختتام پر پنجاب میں قائم انجمن "دعوتِ ارشاد" جو قادیانیت کی تردید کے لئے حضرتِ مرحوم کے تلامذہ نے بنائی تھی اسمیں شرکت کی اپیل فرمائی اور مولانا ظفر علی خاں کا مشہور اخبار "زمیندار" جو اس زمانے میں قادیانیوں کے تعاقب میں اپنے نوکِ قلم سے آگ اگل رہا تھا اس کے تعاون کے لئے مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے اور ذیلاً کشمیر سے شائع ہونے والے قادیانی اخبار جسے قادیانی مشن نے کشمیریوں کا ایمان خریدنے کیلئے جاری کیا تھا عامۃ المسلمین کو اس جریدہ کی اعانت سے ان الفاظ میں روکا گیا۔

"اہلِ کشمیر پر واضح رہے کہ جو قادیانی اخبار کشمیر سے جاری ہوا ہے وہ قادیانی عقائد کی ترجمانی کرتا ہے اور عنقریب اس کے نتائج برآمد ہوں گے مسلمان اپنی جیبیں خالی کر کے کفر نہ خریدیں۔"

النّورُ الفائضُ علیٰ نظمِ الفرائضُ

فارسی نظم میں بانوے اشعار پر پھیلا ہوا یہ رسالہ علمِ میراث میں ہے جسے اپنے عزیز شاگرد مولانا فخر الدین احمد مرادآبادی کو شاہ صاحب نے درساً پڑھایا بھی اور پھر بطورِ یادگار ان کو عنایت بھی فرما دیا مولانا موصوف نے اس یادگار کو ذاتی میراث نہیں بنائی بلکہ ۱۳۵۶ھ میں مرادآباد سے شائع فرما دیا اس طرح حضرت شاہ صاحب کی یہ علمی یادگار ہمیشہ کے لئے

محفوظ ہو گئی۔

آغاز تالیف اس طرح ہے۔

بعدِ حمد خدا و نعتِ رسول — بشنواز انور ظلوم وجہول
مال نہ بود چوں مستحق العین — بعد تجہیز و دفن و دادنِ دین
ہم پس از عزل ثلث موصیٰ بہ — ذی فروضِ مقدرہ را دہ
عصبہ بعد ازاں برد ہمہ مال — بعد ازیں روبذی فروض سگال
بعد ازیں دو فریق اے منعام — وارثِ مال داں ذوی الارحام

جو اسباب مانعِ ارث ہیں ان کی تفصیل میں ارقام فرمایا۔

مانعِ ارث آمدہ اند ایں چہار — رق و قتل و اختلافِ دین و دار
لیک قتلے کہ بالسبب باشد — مانعِ ارث کس نمی باشد

خزائن الاسرار

علامہ کا دستور تھا کہ دورانِ مطالعہ جو نوادرات اور بلند پایہ تحقیقات نظر سے گذرتیں انہیں یکجا فرما لیتے۔ اسی لئے ایک طویل و عریض کشکول بھی لکھی تھی جس میں نادر تحقیقات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود تھا لیکن افسوس کہ پسماندگاں کے پاس اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے[ع]۔ علامہ دمیری کی مشہور کتاب حیوۃ الحیوان جو دو طویل جلدوں میں

[ع] مولوی حشمت علی سابق مہتمم مدرسہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ نے سنایا کہ جس سال وہ دورۂ حدیث میں شریک تھے حضرت شاہ صاحب نے سحر پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سحر سے تیار کردہ چیزیں یا شعبدوں کی پیداوار شبانہ روز سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ مولوی حشمت علی صاحب نے عرض کیا کہ "حضرت میں نے ایک جادوگر کے منہ سے نکالے ہوئے کاغذ تین روز تک باقی دیکھے"۔
یہ سنکر فرمایا کہ بھائی میں تمہارے نام کی تصریح کے ساتھ اسے اپنے کشکول میں لکھ لوں گا
اس سے معلوم ہوگا کہ کس جستجو و کاوش اور طلب و تلاش سے انھوں نے یہ کشکول تیار کی تھی اہلِ علم کو جہاں چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں ہزاروں ہزار علمی خزانوں کی ضیاع پر غم واندوہ کی سرد آہیں کھینچنا پڑیں اس خزینۂ معلومات کی تباہی کو بھی اسی فہرست میں شریک کیا جائے۔

ہے اور اسے کتب خانۂ علم ہی کہنا چاہیئے۔ شاہ صاحب نے دورانِ مطالعہ اس سے کچھ خاص عملیات کا انتخاب فرمایا تھا جس میں اپنے خصوصی مجربات کا بھی اضافہ کیا غالباً سو صفحات کا یہ رسالہ مجلسِ علمی ڈابھیل نے شائع کیا اور ڈیڑھ سال قبل عزیز ڈاکٹر مولوی مظفر الحسن مونگیری نے اس کی اردو ترجمانی کی جس کی پہلی طباعت ختم ہو چکی اور دوسرے ایڈیشن کی تیاری کی ہے۔

حضرت ممدوح کی موجودہ دستیاب تصنیفات و تالیفات کی یہ ایک مختصر تعارفی فہرست تھی جن میں سے بعض کتابیں اب نایاب بھی ہوتی جاتی ہیں اور بڑا علمی سرمایہ یعنی آپ کا تصنیفی کارنامہ جسے آپ نے اپنے وطن کشمیر میں اپنے گھر محفوظ کر رکھا تھا اس وقت نذرِ آتش ہو گیا جب سوءِ تقدیر سے "ورنو" میں اتفاقی آگ کا حادثہ بہت سے لوگوں کو بے خانماں کرنے کا موجب بنا خدا جانے یہ کن موضوعات پر اور کیسی کیسی علمی تحقیقات ہوں گی جنکے ضیاع پر آج امتِ مرحومہ کو افسوس و حسرت ہی نصیب ہے۔ ان کی ایک خاص عادت یہ بھی تھی جس کتاب کا مطالعہ فرماتے اسکے مندرجات پر خود اپنے افادات کا بھی اضافہ فرماتے۔ مرحوم جمع کردہ کتابیں جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ ان کے ساتھ۔ یہ گرانقدر علمی اثاثہ بھی نکل گیا۔ اب یہ کہاں ہے کس کے پاس ہے کیا یہ نوادرات کبھی منظرِ عام پر آئیں گے یا دانشور طبقہ ان علوم سے بھی افادہ نہیں کر سکے گا؟ ان سوالات کا جواب ایک حسرتناک خاموشی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاہ صاحب کی تمام تصانیف عربی میں ہیں جن کو انھوں نے اپنے علم و کمال کی رفعتوں سے تصنیف کیا ہے اسلئے عام اردو داں طبقہ موصوف کو براہِ راست سمجھنے سے قاصر رہا۔ ضرورت اس کی ہے ایک مستقل اکیڈمی مرحوم پر قائم کی جائے جسمیں صرف یہی نہیں کہ آپ کی تصانیف کو صحت و خوبی کے ساتھ شائع کیا جائے بلکہ مختلف زبانوں میں اسکے تراجم بھی ضروری ہیں تاکہ ان علمی جواہر سے استفادہ کی راہیں کھل جائیں خدا کرے کہ اس "نقشِ دوام" کے بعد جو اس منصوبہ کا مقدمہ ہے منصوبہ کے عملی تشکیل کی راہیں راقم الحروف کے لئے ہموار ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

چند سال گزرتے ہیں کہ پاکستان کے مشہور دانشور مولانا عبدالحلیم چشتی کا ایک طویل مقالہ ہندوستان کے مشہور مجلہ "معارف" اعظم گڈھ میں حضرت شاہ صاحب پر شائع ہوا تھا جس میں فاضل مضمون نگار نے لکھا تھا کہ اگر حضرت شاہ صاحب اپنے بلند

علمی مقام سے اتر کر عوام کی رعایت سے تصنیف فرماتے تو اسلام کی ادھر پانچسو سالہ تاریخ اس بے نظیر عالم کی نظیر سے خالی رہتی۔ خاتمۂ بحث پر یہ تبصرہ بلا تبصرہ پیشِ قارئین ہے۔ عنوان کی تکمیل کے لئے ان کتابوں کی نشاندہی بھی غیر مناسب نہ ہوگی جس میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ یا شاہ صاحب کے مستقل سوانحی تذکرے ہیں تو لیجئے پہلے ان تاریخی دستاویزات کو جن میں شاہ صاحب کا تذکرہ مختصر یا مفصل آیا۔

۱۔ علمائے حق، مصنفہ مولانا محمد میاں صاحب ۲۔ نگارستانِ کشمیر، از مولانا ظہور الحسن صاحب سہواروی ۳۔ تاریخِ اقوامِ کشمیر، مولوی محمد الدین فوق کشمیری ۴۔ مقدمۂ مشکلات القرآن، از مولانا یوسف بنوری ۵۔ مقدمہ فیض الباری، از مولانا یوسف بنوری ۶۔ مقدمۂ التصریح بما تواتر المسیح، از عبد الفتاح ابوغدہ الشامی ۷۔ مقدمۂ انوار المحمود، از مولانا صدیق احمد نجیب آبادی ۸۔ مقدمۂ انوار الباری، از مولانا احمد رضا بجنوری ۹۔ اکابرِ دار العلوم، از مولوی عزیز الرحمٰن بجنوری ۱۰۔ نئی دنیا مدنی نمبر، مرتبہ عبد الوحید صاحب غازی پوری ۱۱۔ رسالہ الحرم میرٹھ، مدیر قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی ۱۲۔ رسالہ دار العلوم، مدیر جناب ازہر شاہ صاحب قیصر ۱۳۔ الرشید دار العلوم نمبر، مرتب عبد الرشید صاحب۔

اور مختلف علمی مجلات از ہند و پاکستان، متعدد سوانحی تذکروں کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ نفحۃ العنبر فی ھدی شیخ انور۔ از مولانا یوسف بنوری۔

۲۔ حیاتِ انور۔ مرتبہ جناب ازہر شاہ صاحب قیصر۔

۳۔ سیرتِ انور۔ مرتبہ جناب مسعود اقبال دیوبندی۔

۴۔ مولانا انور شاہ اور ان کے علمی کارنامے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب لیکچرار علیگڈھ یونیورسٹی۔

۵۔ الانور۔ مؤلفہ جناب عبد الرحمٰن صاحب کوندو، کشمیر۔

۶۔ کمالاتِ انوری۔ از مولانا محمد صاحب انوری لائلپوری مرحوم۔

تحقیقات و تفردات

زشعرِ حافظ شیراز می رقصند و می نالند
سیاہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

لیجئے

قلم کا مسافر اس سوانحی غزل کے بیت الغزل تک آ پہونچا۔ یہ دعویٰ کسی حال میں بھی نہیں تھا کہ شکستہ سر قلم نے اس تذکرہ کو اس انداز پر ترتیب دیا جو علامہ کی جامع زندگی کا تقاضہ ہے ظاہر ہے کہ دعویٰ ہو بھی سکتا تو کس طرح؟ زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں میں موجود سیاروں کے جھرمٹ سے کسی سیارے کا طول و عرض یا اس کی شعاؤں کی مسافت اور اس میں مستور خزانوں کی صحیح تحقیق کس طرح ممکن ہے بس ایک ہیچ پوچ قلم جو ایسے بے بضاعت کے ہاتھ میں ہے جسے علم و فہم کی پستیاں ہی نصیب رہیں وہ سپہرِ علم کے آفتابِ نیم روز پر اس کے شایانِ شان لکھنے کا حق کب ادا کر سکتا ہے؟ تاہم تہی دامنی کے باوجود قلم چلتا رہا لیکن اس عنوان پر پہونچا تو قلم خود سر افگندگی کر رہا ہے کہیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور وہی مکرر عرض ہے کہ علامہ کے درسی افادات اور ان کی علمی تحقیقات و تفردات پر انہیں دانشوروں کو لکھنے کا حق ہے جو اس علم و فضل کے باریاب رہے ہیں۔ لیکن سوانح نگار کو اپنے تالیفی کام کو پورا کرنے کے لئے اس گوشۂ بحث میں بھی خام و ناپختہ گفتگو ناگزیر ہے خدا تعالےٰ سے اس دعا کے ساتھ کہ وہ ممدوح کے پایۂ علم کے مطابق کچھ چیزیں قلمبند کرا دے اس عنوان پر سفر کا آغاز ہے۔

عجیب بات ہے کہ بعض شخصیتیں اپنی جامعیت کے باوجود کسی ایک شعبہ میں ایسی شہرت رکھتی ہیں کہ کمالات کے دوسرے گوشوں میں ان کی نمود و نمائش اگر کیجئے تو یہ دوسروں کے لئے حیرت انگیز و تحیر خیز بنتی ہے۔ شاہ صاحب کی عام شہرت تو بے نظیر قوتِ حافظہ اور یادداشت کی غیر معمولی صلاحیت کی بنیادوں پر ہے۔ رہا اہلِ علم طبقہ تو وہ انہیں ایک بے نظیر محدث اور فنِ حدیث پر کامل دستگاہ رکھنے والا عبقری انسان سمجھتا ہے

خال خال وہ دیدہ ور بھی موجود ہیں جو موصوف کی جامعیت، ہمہ جہتی، وہمہ گیری پر اطلاع رکھتے ہیں اسلئے راقم الحروف کا منصوبہ یہ ہے کہ مختلف علوم وفنون پر ان کی تحقیقات و انکشافات کے جوہری نمونے سامنے کر دئے جائیں تاکہ ان کی واقعی حیثیت وممتاز مقام سامنے آئے۔ اس سلسلہ میں ابتدا ر قرآنِ حکیم سے ہے کہ کائناتِ ایمانی میں سب سے پہلی کتاب جہاں سے ایمانیات کی بسم اللہ ہوتی ہے اور حکیم وعلیم کا کلام ہونے کی بنا پر یہ یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اسے ہر ایک پر مقدم کیا جائے۔ اتنا تو آپ مجھ سے سن چکے ہیں کہ علامہ قرآن کی اتھاہ گہرائیوں میں اسطرح اترتے کہ اسکے عمق سے علم کے موتی اور حقائق کے جوہر اٹھاتے۔ اگر کوئی شخص ان کے روبرو ان کی عبقریت کا قصیدہ پڑھتا تو وہ اپنی طبعی منکسر المزاجی کے باوجود جن چند علوم میں اپنی حذاقت کو تسلیم کرتے اُن میں ایک اعجاز قرآن کا فن بھی ہے۔ کائناتِ تفسیر کا وہ مشہور مقولہ جس میں شیخ عبدالقاہر جرجانی اور زمخشری کے کمالاتِ قرآنی کو تسلیم کرتے ہوئے واشگاف اعلان کیا گیا کہ

"لم یدر اعجاز القرآن الا الاعرجان احدھما من
زمخشر وثانیھما من جرجان"

حضرت شاہ صاحب درسگاہ کے حدود اور طلبہ کے ہجوم میں اس مشہور مقولہ کو سناتے ہوئے اپنے متبسم انداز میں فرماتے "وانا ثالثھما" یعنی اعجازِ قرآن کو سمجھنے والی تیسری شخصیت میری ہے۔ اب کیا عرض کیا جائے وہ حلقہ جو دیوبند کے مزاج وروایات سے سراسر ناآشنا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے اس اضافہ میں بے بنیاد دعار کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے۔ جس مکتبِ فکر سے ان کا فکری رشتہ استوار تھا اور جو ان کے منکسر المزاجی پر براہِ راست واقف ہیں انہیں تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ادا ناشناس حلقوں سے بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ دیوبند جس دبستانِ علم وفن کا نام ہے وہاں علم وفن کے ساتھ اس سلوک وعرفاں کا غلبہ جس کی پہلی منزل اپنے کمالات کا انکار اور منتہی اپنی بود کو نابود کرنا ہے۔ اس حلقہ سے اٹھے ہوئے افراد ادعائی آوازوں سے نہیں بلکہ مدعیانہ جذبات سے بھی یکسر خالی ہوتے ہیں اور پھر عقلی طور پر ذرا اسے بھی سوچئے کہ شاہ صاحب کی حیاتِ طیبہ ہی میں ان کی جامعیت کے چرچے از شرق تا غرب پھیلتے چلے جاتے تھے۔ ان تمام امتیازات کو بلاشرکتِ غیرے

قبول کرنے میں ایک ادعا رپسند مزاج کو کیا پس وپیش ہوسکتا لیکن عرض کرچکا ہوں کہ وہ عام مجمعوں میں بھی اپنے علمی دسترس کا انکار کرتے ہوئے اعجازِ قرآن میں مجتہدانہ بصیرت کے مدعی تھے اس لئے روایتی و درایتی جن چند نقاط کی جانب مختصر توجہ دلائی گئی بنظرِ انصاف ان پر غور کرتے ہوئے خیال یہی ہے کہ پڑھنے والے شاہ صاحب کے اس اعلان کو مدعیانہ نہیں بلکہ مبنی برحقیقت قرار دیں گے اگرچہ انھوں نے تفسیر پر کوئی خاص کتاب اپنی شایانِ شان نہیں چھوڑی۔ تدریس وتعلیم سے تمامتر تعلق کی بناپر تصنیف وتالیف سے یکسوئی بعد والوں کے لئے ان السابقون الاولون کے علمی خزانوں سے کتنی بڑی محرومی کا موجب ہے اس کا اندازہ کچھ دشوار نہیں پھر دینی درسگاہوں کی عجیب وغریب روایت کہ حدیث وہاں کی انتہائی تعلیم اور سب سے بڑا درس حدیث کی آخری کتاب بخاری شریف ہی میں اپنی علمی چابکدستیوں کی داد دیتا رہتا ہے۔ کاش کہ وہ قرآن پر خود کچھ لکھتے یا قرآن سے متعلق ان کے درسی افادات ہوتے تو حدیث پر موجود املائی تقریروں سے جس طرح فنِ حدیث میں ان کی یکہ تازیوں کو تسلیم کیا جارہا ہے قرآنیات میں بھی ان کی منفرد حیثیت سامنے آتی۔ لے دے کہ تصنیفات میں ایک صرف "مشکلات القرآن" ان کا قلمی اثاثہ ہے جسمیں انھوں نے قرآن کے تمام ہی مشکل مقام کی یا خود تفسیر کی یا ان اہم تفسیری ماخذ کی نشان دہی کی جہاں ان مشکلات کا واقعی حل دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اس راہ نما وامام کتاب کے علاوہ ان کا خود کوئی قلمی کارنامہ بسلسلۂ قرآن موجود نہیں۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہے ان کا درس کسی ایک فن کے مہمات تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ مختلف علوم وفنون کا پیوند لگاکر ایک عجیب وغریب علمی چمن آراستہ و پیراستہ کرتے۔ قرآن سے متعلق بھی ان کے علمی نظریات وافکار طلبار کو اسی درسی حلقہ میں سننے کو میسر آتے۔ خدائے تعالےٰ جزائے خیر دے ان کے بعض تلامذہ کو جنھوں نے ان کے قرآنی افکار کو بڑی حد تک جمع کردیا اب جو کچھ لکھا جارہا ہے وہیں سے ماخوذ ہے۔

قرآن میں سب کچھ نہیں:۔ قرآن کے باب میں ایک بنیادی غلطی جس کا منشا جہل مفرط یا بے پناہ عقیدت ہے یہ پھیلادی گئی کہ قرآن میں سب کچھ ہے بلکہ بمبئی کے ایک صاحب نے جن کا نام مولوی رحیم بخش ہے اور ان کے لئے تعظیمی القاب میں آیۃ من آیات اللہ کا بھی اضافہ ہے۔ اپنی کتاب میں ہندسہ، ہیئت، نجوم، جبر ومقابلہ، تجاریت، حدادت،

نسج وغزل (کاتنا بننا)، فلاحت، رنگ ریزی بلکہ کھانے پکانے تک کے گر قرآن مجید ہی سے نکال کر پیش کئے ہیں اور اس غریب آیۃ من آیات اللہ کا تو کیا کہنا ہماری دینی درسگاہوں کی مایہ ناز کتاب "نور الانوار" کے بلند پایہ مصنف ملاجیون علیہ الرحمہ نے اپنی عمر کی اکیسویں[۲۱] سال میں جبکہ وہ طالب علمی سے صحیح طور سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے "تفسیرات احمدیہ" لکھ کر ایک اہم علمی کام انجام دیا تھا اس کے دیباچہ میں بھی مرحوم ملا کے قلم سے یہ نکل گیا "فما من شئ الا یمکن استخراجہ من القرآن" کوئی ایسی چیز نہیں جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو۔ افسوس کہ ہندوستان میں ملاجیون کا یہی فقرہ قرآن سے سب کچھ نکالنے کا راہنما فقرہ بن گیا اور اس حقیقت سے نظر ہٹالی گئی کہ زندگی کے جس سن وسال میں رسمی علوم سے بھی فراغت کے بغیر صاحب تفسیرات احمدیہ کے قلم سے جو تراوش ہوگئی بالغ النظری کے دور میں کیا مصنف کا وہی نظریہ تھا یا اس سے وہ ہٹ گئے تھے اس بنیاد کو منقح کئے بغیر ملا کے شگوفہ پر ہی یہ عالم رنگ و بو تیار کیا جارہا ہے کہ قرآن میں سب کچھ موجود ہے بلکہ اس سلسلہ میں ایک شعر بھی عام طور سے سنادیا جاتا ہے۔

جمیع العلم فی القرآن لکن　　تقاصر عنہ افہام الرجال

سارے علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن　　لوگوں کی عقلیں اسکی دریافت سے قاصر ہیں۔

علامہ کشمیری اپنے درس میں قرآن سے متعلق اسی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کی پرزور تردید فرماتے اور مختلف عنوانات واسالیب سے طلبہ کے اذہان میں یہ حقیقت جاگزیں کردیتے کہ ہر چیز کا ماخذ اور سرچشمہ قرآن کو قرار دینا ایک جاہلانہ عقیدت کے سوا کچھ نہیں اپنے اسی نظریہ کی اشاعت کے دوران جب اسی مذکورہ شعر کا تذکرہ آتا تو شعر سنانے کے بعد فرماتے کہ یہ کسی غبی کا شعر ہے بلکہ کبھی جلال میں ہوتے تو فرماتے کہ غبی الاغبیاء کا شعر ہے۔

بعض روایتوں میں قرآن حکیم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس کا بھی اظہار ہے کہ

"قرآن کے عجائب یعنی ایسے انکشافات جو لوگوں کو غرق حیرت کردیں گے ان کا سلسلہ بدستور رہے گا اور بار بار دہرانے کے باوجود یہ کلام بھی پرانا نہ ہوگا۔"

شاہ صاحب اس سے متعلق ایک خاص رائے رکھتے وہ یہ کہ یہ جو سمجھ لیا گیا کہ قرآن خدا کا کلام ہے اسلئے اسکے کلام میں سب کچھ ہونا چاہیئے یہی عامیانہ احساس اور خوش عقیدگی اس جہل کی بنیاد بن گئی۔ تردید میں یہ حقیقت زبان پر آتی کہ اگر اپنی معلومات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا تعالےٰ نے قرآن تصنیف کیا ہے تو ساری کائنات بھی اگر کاغذ بن جاتی تو خدا کے معلومات کے اظہار کے لئے وہ بھی ناکافی ہوتی۔ یہ بھی فرماتے کہ خدا سے تو بحث کیا ہے اگر کوئی جاہل بھی اپنے معلومات قلمبند کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ سب کچھ قرآن ہی سے نکال لینے کا جاہلانہ نظریہ اگر قبول کر لیا گیا تو پھر یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسا کوئی شرح وقایہ یا ہدایہ اولین میں میر تقی میر یا غالب کے ناقابلِ فہم کلام کی شرح تلاش کرنے کی جدوجہد شروع کر دے۔ گویا کہ حضرت شاہ صاحب کا قرآن کے بارے میں سب سے پہلا نظریہ یہی تھا کہ وہ قرآن کریم کو تمام معلومات کا سرچشمہ قرار دینے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اس طرح کی کوششیں سرے سے ان کے یہاں مذموم تھیں اور بالکل اسکے بالمقابل ایک دوسرا نظریہ جو قرآن کے بارے میں تیار کر لیا گیا یعنی یہ کہ قرآن سب سے زیادہ آسان اور عام فہم کتاب ہے جسکے سمجھنے سمجھانے میں کوئی بھی دشواری نہیں اور اس مقصد کیلئے خود قرآن مجید کی آیت ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر کو استعمال کیا جا رہا ہے اس نظریہ کی بھی پوری قوت سے تردید فرماتے کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ قرآنی حقائق و معارف کی گہرائیوں تک ہر ایک کی رسائی آسان ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے بڑے بڑے علمائے روزگار بلکہ متبحر علماء قرآن کی مکمل دریافت سے عاجز رہے۔ اگر یسرنا القرآن کا وہی مطلب ہوتا جو عام طور پر سمجھا جا رہا ہے تو اہلِ علم کو دریافت کی راہ میں نایافت سے سابقہ نہ پڑتا بلکہ تیسیر قرآن کا مطلب یہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ کی پسندیدہ زندگی گذارنے کا طریقہ جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے اس طریقہ کی تفصیلات و تراشش و خراشش اتنی صاف و سہل ہے جسکے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ راقم السطور ہی کے نظر سے کسی تفسیر میں یہ نکتہ بھی گذرا ہے کہ قرآن کا یُسر اور اس کی سہولت صرف ذکر کی حد تک ہے جیسا کہ خود ہی فرمایا گیا ولقد یسرنا القرآن للذکر اس لئے قرآن کو سہولت اور آسانی کا سب سے بڑا مرکز قرار دینا کھلی جہالت ہوگی۔ بخاری شریف کی املائی تقریر "فیض الباری" کے مصنف نے حضرت شاہ صاحب کے افکار کی تفصیل

دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حق تعالےٰ کے ارشاد ولقد یسرنا القرآن کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر ایک کے لئے قرآن فہمی کی راہیں آسان ہوگئیں بلکہ اس آسانی کا مطلب یہ ہے کہ ہر تشنہ لب کے لئے قرآن سے اپنی تشنگی کو دور کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے گئے اور ہر شفا طلب اس سے بہترین شفا حاصل کر سکتا ہے یعنی ان باتوں کا قرآن میں تذکرہ ہے جنہیں خدا تعالےٰ پسند کرتے ہیں (اوامر) اور وہ بھی ہیں جنہیں ناپسند کرتے ہیں (مناہی) پس خدا کی پسندیدہ و ناپسندیدہ کے لئے قرآن کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ رہ گئے قرآن کے گہرے معانی اور اس کے شاداب عمیق پہلو اور جن دلآویز حقائق کی جانب قرآن میں راہنمائی کی گئی ہے ان کی یافت انتہائی دشوار ہے۔ عام تو درکنار اس راہ کے بلند پایہ رجال کی پیٹھیں بھی قرآن کو مکمل سمجھنے سے ٹوٹ گئیں اور اسکے اسرار و رموز، لطائف و دقائق کی کنہ تک پہونچنے میں دانشور بھی عاجز رہے۔"

الحاصل قرآن کے یسری پہلو کے متعلق جو مشاغبہ جاری ہے مرحوم کی رائے اس جدا ان فکر و نظر میں یہ تھی قرآن مجید کی تعبیرات اور اس کی خصوصی اسلوب کی جانب طلبہ کو متوجہ کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھاتے کہ قرآن مجید میں مثلاً یہ جو حکم ہے کہ کیا تم اونٹ نہیں دیکھتے یا آسمانوں کو پہاڑوں کو زمین وغیرہ کو دیکھنا ایک انسانی فعل ہے جسے قرآن مجید نے گردوپیش میں استعمال کرنے کی دعوت دی ہے اب اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ آدمی درحقیقت رنگ کو دیکھتا ہے رنگ کو بھی نہیں بلکہ روشنی سے حقیقی تعلق انسان کی بینائی کا ہوتا ہے اور پھر روشنی کی وساطت سے مختلف رنگوں کو دیکھتا ہے لیکن جو چیز نہ روشنی ہے نہ رنگ اس کے ساتھ تو بینائی کا تعلق ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہوا انسان کی بینائی گرفت سے باہر ہے چونکہ وہ ایک بے رنگ چیز ہے۔ اب سائنس کی اس تحقیق کو بنیاد بنا کر کوئی قرآن پر اعتراض کرے کہ جو چیزیں نہ رنگ ہیں نہ روشنی ان کو دیکھنے کا مطالبہ کر کے قرآن نے ایک بے سود و مہمل مطالبہ العیاذ باللہ

کیا ہے۔ ممدوح اس تذکرہ کے بعد عموماً فرماتے کہ قرآن پر یہ اعتراض معترض کے مخبوط الحواس ہونے کی علامت ہے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے احساسات و تاثرات کی تعبیر کا جو عام انداز انسانوں میں شائع و ذائع ہے قرآن مجید اسی رائج طریقہ کو اختیار کرکے حقائق سمجھاتا ہے اور قرآن ہی کیا اگر فلسفہ قدیم اور فلسفہ جدید کے مسائل میں الجھا ہوا کوئی خبطی اپنی بیوی سے کہہ بیٹھے کہ "تم کو اگر میں دیکھوں تو تم پر طلاق" اور پھر بیوی کو دیکھنے کے بعد طلاق کے وقوع سے بچنے کے لئے اسی خبط کو بطورِ دلیل استعمال کرتے ہوئے کہے کہ میں نے بیوی کو کہاں دیکھا میں نے تو صرف اس رنگ کو دیکھا ہے جو اس کی کھال پر چڑھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خبطی کے لئے پاگل خانہ کے سوا اور کوئی جگہ نہیں قرآنی تعبیر اور اس کے پیرایہ بیان سے متعلق اس عالمانہ نکتہ کی جانب (یعنی یہی کہ قرآن عام انسانی احساسات و تاثرات میں انہیں کی اختیار کردہ تعبیرات کو دہرانے کا خوگر ہے) توجہ دلاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ قرآن میں اس قسم کی آیتیں پائی جاتی ہیں جن میں حرکت یا جاری ہونے کے تعلق کو آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب کر دیا گیا مثلاً والشمس تجری لمستقر لھا یعنی آفتاب اپنے ٹھکانہ کے لئے جاری ہے۔

ان آیات میں بھی قرآن نے انہیں تعبیرات کو استعمال کر لیا جو عام مشاہدات و احساسات سے قریبی تعلق رکھتی ہیں اس لئے یہ سمجھ لینا کہ رات و دن کی جو گردش ہمارے سامنے ہے ان تعبیرات سے قرآن ان کی اس حقیقت کو وانکشاف کر رہا ہے بڑی بھاری غلطی ہوگی۔ رات و دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب کیا ہیں؟ زمین گھوم رہی ہے؟ یا آفتاب گردش میں ہے یا خود آسمان مصروفِ گردش ہے قرآنی مباحث کے دائرہ سے یہ سوالات قطعاً خارج ہیں۔ اس موقعہ پر ایک علمی نکتہ آپ کی زبان پر یہ بھی آتا کہ اگر قرآن اپنی تعبیرات عام انسانی احساسات کے مطابق نہ بنا لیتا تو مثلاً رات دن کے اس قصہ میں قرآن کا یہ اعلان ہوتا کہ یہ الٹ پھیر زمین کی گردش کا نتیجہ ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکلتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے ہوتا لوگ قرآن پر ایمان لانے ہی سے محروم رہتے عامۃ الناس دن رات ہی کے قصہ میں الجھے ہوئے ہیں لیکن انسان جب حقیقت کی پیش گاہ میں داخل ہوگا اور مستور حقیقتیں اپنی اصل شکلوں میں سامنے آئیں گی تو صرف شب و روز ہی نہیں بلکہ دنیاوی زندگی میں جو کچھ ہم نے دیکھا اور سنا اور جو کچھ چکھا اور

چھوا. غرضیکہ ہمارے احساسات کا بہت بڑا حصہ اس عالم حقیقت سے بالکل بدلا ہوا ہے تب پتہ چلے گا کہ ہم کیا سوچتے تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔ کبھی طلباء کو چونکا دینے کے لئے ان سے دریافت فرماتے کہ لیل و نہار کا انقلاب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے حالانکہ موجودہ علمی حلقوں میں اسکو ایک ثابت شدہ بلکہ غیر مشتبہ فیصلہ قرار دیا گیا مگر بایں ہمہ اب بھی یہی کہا جا رہا ہے آفتاب غروب ہو رہا ہے وہ طلوع ہو رہا ہے وہ سمت الراس پر آگیا۔ دریافت فرماتے کہ یہ کیا ہے؟ مطلب یہی تھا کہ افہام و تفہیم میں دستور یہی ہے کہ عام مشاہدات کے مطابق تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں غرضیکہ قرآن کے اس خصوصی اسلوب پر جو عالمانہ نکتہ جس سے قرآن فہمی میں موجود مشکلات کا قلع قمع ہوتا ہے بقوت اس طرح اٹھایا کہ مولانا گیلانی رح نے اپنے مضمون میں اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "جہاں تک میں جانتا ہوں کھلے کھلے صاف الفاظ میں قرآن کے طریقہ تعبیر کے اس پہلو کو شاہ صاحب کے پہلے شاید ہی کسی نے اس قوت کے ساتھ واضح کیا ہو"

تفسیر بالرائے:۔ تفسیر بالرائے کا مسئلہ قرآنیات میں ایک اہم مضمون ہے۔ خود قرآن مجید میں سابقہ امم کی اس زشتیٔ کردار پر کہ وہ اپنے عہد کی آسمانی کتابوں میں تفسیر بالرائے سے آغاز کرتے اور اس نقطۂ آغاز کا بدترین اختتام تاویل و تحریف بلکہ کتمان پر ہوتا۔ پر غضب لہجہ میں نکیر کی گئی اور اسی کے ہم وزن جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ من قال فی القران برائیہ فلیتبو أمقعدہ من النار اوکما قال نے امت کو ایک عجیب و غریب چوراہے پر لا کھڑا کیا۔ اس روایت اور اس جیسی دوسری روایات کی پشت پناہی حاصل کرتے ہوئے یہ خیال شدت کے ساتھ پھیلا دیا گیا کہ قرآن کی کوئی تفسیر اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ اسکی تائید میں کوئی حدیث نہ ہو جو کچھ کہا گیا اس میں غلو اس قدر کیا گیا کہ حدیث کی مختلف اقسام کو بھی پیش نظر نہیں رکھا گیا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بھی صاف نہیں کی گئی کہ آیا وہ حدیث صحیح ہو، حسن ہو، ضعیف ہو بلکہ ان فنی مباحث سے قطع نظر صرف حدیث کی ضرورت و تائید پر زور دیا گیا۔ اسی خیال کی اشاعت کا نتیجہ ہے کہ تفسیر کی وہ کتابیں ہمیشہ قبول عام حاصل کرتی رہیں جن میں ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی حدیث موجود ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر یا سیوطی کی در منثور ان تفاسیر کی

قبولیت کا راز بذیلِ تفسیر احادیث کا انبار لگا دینا ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس نے امام فخر رازی کے تفسیری شاہکار کے متعلق یہ فقرہ اولین سے آخرین تک پہونچا دیا کہ فیہ کل شیٔ الا التفسیر۔ کیونکہ غریب فخر رازی نے اپنی تفسیر میں روایات کا وہ ذخیرہ تیار نہیں کیا جو ابن جریر وغیرہ بہم پہونچاتے رہے ٹھیک اس کے مقابلہ میں ایک طبقہ ان جسارت پسندوں کا بھی کھڑا ہو گیا جو قرآن مجید کی شرح و تفسیر میں نہ صرف حقیقی اور واقعی تفسیری روایات سے آزاد ہوا بلکہ اس نے سرے سے اس ماحول کو بھی نظر انداز کیا جس میں قرآن کا نزول ہو رہا تھا اور صحابۂ کرام سے بھی یک لخت صرفِ نظر کی درآنحالیکہ وہ قرآن کے مخاطبِ اول تھے بلکہ ان کی عقل باختگی اس حد تک جا پہونچی کہ عربی لغت، لغوی رعایتیں، عربی اسلوب کی نزاکت بلکہ قرآن کی زبان اور اس کے مختلف پیرایوں کی رعایت بھی ضروری نہیں سمجھی۔ تفسیر بالرائے کا ھنگامہ جس شان سے کھڑا کیا گیا اور جس پر یہ دو متضاد نقطۂ نظر وجود میں آئے سیوطی کے اتقان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آویزشوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سیوطی ہی نے یہ عجیب لطیفہ سنایا کہ ایک صاحب قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے تیار ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے اس مطالبہ میں کہ "اے رب آپ مجھے دکھا دیجئے کہ کس طرح زندہ کرتے ہیں مردوں کو" اس عجیب وغریب مفسر کو جب یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ بھلا ابراہیمؑ ایسے پیغمبرِ جلیل سے احیاءِ موتٰی کے بارے میں یہ تردد آمیز سوال کیسے ممکن ہے؟ تو اس کی "دور اندیش عقل" نے جھٹ پٹ جواب تیار کیا کہ "قلبی" نامی حضرت ابراہیمؑ کا دوست تھا ابراہیمؑ احیاء اموات کے بارے میں اپنے لئے اطمینان کے طالب نہیں تھے بلکہ اپنے جگری دوست قلبی کے لئے دولتِ اطمینان کی دریوزہ گری کر رہے تھے۔ والعیاذ باللہ۔ بلکہ سیوطی ہی کے قلم سے یہ بھی سننے میں آیا کہ بعض مفسرین کے خیال میں میتۃ اور لحم خنزیر بعض مرد اور عورتوں کے نام تھے جن کے تعلق و اختلاط سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا۔

یہ واقعات جن میں عقل نے سکرات میں مبتلا ہو کر بوالعجبیوں کا ایک طومار تیار کیا ہے ان کی نقل و حکایت بھی بقول ابومسلم اصفہانی صرف اسلئے ہو سکتی ہے

"تاکہ معلوم ہو کہ مدعیانِ علم میں احمقوں کی کمی نہیں"

ان خرافاتی تفسیر کا سلسلہ جب دراز ہوا اور اس کا سرا اس ارتقائی دور سے بھی

آخر انوکھے والے یہاں تک کہہ گذرے کہ قرآن میں نہ فرشتوں کا تذکرہ ہے نہ جنات کا نہ جنت کا نہ جہنم کا نہ حور و قصور کا نہ جنتی اشجار و انہار کا نہ غلامی کا نہ تعدد ازدواج کا نہ معجزات کا نہ کرامات کا غرضیکہ قرآن میں جو کچھ ہے ان بدبختوں کی رائے میں وہی قرآن میں نہیں ہے۔ بہرحال عرض تو یہ کرنا تھا کہ رطب ویابس روایات پر جمود یا صحیح روایات تک کا انکار اور پھر تفسیر بالرائے کی کھلی پگڈنڈی پر الحادی سفر اس دوراہے پر ایک جچی تلی آواز متوازن و متین لب ولہجہ میں آج سے ستر سال پہلے دینی درس گاہ میں علامہ کشمیری کی یہ تھی۔

"مسلمانوں میں نسلاً بعد نسلٍ خلفاً عن خلفٍ جن حقائق سے دین کی تعبیر و تقویم ہوئی ہے جن کے بغیر اسلام کا تصور مسلمان تو درکنار کوئی شد بد رکھنے والا غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا یعنی ضروریات دین جو اسلام میں کسی اختلاف کے بغیر عام طور پر جانی پہچانی ہیں ان سے ہٹ کر قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کی جرأت ایمان سوز جرأت ہے متواتر مسئلہ دین کا جس تفسیر سے بدلتا ہو یا جن تفسیر سے مسلمانوں کے اجماعی عقیدہ میں تبدیلی رونما ہوتی ہو درحقیقت تفسیر بالرائے ہے جس کا مرتکب جہنم کا مرتکب ہوگا۔"

اس منصفانہ اعلان میں بشدت اسکی تردید فرمائی کہ روایات کی تائید کے بغیر جو تفسیر بھی کی جائے گی وہ تفسیر بالرائے ہوگی وہ طلبہ کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرتے کہ وہ روایات جن پر تفسیر کتاب اللہ کا مدار رکھا گیا ہے ان کا بیشتر حصہ صحیح و مستند نہیں ہے۔ الشافعی الامام، احمد بن حنبل، بلکہ اکابر امت نے جن تین علوم سے متعلق حدیث کے ذخیرہ کو مشکوک قرار دیا ہے ان میں ایک فن تفسیر سے متعلق روایات ہیں۔ بخاری علیہ الرحمہ جن کی کتاب کی صحت کی شہرت ہیں ان کی کتاب التفسیر کو بھی لوگ قابل قبول سمجھ رہے ہیں۔ شاہ صاحب واضح طور پر طلبا کو بتاتے کہ

"صحیح بخاری میں جو تفسیری اقوال ہیں ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ یہی امام بخاری کا فیصلہ بھی ہے بلکہ اس باب میں ان کی حیثیت صرف ناقل کی ہے۔ امام بخاری نے ابوعبیدہ معمر ابن مثنیٰ کی کتاب مجاز القرآن پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے اقوال کسی تنقید کے بغیر اپنی کتاب بخاری

میں لے لئے۔"

تفسیر بالرائے سے متعلق علامہ کا یہ خاص الخاص نقطۂ نظر ان کی املائی تقریر بخاری "فیض الباری" میں بھی اس تفصیل سے موجود ہے:

"اگر اہلِ علم کتاب اللہ کے معانی و مطلب کو سیاق و سباق اور الفاظ کے تقاضوں کے مطابق جس میں سلفِ صالحین کے عقائد کی بھی پوری رعایت ہو بیان کریں تو ایسی تفسیر سے انہیں کون روک سکتا ہے بلکہ اللہ کی کتاب میں اہلِ علم کا واقعی کام یہ ہے کہ اس کے نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے رہیں اور اس کے اسرار سے نقاب کشائی ان کے ذریعہ ہوتی رہے بلکہ جو مستور حقائق ہیں انہیں اجاگر کریں۔ ظاہر ہے کہ اسے تفسیر بالرائے نہیں کہا جا سکتا بلکہ قرآنی آیات سے نتائج پیدا کرنیوالے باخبر اہلِ علم کا تو یہی کام ہے۔"

البتہ قرآن کی تفسیر میں اس اجازت و جواز کے پہلو کو نمایاں کرنے کے ساتھ واقعی تفسیر بالرائے کے جرم عظیم پر ان لفظوں پر تنبیہ فرماتے کہ

مگر قرآنی خطاب سے صحیح واقفیت کے لئے جن قدرتی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے جو ان سے تہی دامن ہو جسے متقدمین و متاخرین کے تفسیری اقوال کا علم نہ ہو نہ عربی جانتا ہو نہ اس کے ادب اور اس کے اسالیبِ بیان پر واقفیت رکھتا ہو ایسے نرے جاہل کے لئے تفسیر قرآن کی جرأت کھلا جہنم کا استحقاق پیدا کرتی ہے۔"

تفسیر بالرائے کے اہم اختلافی مسئلہ میں دو نقطۂ خیال کی کشاکش نے اختلافات کا ناقابلِ عبور مرحلہ لا کھڑا کیا تھا جس کی مختصر تفصیل آپ مجھ ہی سے سن چکے۔ علامہ کشمیری کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ سب کچھ تھا جسے ان کی املائی تقریروں سے ترتیب دے کر پیش کیا ہے۔ توقع یہی ہے کہ اگر ان سطور کو توجہ و انصاف کے ساتھ پڑھا گیا تو انشاء اللہ تفسیر بالرائے کے باب میں ایک متوازن و متین رائے قارئین کے ہاتھ لگ جائے گی۔

حدیث و قرآن :- امام شافعی علیہ الرحمہ کا ایک حقیقت آفریں ارشاد انہیں کے سلسلہ کے اساطین علم سے منتقل ہوتا چلا آیا کہ قرآن حدیث کا محتاج ہے۔ حدیث کو قرآن

کی احتیاج نہیں جس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن متن ہے اور حدیث اس کی شرح متن کے اغلاق وابہام کو حل کرنے کے لئے شرح کی جانب التفات ضروری ہے۔ یہی بات ہے جسے امام شافعی علیہ الرحمہ نے اپنے انداز میں سمجھایا۔ قرآن کی سب سے پہلی شرح تو خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کا خلق اور آپ کے اعمال اور آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک رخ ہے۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے کان خُلقہ القرآن سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ علامہ کا بھی ارشاد ہے کہ

"اگر کوئی جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا صحیح بصیرت سے مطالعہ کرے تو معلوم ہوگا کہ قرآن ایک رواں دواں چشمۂ صافی ہے اور یہ احادیث اسی کی سوتے ہیں۔ بلکہ بہت سی احادیث میں تو تعبیرات قرآنی کی جانب اشارات ملتے ہیں۔"

یہ بھی فرماتے کہ

"قرآن کی مراد اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گی جب تک کہ حدیث کی طرف رجوع نہ کیا جاوے بلکہ حدیث کو اسکی شرح نہ بنایا جائے^{عہ} اور خود حدیث کی نشأ فقہ کی جانب رجوع کئے بغیر ناقابلِ فہم ہے۔"

وہ اپنے درس میں اکثر مواقع پر حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ درس حدیث کے باوجود قرآن کی اہم ترین مشکلات اس درس میں حل ہو جاتیں۔

اعجازِ قرآن:- قرآن سے متعلقہ علوم میں سب سے اہم موضوع اعجازِ قرآن کا ہے۔ اس فن کی اہمیت کے پیشِ نظر یہی نہیں کہ اکثر و بیشتر مفسرین نے اپنے تفسیری کارناموں میں اعجازِ قرآن کا خاص ذکر کیا بلکہ بعض مفسرین نے اس موضوع پر مستقل

عہ لیکن اس مہم میں اس درجہ غلو نہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کی ہر آیت کے لئے بطور شرح و تفسیر کوئی نہ کوئی حدیث زبردستی بہم پہونچائی جائے اور حدیثی نقطۂ نظر سے اس کی صحت و سقم کے پہلو بھی پیشِ نظر نہ رہیں۔ سابق میں صاحب سوانح اسی غلط جد وجہد کی پرزور تردید کر چکے۔ موجودہ تصریحات کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ واقعی اگر کوئی حدیث قرآن کی کسی آیت کی تفسیر ہے تو اسے نظر انداز کرنا غلط ہوگا بلکہ اسی حدیث کی مدد سے آیت کا صحیح مفہوم و مطلب متعین کیا جا سکے گا۔

کتابیں بھی تصنیف کیں چنانچہ ابوعثمان الجاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی فنی اعتبار سے یہ تصنیف اگرچہ کسی اہمیت کی مستحق نہیں لیکن جو تاریخی تقدم مصنف کو حاصل ہے اس کی بنا پر یہ تالیف اس فن میں نقطۂ آغاز ہے۔ ابوعبیداللہ الواسطی المعتزلی نے بھی اعجاز القرآن کے نام سے کتاب لکھی جس کی شرح شیخ عبدالقاہر الجرجانی نے کی۔ ابوالحسن علی بن عیسی الرمانی، قاضی ابوبکر الباقلانی، شیخ عبدالقاہر الجرجانی، احمد بن محمد الخطابی امام رازی، ابن ابی الاصبغ، شیخ زملکانی وغیرہ وہ علماء روزگار ہیں جن کی مؤلفات اعجاز قرآن پر اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن شیخ جرجانی اور زمخشری کی کوششیں اس فن میں سنگ میل کی حیثیت لئے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اعجازِ قرآن کیا ہے؟ اور قرآن کی کس چیز میں اعجاز موجود ہے؟ شاید اس سلسلہ میں سب سے غلط بات نظام معتزلی کی ہے جو اس کا قائل ہے کہ اہلِ عرب میں (عیاذاً باللہ) قرآن کے مقابلہ کی صلاحیت و قدرت موجود تھی لیکن خداتعالےٰ نے اپنی قہاریت سے کام لے کر اس مقابلہ کی قوت کو معطل و مفلوج کر دیا۔ بس اعجازِ قرآن اسی حد تک ہے۔ نظام معتزلی کی یہ رائے انتہائی غلط اور اس کا بطلان واضح ہے۔ قاضی عیاض مالکی کے خیال میں قرآن کے وجوہ اعجاز یہ ہیں:۔

(۱) قرآن کی حسنِ ترکیب (۲) کلمات کی نشست و برخاست (۳) کلمات کی فصاحت اور وہ بلاغت جس نے عرب کے قادر الکلام لوگوں کو نظیرِ قرآن پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔

تاہم اعجازِ قرآن کے بارے میں اس فن کے رجال و اشخاص کی تحقیقات پر مطالعہ کرنے کے بعد بنیادی باتیں جنہیں اعجازِ قرآن کی تقویم میں خاص دخل ہے یہ ہیں:۔

فصاحت الفاظ و کلمات، بلاغت، ترتیبِ کلام، نایاب و بے نظیر اسلوب جو عرب کے مروج اسالیب میں اپنی مثال نہیں رکھتا پھر قرآن کی دی ہوئی خبریں یا پیشین گوئیاں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ امم سابقہ اور پچھلی امتوں سے متعلق وہ صحیح تاریخی حقائق جنہیں تاریخِ عالم غلط قرار نہیں دے سکتی اور پھر ایسے امی کی زبان سے ان کی ادائیگی جس کا تعلق نوشت وخواند سے کبھی اور کچھ نہ رہا ہو۔ یہی کچھ وجوہ اعجاز قرآن چھن چھنا کر سامنے آتے ہیں ورنہ تو بقول ابن سراقہ یہ بھی ایک اعجاز قرآن ہے کہ اب تک اعجازِ قرآن کا مسئلہ طے

نہیں ہوسکا بلکہ اعجاز کے نئے نئے گوشے دریافت کیے جا رہے ہیں۔ علامہ کشمیری جن کے متعلق عرض کیا جا چکا کہ اپنی طبعی انکساری کے باوجود اعجازِ قرآن سے اپنی گہری واقفیت اور مبصرانہ صداقت کا اعلان کرتے ہوئے اس مشہور مقولہ لم یدر اعجاز القرآن الا الاعرجان میں وانا ثالثھما کا اضافہ زبان پر بے تکلف آجاتا۔ فرماتے کہ خدا تعالےٰ نے میرے قلب میں بلاغت و اعجازِ قرآن کی معرفت کا ایسا ذوق عطا فرمایا ہے کہ میں اس فن میں کسی کا مقلد نہیں بلکہ خود اپنی رائے رکھتا ہوں۔ وہ جب تلاوتِ قرآن کرتے تو قرآنی تعبیرات و اسلوب سے جو نشاط ان کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا اس کی سرمستی ان کے چہرہ بشرہ پر بھی کھل جاتی۔ ٹھیک اس وقت میں ان کے چہرے پر ایک پُر معنی تبسم کی نمود ہوتی، اسارِ پیشانی میں سرور و کیف جھلکتا اور گاہے گاہے عالمِ جوش و نشاط میں ان کے شانے متحرک ہوجاتے یہ بھی فرماتے کہ

> ”اعجازِ قرآن کا مسئلہ میرے لئے طلوع پذیر آفتاب سے زیادہ صاف اور واضح ہے بلکہ اعجازِ قرآن میں مجھے کوئی شبہ و تردد نہیں جبکہ طلوعِ آفتاب میں شبہ ہوسکتا ہے چونکہ کبھی آفتاب خود طلوع نہیں ہوتا بلکہ وجودِ آفتاب کی عکس ریزیوں کو آفتاب سمجھ لیا جاتا ہے۔ سائنسِ جدید میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ابھی سورج اپنے حقیقی افق سے اُبھرتا بھی نہیں مگر اس کا جرم دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسا کہ کسی گہرے برتن میں کوئی سکہ پڑا ہوا ہو اور وہ برتن تم سے بہت دور ہو جس کی بنا پر وہ سکہ نظر نہ آتا ہو اس میں اگر پانی بھر دیا جائے تو وہ سکہ نظر آنے لگتا ہے اسی طرح آفتاب اپنے حقیقی افق میں بھی موجود ہے لیکن بعض اسباب کی بنا پر مطلع پر وہ خود نہیں بلکہ اس کا عکس جلوہ ریز ہوتا ہے تو طلوعِ آفتاب مشتبہ ہوسکتا ہے مگر اعجازِ قرآن میرے لئے ہرگز شبہ انگیز نہیں۔“

ان کی رائے میں تفسیرِ قرآن میں سب سے زیادہ ضروری چیز قرآن کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی تفسیر کرنا ہے اور مقصد بھی وہ جو خدائے تعالےٰ کے شایانِ شان اور قرآن کے بلیغ و معجز اسلوب کے مطابق ہو جس تفسیر میں نہ کسی تکلف کی ضرورت پیش آتے اور نہ خارج سے

اضافوں کی احتیاج ہو اسلئے کہ خارجی مدد یا تقدیرِ عبارت کا چکر قرآن کو اس اعجاز و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر نہیں رہنے دیتا جو اس کا مخصوص و بلند و بالا معیار ہے۔ زمخشری کی بھی کچھ تصریحات علامہ کے اس نقطۂ نظر کی مؤید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابراہیم بن عمر البقاعی ۸۸۵ھ المتوفی جو شارح بخاری حافظ ابنِ حجر عسقلانی کے ارشد تلمیذ ہیں ان کی کتاب "نظم الدررفی تناسب الایۃ والسُّور" کو بے حد پسند فرماتے بلکہ اس کے بارے میں فرماتے کہ

"ایک انسان اپنی توانائیوں کے مطابق تفسیری سلسلہ میں جو کچھ کرسکتا ہے بقاعی کی کوششیں اس طرز میں بے مثال ہیں بلکہ اعجازِ و بلاغت قرآن پر ابتک امت میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے بقاعی کی یہ تصنیف سب میں اعلیٰ ہے"۔

بڑی آرزو یہ تھی کہ "نظم الدرر" کو شائع کیا جائے اپنی آخری عمر میں مصر سے اس کے عکسی فوٹو لینے کی تیاریاں کیں تھیں لیکن افسوس کہ موت نے مہلت نہ دی۔

وجوہ اعجاز:۔ سطورِ بالا میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی تھی کہ خاص اعجاز قرآن کے مسئلہ میں اکابرِ امت کا کافی اختلاف چلا آتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحب کا خیال تھا کہ قرآنی اعجاز مکمل قرآن مجید میں موجود ہے اس کے مفردات و مرکبات، ترتیبِ کلمات، مقاصدِ قرآن اور حقائق سب اعجاز سے مملو ہیں فرماتے کہ

"مفردات میں اعجاز سے میری مراد یہ ہے کہ جب کسی امر کی حقیقت کے اظہار میں اہلِ عقل مختلف ہوتے ہیں اور باہمی کشاکش رونما ہوتی ہے عقلمند تعبیر میں الجھ جاتے ہیں حقیقت مشتبہ ہوکر رہ جاتی ہے اور کوئی مخلص باقی نہیں رہتا تو اس وقت قرآن مجید اس ساری قیل و قال میں ایک ہی لفظ ایسا انتخاب کرتا ہے کہ اس لفظ سے بڑھ کر کوئی حقیقت کا ترجمان، مقصد کی ادائیگی میں کامل اور اس مقام کے مناسب نہیں ہوسکتا اگر جن و انس اس لفظ کے بجائے کوئی دوسرا لفظ وہاں رکھدیں اور چاہیں کہ ان کے منتخب لفظ سے قرآن کے لفظ کی قائم مقامی ہوجائے تو اس مہم میں ثقلین کو شدید ناکامی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ تمام دنیا جس مقصد کی ترجمانی کے لئے طول وطویل تعبیرات اختیار کرنے کے باوجود کامیاب نہیں ہوتی وہاں قرآن صرف ایک

لفظ سے بھرپور کامیابی کے ساتھ سب کچھ کہہ گذرتا ہے۔"

توفی کی حقیقت:۔ اپنے اس نظریہ کی تائید میں قرآن مجید کے لفظ توفی پر جو جامع تقریر فرماتے اور جس سے ان کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن اپنے مفردات کے اعتبار سے بھی سراپائے اعجاز ہے اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ عام طور پر عرب حیات بعد الموت کے منکر تھے ان کا خیال یہ تھا کہ انسان جب مرنے کے بعد گل گیا سڑ گیا اور اجزائے بدن کا نام و نشان باقی نہ رہا تو پھر دوسری زندگی کا کیا سوال؟ قرآن مجید نے مشرکین عرب کے یہ واہی خیالات جا بجا نقل کئے ہیں مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

وقالوا ان هی الاحیاتنا الدنیا نموت ونحیا ومانحن بمبعوثین۔ (اور کہتے ہیں کہ صرف دنیاوی زندگی ہے یہیں مرنا یہیں جینا اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہیں)

صحیح بخاری شریف میں ایک شعر ہے۔

یخبرنا الرسول بان سنحیی وکیف حیاۃ اصداء وھام

ان کے خیال میں "صدی" کی حقیقت یہ تھی کہ جب کوئی آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے سر سے ایک پرندہ نکلتا ہے جس کی مسلسل یہ پکار ہوتی ہے کہ میری تشنگی بجھاؤ میری تشنگی بجھاؤ اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا وہ پرندہ یہی چیخ و پکار کرتا رہتا ہے غرضیکہ ان کے خیال میں حساب و کتاب کی کوئی حقیقت نہ تھی نہ وہ حشر و نشر کو مانتے تھے بلکہ وہ یہ یقین رکھتے کہ موجودہ دنیا جوں کی توں رہے گی اور اس پر کبھی تباہی و ویرانی کا دور نہیں آئے گا۔ صاعد اندلسی نے طبقات الامم ص۴۸ اور شہرستانی نے ملل و نحل نقل مشرکین کے عقائد و افکار کی یہی سرگذشت سنائی ہے۔

مشرکین میں ایک جماعت وہ بھی تھی جو حیات بعد الموت کی قائل تھی جیسا کہ جاہلیت کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے لیکن ان میں بھی اس قدر اختلاف تھا کہ کسی ایسی حقیقت پر یہ متفق نہ ہو سکے جو طمانینت کی موجب ہو بقول حق حضرت جل مجدہ "فھم فی امر مریج" ابوطیب کے کچھ اشعار اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

تخالف الناس حتی لا اتفاق لھم الا علی شجب والخلف فی الشجب

فقیل تخلص نفس المرء سالمۃ وقیل تشرک جسم المرء فی العطب

ومن تفکر فی الدنیا ومھجتہ اقامہ الفکر بین العجز والتعب

ابن سید الاندلسی نے اپنی کتاب کے چھٹے جز میں تفصیل سے بتایا ہے کہ مشرکینِ عرب نے موت کے لئے کتنے الفاظ انتخاب کئے تھے یہ انتخاب موت کے بارے میں ان کے تصورات کے مطابق تھا چنانچہ وہ موت کے لئے ھمیغ، نیط، رھز، نون، شعوب، فوت، ھام، سام، مقداء، قتیم، جیاز، حلاق، قاضیہ، طلاطل، طلاطلۂ عول، ذام، کفت، جذاع، حزرہ، حتف، خالج۔ یہ سب الفاظ استعمال کرتے اور جاہلی شعراء نے اپنے کلام میں ان کا استعمال کیا ہے لیکن تَوَفِّیْ کا لفظ سب سے پہلے قرآن نے اختیار کیا اور شعرائے عرب نے نزولِ قرآن کے بعد ہی اس لفظ کا استعمال شروع کیا۔ قرآن حکیم نے ان کے باطل افکار کی تردید کرتے ہوئے فناءِ محض کے تصور کو غلط قرار دیا حیاتِ اخروی کو بطورِ عقیدہ پیش کیا اور اس ذیل میں جو فاسد خیالات مشرکینِ عرب میں موجود تھے اس پر بھرپور تردید بھی کی تنقید بھی کی۔ تَوَفِّیْ کا لفظ جس کا ترجمہ کسی چیز کو بھرپور لے لینا ہے۔ یہ وصولیابی اس انداز میں ہوگی کہ کوئی چیز کم نہ ہونے پائے۔ پس قرآن کے بیان کے مطابق ارواح کے لئے ایک جائے قرار ہے اور اجزائے جسد کیلئے بھی ایک مستقر ہے اور خدا تعالےٰ جب چاہے گا تو ان اجزاء کو جمع کرلے گا۔

وھو علےٰ جمعھم اذا یشاء قدیر۔

کوئی ذرّہ خدا کے معلومات سے خارج نہیں

جیسا کہ خود ارشاد ہے:۔

وعندنا کتاب حفیظ۔

شاہ صاحب فرماتے کہ الفاظِ قرآن میں جو حلاوت و وقار شوکت وعظمت ہے اسے آپ ٹکسالی الفاظ سے بھی ادا نہیں کرسکتے۔ قرآن مجید نے شہادۃ کے لئے اور موت کی تعبیر کے لئے جو یہ اسلوب اختیار کیا فمنھم من قضےٰ نحبہ اس اسلوب کا بدل ممکن نہیں چنانچہ اپنی کتاب "تحیۃ الاسلام" میں لکھتے ہیں۔

"توفی بمعنے موت کا استعمال خود اسلام میں نزولِ قرآن کے بعد شروع ہوا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ "ازہری" نے تہذیب الالفاظ میں اور ثعالبی نے فقہ میں اسماء موت کی جو فہرست دی ہے اس میں توفی کا تذکرہ نہیں ہے۔"

بلکہ

"لفظ توفی میں ایک اور بھی لطیفہ ہے وہ یہ کہ متوفٰی متوفی کا حق ہوتا ہے اسلئے اگر صحرا سے کوئی گھوڑا لیا گیا تو توفیتُ الفرس کہنا صحیح نہ ہوگا بلکہ توفیتُ حقّے کہنا چاہیئے جس کا ترجمہ حصلتہ ہے۔ فارسی میں اسکا ترجمہ "وصول کردم حق خویش را" ہوسکے گا جب توفی کا مطلب وصولیابیٔ حق ہے اور آپ کا حق غیر کے پاس ہوگا تو وہ بطورِ رعایت وامانت ہی ہوسکتا ہے جس کی کوئی مدت بھی متعین ہوگی اس حیثیت سے لفظ توفی میں "مدت کی تکمیل" کا مفہوم بھی موجود ہے کیونکہ صاحبِ حق جب چاہے گا اپنا حق وصول کرلے گا۔" اسی مفہوم میں یہ شعر ہے۔

وما الرّوح والجسمان الّا ودیعۃ

ولابدّ یوما ان تردّ الودائع

کہ روح وجسم دونوں بندے کے پاس امانت ہیں اور امانت کو ایک نہ ایک دن لوٹانا ہی پڑتا ہے اور یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ تَوَفِّیْ جس کے معنی اپنے حق کو مکمل وصول کرنا ہے جب اس کا تعلق خدا تعالٰے سے قائم ہوگا تو یہ نسبت اس کی علامت ہوگی کہ متوفّٰی فنا نہیں ہوا اس لئے کہ وہ ایک جیتی جاگتی ہستی کا (اللہ کا) ملوک بن گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے "وکنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون" تو اماتۃ اور احیاء جو دوسری مرتبہ ہوگی وہ ہمیشہ نہیں ہوتی رہے گی بلکہ اس کا سلسلہ ثم الیہ ترجعون پر ختم ہوجائے گا۔ اسی حقیقت کو قرآن میں یہ کہہ کر بھی ظاہر کیا گیا ماعندکم ینفد وما عند اللہ باق۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز خدا تعالٰے کے قبضہ میں ہے وہ نہ ختم ہونے والی ہے تو متوفٰے جب خدا تعالٰے کے قبضہ میں داخل ہوگیا تو پھر وہ فنا پذیر نہیں رہا اور متوفّٰی اگر روح ہے تو وہ بدستور باقی رہے گی اور سب انسانوں کا بدن خدا تعالٰے کے حضور میں حاضر نہیں ہوتا حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا معاملہ روح مع بدن پیش آیا یہی وجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران میں اسکی

تفصیل بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا" ورافعك الی" جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع کو خصوصی طور پر اپنی جانب منسوب فرمایا"۔

قرآن حکیم نے توفی کا لفظ موت کے لئے جا بجا استعمال کیا ہے لیکن یہی لفظ گاہے قرآن حکیم ہی نے نوم (سونے) کے لئے بھی استعمال کیا جس سے اشتباہ پیدا ہونے کا امکان ہے علامہ کشمیری نے اسی اشکال کو حل کرتے ہوئے فرمایا کہ

"نوم میں بھی قرآن مجید توفّی کا لفظ استعمال کر رہا ہے مثلاً "اللہ یتوفی الانفس حین موتہا" الآیۃ۔ یا "ھو الذی یتوفکم باللیل" ان آیات میں قرآن مجید نے انفس کا اضافہ کیا ہے کیونکہ عام طور پر لوگ توفّی بمعنی موت کو تو جانتے ہیں لیکن توفّی بمعنی نوم سے واقف نہیں اسلئے قرآن نے سمجھا کہ نوم میں توفی نفس کی ہے تو ضروری تھا کہ نفس کا اضافہ کیا جائے اور جب نفس کا اضافہ کر کے منامی توفی کی حقیقت کھول دی گئی تو بعض مواقع پر اس تصریح کی ضرورت بھی نہیں رہی چنانچہ یتوفاکم باللیل میں نفس کا تذکرہ نہیں آیا اور صرف "باللیل" کا اضافہ کر دیا۔ یہ اس لئے کہ سابق میں توفی منامی کے ساتھ نفس کا تذکرہ گذر چکا جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں"۔

غلام احمد قادیانی نے سیدنا عیسٰی علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات کا اعلان کیا اور ان کی مصلوبیت کا بھی، بلکہ اپنی تحریروں میں قرآن مجید کے اسی لفظ "یعیسیٰ انی متوفیك" سے چند در چند باطل استدلالات کئے۔ شاہ صاحب نے اس کی تردید میں "عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام" تصنیف فرمائی اور لفظ توفی پر اپنے خداداد فہم اعجاز قرآن سے گہری دلچسپی کی بنا پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ راقم الحروف نے یہ مختصر اشارات اسی کتاب سے جمع کئے ہیں اہل علم "عقیدۃ الاسلام" سے مراجعت کر کے محظوظ ہو سکتے ہیں اور اردو داں طبقہ کو اس کتاب کی اردو ترجمانی کا انتظار کرنا ہو گا۔ ممدوح نے قرآن کے مفردات میں اعجاز پر طویل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ بعض الفاظ اگر انہیں خود مستقل استعمال کیا جائے تو اپنے دامن میں ایک نکارت رکھتے ہیں لیکن قرآن کریم نے انہیں جس انداز میں استعمال کیا تو وہی تابدار و آبدار موتی کے ایک مسلسل لڑی بن گئے اور بجائے نکارت کے

کے ان میں نزہت بلکہ حسن و لطافت پیدا ہو گئی۔ مثلاً

"ضیزیٰ" کا لفظ اگر اسے تنہا استعمال کیا جائے تو اسمیں جو نکارت ہے اہل ذوق سے مخفی نہیں مگر قرآنِ حکیم نے سورۂ والنجم میں اس کا استعمال کیا پوری سورت آخری حرف کے اعتبار سے یاء پر ختم ہو رہی ہے قرآنِ کریم مشرکین کے اس تخیل پر بھرپور تنقید کرتے ہوئے کہ انھوں نے تقسیمِ اولاد میں بھی اپنے لئے اولادِ ذکور کا انتخاب کیا اور خدائے تعالےٰ کے لئے العیاذ باللہ لڑکیوں کا یہ کہہ کر "الکم الذکر ولہ الانثیٰ" اور اس کے پہلو بہ پہلو "تلك اذا قسمة ضيزىٰ" اس انداز سے استعمال کیا کہ خود "ضیزیٰ" اپنی پستیوں سے اٹھ کر لطافت وجزالت کی رفعتوں میں جا پہونچا۔ اگر "ضیزیٰ" کے بجائے قسمة جائزة یا قسمة ظالمة کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو کلام میں جو خوبصورتی، شوکت وجزالت اور قافیہ کی رعایت "ضیزیٰ" نے باقی رکھی وہ جائزة وظالمه سے ہرگز باقی نہ رہتی۔"

ترکیبی اعجاز:۔ مفردات میں اعجاز کے ان روشن و اجاگر پہلوؤں پر ایک تفصیلی گفتگو کے بعد تراکیب میں اعجازِ قرآن پر فرمایا کہ:۔

"قرآن مجید ترکیب میں بھی وہ انداز اختیار کرتا ہے جس سے بلیغ اور حقیقت کا ترجمان مہیا نہیں مثلاً قرآن نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا "وجعلوا للہ شرکاء الجن" بظاہر یہ عبارت "وجعلوا الجن شرکاء للہ" ہونا چاہیئے تھی۔ اس عبارتی تغیر سے قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان ظالموں نے شریک گردانا کس ہستی کا اس ہستی کا جو شریک سے قطعاً پاک ہے۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے للہ کی تقدیم مشرکین کی انتہائی سفاہت کو واضح کرنے کے لئے بے پناہ مؤثر ہے پھر اس پر بھی نظر رکھئے کہ شریک بھی تجویز کیا اور وہ بھی کوئی اعلےٰ وارفع نہیں بلکہ مخلوقِ خدا میں سے گئی گذری ایک مخلوق یعنی جنات کو۔ اس اندازِ عبارت نے مشرکین کی اس دوسری سفاہت پر توجہ دلائی

یہ مقاصد اس ترکیب کے علاوہ کسی اور ترکیب سے حاصل نہیں ہو سکتے۔"
یہی نہیں بلکہ مرحوم نے اپنی کتاب "نیل الفرقدین" کے آخر میں ترکیب کے موضوع پر کچھ اور دلآویز نکات بھی قلمبند کئے ہیں۔

مقصدی اعجاز:۔ اس عنوان کے تحت خود حضرتؒ نے اردو عبارت استعمال کی ہے۔

"مقاصد" سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے جیسا علماء کرام نے اسمائے حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے۔"

اس سے آپ کی بظاہر مراد یہ ہے کہ ان مذکورہ چیزوں کو عوام اپنا دین بنائیں ان سے نصیحت حاصل کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں اور یہ ان کا یقین بن جائے کہ عبدیت کا کمال ان امور مذکورہ پر عمل کئے بغیر نہیں۔ یہی سعادتِ ابدی کا سرچشمہ اور مرضیاتِ الٰہی کو حاصل کرنے کی شاہراہ ہے۔ نتیجتہً اس یقین کے حصول پر مؤمن خدا تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے لئے بہ دل و جان تیار ہو گا اور دین و دنیا دونوں کو آراستہ کرنے کی اس کو فکر ہو گی اسکے بعد یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

قرآنِ حکیم کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدأ و معاش و معاد اور فلاح و نجاح دنیا و آخرت وابستہ ہو انہیں کی جانب قرآن مجید کی یہ آیات مشیر ہیں۔ واعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب و لھو و زینۃ و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما و فی الاخرۃ عذاب شدید و مغفرۃ من اللہ و رضوان و ما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔"

شاہ صاحب نے مقاصد کے ذیل میں قرآن مجید کے جو اعجاز بیان فرمائے ہیں ظاہر ہے کہ ایک حکیم، دانا، بینا، عزیز و مقتدر کی کتاب میں ان مقاصد کی رعایت سب سے زیادہ مطلوب تھی اور بلاشبہ فہرستِ مقاصد میں ان امور کے علاوہ کسی اور کو شریک بھی نہ ہونا چاہیئے۔

اعجازِ قرآن اور حقائق:۔ ارشاد ہے کہ حقائق سے میری مراد وہ دقیق امور ہیں جنکی دریافت سے انسانی عقول عاجز ہیں اور شدید قیل و قال علمی و دماغی کاوشوں کے باوجود

حقیقتیں آج تک طے نہ ہوسکیں۔ مثلاً بندہ کا اپنے فعل سے تعلق کیا ہے اور کس نوعیت کا ہے اور اس فعلِ حادث کی ازلی قدرتوں سے روابط کی نوعیت کیسی ہے۔ ایسے الجھے ہوئے مسائل میں قرآن مجید ان تعبیرات کو اختیار کرتا ہے کہ کشفِ حقیقت کے لئے اس سے زیادہ کامل و واضح تعبیر کا انتخاب بشری قوتوں سے ماوراء ہے۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا یہ حقیقتہً ہیچ و پوچ قلم سے شرح اس متن کی تھی جو علامہ کے قلم نے ان الفاظ میں ایک علمی وثیقہ کی حیثیت سے چھوڑا ہے۔

"قرآن مجید کا اعجاز مفردات اور ترکیب و ترتیبِ کلمات اور مقاصد و حقائق کی جملہ وجوہ سے ہے۔ مفردات میں قرآنِ مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے اوفی بالحقیقۃ واوفی بالمقام الثقلین نہیں لاسکتے۔ مثلاً جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر توفی کا اطلاق درست نہ تھا کیونکہ ان کے اعتقاد میں نہ بقاءِ جسد تھی نہ بقاءِ روح۔ توفی وصول کرنے کو کہتے ہیں ان کے عقیدہ میں موت توفی نہیں ہوسکتی۔ قرآن مجید نے موت پر توفی کا اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصول یابی ہوتی ہے نہ کہ فناءِ محض۔ اس حقیقت کو کلمہ سے کشف کردیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے معنی سے جسد مع الروح کے وصول کرنے پر کیا۔"

ترکیب و ترتیب جیسے وجعلوا للہ شرکاء الجن ظاہر قیاس یہ تھا کہ عبارت یوں ہوتی وجعلوا الجن شرکاء اللہ۔ لیکن مراد یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے شریک ٹھہرا کر کوئی معمولی جرم نہیں کیا اور وہ شریک بھی کون (جن)، پس یہ مراد اسی ترتیب اور نشست الفاظ سے حاصل ہوسکتی ہے۔

مقاصد سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے جیسا علماء کرام نے اسماءِ حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے۔ مقاصد قرآن حکیم کے وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدأ و معاش و معاد اور فلاح و نجاح دنیا و آخرت وابستہ ہو۔

حقائق سے میری مراد وہ امور غامضہ ہیں جن سے عقول و افکار قاصر

رہے اور تجاذب وجوانب اور نزاع عقلاء باقی رہا جیسے مسئلہ "خلقِ افعالِ عباد" کہ عبد کا ربط فعل سے کیا ہے اور کیسے ہے اور اس فعل کا ربط قدرتِ ازلیہ سے کیا ہے۔ قرآن مجید ایسے مقام میں وہ تعبیر اختیار فرمائیگا جس سے ادنٰی بالحقیقت طوق بشر سے خارج ہو۔

اسلوبِ قرآن :- فرمایا کہ قرآن مجید اپنے خطاب میں عربوں کے عام اسلوب اختیار کرتا ہے اسکے بیانات اگرچہ دلائلِ عقلی و منطقی ترتیب ونتائج کے حامل ہوتے ہیں جن سے معقولی مزاج خاص ذوق حاصل کر سکتے ہیں تاہم قرآن مجید معروف منطقی انداز کو اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ بالعموم عربی اسلوب پر چلتا ہے جس میں ایسے مسلّمات کا تذکرہ آتا ہے جو عام طور پر ثابت ہیں اور ان کے اثبات کے لئے کسی کاوش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

آیاتِ توحید :- یہ بھی فرماتے کہ عام طور پر لوگوں نے لوکان فیہما الٰھۃ الا اللہ لفسدتا کو اس پر محمول کیا ہے کہ اگر زمین و آسمان میں دو خدا ہوتے تو ارض وسماء کا یہ موجودہ نظام شکست وریخت ہو جاتا اور پھر اس بیان کردہ مطلب کو اثباتِ توحید کے لئے کارآمد سمجھتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اصل اس آیت میں یہ ہے کہ اگر اس زمین وآسمان میں خدائے واحد و برحق کے علاوہ کوئی اور خدا ہوتا۔ ایک ہوتا یا متعدد ہوتے تو نظامِ عالم ہرگز قائم و باقی نہیں رہتا بلکہ کائنات ہولناک اور نہ ختم ہونے والی تباہی کے دہانہ پر آکھڑی ہوتی۔ اس لئے میرے خیال میں آیت وجود خدائے برحق اور ان کی وحدت پر اس انداز پر زور دے رہی ہے جو میں نے سمجھا۔ میں نے اپنی کتاب "ضرب الخاتم علٰی حدوث العالم" میں یہ شعر اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے کیا ہے۔

ولو کان الا اللہ قد قام فیہما لقد فسدا بالجور یجری لما ھنا

راقم السطور کہتا ہے کہ اس تقریر کے بعد آیت اپنی مراد و اثباتِ توحید میں نزاکتِ خیال کی رفعت پر ہے۔

ایک اہم نکتہ :- اعجازِ قرآن سے متعلق کافی اختلاف ہے کہ قرآن کا کس قدر حصہ معجز ہے۔ امام باقلانی نے اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں مختلف اقوال کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن علامہ کشمیری کی رائے تھی کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی آیت بھی بجائے خود معجز ہے اگرچہ اُس مختصر آیت میں اعجاز کی دریافت و سراغ میں کامیابی بہت دشوار ہے۔ اہلِ علم

بھی جستجو و تلاش میں ناکام ہوں گے عوام کی رسائی تو ناممکن ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ امام اعظم علیہ الرحمہ سے یہ جو منقول ہے کہ قرآن کی چھوٹی سی آیت بھی نماز میں فرض قرات کی ادائیگی کے لئے کافی ہے اور انہیں امام ہمام سے یہ بھی منقول ہے کہ جس پر غسل واجب ہو (جنبی) اس کے لئے ایک آیت سے کم کی تلاوت جائز ہے جبکہ پوری آیت کی تلاوت ممنوع ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ امام اعظم کے یہ مسائل اس دقیق نکتہ پر مبنی ہیں کہ قرآن کی ہر ہر آیت سراپائے اعجاز ہے اور یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ رفعتِ تخیل میں کیسے بے مثل واقع ہوتے ہیں اور ان کے مذہب کو سمجھنے کے لئے کن اطراف وجوانب پر وسیع نظر کی ضرورت ہے۔

اعجازِ قرآن کے سلسلہ میں ان کا اعلان تھا کہ

"مجھے منجانب اللہ اس فن میں خداداد ذوق حاصل ہے اور کسی چیز کی فصاحت و بلاغت کا فیصلہ کرنے میں متقدمین و متاخرین کا پابند نہیں ہوں اور اسی لئے بہت سے وہ اشعار جنہیں فصاحت و بلاغت کے ماہرین نے معیار سے ساقط قرار دیا ہے میرے خیال میں وہ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہیں مثلاً متنبی کا یہ شعر

ویسعدنی فی غمرۃ بعد غمرۃ ؛ سبوح لہا منہا علیہا شواھد

عام طور پر اس کے بارے میں ضمائر کا تکرار مخلِ فصاحت سمجھا گیا ہے لیکن میں اسے معیارِ فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا نہیں سمجھتا اور اسی لئے میں امام باقلانی کو اعجازِ قرآن کے بارے میں "سند" قرار نہیں دیتا۔ وہ ایک تجربہ کار متکلم تو ہو سکتے ہیں مگر اعجازِ قرآن میں ذوقِ سلیم نہیں رکھتے۔ یہ فن علامہ قاہر جرجانی اور علامہ زمخشری کا ہے۔"

تو جب ممدوح اس فن کی اساسی شخصیتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اپنے ذوقِ سلیم و وجدان سے اعجاز کے فیصلے کرتے ہیں اور کلام بھی اپنے شایانِ شان۔ تو یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے افکار و علوم کی ترجمانی شکستہ قلم صحیح طور پر کرتا چلا آرہا ہے تاہم جو کچھ لکھا گیا وہ اپنی دانست کے مطابق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اہلِ علم ترجمانی کے ساتھ انکے قلمی افادات کو بھی سامنے رکھیں۔

اندازِ نگارش:۔ ارشاد فرمایا کہ:۔

"قرآن کریم اپنے اسلوب میں عام تصنیفی و تالیفی قواعد کا پابند نہیں ہے۔ وہ کسی موضوع سے متعلق اس کی تمام جزئیات کو بھی سمیٹنے کا اہتمام نہیں کرتا یا موجودہ مؤلفین کی طرح دفعات وار بیان کرنے کا اہتمام بھی قرآن میں نہیں۔ بلکہ قرآن کا اسلوب عربی اسالیب کے مطابق ہے جسمیں مفردات کا مفردات پر جملوں کا جملوں پر عطف کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جو آیات ایک سیاق میں چلی جاتی ہیں ان کے بارے اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ آیتِ ثانی کا موضوع بعینہٖ آیتِ اولےٰ کا موضوع ہے یا اور کچھ؟ بلاشبہ یہ بہت اہم امر ہے جس پر طالبینِ قرآن کی خاص توجہ رہنی چاہیئے۔"

یہ بھی فرماتے کہ:۔

"قرآنِ حکیم کسی واقعہ کے تمام تاریخی اجزاء کا استیعاب نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ہی واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے کہیں اسے مفصل بیان کرتا ہے اور کہیں مختصر! بلکہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ایک ہی داستان کے مؤخر اجزاء کو قرآن نے مقدم کر دیا اور ترتیب میں پہلے آنے والے اجزاء کو مؤخر کر ڈالا۔ بظاہر یہ اندازِ نگارش کے عام اسلوب سے ہٹا ہوا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن اسلوب کا موجد ہے کسی اسلوب کا پابند نہیں۔ قرآن اپنے اس طرز میں ایسے لطائف پنہاں ملحوظ رکھتا ہے جن کا فہم نصیب نہیں تاوقتیکہ ذوقِ لطیف، فکرِ سلیم اور ذہنِ ثاقب کی دولت نصیب نہ ہو۔"

مشکلات القرآن:۔ یہ بھی فرماتے کہ:۔

"قرآنی مشکلات حدیثی مشکلات سے اہم و سنگلاخ ہیں۔ مگر امت کی عام توجہات حدیث کی طرف تو رہیں لیکن قرآن کی جانب جیسی توجہ ہونی چاہیئے تھی نہیں کی گئی۔ بخاری شریف پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے "فتح الباری" لکھدی جو بخاری شریف کے ہر حسین رُخ سے نقاب

کشائی کرتی ہے مگر تفسیر کے پورے ذخیرے میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو قرآن کریم کے جمیل ولطیف پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے حالانکہ قرآن توجہات کا زیادہ طالب ہے اور وہ ایک ناقابلِ عبور بحرِ ناپیدا کنار ہے۔"

تعبیراتِ قرآن:۔ ارشاد فرمایا کہ:۔

"قرآن کسی مقصد کی تعبیر میں اگر وہ واضح ہو گیا پھر الفاظ کی بھرت پیشِ نظر نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر آپ محسوس کریں گے کہ یہاں اس لفظ کی کمی ہے۔ حالانکہ قرآن جس مقصد کی توضیح چاہتا تھا جب وہ حاصل ہو چکی تو زائد الفاظ بالکل زائد ہوتے۔"

لفظی انتخاب:۔ ارشاد ہوا کہ:۔

"جسے قرآن کا صحیح ذوق نصیب ہو گا اور عربی اسلوب پر اسے بصیرت ہو گی وہ دیکھے گا کہ قرآن اس انداز پر رواں دواں نہیں جو عامیانہ ہے بلکہ قرآن کریم الفاظ کے انتخاب میں خود اپنا ایک معیار رکھتا ہے اور اور اس کا معیار نہایت صاف ستھرا، شگفتہ اور اس قدر جامع ہے کہ آپ قرآن کے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لانے سے عاجز ہیں جو قرآن کے منتخب لفظ کی واقعی قائم مقامی کر سکتا ہو اور یہ اس لئے کہ مخلوق اشیاء کی حقائق پر صحیح اطلاع نہیں رکھتی اور وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ یہاں کونسا لفظ حقیقت کی صحیح ترجمانی اور مقام کے واقعی مناسب وزیبا ہے۔"

تکرار اور اُس کی حکمت:۔ قرآن مجید میں تکرار کا مسئلہ اختلافی مسائل میں سے ہے عام شعراء نے بھی شاعری میں تکرار مضمون کی بحث کو اٹھا کر تکرار قبیح و تکرار حسن میں تقسیم کی ہے۔ قرآن کریم کے تکرارِ مضامین کو معیارِ فصاحت سے ساقط تو کسی نے قرار نہیں دیا۔ البتہ تکرار کی توجیہات مختلف اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق کی ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی "تکرار" کے بارے میں رائے یہ تھی:۔

"قرآن مجید میں بالعموم تکرار قدرِ مشترک کا حاصل ہوتا ہے اور

کہیں کہیں قدرِ مغایر اور صرف تکرار برائے تکرار تو بہت ہی کم ہے
اس تفصیل سے میری مراد یہ ہے کہ جو الفاظ بظاہر مکرر نظر آتے ہیں ان میں
سے ایک لفظ سے ایک حکم مفہوم ہے اور دوسرے سے دوسرا حکم۔
حالانکہ موضوع مشترک تھا اس کے بعد ان دونوں میں تعلق متن وشرح
کا ہوجاتا ہے۔ پھر کبھی تکرار سے قرآن مجید کسی خاص چیز کی اہمیت پر بھی
توجہ دلاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں نماز کا نو سو سے بھی زیادہ تذکرہ نماز
کی اہمیت کے پیشِ نظر ہے۔"

رَبطِ آیاتؒ :- قرآن کے جن چند امور میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کو اہمیت بھی ہے
انہیں مسائل میں ربط بین الآیات کا بھی مسئلہ ہے۔ بعض دانائے قرآن، قرآن کی مختلف
سورتوں، مختلف بیانات بلکہ آیات میں ربط وارتباط قرار دیتے ہوئے از اوّل تا آخر
قرآن کو مربوط ومرتب صحیفہ مانتے ہیں۔ جبکہ بعض قرآن مجید میں ربط وارتباط کی مسلسل
تلاش کو ایک بے مصرف مشغلہ سمجھتے ہیں۔ مؤخر الذکر جماعت کے خیال میں قرآن میں ربط
اگر کہیں ہے تو وہ فطری ہے اور اس کا انکار صحیح نہیں۔ لیکن تمام قرآن کو مربوط ماننے کی
جدوجہد قطعاً غیر ضروری ہے۔ "فوز الکبیر" میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصریحات
بھی اس ثانی الذکر خیال کی مؤید ہیں۔ علامہ کشمیریؒ اس باب میں یہ رائے رکھتے ہیں:-

"جن آیات میں بظاہر ترتیب وارتباط نظر نہیں آتا یقین رکھئے وہ
ہماری نارسائی ذہن کا نتیجہ ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ان آیات میں
بھی ایسے دبیز تعلقات اور گہری مناسبتیں ہیں جنھیں خدائے تعالےٰ
ہی بہتر سمجھتا ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فقیہ مجتہد کسی فقہی
باب کے تحت جزئیات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ منتشر
جزئیات ہیں اور ان میں کوئی علاقہ نہیں۔ حالانکہ وہ ایک اصل اور قاعدے
کے تحت ہوتے ہیں میرے خیال میں ایک ہی آیت کے متعدد اجزار کو
ایک دوسرے سے مربوط کرنا زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ اسی لئے میں متعدد
آیات کے مقابل میں واحد آیت کے متعدد الفاظ کو مربوط کرنے کے
مسئلہ کو اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی مثال اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

فاعتزلو النساء فی المحیض ولا تقربوھن حتے یطھرھن فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ۔ اس آیت میں فاذا تطھرن کو مشدد پڑھتے ہوئے حتے یطہرن تخفیف کے ساتھ نبھانا بے حد دشوار ہے۔ بظاہر طہور سے مراد انقطاع حیض ہے اور تطہر سے میرے خیال میں انقطاعِ حیض بعدِ غسل ہے۔ تو اب قرارت تخفیف و قرارت تشدید ایک دوسرے پر کس طرح مرتب ہوتی۔ یہ تو بالکل ایسا ہو جائے گا جیسا کہ عربی میں کوئی کہے کہ لاتعطہ فلانًا حتے یدخل الدار فاذا دخل المسجد فاعطہ (فلاں کو کچھ مت دیجیو تا وقتیکہ وہ گھر میں نہ آئے اور جب مسجد میں داخل ہو جائے تو دیدو) ادھر امام اعظمؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر انقطاعِ حیض متعینہ مدت کے اکثر ایام پر ہوا تو پھر بیوی سے بغیر غسل بھی ہمبستری جائز ہے اس اشکال کا جواب اس مفروضہ پر کہ "طُھُرْ" سے صرف انقطاع مراد لیا جائے حالانکہ انقطاع واغتسال بھی مراد لے سکتے تھے اور "تطہر" سے صرف غسل مراد لیں درآنحالیکہ یہاں انقطاعِ حیض، مقامِ جریانِ خون کو دھونا، غسل اور وضو بھی مراد لے سکتے ہیں لیکن گفتگو صرف اسی مفروضہ پر ہے تو جواب میں دو حیثیتیں پیشِ نظر رہیں گی۔

(۱) صرف جواز، توسیع، آسانی وسہولت (۲) عزیمت، محتاط جانب کا انتخاب اور ترجیح افضل۔

اب اسکے بعد سمجھئے کہ تخفیف والی قرارت سے صرف جواز پر اشارہ کرنا ہے اور عزیمت پر "فاذا تطہرن" میں توجہ دلائی گئی۔ یہ دوسری قرارت یعنی "تطہر" والی تخفیف قرارت کا بیان ہے اور شارع کیلئے یہی پسندیدہ ہے جبکہ انقطاعِ دمِ حیض کے اکثر مدت پر یقینی ہوگا جس کی امام ابوحنیفہؒ نے پوری رعایت کی ہے۔ امام اعظم کی یہ دقتِ نظری جس سے یہ مسائل رونما ہوئے دونوں قراءتوں کو ایک ہی سورت میں لے کر یا دو مختلف قراءتوں کو ممکن مان کر ان کا ایک ہی مفہوم لینے کی ضرورت

میں ان متعدد مسائل کا استنباط ممکن نہیں تھا۔"

اپنے اس مقصد کی توضیح کے لئے "مشکلات القرآن" میں مفصل اور واضح گفتگو کی ہے اہلِ علم مراجعت کے بعد محظوظ ہوں گے۔ غرضیکہ آپ کے خیال میں قرآنی ربط کے ہنگامی مسئلہ میں معتدل بات وہ تھی جس کی تفصیل آپ کو سنائی گئی۔

ناسخ و منسوخ:۔ قرآن کا کتنا حصہ ناسخ ہے اور کس قدر منسوخ۔ یہ مسئلہ بھی متقدمین و متاخرین کے یہاں نزاعی ہے۔ متقدمین عام کو خاص یا خاص کو عام، کسی حکم مطلق کو مقید کرنا یا مقید کو مطلق بنانا استثناء و ترک استثناء ان سب صورتوں پر نسخ کا اطلاق کرتے ہیں اسلئے ان کے خیال میں قرآن مجید میں کثرت سے نسخ ہوا ہے۔ لیکن متاخرین کی کوشش یہ رہی کہ قرآن مجید میں نسخ کو کم سے کم کیا جائے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے کل ۲۰ مواقع پر نسخ کا اقرار کیا ہے اور شاہ ولی اللہؒ تو صرف ۵ پانچ ہی مقام پر نسخ تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کا اس باب میں نقطۂ نظریہ تھا کہ

"قرآن مجید کے منسوخات میں کوئی منسوخ چیز ایسی نہیں ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اس کا حکم باقی نہ رہا ہو یقیناً منسوخ بھی کسی حال میں یا کسی زمانہ میں یا کسی محل پر کار آمد، مفید، مؤثر اور بار آور ہوگا۔ فرمایا کہ میں تو اس کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ قرآن کریم میں ایک حرف بھی زائد نہیں ہے۔ مثلاً خدا تعالےٰ کا ارشاد ہے فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم اس میں حرف مَا کو عام طور پر زائد قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ قطعاً زائد نہیں ہے بلکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اقدس میں خدا تعالےٰ نے جو احسانِ عظیم مخلوق پر فرمایا ہے اس نعمت کی جلالتِ شان کو یہی حرف مَا واضح کرتا ہے اگر اس حرف مَا کو نظر انداز کر دیا جائے تو نعمت کی ضخامت ہرگز بھی واضح نہیں ہوگی اس لئے میرے خیال میں تو قرآن کا کوئی منسوخ بھی حقیقۃً منسوخ نہیں۔"

اعتبار عموم لفظ:۔ ایک موقعہ پر یہ فرمایا کہ اصولیین کے یہاں یہ جو مشہور قاعدہ ہے کہ اعتبار لفظوں کے عام ہونے کا ہے اگرچہ سبب خاص ہی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ خود یہ قاعدہ عام نہیں۔ بلکہ

"سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ متکلم کے مقصود کو معلوم کیا جائے ضروری نہیں ہے کہ اس کا کلام جملہ حالات میں اسکے مقصد کے ہم وزن ہو۔ چونکہ کبھی منطوق متکلم کے مقصد سے عام کبھی خاص اور گاہے مساوی ہوتا ہے۔ لہذا لفظوں کا عموم صرف اس وقت کارآمد ہوتا ہے جب کہ شارع کی غرض متعین نہ ہو اور کوئی دلیل اس پر موجود نہ ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ مثلاً فاقرأ وا ما تیسر منہ کیا آپ اس آیت کے پیشِ نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک آیت پر اکتفا اور سورۂ فاتحہ کو بھی نماز میں نظر انداز کر دینا نماز کی صحت کا ضامن ہوگا؟ اور دوسرے واجباتِ نماز بھی ایک آیت کی قرأت سے ادا ہو جائیں گے۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو گویا کہ قرآنِ کریم نے ہمیں اس آیت میں ایک ایسے حکم کا پابند کیا جو شریعت میں نماز سے متعلقہ احکام کے بالکل خلاف ہے حالانکہ یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن کا مقصد اس حکم سے صرف بیمار، مسافر، اور مجاہدین کے لئے قرأت میں تخفیف ہے۔ ان کے لئے شب میں تہجد دشوار تھا اس لئے خدا تعالےٰ نے رحمت فرماتے ہوئے قرأت کے مسئلہ میں تخفیف فرما دی۔ رہ گیا سورۂ فاتحہ کی رکنیت و وجوب کا مسئلہ تو اس کا تعلق حکمِ قطعی کے بعد ظنی روایتوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ کے خیال میں سورۂ فاتحہ واجب ہے۔ چونکہ اس کا ثبوت احادیث سے ہے اور امام شافعیؒ اسے قطعیات سے ماخوذ سمجھتے ہیں تو یہ خیال نہ کیا جائے کہ احناف نے ظنیات پر کوئی عمل ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے قطعی اور ظنی کے درمیان فرق کیا ہے۔ احناف بھی قائل ہیں کہ اگر کسی نے نماز میں قصداً سورۂ فاتحہ چھوڑ دی تو تارک گنہگار ہوگا اور اعادہ بھی واجب ہوگا۔ اس تفصیل کے بعد آپ سمجھے ہوں گے کہ عموم لفظ سے زیادہ متکلم کے مقصد کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔"

سلیمان علیہ السلام اور سحر:۔ سلیمان علیہ السلام سے متعلق وہ تفصیلات جو قرآن نے دی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جادوگری اختیار کر کے کفر کا

ارتکاب نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور بابل میں جو علم ہاروت و ماروت کو دیا گیا تھا وہ جادو نہیں تھا۔ ہاروت و ماروت کون تھے؟ خدا کے مقدس فرشتے یا جادوگر جو شیطان کا کردار ادا کر رہے تھے؟ ان تفصیلات میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہود نے اپنی کج روی و کج رائی سے کوئی ایسا نازیبا الزام نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے مقدس طائفہ پر عائد نہ کیا ہو۔ انہیں نے حضرت سلیمانؑ سے متعلق یہ بدگمانی پھیلائی کہ وہ وسیع حکمرانی کے مالک صرف جادو سے تھے۔ خدا کے یہ برگزیدہ پیغمبر کیا جادو جیسی لغو چیز میں مبتلا ہو سکتے تھے؟ درآنحالیکہ وہ کھلا کفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان آیاتِ مذکورہ میں سلیمان علیہ السلام سے یہودیوں کے اس عائد کردہ الزام کو بھی بقوت ہٹا دیا ہے۔ آیات زیرِ بحث میں مشہور نحوی و مفسر فرّاء سے منقول ہے کہ ما انزل میں مَا نافیہ ہے۔ اور آیات کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سحر کی تعلیم کا ذریعہ شیاطین تھے۔ یہ غلط ہے کہ سحر سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے نازل ہوئے جو لوگوں کو جادو سکھانے سے روکتے اور پھر بنو اسرائیل کے اصرار پر انہیں جادو سکھا بھی دیتے۔ غرضیکہ فرّاء نے مَا کو نافیہ پر محمول کر کے یہود میں ایک لغو داستان کی شہرت کا انکار کیا ہے۔ دوسری تفسیر امام قرطبی کی ہے جسے مشہور مفسر ابن جریر نے بھی راجح قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ما انزل میں مَا نافیہ ہے۔ لیکن ہاروت ماروت شیاطین سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ بنو اسرائیل کی آزمائش کے لئے آسمان سے فرشتے جادو کا علم لے کر آئے تھے بلکہ شیاطین سحر سکھاتے تھے۔ اور انسانوں میں سے دو شیطانی کردار کے حامل یعنی ہاروت و ماروت بابل میں مشہور جادوگر تھے۔ یہود اپنی مذہبی زندگی پر ان سے شدید طنز سننے کے باوجود جادو سیکھتے اور ناپاک مقاصد کے لئے استعمال کرتے۔ ان دو مشہور تفسیر کے علاوہ اور بھی بہت سے تفسیری اقوال ہیں۔ لیکن راقم الحروف حضرت شاہ صاحب کی تفسیری کاوش اور اس فن میں آپ کی خداداد بصیرت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ آپ کے خیال میں ما انزل علے الملکین میں مَا نافیہ نہیں بلکہ بمعنی الذی ہے۔ چونکہ آیت میں سحر اور ما انزل کے درمیان معطوف و معطوف علیہ کی نسبت ہے اور عربی کے قاعدہ کے مطابق عطف مغائرتِ کلام کے لئے ہوتا ہے اس لئے سحر اور فرشتوں کے لائے ہوئے

علم میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ اس اجمال کے بعد تفصیل مرحوم ہی کی قلمبند کی ہوئی سنیں۔

"جب بنو اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھلا کر گمراہ کر دیا اور یہود شیاطین کو غیب داں سمجھنے لگے اور زمانہ وہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی۔ خدا کا کوئی مقدس پیغمبر ہدایت کے لئے بدنصیب یہودیوں کے درمیان موجود بھی نہیں تھا۔ تو اس معجزانہ طریقہ کے مطابق جو صدیوں سے یہود کے لئے منجانب اللہ چلا آرہا تھا۔ ہاروت و ماروت ڈو فرشتے آسمان سے نازل کئے گئے انھوں نے یہود کو تورات سے ماخوذ اسماء و صفاتِ الٰہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جیسا کہ مسلمانوں میں قرآن سے ماخوذ تعویذ و عملیات۔ یہ پاکیزہ علم ناپاک سحر سے بالکل جدا چیز تھی اور یہودیوں کے لئے اسمیں کوئی اشتباہ نہیں تھا۔ پھر بھی فرشتے یہ احتیاط برتتے کہ یہ علم یہودیوں کو سکھانے کے بعد انہیں نصیحت آمیز لہجہ میں بتاتے کہ دیکھو اب تم پر حقیقت کھل گئی اور حق و باطل کے درمیان تم نے خود مشاہدہ کرلیا۔ پھر بھی اگر تم علم علوی کو پسِ پشت ڈال کر سحر و جادو کی طرف رجوع کروگے تو یقیناً یہ کفر ہوگا اور تم خدا کے یہاں معذور بھی نہیں ٹھہروگے۔ کیونکہ ہمارا وجود تمہارے لئے ایک آزمائش ہے کہ تم ہماری تعلیم کے بعد بدستور سحر کے شیدائی رہتے ہو یا علم اسرارِ الٰہی کے گرویدہ؟ مگر بنو اسرائیل کی کجیٔ فطرت کہ وہ اس پاک علم کو بھی غلط مواقع پر استعمال کرنے لگے۔ مثلاً شوہر و بیوی کے درمیان تفریق اور دیگر نامناسب بلکہ ناحق چیزوں کے لئے اسکا استعمال۔"

حضرت موصوف کی اس نادر تفسیر پر صاحب قصص القرآن نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:-

"یہ تفسیر معانی کی ترتیب، سیاق و سباق کی مطابقت اور حقائق و وقائع کی وضاحت کے لحاظ سے اہم اور بہت وقیع ہے اور اسی لئے ہم اس کو ارجح قرار دیتے ہیں۔"

خلافت اور آدم علیہ السلام:- قرآنی قصص میں مشہور ترین واقعہ یعنی آدم علیہ السلام

کی تخلیق، خلافتِ ارضی کا منصوبہ، فرشتوں کا مکالمہ، آدم و ملائکہ کا علمی امتحان، ابلیس اور اسکی فریب کارانہ ذہنیت کی تفصیلات ہیں جسے قرآن مجید نے جا بجا مختلف اسالیب میں اور بہت سے مقاصد کے تحت ذکر فرمایا ہے۔ اس مشہور واقعہ کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:-

"فرشتوں کا آدمؑ کی تخلیق سے متعلق عرض و معروض اس خیال سے ہے کہ ہم اصلاحِ طبائع و انتظامِ شرائع کی خدمت جس کے لئے نائب کی تجویز کی جا رہی ہے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ منتظم اور مصلح کیلئے ضروری ہے کہ وہ جس دائرۂ عمل میں اصلاحی مہم کا پروگرام رکھتا ہو اسکی حقیقت اور نشیب و فراز پر اسے تام اطلاع ہو۔ حاکم اگر اپنی رعایا کی ذہنیت رسوم و رواج، طرزِ بود و باش سے ناواقف ہے تو وہ کبھی ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تو جب خدائے تعالےٰ کے خلیفہ کو طبائع کی اصلاح کا کام سپرد کیا جا رہا ہے تو پھر طبائع کی کیفیات، خصوصیات، اس میں تبدیلیاں جو رونما ہوتی ہیں ان پر مطلع ہونا ضروری ہے۔ یہ حدود باطنی انتظام کے ہیں اور ظاہری نظم و نسق جس میں اشیاء کی حلت و حرمت سے زیادہ تر بحث ہوتی ہے۔ اس میں بھی اشیاء کے خواص، نفع و نقصان معلوم ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص نشہ کو نہیں جانتا اور اس کی مضرت پر بھی مطلع نہیں بلکہ نشہ کی حدود پر بھی کوئی واقفیت نہیں رکھتا وہ کسی شراب نوش کو کیا تنبیہ کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ اسلام میں شراب کی ممانعت کے ساتھ ان برتنوں کے استعمال پر بھی قدغن لگا دی تھی جو شراب کے لئے استعمال ہوتے چونکہ آپؐ طبیعتوں کے خواص اور اپنے سکون کے لئے راہیں تلاش کرنے کی چالاکیوں پر مطلع تھے اور جیسے ہی آپؐ کو اس کا اطمینان ہوا کہ اب شراب کی نفرت نئے دلوں میں جگہ پکڑ لی ہے تو ان ظروف کے استعمال کی اجازت دیدی۔ احکام میں تغیرات اس بات کی علامت ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن میں اصلاحی کام کرنا تھا آپ ان کے مزاج اور طبعی

کیفیات پر پوری اطلاع رکھتے بلکہ میرے خیال میں یہ آیات صرف ان ہی مذکورہ بالاحقائق کو حاوی نہیں ہیں بلکہ اور اہم وبنیادی حقیقتوں کی جانب بھی مشیر ہیں۔ مثلاً:-

۱ــــ ایمان باللہ کے بعد نبوت ورسالت پر عقیدہ ضروری ہے۔ ان ہی آیات کا یہ مفاد ہے۔

۲ــــ بعثت کیلئے جس بندہ کا انتخاب ہوگا وہ اطاعت وانقیادِ الٰہی کا پیکر ہوگا۔

۳ــــ اگر کوئی شخص اطاعتِ خداوندی کا اعلان کرتا ہے تو اس کا معیار یہ ہے کہ وہ اطاعتِ رسول میں بھی سرگرم ہو ورنہ دعوائے اطاعت مہمل ہے۔

۴ــــ یہ آیات حسن وقبح کے شرعی وعقلی ہونے کی طرف بھی مشیر ہیں۔

۵ــــ تعدیل وتجویز کا مسئلہ بھی ان ہی سے مستفاد ہے۔

۶ــــ اسماء واحکام کی تفصیل بھی اس میں موجود ہے بلکہ "شہرستانی" کی رائے میں وعدہ وعید بھی اس میں آگئے۔

۷ــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کا منتہی خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔

۸ــــ بندہ کا شرف وکمال، عبودیت میں پنہاں ہے۔

۹ــــ اور قربِ خداوندی کا ذریعہ توبہ واستغفار، انابت ورجوع الی اللہ ہے۔

۱۰ــــ آیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ خدا تعالےٰ سے کسی کو بازپرس کا حق نہیں جب کہ وہ ہر ایک سے محاسبہ کرے گا۔

۱۱ــــ مراحم ملکوتیہ کا مسئلہ بھی اس میں موجود ہے۔

۱۲ــــ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تمام کائنات سے افضل ہیں۔ یہ بھی ان آیات سے واضح ہوا۔

۱۳ــــ خدا تعالےٰ کے افعال اضطراری ہیں یا اختیاری؟ ان ہی آیات سے واضح ہوا کہ اختیاری ہیں۔ چونکہ انھوں نے انسان کی تخلیق اور اس کی خلافتِ ارضی سے پہلے فرشتوں سے اس بارے میں جو گفتگو کی وہ بتاتی ہے کہ حضرت حق جل مجدہ فاعلِ مختار ہیں۔

آپ نے ان آیات پر جو جامع کلام کیا ہے اور جن حقائق کی جانب اشارے کئے ہیں

جن لوگوں کو تفسیر سے ذوق ہے اور اس فن کی مہمات ان کے پیشِ نظر ہیں۔ وہی اس سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

زینت کے حدود:۔ قرآن مجید کی وہ آیات جن کا تعلق پردہ سے ہے انہیں پر فقہی اختلافات کے تحت اس بحث کا آغاز ہو گیا کہ کونسے وہ اعضاء ہیں جنھیں پردہ میں رکھا جائے اس بارے میں فرمایا کہ:۔

"زینت سے وہ اعضاءِ بدن مراد ہیں جن کو عموماً پوشیدہ رکھا جاتا ہے جن سے چہرہ اور ہتھیلیوں کا استثناء ہے لیکن متصل ہی دوپٹہ اوڑھنے کا جو حکم آیا اس نے چہرہ کو بھی اعضاءِ مستور میں داخل کر دیا کیونکہ دوپٹہ سر سے ٹھوڑی تک رہتا ہے اور عربی میں خمار کا اطلاق ایسے ہی دوپٹہ پر ہے۔ جس آیت میں جلباب کے ڈالنے کا حکم ہے وہ سابقہ آیت کی مزید وضاحت کرتی ہے اور لا یضربن بارجلھن الایۃ اس آیت نے مواقعِ زینت بھی متعین کر دئے جلباب (برقعہ وغیرہ) گھر سے باہر جانے پر ضروری ہوگا اور خمار (دوپٹہ وغیرہ) گھر میں بھی استعمال کرنا ضروری ہر تاکہ سینہ مستور رہے۔ الّا ماظہر منہا میں ابن عباس سے منقول ہے کہ وہ "وجہ" اور کفین مراد لیتے تھے۔ چاروں ائمہ بھی چہرہ اور کفین ہی مراد لیتے ہیں لیکن متاخرین نے بطورِ احتیاط چہرہ اور ہاتھوں کو بھی مستور رکھنے کا فتویٰ دیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ اور ابو عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے چہروں اور سروں کو چادر سے ڈھانپ لیں۔ اس کی تائید میں علی بن طلحہؓ نے ایک روایت بھی ابن عباس سے نقل کی ہے یہ اس لئے کہ مردوں پر عورتوں کی عفت پسندی کا اظہار ہو۔ فطرۃً مرد کسی ایسی عورت کی جانب متوجہ نہیں ہوتے جو اپنی عفت کا غیر معمولی اہتمام کر رہی ہو۔"

ذکرِ رب:۔ قرآن شریف کی مشہور آیت واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفۃ ودون الجھر من القول بالغدو والاٰصال۔ ان آیات میں یہ بحث عام طور سے کی گئی کہ ذکر سے مراد عام ذکر ہے یا نماز؟ شاہ صاحبؒ کی رائے میں اس آیت کا تعلق عام ذکر سے

ہے نماز سے نہیں حالانکہ نماز بھی ذکر ہی ہے لیکن یہاں قرائن متعین کرتے ہیں کہ ذکر قلبی مراد ہے اور مطلوب یہ ہے کہ بندہ ہمہ وقت خدا کی یاد میں مستغرق رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ عباس سے فرمایا تھا کہ تم خدا کو یاد کرو خدا تمہیں یاد کرے گا اگر تم خدا کی طرف متوجہ رہو گے تو ہمیشہ اسے اپنے روبرو پاؤ گے اور صرف خدا ہی سے سوال کرو اور اسی سے مدد چاہو۔ لہٰذا قلب ہمیشہ ذکرِ الٰہی سے معمور رہے اور صبح و شام خصوصی ذکر کا اہتمام ہو تاکہ عنداللہ شمار غافلین میں نہ ہو۔ یہ مقصد ہر قسم سے ذکر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ذکرِ جہری جس کی قرآن نے دون الجہر سے ممانعت فرمائی ہے۔ تو جہر کی حد کیا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر قریب کے لوگ سن لیں تو یہ ذیلِ جہر میں نہیں آئے گا۔ ایک حدیث میں ہے جہرِ مفرط کیوں کرتے ہو اور کیوں بلاوجہ اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا کرتے ہو۔ تم کسی غائب و بہرہ کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ تم نے اس ذات کو پکارا ہے جو غیب و شہود کا علم یکساں رکھتی ہے اور ہمیشہ حاضر و ناظر ہے۔ اور دُعا خدا ہی سے کی جاتی ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس لئے دُعا میں اخفاء ہی محمود و مطلوب ہے اسی لئے امام اعظمؒ نے اخفاء کو ترجیح دی اور ذکر کا مقصود قلب کا علاج اس کو منور و روشن کرنا ہے تو اس میں جہر بھی چل سکتا ہے۔

خاتم النبیینؐ:- قرآنِ مجید کی مشہور آیت ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شئ علیما۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کی اساس ہے جس پر ایمان کی تکمیل موقوف ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ ماننے کے باوجود اگر کوئی بدنصیب آپؐ کی ختمِ نبوت کا یقین نہیں رکھتا یا ختمِ نبوت میں کوئی بھی تاویل کرتا ہے تو وہ ایمان سے قطعاً محروم ہے۔ غلام احمد قادیانی نے اسی ختمِ نبوت کے اجماعی عقیدہ کو شکست و ریخت کیا اور اپنے متبعین کے ساتھ بالاتفاق ایمان سے خارج ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب جو قادیانی نبوت کے دجل و فریب کا پوری قوت سے مقابلہ کرنے والے تھے انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت پر مفصل گفتگو فرمائی ہے جو عالمانہ فاضلانہ اور خاص علمی کاوشوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ اسلام کا اساسی عقیدہ ہے اور یہ بحث اپنے اطراف و جوانب کے اعتبار سے بیحد اہم ہے اسلئے طوالت کے باوجود اسے من وعن نقل کیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کائنات میں نبوت کے آغاز کیلئے تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ آپؐ کی تشریف آوری سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے کے لئے ہے اس لئے آپؐ کی نبوت کا دوام قیامت تک بلا فصل رہیگا۔ اور چونکہ نبوت وہبی چیز ہے اس میں کسب کو کوئی دخل نہیں اسلئے آپکے بعد کوئی کتنا ہی جامع کمال انسان ہو نبی نہیں ہو سکتا۔ میں اس آیت کی تفسیر اوّل تو لغۃً کرتا ہوں، ثانیًا احادیث سے، ثالثًا حضراتِ صحابہؓ و تابعین کے اقوال سے، رابعًا ائمۂ تفسیر کے اقوال سے۔

(۱) رسول اللہ اور خاتم النبیین کے درمیان واؤ عاطفہ ہے اور لکن عربی میں کسی شبہ کو زائل کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رسول کے عام معنے تو قاصد و فرستادہ کے ہیں لیکن رسول اور نبی کے بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنی و ہم پایہ ہیں۔ معتزلہ کا خیال یہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ نبی انسان ہی ہو سکتا ہے جبکہ رسول فرشتہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ جبرئیلؑ نے مریم عذراء سے کہا کہ انا رسول ربك لاهب لك۔ لیکن اہل سنۃ والجماعۃ کی رائے میں نبی صاحبِ شریعت بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس پر صرف وحی آرہی ہو جب بھی اسے نبی کہا جا سکتا ہے بخلاف رسول کے کہ اسکے لئے کوئی نئی کتاب اور نئی شریعت ضروری ہے۔"

خَاتَمُ:۔ خَاتَمْ بفتح تا و بکسر تا ہر دو طرح استعمال ہے لیکن تاء کے فتحہ کے ساتھ حسن بصریؒ اور امام عاصمؒ پڑھتے ہیں باقی تمام قراء تاء کے زیر پر اتفاق کئے ہوئے ہیں اعراب کے اس اختلاف سے مفہوم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی معنی وہیں رہیں گے کہ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں۔ ابنِ جریر اور بیضاوی نے تصریح کی ہے کہ تاء کے فتحہ کی صورت میں بھی وہی مفہوم ہے جو تاء کے کسرہ کی صورت میں تھا۔ مفردات امام راغب اور مجمع البحار میں اس سے متعلق کافی تفصیل موجود ہے۔ ابو البقاء کی کلیات میں خاتم کی بحث پر مفید معلومات موجود ہیں۔

النَّبِیّیْنَ:۔ الف لام اور نبیین کا مرکب مجموعہ۔ نبیین، نبی کی جمع ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے شہرت پذیر ہے۔ الف لام عربی میں تعریف کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی

چار صورتیں ہیں :۔ جنسی ، استغراقی ، عہد ذہنی ، عہد خارجی۔
اصولیین نے وضاحت کی ہے کہ اگر الف لام جمع پر داخل ہوگا جیسے النبیین پر داخل ہے تو پھر جنسی مراد نہیں ہوسکے گی بلکہ کوئی دوسری چیز اگر معہود ہے تو وہ مراد ہوگی اور معہود نہ ہونے کی صورت میں یہ الف لام استغراق پر محمول ہوگا۔ چنانچہ کلیات الوالبقاء میں ہے کہ اصولین اور اہل عربیت کے خیال میں لام تعریف خواہ مفرد پر داخل ہو یا جمع پر وہ استغراق ہی کا فائدہ دیتا ہے البتہ اگر معہود ہو تو یہ عموم کے لئے ہوگا۔ ان تصریحات سے واضح ہوا کہ خاتم النبیین کا بے غبار مفہوم یہی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے لئے خاتم ہیں آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

حدیث کی روشنی میں :۔ خدا تعالےٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اس امت میں صبح قیامت تک کیسے خوفناک فتنے اور دل دوز ہائلے پیش آئیں گے اور گمراہی وضلالت کے کیسے کیسے وہ منادہوں گے جو اسلام کے اساسی معتقدات سے کھلی بغاوت کرتے ہوئے نہ صرف خود ہی اسلام سے نکل جائیں گے بلکہ کتنے بدنصیب ان کی لائی ہوئی شقاوت میں شریک ہوں گے۔ خدائے علیم وعلاّم نے جس قدر مناسب وضروری سمجھا درپیش حوادث کی کچھ تفصیل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنی ختمِ نبوت کا اعلان بہت سی احادیث وارشادات میں واضح فرمایا ہے۔
ایک حدیث میں ہے کہ انا اٰخر الانبیاء وانتم اٰخر الامم جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ آپؐ کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں اور نہ کسی جدید امت کی تشکیل کا منصوبہ پیش نظر! ابویعلیٰ کی مسند میں بحوالۂ حضرت تمیم داری رضؓ یہ بھی موجود ہے کہ منکر ونکیر قبر میں وہی متعین سوالا کرتے ہوئے جب آپ کی نبوت کے بارے میں پوچھیں گے اور مؤمن کا جواب یہ ہوگا۔ ربی اللہ والاسلام دینی ومحمد نبی وھو خاتم النبیین تو اس روایت کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ مردے سے یہی سب کچھ سننے کے بعد فیقولان لہ صدقت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی ختمِ نبوت کا اعتراف اور اس عقیدہ کے اظہار پر اس کی تصدیق برزخی زندگی میں بھی معتبر رہے گی۔ ان تمام احادیث پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد احادیث کے طویل دفتر سے چھن چھنا کر جو حقیقت واضح ہوئی ہے اسے انہیں کے الفاظ میں سنئے کہ
"خاتم النبیین کے معنی جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے

ہیں وہ یہی ہیں کہ آپ سب انبیاء میں آخری نبی ہیں اور انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔ نہ اس میں کسی تشریعی نبی کی تخصیص ہے اور نہ غیر تشریعی کی بلکہ مراد یہ ہے کہ اب آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ یہی حقیقت ایک اور حدیث سے واضح ہے جس میں موجود ہے کہ آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک موقعہ پر فرمایا کہ تمہارے اور میرے درمیان قرابت کا استحکام اخوت کے اس پاکیزہ رنگ میں ڈھل چکا ہے جو موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا۔ ہارونؑ جیسا کہ معلوم ہے خود بھی نبی تھے اگرچہ ان کی نبوت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تتمہ تھی تاہم مذکورہ بالا ارشاد سے کوئی کج فہم اگر حضرت علیؓ کی نبوت کا شوشہ اٹھاتا تو اس امکان کو بھی آپؐ نے قیامت تک کے لئے یہ کہہ کر ختم کر دیا الا انہ لا نبی بعدی یعنی فرق اتنا رہے گا کہ ہارونؑ نبی تھے اور تم نبی نہیں ہوگے۔ ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ اسی حدیث نے یہ حقیقت بھی واضح کی کہ سلسلۂ نبوت میں وراثت بھی نہیں چلتی۔"

تفسیر آیت باثارِ صحابہؓ:۔ ختم نبوت پر تحقیقی کلام کے دوران شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ رضوان اللہ اجمعین و تابعین کے اقوال بھی بطورِ حوالہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن کریم کے یہ مخاطب اوّل خاتم النبین کا اسکے سوا اور کوئی مطلب نہیں لیتے تھے کہ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس سلسلہ میں ابن جریر، سیوطی وغیرہ کے حوالے پیش کرتے ہوئے مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرتِ عائشہؓ کی یہ روایت بھی سنائی گئی ہے کہ آپ کو خاتم النبین کہو لیکن یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس وضاحت سے اشقیاء نے کسی نئے نبی کی آمد کا جواز ڈھونڈ نکالا۔ حالانکہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آپؐ نے نبوت کے سلسلہ کو کلیتہً ختم کر دیا اور کوئی نیا نبی آپؐ کے بعد آنے والا نہیں البتہ قربِ قیامت میں عیسیٰ کا نزول ضرور ہوگا سو وہ کوئی نئے نبی نہیں بلکہ ان کی رسالت پرانی ہے۔ عائشہؓ چاہتی ہیں کہ جدید نبوت کے انکار میں کہیں نزولِ عیسیٰ ہی مشتبہ ہو کر نہ رہ جائے۔ اسلئے انھوں نے اس اضافہ کی ضرورت محسوس کی۔ ائمۂ تفسیر نے بھی اسی آیت کی تفسیر و تبیین میں نکتہ آفرینیوں کا انبار

لگایا ہے۔ ابن جریر اور زمخشری نے جس قدر اس موضوع پر لکھا ہے وہ قابلِ مراجعت ہے۔ محدثین بھی دس پانچ نہیں بلکہ ساٹھ کے لگ بھگ ہیں جنھوں نے مرفوع روایات سے آپؐ کی ختمِ نبوت کو ثابت کیا ہے۔ امام طحاوی جن کی حدیثی مہارت میں امتیاز کا کون انکار کرسکتا ہے۔ اپنی تصنیف "عقیدہ طحاوی" میں اعلان کر رہے ہیں کہ:۔

"ہر دعویٔ نبوت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد گمراہی وضلالت ہے بلکہ اسلام سے خروج وبغاوت ہے۔ محدث قسطلانی نے لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری دینے والوں کے لئے صلوٰۃ وسلام کی تعبیرات میں یہ بہترین تعبیر ہے السلام علیك یا سید المرسلین وخاتم النبیین۔ محدثِ جلیل ابونعیم، حافظ ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنے مجموعۂ احادیث وتصانیف میں ان روایات کو جمع کیا ہے جو ختمِ نبوت کے لئے آفتاب کا اجالا ہیں۔"

فقہی مؤیدات:۔ ختم نبوت کے باب میں فقہائے اسلام کے بھی ایسے اقوال ہیں جن سے ختمِ نبوت کا حقیقی تصور کھلتا ہے۔ اشباہ والنظائر میں کتاب السیر والردۃ کے ضمن میں ختمِ نبوت کی وضاحت پر یہ سطور موجود ہیں:۔

"اگر کوئی شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں جانتا تو وہ مسلمان نہیں چونکہ آپؐ کا آخری نبی ہونا ضروریاتِ دین سے ہے اور ضروریاتِ دین کا علم واجباتِ دین میں سے ہے۔"

علامہ ابنِ نجیم شارح کنز الدقائق نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص انبیاء کے ارشادات کی صحت کو مشکوک انداز میں تسلیم کرتا ہے تو وہ کافر ہے اور یہ کہنا کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں اسے بھی کفر ہی کہا جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس سلسلہ کی کچھ اور تفصیلات موجود ہیں لکھا ہے کہ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ عیاذاً باللہ رسولِ اکرم نبی نہیں تھے تو وہ مسلمان نہیں اور اگر وہ مدعی ہے کہ میں رسول اللہ ہوں اور زبانِ فارسی وغیرہ میں کہے کہ میں پیغمبر ہوں جس سے مراد اپنی پیغام رسانی ہو تب بھی کافر ہوگا۔ فقہائے اسلام کے ساتھ متکلمینِ اسلام کی بھی تائیدات قابلِ توجہ ہیں۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ ان تمام امور کا اقرار واجب ہے اور یہ یقین معتقداتِ اسلامی میں ہے

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبوت کا وجود مبنی بر بطلان اور قطعاً ناممکن ہے۔ عبدالسلام ابن ابراہیم مالکی نے بھی ان الفاظ میں ختمِ نبوت کے مسئلہ کو صاف کیا ہے کہ ہمارے پروردگار نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر تمام انبیاء کے سلسلہ کو ختم کر دیا کیونکہ آپؐ کو خدائے تعالےٰ نے خاتم النبین فرمایا اور جب نبوت ختم ہوگئی تو رسالت بھی باقی نہ رہی۔ نبوت عام ہے اور رسالت خاص۔ عام کا اختتام خاص کے ختم ہونے کی تمہید ہے اسلئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب نہ کوئی نبوت ہوگی اور نہ کوئی شریعت۔ صوفیاءِ اسلام بھی ختمِ نبوت کے مسئلہ میں امت کے عمومی نقطۂ نظر کی مضبوط تائید کر رہے ہیں۔ "شرحِ تعرّف" جس کے متعلق چلپی زادہ نے لکھا ہے کہ "اگر تصوف پر "تعرّف" نامی کتاب نہ ہوتی تو دنیا تصوف ہی کو نہ جانتی۔" اس میں ہے کہ

> اللہ تعالےٰ نے پیغمبری کو آپؐ پر ختم کر دیا۔ ارشاد ہے کہ "ولکن رسول اللہ وخاتم النبین" خاتِم اور خاتَم کا مفہوم ایک ہی ہے۔ نیز آپؐ نے ہمیشہ اپنے ارشادات میں ختمِ نبوت کے باب میں کوئی ابہام پیدا نہیں ہونے دیا۔ حضرت علیؓ سے فرمایا کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ اور متصلاً ہی اس کے یہ ارشاد کہ الا انہ لانبی بعدی اور نیز آپؐ کا یہ فرمانا کہ میں عاقب ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ نبوت کے تسلسل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہے۔"

"حیات القلوب" میں ہے کہ تصوف کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل اور نبوت کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔ بلکہ تاریخِ قدیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امم سابقہ میں بھی جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو امتیازات متعارف تھے اُن میں آپؐ کا خاتم النبین ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مشہور محدث ابونعیم نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "دلائل النبوۃ" میں لکھا ہے کہ یہود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اعلان کرتے کہ عنقریب مکہ میں ایک نبی مبعوث ہوگا جس کا نام احمد ہوگا۔ جس کے بعد پھر کوئی نبی کی حیثیت سے نہیں آئے گا۔ سیوطی نے "خصائص کبریٰ" میں اس مشہور و مسلسل الہام کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہود میں نبی آتے رہیں گے اور پھر نبی آخر الزمان آئینگے جن کے بعد کوئی نبی قیامت تک نہیں آئے گا۔ بہرحال اسلام کے مختلف مکاتیبِ فکر کے

جو اقوال آپ کے سامنے آئے ان سے معلوم ہوگا کہ ختمِ نبوت کے باب میں امت کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں بلکہ نسلاً بعد نسلٍ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبین ہونے کا عقیدہ منتقل ہوتا رہا۔ نقول کے اس انبار کے علاوہ از روئے عقل بھی جناب رسولِ اکرمؐ کے بعد کوئی نبوت ممکن نہیں جس کی تفصیلات ترجمان السنۃ مصنفہ مولانا بدرِ عالم میرٹھی میں موجود ہیں۔ علامہ کشمیریؒ نے قادیانی فتنۂ عیار کی تردید میں بسلسلۂ ختمِ نبوت جو کچھ لکھا اور خصوصاً اپنی آخری تصنیف خاتم النبیین میں جس انداز سے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی اس سے معلوم ہوگا کہ مرحوم کسی مسئلہ کے اطراف وجوانب پر تام واقفیت رکھتے اور آپ کے یہاں بحث کا کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہ رہتا۔ ختمِ نبوت، نزولِ عیسیٰ، حضرت عیسیٰ کا رفعِ آسمانی، غلام احمد قادیانی کی یہ جدوجہد کہ عیسیٰ علیہ السلام کو وفات یافتہ ثابت کرکے خود اپنی نبوت کی بارآور کاشت کرے۔ ان تمام امور پر آپ کے علم ریز قلم نے وہ کار آمد مواد جمع کیا ہے جس کی حقیقی قدر وقیمت اہل علم محسوس کریں گے اور جزائے خیر خدا تعالےٰ ہی عطا فرمائے گا۔

ذُوالقرنینؒ اور یاجوج وماجوج:۔ "مشکلاتِ قرآن" میں سے اہم ترین مسئلہ ذوالقرنین کی شخصیت قرآن کے بیان کردہ اوصاف کے مطابق اس شخصیت کی تعیین، اس کے حدود سفر، طلوع پذیر آفتاب اور قریب بہ غروب شمس کے خاص مناظر، سدِ ذوالقرنین اور اسی قبیل کے دوسرے مباحث، نزول قرآن کے چودہ سو سال بعد بھی غور وفکر، کدوکاوش، جدید انکشافات وتحقیقات کے خاص مسائل ہیں۔ قدیم مفسرین نے عجوبہ پسند طبائع کے پیشِ نظر ان مباحث میں جو گلکاریاں کی ہیں دلچسپ ہونے کے ساتھ بعض مضحکہ خیز بھی بن گئیں۔ خود ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں اس مردِ مومن کے سر پر حیوانات کی طرح سنگ کا وجود، راہِ حق میں مکرر شہید ہونے اور حیاتِ دنیوی کے تکرار کی موشگافیاں، قرآنی علوم کے طالب علم کو ایک حیرت زا جولانگاہ میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ سکندرِ مقدونی، سکندرِ اعظم، طرح طرح کے اقوال وآرا قدیم تفاسیر کا بڑا سرمایہ ہیں۔ جدید مفسرین میں سے محمد علی قادیانی کی تحقیق، مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوش اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قصص القرآن کی جستجو وتلاش عصرِ حاضر کی نت نئی تحقیقات ہیں۔ صاحبِ سوانح حضرت شاہ صاحبؒ نے ذوالقرنین پر اصلاً تو نہیں لیکن اپنی تصنیف "عقیدۃ الاسلام" میں ذیلاً

گفتگو کی ہے آپ کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین اہل مشرق میں سے نہیں تھا اور نہ فغفور چین ہی تھا جس نے چین میں بارہ سو میل لمبا بند تعمیر کرایا ہے اور جسے پہاڑوں اور دریاؤں پر سے گذارا گیا ہے اس کے مشرقی نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ مشرقی باشندہ ہوتا تو اس کے سفر بجانب مغرب کے بعد مراجعت بسوئے مشرق کی قرآن اطلاع دیتا حالانکہ قرآن نے اس طرح کوئی اطلاع نہیں دی۔ قرآن کی بیان کردہ تفصیل سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے مابین کسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اسکندر بن فیلقوس تھا کیونکہ یہ اسکندر کافر ہے حالانکہ قرآنی تصریحات بتاتی ہیں کہ ذوالقرنین ایک مؤمن وصالح مزاج، بادشاہِ عدل پرور تھا۔ پھر ذوالقرنین کو اذوائے یمن سے قرار دینا صحیح نہیں ہے اور عجمی بادشاہی سلسلہ میں اسے داخل کر کے "کیقباد" کہنا بھی درست نہ ہوگا۔ صاحب ناسخ کی تحقیق کے مطابق وہ سام اوّل میں سے ہے جس کا سلسلۂ نسب عربوں تک منتہی ہوتا ہے۔ اسی مصنف نے سد ذوالقرنین کی بنائے تعمیر ۲۴۶۰ ہبوط سے قرار دی ہے۔ آپ کی رائے میں ذوالقرنین کا تعلق عادِ اولٰے سے ہے روم اور یونان سے متعلق نہیں۔ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ گورش (کے خسرو) وہ کیقباد نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہِ شہر بابل کے دوسرے طبقہ میں ہے۔ مرحوم نے ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول قول کو ترجیح دی ہے جسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی مشہور شرحِ بخاری "فتح الباری" میں راجح قرار دیا ہے۔ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علی کے قول کی صحیح شرح "شرحِ قاموس" میں موجود ہے۔ پھر تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے تین سفر ذکر کئے گئے ہیں۔ پہلا بجانبِ مغرب دوسرا مشرقی علاقہ میں لیکن قرآن تیسرے سفر کی جہت متعین نہیں کرتا۔ اس تیسرے سفر کو جنوب کی طرف بتانے کا کوئی قرینہ بھی نہیں ہے۔ اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ تیسرا سفر شمال کی جانب میں ہے اور یہیں وہ سد ذوالقرنین جبلِ قوقاف میں متعین ہوگی۔ جس کا اسوقت نام "طائی" ہے۔ حزقیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحیفہ میں جس الجربیا کا تذکرہ ہے وہ دوسری چیز ہے صاحب روح المعانی نے اس کی تصریح کی ہے "جربیا" کے لغوی معنی "وہ ہوائیں جو مشرق و شمال سے چلتی ہیں" ہے۔ چین کے بادشاہوں نے بھی ذوالقرنین ہی کے مقاصد کے تحت ایک دیوار کی تعمیر کی ہے جس کا مغل سیاح نے تذکرہ کیا ہے اور ترکوں نے اس کا نام "بوقورقہ" ذکر کیا ہے۔ مصنف

ناسخ نے اس طویل ترین دیوار کی تاریخ تعمیر ۲۸۱ھ بتائی ہے۔ باب الابواب پر بھی بعض عجمی بادشاہوں کی ایسی ہی تعمیر کردہ دیوار موجود ہے بلکہ اور دیواریں بھی طویل ترین موجود ہیں اور وہ سب شمال میں ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بھی وضاحت فرمائی کہ ذوالقرنین نے جو دیوار تعمیر کی تھی اس کا تعلق کل یاجوج ماجوج سے نہیں تھا بلکہ یاجوج ماجوج کے صرف ایک ایک ہی گروہ کے قزاقانہ حملوں سے تحفظ کے لئے یہ دیوار تعمیر کی گئی تھی ممکن ہے کہ یاجوج وماجوج کے کچھ گروہ دوسرے اطراف وجوانب میں بھی اس طرح کی غارت گری کرتے ہوں اور یہ دوسری دیواریں جو دنیا میں موجود ہیں ان ہی سے حفاظت کے لئے تعمیر کی گئی ہوں اسی لئے شاہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ دیوار جس کے دیکھنے کا تذکرہ "فتح الباری" میں ایک صحابی سے متعلق موجود ہے جسے سیوطی نے "درّ منثور" میں اور دِمیری نے "حیوٰۃ الحیوان" میں ذکر کیا ہے وہ سد ذوالقرنین نہیں ہے بلکہ ان ہی بنائی ہوئی دیواروں میں سے کوئی دیوار ہے جسے اِن صحابی کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس بحث کے آخر میں حضرتِ مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے جو کچھ ذوالقرنین کے متعلق لکھا ہے وہ قرآن میں تاویل نہیں بلکہ تاریخی حقائق وتجربات کی روشنی میں قرآن کے کسی لفظ کو اس کی حقیقی مراد سے ہٹائے بغیر گذارشات کی ہیں۔ مرحوم نے ذوالقرنین سے متعلق اس کے نبی یا فرشتے ہونے کی رائے کو قطعاً غلط قرار دیا ہے۔

عرض کرچکا ہوں کہ ذوالقرنین پر موصوف نے ذیلاً کچھ اشارات کئے ہیں ذوالقرنین ہی کو موضوع بناکر کوئی تصنیف وتحقیق نہیں فرمائی۔ آپ کی اسی نگارش سے جستہ جستہ یہ اقتباسات خلاصۂ بحث کے طور پر نظرِ قارئین کر رہا ہوں۔

تفسیر کے مقدس ومنور ذخیرہ میں جو خرافاتی عنصر ہمارے مفسرین کی سادہ لوحی سے دخل پاگیا ان میں یاجوج ماجوج سے متعلق تفصیلات اور بھی مضحکہ خیز ہیں جس کو پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ رطب ویابس، یاسمین وہزال بلا نقد وتبصرہ جمع کر دینے کا ملکۂ راسخہ، رسوخ کی آخری منزل پر ہے مگر ان تحقیق پسند مفسرین کی بھی کمی نہیں جنھوں نے اس خرافاتی طومار کو قرآنی علوم سے یکسر خارج کرڈالا۔ یاجوج ماجوج کے کان اتنے بڑے تھے کہ ایک کو بستر بناتے اور دوسرے سے اوڑھنے کا کام لیتے۔ کسی نبی کے ضرورتِ غسل میں خارج مادہ سے ان کی تخلیق ہوئی تھی کہاں تک نقل کیجئے ان دیومالائی افسانوں کو۔

پھر یاجوج ماجوج کون تھے؟ حضرتِ شاہ صاحب نے مذکورۃ الصدر "عقیدۃ الاسلام" میں اس پر اور انہیں یاجوج ماجوج کے واقعہ میں مذکور بعض قرآنی بیانات پر بحث فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج قزاق پیشہ ایک قوم تھی قتل و غارت گری اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ذوالقرنین نے انھیں کے فتنہ سے حفاظت کے لئے ایک خاص قوم کی درخواست پر طویل و عریض دیوار کھڑی کی تھی۔ احادیث سے واضح ہے کہ خروجِ دجال کے وقت حضرت مسیح تشریف لائیں گے اور دجالی فتنہ سے نجات دہندہ ثابت ہوں گے لیکن ابھی اطمینان کی کیفیات میں ٹھہراؤ پیدا نہ ہوگا کہ یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور کائنات ایک نئی مشکل سے دوچار ہوگی۔ یہ یافث بن نون کے خاندان سے متعلق ہیں اور یورپ میں گاگ اور میگاگ انہی کو کہا جاتا ہے۔ ابن خلدون نے ان کا نام غوغ ماغوغ ذکر کیا ہے۔ دانشورانِ یورپ کو تسلیم ہے کہ وہ ماجوج کی نسل سے ہیں۔ جرمن بھی خود کو انہیں کی اولاد بتاتے ہیں۔ یہ انسان ہیں کوئی نرالی مخلوق نہیں البتہ ایک شر پسند قوم ہے قرآن کریم میں ان کے جس خروج کا تذکرہ ہے وہ علم الٰہی میں متعین وقت پر ہوگا لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ انکا شر و فساد صرف خروج ہی کے وقت ہوگا ایسا نہیں بلکہ آہنی دیوار پھوٹنے سے پہلے بھی دنیا ان کی فتنہ پردازیوں سے حیران و پریشان رہے گی۔ یوحنا کے مکاشفات میں بھی اس طرح کے اقوال موجود ہیں ان کے وجود سے کسی کو انکار نہیں۔ بہت سی احادیث ان سے متعلق موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے یاجوج ماجوج کا انکار غلط ہوگا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ان سے متعلق اکثر باتیں ایسی مشہور ہیں جن کا قرآن و حدیث میں وجود نہیں۔ شارحِ بخاری علامہ عینیؒ نے "کتاب الجمان فی تاریخ الزمان" میں اس کی تصریح کی ہے۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ سد ذوالقرنین یاجوج ماجوج کے صرف ایک گروہ پر قائم کی گئی ہے اس لئے باقی ماندہ یاجوج و ماجوج اپنی لائی ہوئی تباہی سے دنیا کو تہ و بالا کرتے رہیں گے۔ قرآن کریم میں تین مواقع پر خروج یاجوج و ماجوج کا ذکر ہے ان میں سے دو مواقع پر کوئی تعین نہیں یعنی ذوالقرنین کا یہ قول "فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکّاء وکان وعد ربی حقا اور دوسرے "وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض" یہ آیات مشیر ہیں کہ ان کے حملے وقتاً فوقتاً جاری رہیں گے۔ البتہ یہ آیت یعنی "حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون" واضح کرتی ہے کہ قرب قیامت میں وہ

بلندٹیلوں سے نیچے چلے آرہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ فرقہ ہے جس پر سدِ ذوالقرنین قائم کی گئی ہے۔ مجھے کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں ملی جس میں دیوار کے وجود کو ان کے خروج سے مانع بتایا گیا ہو۔ البتہ ترمذی میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیار دیوار قیامت کے قریب ٹوٹے گی اور یاجوج وماجوج نکل پڑیں گے۔

حدیث یہ ہے:۔

"وہ اس کو ہر دن کھودتے ہیں اور جب اس کا کچھ حصہ رہ جاتا ہے تو وہ اپنے گھروں کو یہ کہتے ہوئے لوٹتے ہیں کہ باقی کل کھودلیں گے اور انشاءاللہ ان کی زبان پر نہیں آتا۔ جب دوسرے دن صبح آتے ہیں تو قدرتی طور پر وہ دیوار بدستور صحیح وسالم کھڑی نظر آتی ہے۔ یہ معاملہ چلتا رہے گا تاآنکہ قیامت قریب آئے گی تو وہ یہ کہہ کر لوٹیں گے کہ اب باقی انشاءاللہ کل آئندہ کھودی جائے گی۔ دوسری صبح میں اس انشاءاللہ کی برکت سے دیوار وہیں تک موجود ہوگی جہاں تک وہ اسے چھوڑ چکے تھے تو باقی حصہ کو منہدم کرکے مفسدہ پردازی کرتے ہوئے پھیل جائیں گے۔"

لیکن اس حدیث کی امام بخاری نے تضعیف کی ہے اس لئے حدیث سے کسی امر پر استدلال صحیح نہیں بلکہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں یاجوج وماجوج کا عام خروج ہوگا۔ رہ گئی دیوار تو اس کی شکست وریخت علاماتِ قیامت میں سے نہیں۔ ان کی آخری یلغار اتنی شدید ہوگی جس کی مدافعت عیسیٰ علیہ السلام بھی نہیں کرسکیں گے مگر اس کا دیوار کے انہدام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دیوار میں سوراخ تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد میں ہوچکا تھا جس کی آپ نے ایک حدیث میں اطلاع بھی دی ہے اور ممکن ہے کہ وہ ٹوٹ بھی چکی ہو۔ علامہ مرحوم کی ان تصریحات کو ذیل کی وضاحتوں میں ایک بار پھر دیکھئے۔

۱۔ یاجوج وماجوج کیا گاگ ومیگاگ کا معرب ہیں اس کا کوئی یقینی قرینہ نہیں اور اسی طرح روسی اقوام کو یاجوج کی نسل قرار دینا اور برطانوی قوم کو ماجوج کے سلسلۂ نسب میں داخل کرنا جیسا کہ عام مؤرخین کے یہاں مشہور ہے مستند نہیں ہے

کیونکہ وہ احادیث جن میں یاجوج و ماجوج کے احوال و صفات بیان کئے گئے ان اقوام پر کلیۃً منطبق نہیں ہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا سیکاس، یا چین ماچین یا پھر منگولیا و منچوریا کا ہرگز معرب نہیں بلکہ یہ شمال و مشرق کے اقوام میں سے دو قومیں ہیں۔

۲۔ احادیث یا قرآن میں ان کے جس ہلاکت انگیز خروج کی اطلاع ہے وہ آخری خروج ہوگا اور یہی علاماتِ قیامت میں سے ہے۔

۳۔ یاجوج و ماجوج مسلسل دنیا کو پریشان کرتے رہیں گے آبادیوں کو تہ و بالا کرتی رہیں گے۔ اقوامِ عالم ان کی ہلاکتوں سے تباہ ہوتی رہیں گی وہ ملکی سیاست میں کسی سلیقہ و قرینہ یا تہذیب و تمدن کے اصول و قوانین پر عمل نہیں کریں گے بلکہ ان کی کارروائیاں جابرانہ و قاہرانہ نوعیت کی ہوں گی۔

۴۔ دیوار ہر جانب سے ان کو گھیرے ہوئے نہیں ہے اور نہ وہ سب کے سب محصور ہیں بلکہ صرف ایک گروہ مقید کیا گیا ہے اس لئے اگر دیوار ٹوٹ گئی اور وہ باہر نکل آئے یا دیوار سے ہٹ کر کسی دوسری جانب میں راہِ خروج ڈھونڈ نکالی تو وہ قرآنی بیانات کے خلاف نہ ہوگا چونکہ قرآن میں یہ خروج مراد نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں جس خروج کی اطلاع دی گئی ہے وہ یاجوج و ماجوج کے مخصوص گروہ کا ہوگا۔

"عقیدۃ الاسلام" میں ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج اور نزولِ عیسیٰ پر طویل و عالمانہ بحث کا یہ ایک طالب العلمانہ خلاصہ ہے جسے آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جدید انکشافات و اکتشافات نے قدیم تحقیقات میں جو ہلچل پیدا کی ہے ممکن ہے کہ کچھ نئی باتیں ایسی سامنے آئیں جو ان تحقیقات کے خلاف ہوں۔ ظاہر ہے کہ کون کس وقت یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ جو کچھ سمجھا گیا یا کہا گیا وہ حرفِ آخر ہے لیکن اس کے باوجود راقم السطور کا خیال ہے کہ قرآن کو سامنے رکھ کر مرحوم نے اپنے عہد تک جو نئے انکشافات ہوئے تھے ان میں ایک ایسی مطابقت پیدا کی جو قرآن کی جانب سے شکوک و شبہات کو دور کرنے کا ذریعہ بنے گی پھر آپ کا مقصد اس دور کے بعض ان زیغ و ضلال پسند مترجمین یا مفسرین کی تردید تھی جو قرآنِ کریم سے اپنے باطل مزعومات کی تائید حاصل کر رہے تھے بالخصوص قادیانی فرقہ نے نزولِ عیسیٰ کے بارے میں جو کچھ گمراہی پھیلانے کا تہیہ کیا تھا چاہا کہ دستی

سے اسی کا تعاقب کیا گیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ان تحقیقات کو ان کے واقعی پس منظر سے جدا کر کے مطالعہ نہ کیا جائے۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام:۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اسلام کے بنیادی واساسی تصورات وعقائد جن پر یقین کئے بغیر ایمان کی تشکیل وتکمیل ہی مشتبہ ہے اُن میں حضرتِ عیسیٰ کے نزول کو جو قربِ قیامت میں ہوگا براہِ راست داخل کیا ہے۔ شاہ صاحب کا اس تصریح سے مطلب یہی ہے کہ ایک مسلمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اپنے متعین وقت پر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام آسمان کی رفعتوں سے اس انسانی کائنات میں تشریف لائیں گے۔ چودہ سوسال کے طویل عرصہ میں امت نسلاً بعد نسلٍ اس عقیدہ کو داخلِ فہرستِ عقائد کئے ہوئے ہے مگر متنبئ قادیان غلام احمد نے امت کو دھکیل دھکیل کر کی جن ضلالت مہلک وادیوں میں پہونچایا اُن میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ان کی اور ان کے والدہ کی صریح توہین، وفاتِ عیسیٰ کا شوشہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اس متنبئ پنجاب نے بتایا کہ حضرتِ عیسیٰ کی وفات ہو چکی اور اب ان کا نزول حقیقتِ ثابتہ نہیں اور اس مقصد کے لئے قرآن مجید کے بعض مواقع کو اپنی غلط مراد اور باطل منشا کے لئے بے باکانہ استعمال کیا۔ حالانکہ آیات واحادیث نزول کے بارے میں اتنی واضح ہیں جن کے ہوتے ہوئے کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ قدیم عیسائی فرقے بھی اس کے قائل رہے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام جسد وروح کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رہے کہ خدا کے اس جلیل پیغمبر کی حیاتِ مقدسہ کے بیشتر رُخ اعجازی کرشمہ کاریوں کے حامل ہیں۔ معتاد طریقہ سے ہٹکر اُن کی پیدائش اور بقول بعض مفسرین حیرت انگیز پرورش، طفولیت میں تعجب خیز واقعات، مسیحائی قوتیں، نابینا کو بینا کرنا، جذامیوں کو بھلا چنگا بنا دینا، مردوں کو زندہ کرلینا۔ سب کچھ حیرت زا معجزے ہیں اس لئے یہ کچھ مستبعد نہیں کہ وہ خاص وقت پر آسمان پر اٹھالئے گئے ہوں اور وہاں طویل وقت گذارنے کے بعد متعین وقت پر اُن کا نزول ہو۔ جس دل ودماغ نے ان کی محیّر العقول پیدائش کے عجوبہ کو تسلیم کرلیا ظاہر ہے کہ اس کے لئے ان کا رفع ونزول تسلیم کرلینا دشوار نہیں لیکن وہ کیا حکمتیں ہیں جن کے پیشِ نظر انہیں اٹھانے کے بعد دوبارہ دنیا میں بھیجا جائیگا۔ علامہ کشمیری نے ان حکمتوں کو ایک لطیف ومؤثر انداز میں اس طرح

پیش کیا ہے۔

۱۔ یہود انبیائے سابقین کی مسلسل اطلاعات کی بنا پر ایک مسیحِ ہدایت اور ایک مسیحِ ضلالت بالترتیب عیسیٰ و دجال کے منتظر تھے مگر افسوس جب مسیحِ ہدایت یعنے عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو اُن کج فہم یہودیوں نے عیاذاً باللہ ان ہی کو مسیحِ ضلالت یعنی دجال سمجھ لیا۔

۲۔ اور جب واقعی دجال کا خروج ہوگا تو یہی یہود اسے مسیحِ ہدایت یعنی عیسائے منتظر قرار دیں گے۔

۳۔ اور جس طرح اپنی کج فہمی کی بنا پر حقیقی مسیحِ ہدایت کے دشمن بنکر انکی جان لینے کو تیار ہو گئے ٹھیک اسی طرح اس واقعی مسیحِ ضلالت یعنی دجال کو مسیحِ ہدایت سمجھ کر اس پر ایمان لے آئیں گے۔

۴۔ سنتِ الٰہی جو رفعِ اشتباہ کے لئے مسلسل مصروف رہتی ہے ٹھیک خروجِ دجال کے وقت نزولِ عیسیٰ کو سامنے لائے گی تاکہ دنیا کا یہ بدبخت طبقہ یعنی یہود ایک بار پھر مسیحِ ضلالت و ہدایت میں فرق و امتیاز کرلے بلکہ اشتباہ کو کلیۃً ختم کرنے کیلئے مسیحِ ہدایت (عیسیٰ) کے ہاتھوں مسیحِ ضلالت (دجال) کو ختم کرا دیا جائے گا۔ رہا یہ شبہ کہ عہدِ عیسیٰ میں خروجِ دجال کیوں نہ ہوا مہمل ہے۔ اسلئے کہ خروجِ دجال بتواتر علاماتِ قیامت میں سے ہے جس کا وہ وقت نہیں تھا۔

۵۔ یہود اور ان کے مسلسل پروپگنڈے خصوصاً پولس کی سازشوں کے نتیجہ میں عیسائیت صحیح منہاج سے ہٹکر جس زیغ و ضلال میں مبتلا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰ کی وفات کا تخیّل عام بنا لیا گیا ہے جبکہ قرآن ان کی حیات کا اور رفعِ آسمانی کا واشگاف اعلان کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ نزولِ عیسیٰ ہو۔ تاکہ منکرینِ حیاتِ عیسیٰ خود ان کی حیات کو بچشمِ سر دیکھ لیں۔ یہ تفسیر درج ذیل آیت ہیں

"وان من اهل الكتاب ليؤمنن به قبل موته ويوم القيمة يكون عليهم شهيدا۔"

قبل موتہٖ کی ضمیر کا مرجع شخصیتِ عیسیٰ کو قرار دینے کے بعد ہے۔

۶۔ عیسیٰؑ کی زندگی جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اشبہ ہے بلکہ ہر دو

جلیل پیغمبروں کی بعثت کے قرب نے اس مشابہت کو قریب تر کر دیا۔ مکہ ہی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ اقدس کو گھیر کر جان لینے کی کوشش یہودیوں کے اس ناپاک منصوبہ کا تکرار ہے جو انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے کیا تھا۔ پھر آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح اس نرغۂ اعداء سے اعجازی طور پر نجات دی گئی ٹھیک اسی طرح چند صدیوں قبل عیسیٰؑ بھی محاصرۂ معاندین سے قدرتی طور پر بچا لئے گئے۔

۷۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرما ہوئے۔ حضرت عیسےٰؑ کی بھی ہجرت ہوئی صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلی ہجرت اس ناسوتی عالم میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی جانب تھی اور دوسری ہجرت اِس عالم سے عالمِ بالا کی جانب۔ اور یہ اس لئے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نفخۂ جبرئیل کا اثر ہیں جن کے لئے مناسب عالمِ بالا ہی ہے اور ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اس دنیا میں عرصۂ حیات اس قدر تنگ کر دیا گیا ہو کہ "مأمن" بجز آسمانی رفعتوں کے اور کوئی نہ ہو یا اس قبیل کی دوسری حکمتیں جن کا صحیح علم خدائے علیم و علام ہی کو ہے۔

۸۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مغلوبیت اور ہجرت کے بعد فاتحانہ مکہ کی جانب لوٹ گئے مناسب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنی مقہوریت کے بعد فتحمندی کے پھریرے اڑاتے ہوئے اُسی فلسطین پہونچیں جہاں سے اُن کو نکالا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے نزول کا علاقہ کل عالم کو چھوڑ کر فلسطین منتخب کیا گیا تاکہ دونوں جلیل پیغمبروں میں مشابہت کی بنیادیں آخر تک استوار رہیں۔

۹۔ یثاقِ ازلی کے مطابق ہر امت کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقیدہ میں تفریق بین الرسل کے دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کر کے تمام انبیاء پر ایمان لانے کا مؤمن کو مکلف بنایا گیا ہے۔

۱۰۔ اس لئے خود حضرتِ عیسیٰ کا یہ فریضۂ منصبی تھا کہ وہ ان یہود کو اپنے بعد آنے والے نبی یعنی نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان قبول کرنے کیلئے آمادہ کریں اور جبکہ یہ کام ادھورا رہ گیا تو اس کی تکمیل کے لئے نزولِ عیسیٰؑ ضروری ہے۔ تلك عشرة كاملة۔

بغیر کسی مبالغہ کے عرض کرتا ہوں کہ رفع و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے مباحث

میں جہاں تک عقیدہ کا تعلق ہے کوئی تزلزل تو درکنار الحمدللہ خاکسار دل و دماغ میں شک و شبہ کی کوئی خلش محسوس نہیں کرتا تاہم منقول سے ہٹکر جب معقول کی طرف آئیے تو نزولِ عیسیٰ پر اسرار وحِکم کی یہ مدلل تقریر جو حضرت کے خصوصی افادات سے ترتیب دی گئی حضرت عیسیٰ کے نزول کے مسئلہ کو واقعہ بنانے کے لئے انشاءاللہ شافی ہے بلکہ خاکسار کا تاثر اسکے مطالعہ کے بعد یہ ہے کہ نزول ہونا ہی چاہیئے ورنہ اس پیغمبر کے رسالت کے کچھ اہم گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں گے ٹھیک اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی نے قادیانی کے کفر میں ہلکی سی سہل انگاری کے باوجود رفعِ عیسیٰ کے مباحث پر تفسیر ماجدی میں جو کچھ لکھ دیا ہے یقین رکھتا ہوں کہ کم از کم رفع کے باب میں اس کے پڑھنے والے کے لئے کوئی تردد وخلجان نہیں رہتا۔

غلام احمد قادیانی نے قرآن میں موجود توفّی کے مسئلہ کو قرآنی علوم سے سراسر ناواقفیت اور اس کے ممتاز ومتعارف اسلوب سے یکسر بیگانگی کے باوصف اپنی ہفوات کے لئے جس طرح استعمال کیا شاہ صاحب نے اس پر خاص تعاقب کیا ہے۔ خاکسار ہی سابق میں توفّی سے متعلق ان کے نوادرات پیش کر چکا ہے لیکن اس موضوع کی تکمیل کے لئے مزید عرض ہے کہ قادیانی کے خیال میں توفی کا فاعل جب خدا تعالےٰ ہو اور اس کا مفعول کوئی ذی روح ہو تو توفی کے معنی متعارف موت کے ہوں گے اس کھینچ تان سے سیدنا عیسیٰ کی وفات ثابت کر کے آنے والے عیسیٰ کے متعلق پیشین گوئیوں کا خود کو مصداق بنانا ہے۔ یہی نہیں اس مضمون سے متعلق صاف وصریح آیات واحادیث سے دامن چھڑانے میں مرزا کی ظالمانہ ومہمل تاویلات اسلام سے خروج وبغاوت کی سنگدلانہ کوشش ہے۔ شاہ صاحب نے قادیانی کی ان رکیک تاویلات کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "لفظ "متوفیك" سے حضرت عیسیٰ کی وفات ثابت کرنا اسلوب قرآن اور اس کی فصاحت وبلاغت کے بالکل خلاف ہے بلکہ قرآنی علوم سے ناواقفیت اور نری جہالت کی علامت ہے"

یہ بھی واضح فرمایا کہ یہاں لفظ توفی سے جس جانب کنایہ کیا گیا ہے وہ حقیقی معنی میں نہیں ہے۔ اہلِ عرب کثیر الرماد بول کر اس کے حقیقی معنی مراد نہیں لیتے بلکہ کسی کی سخاوت کا اظہار ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح آیتِ زیرِ بحث میں توفی متعارف معنی میں استعمال نہیں ہوا

مشہور لغوی ابو البقار نے بھی لکھا ہے کہ یہاں توفی کے معنی بھرپور لینے کے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ توفی کا مفہوم موت و رفع سے وسیع ہے۔ اس کا اطلاق موت پر بھی ہوتا ہے رفع پر بھی اور کبھی دونوں کو چھوڑ کر کسی اور حقیقت پر لیکن اس کے باوجود اس کا حقیقی مفہوم یعنے بھرپور لینا ہر معنی میں ملحوظ رہیں گے۔ ابو البقار ہی نے لکھا ہے کہ اگر اسے وفات کے معنی میں لیا جائے تو وہ اس کا مرادی مفہوم ہوتا ہے ورنہ فصحائے عرب کی تصریحات کے مطابق توفی کے اصل معنی کی رعایت کرتے ہوئے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ زمخشری نے جو فصاحت و بلاغت لغت و ادب کا مسلّم امام ہے اس آیت میں متوفی کا ترجمہ "میں تمہیں پوری عمر دینے والا ہوں" کئے ہیں۔ گویا کہ یہود کے ہنگامے اور حضرت عیسیٰ کی جان لینے کی جدوجہد سے جو نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اور جسمیں بہ تقاضائے بشریت خود عیسیٰ علیہ السلام ان کے ناپاک عزائم و منصوبوں کی تکمیلی جھلک کا مطالعہ کر رہے تھے انہیں عیسیٰ کو تسلی و تشفی دیتے ہوئے مطلع کیا گیا کہ یہود آپ کی جان لینے کے منصوبہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے بلکہ آپ کی دنیاوی زندگی جو علم الٰہی میں طے ہے وقفہ ہی سے سہی مگر اسے اس ناسوتی عالم ہی میں پورا کیا جائے گا جس کی سر دست یہ صورت ہوگی کہ اس نرغۂ اعداء سے صحیح و سالم آپ کو آسمان پر اٹھا لیا جائے گا۔ آیتِ قرآنی کی اس صحیح توجیہ اور اسلامی عقیدہ کے مطابق دل نشین تعبیر کے ساتھ مرحوم نے ۷۰ متواتر احادیث بھی جمع کی ہیں جن سے حیاتِ عیسیٰ، ان کا رفع آسمانی، دوبارہ نزول کا ثبوت ملتا ہے اور اس درجہ مضبوط و مستحکم جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ راقم السطور یہ تفصیلات جستہ جستہ پیش کرتا رہا ہے۔ یہاں تو مقصود حضرت شاہ صاحب کے علوم قرآنی میں گہرائی و گیرائی کے کچھ نمونے پیش کرنا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس موضوع پر اُن کے نوادرات "مشکلات القرآن" کی صورت میں مطبوعہ موجود ہیں جن سے اہلِ ذوق فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

امام العصرؒ اور علم حدیث:۔ صرف علمی حلقے مرحوم کی جامعیت و عبقریت پر مطلع نہیں بلکہ عوام ان کے تبحر اور اسلامی علوم و فنون میں گہرائی و گیرائی سے شناسا ہیں کہیں مجھ سے ہی آپ سن چکے ہیں کہ وہ ہر فن میں اپنی مستقل رائے رکھتے بجز فقہ کے کہ اس میں امام ابو حنیفہ رح کی تقلید کا اعلان کرتے مگر جیسا کہ معلوم ہے کہ ہماری درسگاہوں کا منتہی بلکہ علم و کمال کی معراج حدیث اور اسی سے متعلقہ علوم ہیں۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم و تدریس کے بعد کوئی مدرس

ترقیات کی آخری منزل پر پہونچتا ہے تو یہی فنِ حدیث ہے جہیں اس کے علمی جوہر کھلتے اور فنی حذاقت سامنے آتی ہے۔ موجودہ علمی انحطاط میں تو درسگاہیں حدیث کے صحیح تراجم ہی پر آکر رُک گئیں۔ بہت ہوا تو فنِ حدیث میں فقہی مذاہب کا تذکرہ اپنے مسلک کی نشاندہی اور اس کے مؤیدات جمع کرتے ہوئے وہی ترجیحی مباحث سنادیئے جاتے ہیں جو ہمارے کتب خانۂ علم کا قدیم وفرسودہ ذخیرہ ہے اور غریب یہ اساتذہ اس سے زیادہ کر کیا سکتے ہیں علمی زوال جس قوت سے درسگاہوں کی فضا پر محیط ہے اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے آنے والے دور میں یہی نقص بڑا کمال قرار دیا جائے گا مگر حضرت شاہ صاحب نے اسلامی فنون کی اس دوسری اساس کو متعلقہ علوم سے اس طرح لبریز کر دیا تھا کہ ہندوستان کی علمی تاریخ یکسر بدل کر رہ گئی۔ انھوں نے حدیث کے درس میں علوم وفنون کا وہ حسین پیوند لگایا کہ یہ فن دوسرے فنون کے مقابلہ میں بلند و بالا نظر آنے لگا۔ درسی خصوصیات کے ذیل میں وہ منتشر اجزاء یکجا کئے جا چکے جو اس حقیقت کی تائید ہیں۔ موجودہ عنوان کے تحت تو حدیث میں ان کے چیدہ چیدہ تفردات نظر قارئین ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان تفردات کو پیش کیا جائے مناسب ہے کہ حدیث کی تدوین پر کچھ عرض کر دیا جائے۔

معلوم ہے کہ جس مقدس ہستی نے کائنات کے سامنے صحیفۂ ہدایت کھولتے ہوئے اس کی حفاظت کی تمام ذمہ داریاں خود لے لی تھیں اگر سلامتیٔ فکر کے ساتھ سوچا جائے تو وحی متلو (قرآن کریم) کے ساتھ ہی غیر متلو وحی (حدیث) بھی اسی اعلان کا تتمہ ہے۔ جس زبانِ اقدس کے بارے میں اپنی ذاتی خواہش سے نہ بولنے کا یا اپنے افکار وآراء کو اجزائے دین کی حیثیت سے نہ پیش کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اُن مقدس ارشادات کو عام انسانوں کی زبانی جمع وخرچ کا کوئی شعبہ قرار دینے کی فکر ہے؟ پھر بتایا تو جائے کہ یہ بیل اگر منڈھے چڑھ گئی تو ایک عام انسان اور پیغمبر میں کیا فرق رہے گا؟ سمجھنے والے کے لئے تو کوئی بڑی بات نہ تھی مگر کج فکری جو اس بحث میں موشگافیوں کا انبار لگائے چلی جارہی ہے اسے زیغ وضلال کا کالا دھن قرار دیئے بغیر اور چارۂ کار ہی کیا ہے یا تخیل کی پرواز اس قدر اونچی کہ تدوینِ حدیث قرآنی تدوین کے ساتھ ہی کیوں نہ ہونے کا مطالبہ یا ژولیدگیٔ فکر کا یہ دلدوز منظر کہ النبی کو اتارنے کا عمل شروع کیا تو اس کے واقعی منصب سے کھینچکر معاذاللہ

خدا اور انسان کے درمیان ایک ہرکارہ ہی بنا کر چھوڑا۔

امام العصر مرحوم درسی تقریروں میں جن گرانمایہ افادات کو روزِ اول ہی سے طلبہ کے سامنے لاتے ان میں حجتِ حدیث، تاریخِ تدوین، جمع و تدوین میں حفاظتی اقدامات، محدثین کی غیر معمولی کاوشں، ان کے بے نظیر حافظے وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتاتے کہ

"نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر احادیث جمع کی جاتیں تو بظاہر بڑا اچھا ہوتا لیکن جب کہ مقصد ہی یہ تھا کہ حدیث کے درجہ کو قرآن کے بعد رکھا جائے تو قدرتی طور پر تدوین حدیث کا مرحلہ عملاً بھی دوسرے مرحلہ میں آنا چاہیئے۔"

اور اس طرح دین کا یُسری پہلو زیادہ واضح ہو اور اجتہاد، تحقیق و تدقیق، فقہاء کی فکر و نظر اور محدثین کی جستجو و تلاش کے مطلوب مواقع فراہم ہوتے چلے جائیں اور وہ آسانیاں امت کو مہیا ہوں جو اسلام کا امتیاز ہے۔ اس طرح ان کے حلقۂ درس میں شریک تدوینِ حدیث کے مرحلہ کو ثانوی مرحلہ میں آنے کا کرشمۂ قدرت باور کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حدیث کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش سے اپنے دامنِ دل و دماغ کو بے غبار پاتا یہی نہیں وہ حدیث پر اور اسکی ضرورت و اہمیت پر ایک ایسی شفا بخش تقریر ابتدا ہی میں فرماتے کہ دین کی یہ دوسری اساس جزءِ لاینفک معلوم ہوتی اور طلبہ کے ذہنوں میں یہ حقیقت جاگزیں کر دیتے کہ حدیث کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ فتنۂ انکارِ حدیث جس کی بادِ سموم ان کے عہد میں مصروفِ خرام تھی اور جو بدقسمتی سے آگے بڑھ کر بھیانک شکل اختیار کرنے والی تھی۔ دوسرے فتن کی طرح خاص اس فتنہ کا قلع و قمع بھی انھوں نے اپنا دینی فریضہ یقین کیا تھا۔ اسلام ایسے سادہ، صاف اور بے غبار مذہب میں جن بہتّر فرقوں کا شاخ در شاخ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اس میں یہ حقیقت عیاں ہے کہ نقل کو یکسر نظر انداز کر کے یا درایت ہی پر بجائے روایت کے بھروسہ کرنے والے اس فکری ضلال کے اصل ذمہ دار ہیں۔ والقصۃ بطولہا۔

بہرحال دین کے پورے سرمایہ کو معتبر بنانے کے لئے تواتر کی چار اقسام ان کی درسی افادات کا نہیں بلکہ فتنوں کے استیصال کے لئے کامیاب دریافت تھی۔ بھاولپور کے مشہور مقدمہ میں القادیانی نبوت باطلہ کو سپوتاز کرنے کے لئے انھوں نے اسی

چہار گانہ تقسیم سے کام لیا تھا اور بلا مبالغہ دین کی جانب سے بے اعتمادی پیدا کرنے والوں کو اس تقسیم سے شافی جواب دیا جا سکتا ہے تاہم اسلام کو مشتبہ بنانے کے لئے جب قرآن میں کسی تحریف کی گنجائش نہ مل سکی تو باوجودیکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق کذب بیانی کے مرتکب کو صاف صاف وعیدِ جہنم سنادی تھی اور اس تند و تیز لب و لہجہ میں جس کو سُن کر کذب بیانی تو در کنار واقعی روایات کی روایت میں بھی مؤمن و محتاط طبقہ چونک پڑا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ ہی کا ممبر کے گوشے کو ہاتھوں میں تھام کر روایات کے آغاز میں التزاماً من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کی حدیث سنانا یا عبداللہ بن مسعودؓ کا ہر روایت کے بعد او کما قال یا اسی قسم کی تعبیرات کا اضافہ شائبۂ کذب بیانی سے بھی خود کو محفوظ رکھنے کے لئے تھا مگر ظاہر ہے کہ قرآن میں تحریف و تصرف سے کلیۃً مایوس ہونے پر حدیث ہی کا وہ مرغزار ہے جس میں ظلم پیشہ افراد مصنوعی گُل کاریاں کر سکتے تھے۔ گویا بات امکان سے نکل کر وقوع کے درجہ میں داخل ہو گئی۔ انہیں زائغین کی چیرہ دستیوں سے اسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے حدیث کے سلسلہ میں قبولیت و عدمِ قبولیت کے لئے اسناد کی صحت و عدمِ صحت کو شرطِ اوّل قرار دے دیا گیا۔ یہ اسناد وہ کارآمد چیز ہے جس کے بارے میں رئیس المحدثین و امیرالمومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارک کا ارشاد ہے کہ

"اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہہ ڈالتا۔"

اس لئے محدثین بغیر سند والی حدیث کی روایت کو بھی جائز نہ سمجھتے اور کہتے کہ کوٹھے پر بغیر زینہ کے کیسے چڑھا جا سکتا ہے۔ مرحوم شاہ صاحب نے اپنے افادات میں سب سے پہلے اسی تواترِ اسناد کو لیا جس کا حاصل انہیں کے لفظوں میں یہ ہے:-

۱۔ **تواترِ اسناد:-** "کسی حدیث کی روایت میں از ابتدا تا انتہا رواۃ اتنی بڑی تعداد میں ہوں جن کی کذب بیانی عادۃً محال ہو اور ان کا اتفاق علی الکذب ممکن نہ ہو۔ حدیث من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کے متعلق حافظ الدنیا و جبل العلم ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح و حسن ہے جس کو ۶۲ صحابۂ کرامؓ نے روایت کیا ہے اور وہ احادیث جو ختمِ نبوت سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس [۱۵۰] ہے۔

جن میں سے تقریباً تیس صحاح ستہ میں موجود ہیں اور مسح علی الخفین
کی احادیث اسی انداز کی شہرت کے قریب ہیں اسی لئے امام اعظم
ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک
قائل نہ ہوا جب تک مسح علی الخفین کی حدیثیں دن کے اجالے کی طرح
میرے سامنے نہیں آگئیں۔ یہ سب احادیث اسنادی تواتر لئے ہوئے ہیں۔

۲۔ **تواتر طبقہ** :۔ کا مطلب یہ ہے کہ دین کی کوئی اہم چیز جو طبقہ بطبقہ ہم تک پہونچی اور اس میں رواۃ موجود نہیں جیسا کہ قرآن کریم کہ اس کا تواتر روئے زمین پر تلاوت، درس، حفظ، قرارت کی شکل میں قائم ہے اس میں اسناد کی کوئی ضرورت نہیں۔ فقہاء اپنی اصطلاح میں تواتر سے یہی تواتر مراد لیتے ہیں۔ اہل اسلام کے نزدیک قرآن کا تواتر ثابت ہے اور ہر مسلمان عالم ہو یا جاہل عامی ہو یا خواص میں سے لیکن یہ علم سب رکھتے ہیں کہ قرآن خداتعالےٰ کا مقدس کلام ہے جسے اس نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا جو جس طرح نازل ہوا تھا اسی شان کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اور انشاء اللہ تاقیامت رہے گا۔ قرآن کے ثبوت کے لئے اسناد کا مطالبہ قطعاً غلط ہے۔

۳۔ **تواتر عمل و توارث** :۔ کوئی شرعی حکم توارث وتعامل کے ذریعے ہم تک پہونچا ہو اور جس میں خطا بھی محال ہو مثلاً نماز کہ اسمیں رفع یدین وعدم رفع یدین تعاملاً وتوارثاً چلے آرہے ہیں کہ یہ تواتر زمانۂ رسالت سے لے کر اس وقت تک ہر طبقہ میں موجود ہے اور اپنی قوت کی بنا پر تواتر طبقہ کے قریب تر ہے۔ ناواقف کو معلوم نہیں کہ تواترِ عمل میں بیشتر تواترِ اسناد نہیں ہوتا اور وہ محسوس کرے گا کہ ضروریاتِ دین میں شروع ہی سے اختلاف چلا آتا ہے حالانکہ اسکی حقیقت شک و وہم سے زیادہ نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو قرآن میں شمار نہ کرتے تھے اور ان کے اس خیال کے راوی ان کے وہ شاگرد ہیں جنھوں نے ان سے قرآن حکیم پڑھا اور چونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ ہر صحابی اور پورے عالم اسلام نے معوذتین کو قرآن ہی سے سمجھا اس لئے معوذتین کا قرآن مجید میں ہونے کا یقین صرف ابن مسعودؓ کے خیال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ الحاصل تواترِ طبقہ اور تواترِ توارث وتعامل کے لئے اسناد کا متواتر ہونا ضروری نہیں اور نہ اس تواتر کو کسی خبر واحد سے متواتر سے نکالا جاسکتا ہے۔ جب یہ تواتر قرائنِ قطعیہ سے ثابت ہے تو اس کے بعد مزید

کدوکاوش کی احتیاج نہیں۔

۴۔ تواترِ قدرِ مشترک: یہ جس کا حاصل یہ ہے کہ چند احادیث مختلف درجات کی مختلف طرق سے ہم تک پہونچیں لیکن ان میں جو حقیقت مذکور ہے وہ ان سب احادیث کا قدر مشترک ہے۔ یہ احادیث ابتداء میں خبرِ واحد تھیں مگر قدرِ مشترک واحد ہونے کی بنا پر تواتر متحقق ہوگیا۔ مثلاً معجزات کے متعلق مختلف درجات کی حدیثیں ہیں اور متعدد طریقوں سے مروی ہیں لیکن قدرِ مشترک ایک ہی ہونے کے بنا پر بیانِ معجزات متواتر ہوگیا۔ مرحوم نے تواتر کی ان چہار قسموں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ان میں سے پہلی تین قسموں سے (تواترِ اسناد، تواترِ طبقہ اور تواترِ عمل وتوارث) ثابت کسی چیز کا انکار کرنے والا کافر ہوگا اور آخری قسم (یعنے تواترِ قدرِ مشترک) میں تفصیل ہے کہ اگر قدرِ مشترک امر بدیہی ہے تو اس کا منکر کافر ہے اور اگر وہ نظریات میں سے ہو تو بصورتِ انکار کافر نہ ہوگا۔

مرحوم کی اس بیان کردہ تفصیل کو جس سے پورے دین کو آپ نے متواتر ثابت کیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے "فتح الملہم شرح مسلم" میں نقل کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی نادر ومخصوص تحقیق ہے جسے اس تفصیل کے ساتھ اسلاف نے پیش نہیں کیا تھا۔ اس تفصیل کے بعد یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کفر قولی وفعلی ہر دو طرح پر ہے مثلاً کوئی شخص دین پر ہمیشہ عامل رہا عبادات کا اہتمام کیا اور نماز ہمیشہ قائم کی لیکن صرف ایک بار بت کو سجدہ کرلیا تو اس کا کفر فعلی ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال میں کوئی اس کا شریک ہے تو قولی کفر ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی کفر ہے کہ اگر کوئی اس کا قائل ہو کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آئے گا باستثنائے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور وہ بھی اپنے عہد میں نبی تھے لیکن قرب قیامت میں جب ان کا نزول ہوگا تو تشریعی نبوت کے ساتھ نہیں آئیں گے۔ تواتر توارث سے آنحضور صلی اللہ کا خاتم النبیین ہونا ثابت ہوچکا اس لئے اب کسی دوسرے کی نبوت کا عقیدہ کفر ہے۔

یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی کسی ایک ہی چیز میں تواتر کی متعدد اقسام جمع ہوجاتی ہیں مثلاً وضو میں مضمضہ واستنشاق یا مسواک کہ ان میں تواتر کی کئی اقسام موجود ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ تواتر قلیل الوجود ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام

ہیں بکثرت تواتر ہے اس قدر کہ اس کی فہرست بھی نہیں پیش کی جاسکتی بسا اوقات توجہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں فلاں قسم کا تواتر موجود ہے۔ اقسامِ تواتر کے بعد مرتبۂ واجب کو بھی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں باب ماجاء فی مفتاح الصلوۃ الطہور کی شرح میں اللہ اکبر ابتداء میں اور السلام انتہاء میں مرتبۂ واجب کو لئے ہوئے ہے اور احناف اسی کے قائل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

حدیث تین اقسام پر ہے متواتر، مشہور، خبر واحد۔ اور معلوم ہے کہ احناف نصوص قطعی پر خبرِ واحد سے اضافہ جائز نہیں سمجھتے جبکہ شوافع اور ان کے ہم خیال اس اضافہ کو درست قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ احناف کا یہ مذہب علی الاطلاق صحیح بیان نہیں ہوا وہ بھی اضافہ کی صحت کے قائل ہیں۔ لیکن رکن یا شرط کے درجہ میں نہیں بلکہ وجوب و سنت کے درجہ میں اس لئے خبرِ واحد وجوب و سنت کو ثابت کرے گی نہ کہ رکن و شرط کو اس لئے یہ قطعاً لاعلمی ہے کہ احناف کو خبرِ واحد کا تارک سمجھ لیا جائے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس چیز کا ثبوت دلائلِ ظنیہ سے ہو اس کے شرائط و ارکان خبرِ واحد سے ثابت کئے جاسکتے ہیں جو خود دلیلِ ظنی ہیں۔ لہٰذا ظن کے مطابق عمل کیا جاسکتا ہے لیکن یہ اثباتِ شرط کے لئے مفید نہ ہوگی۔ شوافع نے ظن کو قطعیت کا درجہ دے دیا ہے اور اسی لئے وہ خبرِ واحد سے رکن اور شرط ثابت کرتے ہیں اصول و ضوابط کے تحت اگر غور کیا جائے تو اس مبحث میں احناف کا مذہب قریب بصحت ہے۔ یہ اس لئے کہ جو چیز ثبوتاً ظنی ہوگی وہ صرف واجب کو ثابت کرسکتی ہے رکنیت کے لئے کس طرح مفید ہوگی؟ پھر یہ بھی ہے کہ واجبات صرف نماز و حج یعنی عبادات میں ہیں۔ میرے خیالات میں معاملات میں واجبات نہیں ہیں بشریعت معاملات میں شرائط و ارکان کو ذکر کرتی ہے فرائض و واجبات نہیں، بخلاف شئے الواجب کے کہ وہ عبادات و معاملات دونوں میں یکساں ہے۔ شوافع حج میں واجب الشئے کو مانتے ہیں جبکہ نماز میں اس کے منکر ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے مناہج السنۃ میں لکھا ہے کہ نماز ابوحنیفہ، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے خیال میں فرض، واجب اور سنت سے مرکب ہے اور امام شافعیؒ نماز کی ترکیب صرف فرائض اور سنن سے مانتے ہیں۔ ابنِ تیمیہ کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ مالکیہ اور حنابلہ واجب الشئے کے قائل ہیں پھر احناف کی مخالفت میں انکار کس بنیاد پر ہے؟ الّا یہ کہ امام مالکؒ کے خیال میں واجب

سنت کی قسم ہو۔

حنابلہ قاعدۂ اولیٰ کو فرض کہتے ہیں اور اس کے ترک کو سجدۂ سہو سے صحیح کر دیتے ہیں۔ بتایا جائے کہ یہ اگر مرتبۂ واجب کی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ حضرات اصطلاحات میں اختلاف کر رہے ہیں احکام میں کوئی اختلاف نہیں۔ احناف نے حج و نماز میں شارع کی جانب سے بعض چیزیں مؤکد پائیں اور ان کی کمی کو کسی فساد کے بغیر تدارک کرتے ہوئے بھی پایا تو ایسی چیزوں کو واجب کے درجہ میں لے لیا۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ:۔

ثبوت، دلیل کے ظنی ہونے کی بنا پر درجۂ واجب کی چیز ہے اور غالباً اسی بنار پر حافظ ابن ہمامؒ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے واجب کا انکار کیا ہے کیونکہ آپؐ کیلئے کوئی شے مظنون و مشتبہ نہ تھی۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ واجب کے باب میں یہ بحث دلیل کے طور پر ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب کی حقیقت پر اطلاع نہیں ہوئی۔ درآنحالیکہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ فرض کی تکمیل کے لئے اس طرح کام کرتا ہے جیسا کی سنتیں۔ البتہ جو کمال واجب سے حاصل ہوگا وہ سنت سے حاصل شدہ کمال پر فائق ہوگا۔ اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو آیت وذکر اسم ربہ فصلےٰ سے ذکر کی فرضیت ثابت ہوئی اور ذکر بھی ایسا جو مضمونِ تعظیم کا حامل و ترجمان ہو اور اس باب میں جو احادیث مہیا ہیں وہ چونکہ ثبوتاً ظنی ہیں ان سے ذکر اللہ اکبر کا وجوب ثابت ہوا۔ غرضیکہ احناف جس وجوب کے قائل ہیں وہ ثابت ہے اور اس کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ مرحوم ابتدائے درس میں اس بحث کی اہمیت کے پیشِ نظر اور اس لئے کہ وجوب کا مسئلہ مختلف فیہ ہے تفصیل سے بیان فرماتے۔ اس علمی و تحقیقی بحث کو مکمل نہیں کہا جا سکتا تاوقتیکہ دلائل کی چہار اقسام بھی پیشِ نظر نہ ہوں۔ ان ہی کی تحقیق کے مطابق

۱۔ قطعی الدلالۃ و قطعی الثبوت، یہ دلیل امورات و منہیات میں ایک کی فرضیت اور دوسرے کی حرمت کو ثابت کرتی ہے۔

۲۔ ظنی الدلالۃ و ظنی الثبوت، یہ اگر منہیات میں ہو تو کراہتِ تنزیہی کو بتائے گی اور بجانبِ امر اس کے مستحب ہونے کو واضح کرے گی۔

۳۔ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ۔

۴۔ قطعی الثبوت وظنی الدلالۃ۔ ان کا تعلق اگر اوامر سے ہے تو ان کا وجوب یا مسنون ہونا ظاہر کریں گے اور اگر منہیات سے ہے تو پھر کراہت تحریمی ثابت ہوگی۔ اس تفصیل سے فرض وواجب کا فرق مزید واضح ہوا۔

تحقیقِ رجال :- نہ جاننے والوں سے تو کیا عرض کیا جائے جو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ حدیث کا نصف علم رجال سے متعلق ہے۔ حدیث کی قبولیت وعدم قبولیت، صحت وضعف اور اسی قبیل کے دوسرے فیصلے داخلی پہلو سے ہٹ کر خارج میں رجال ہی پر موقوف ہیں کس درجہ کی ہے ؛ وہ شخصیت جو سلسلۂ سند میں مذکور ہے ؟ اس کا پایۂ علمی، ثقاہت ودیانت حفظ وذکا، احتیاط وورع، تقوے ودیانت اور حدیث کو قبول کرنے کی وہ تمام شرائط جو ان رجال میں ہونی چاہئیں کیا ان میں موجود ہیں یا نہیں ؟ فنِ رجال کی روح ہے۔ موجودہ درسگاہی نظام میں جہاں حدیث کی شرح ہی کا حق ادا نہیں ہوتا رجالی مباحث کی توقع بیکار ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب قدیم محدثین کی طرح رجال پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے۔ مستدلاتِ احناف میں مخالفین نے حدیث کو استدلال کے دائرہ سے نکالنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کا جواب اسکے سوا ممکن نہیں کہ رجالی مباحث سے ان رواۃ کو مجروح ہونے سے بچایا جائے جن کی ثقاہت زبردستی مخدوش کی گئی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں رواۃ میں کچھ ہی ایسے خوش قسمت اشخاص ہوں گے جن کی تعدیل پر عام اتفاق رہا ہے اور وہ بدنصیب بھی کم ہیں جن کے مجروح ہونے پر سب متفق رہے ورنہ عام حال یہ ہے کہ ایک ہی راوی سے متعلق تعدیل وجرح کے متضاد اقوال سے اسماء الرجال لبریز ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ ایک مکتبۂ فکر نے دوسرے مکتبۂ نظر کے افراد کو مجروح بنانے کی ہمہ جہت کوشش کی۔ ظاہر ہے ان حالات میں اس کے سوا اور کیا چارۂ کار تھا کہ مجروح شخصیتوں کے لئے تعدیل کا مصالحہ بہم پہونچایا جائے لیکن یہ وہی کرسکتا ہے جسے وسعتِ مطالعہ کے ساتھ بے نظیر حافظہ کا جوہر بھی نصیب ہو۔ چنانچہ مرحوم نے اس سلسلہ میں احناف کے رُواۃ کو محفوظ رکھنے کے لئے رجال کی بحثوں سے خاص کام لیا۔ ایک حدیث کسی مسئلہ میں احناف کے لئے کارآمد ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی روایت کے ایک راوی کو مجروح کرنے کے لئے جب کوئی گنجائش نہ پائی تو ترکِ جماعت ہی کا الزام لگا دیا۔ شاہ صاحبؒ نے جواب دیتے ہوئے

فرمایا کہ امام مالک ایک عرصہ تک مسجد نبوی کے جوار میں رہنے کے باوجود اس مقدس ترین جماعت میں شریک نہ ہوئے اور جب تشریف لائے تو کسی پوچھنے والے کے جواب میں فرمایا کہ بعض اعذار ناقابل بیان ہوتے ہیں۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس کے باوجود مالک علیہ الرحمہ کی ثقاہت میں کوئی فرق نہ آیا اور حنفیہ کے لئے مفید اس روایت میں یہ غریب راوی بے تکلف زخمی کر دیا گیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی غزارت علمی کو حنفیہ کے لئے مفید تر بنا دیا تھا۔ جہاں کسی پر جرح کرکے اسکی روایت پایۂ ثقاہت سے گرانے کی کوشش کی گئی آپ اسی سرمایہ سے اس کی حیثیت کو مستحکم بناتے پھر یہی نہیں بلکہ متقدمین و متاخرین کی ان لغزشوں پر بھی وسیع نظر کی جو ان حضرات سے واقع ہوئیں، مثلاً:-

(۱) مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی جن کا وفورِ علم متاخرین میں تسلیم حقیقت ہے آپ نے شرح وقایہ کی شرح "سعایہ" میں ایک حدیث "بنایہ" سے نقل کی جس میں کاتب کی غلطی سے ابن سلمہ کے بجائے "عن بن سفیان" لکھا گیا۔ شاہ صاحبؒ نے کاتب کے اس تسامح پر طلبہ کو توجہ دلائی اور بتایا کہ یہ ابن سلمہ ابو وائل شفیق بن سلمہ ہیں۔ ابو داؤد میں اس نام کی تصریح موجود ہے۔

(۲) ایک اور روایت جس کے الفاظ یہ ہیں سعید عن ابن عباس قال خرج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من الغائط الخ۔ عام حدیث کی کتابوں میں اس روایت میں سعید بن جبیر کا تذکرہ ہے۔ فرمایا کہ یہ سعید بن جبیر نہیں بلکہ سعید بن حویرث ہیں۔

(۳) مشہور حدیث حسن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم غنائم پر ذوالخویصرہ کی جانب سے تقسیم کے غیر منصفانہ ہونیکا اعتراض ہے۔ یہی ذوالخویصرہ بعد میں فرقۂ خوارج کا منّاد بنا۔ اسی نام کے ایک دوسرے صاحب بھی تھے جنھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامِ قیامت کے بارے میں سوال کیا تھا اور آپ نے کسی قدر ترش رو ہوکر اُن سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ؟ اُن کا جواب یہ تھا کہ میرے پاس بجز آپؐ کی محبت کے اور کوئی زادِ آخرت نہیں۔ اسی جواب کو سراہتے ہوئے لسانِ نبوت سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے کہ

"پھر تم اپنے محبوب کے ساتھ ہوگے۔"

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں موجود مختلف تذکرے کہ ایک میں آنحضورؐ پر

ظالمانہ تقسیم کا الزام اور دوسری میں عشق و محبت کے آخری منزل پر ہونے کا اظہار۔ میں متعجب تھا کہ یہ دونوں مختلف واقعے ایک شخص کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ پھر تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ دو شخص ہیں۔ ایک تیمی جو شقاوت میں کمال رکھتا تھا۔ دوسرا یمنی جو سعید و اسعد ہیں جس نے آپؐ کی ذاتِ مبارک سے اپنے والہانہ تعلق کا اعلان کیا تھا۔

(۴) عبد الرحمٰن بن اسحٰق کو رجال کی کتابوں میں ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس نام کے بھی دو شخص ہیں ایک تو یہی عبد الرحمٰن جو واسطی ہیں دوسرے عبد الرحمٰن بن اسحٰق مدنی۔ مسلمؒ کی روایات سے قطع نظر خود امام بخاریؒ نے بھی تعلیقاً ان سے دو جگہ روایت کی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ان دونوں میں بعض محققین نے فرق بھی کیا ہے اور زیلعی کی روایت اس سلسلہ میں پیش کی ہے حالانکہ اس عبارت میں یا کاتب کو سہو ہوا یا خود زیلعی کو، زیلعی اس حقیقت سے ناواقف ہوں کہ یہ دو شخصیتیں ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ زیلعی نے ابو داؤد کی یہ حدیث "لاتدعوا سنتی الفجر ولوطردتکم الخیل" کے تحت وہ عبارت پیش کی ہے جو تخریج میں موجود ہے۔ اس لئے کہ عبد الرحمٰن بن اسحٰق واسطی بلاشبہ ضعیف ہے جبکہ عبد الرحمٰن بن اسحٰق مدنی ثقہ ہیں۔ عام محدثین فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک سمجھ کر مجروح کر دیتے ہیں۔

(۵) عبد الرحمن بن زبیر بیشتر احادیث میں زبیر، عزیر کے وزن پر ہے۔ البتہ حدیث بسلسلۂ اشتراطِ وطی درحلالہ جس میں حضرتِ رفاعہ کی بیوی نے اپنے پہلے شوہر کی جانب لوٹنے کی تمنّا کی ہے اور اپنے دوسرے شوہر کی کمزوری کو بتایا ہے وہ عبد الرحمن بن زبیر "صُغیر" کے وزن پر ہیں۔ فرمایا کہ اس فرق کو عام طور پر باقی نہیں رکھا گیا۔

(۶) علامہ شوکانی جن کے قلمی افادات سے غیر مقلدین نے خوب فائدہ اٹھایا۔ شاہ صاحب ان کے تبحّر کے قائل نہیں تھے بلکہ کشمیر میں ایک مناظرہ کے دوران ایک غیر مقلد سے جو شوکانی کے حوالے مسلسل پیش کر رہا تھا فرمایا کہ "انا اعلم بالشوکانی" درس میں ان کے سہو پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ باب ماجاء فے الاستنجاء بالحجرین والی حدیث میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے پتھر لینے اور غلاظت کو پھینک دینے کا جو تذکرہ ہے اس روایت کو شوکانی

نے ایک موقعہ پر نقل کیا اور فانہ روثنا حماد کے اضافہ کو جو روایت میں ہے حدیث مرفوع قرار دیا۔ حالانکہ یہ سرے سے روایت کا جز ہی نہیں بلکہ عبداللہ بن مسعودؓ کا اپنا اضافہ ہے جو انھوں نے ایک شاگرد کے سامنے بیان کیا تھا۔

(۷) کہیں مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی "لمعات" و "اشعۃ اللمعات" دونوں کی تعریف کرنے کے باوجود شاہ صاحبؒ یہ فرماتے کہ مجھے شیخ عبدالحق محدث کی تمام تالیفات میں بجز ایک بات کے اور کوئی نئی تحقیق نہیں ملی۔ ساتھ ہی الدہلوی مرحوم کے سہو پر بھی اطلاع تھی چنانچہ ایک موقعہ پر فرمایا کہ شیخ عبدالحق نے بریدہ اسلمی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین نے مغرب سے پہلے نماز نہیں پڑھی۔ فرمایا کہ "یہ شیخ" کی غلطی ہے۔ کیونکہ بریدہؓ اسلمی سے مغرب کا استثناء مسند بزاز میں موجود ہے۔ جس روایت کو شیخ عبدالحق ذکر کر رہے ہیں وہ درحقیقت ابراہیم سے مرسل شرح معانی الآثار میں مذکور ہے۔

(۸) حافظ ابن حجر عسقلانی جن کی حدیث میں وسعتِ نظر اور تام مہارت سے ایک جانب آپ کے تأثر کا یہ عالم تھا کہ حافظ الدنیا وجبل العلم سے یہی حافظ مراد لیتے تھے اور بدر عینیؒ کو ان کے مقابل کی شخصیت نہیں گردانتے تھے۔ دوسری جانب حافظ ابن حجرؒ کی ارادی چیرہ دستیوں اور بشری تسامحات پر ناقدانہ نظر بھی تھی اور تنقید کی جرأت بھی۔ فرمایا کہ ابن حجرؒ نے فجر کی سنتوں کے بارے میں حدیث کی مراد نہیں سمجھی حالانکہ ان سنتوں کے بارے میں ترمذی میں ہے من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلھا بعد ما تطلع الشمس یہ حدیث مسندِ احمد اور دارقطنی میں ۵ پانچ طریقوں سے مروی ہے اور ۳ تین طریقوں سے سننِ بیہقی میں اور ۲ دو طریق سے سننِ ابنِ حبان و مستدرکِ حاکم میں اور ایک طریقہ سے ذہبی کے طبقات اور نسائی کے سننِ کبریٰ میں بلکہ طحاوی میں بھی ہے اور ان سب کا مدار حضرت قتادہ کی حدیث ہے جسکی تخریج ابوداؤد نے کی ہے ابن حجر و صاحب مشکوٰۃ دونوں نے اسکو ضعیف قرار دیا حالانکہ براء بن عازب کی حدیث پر تو کلام کیا گیا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث قطعاً محفوظ ہے۔

(۹) جمعہ کے روز اگر کوئی مسجد میں ایسے وقت میں پہونچے جبکہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو کیا سنن وغیرہ پڑھی جاسکتی ہے اس میں امام ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ عدمِ جواز کے قائل ہیں جبکہ امام شافعی و احمد بن حنبل تحیۃ المسجد کے پڑھنے کو خطبہ کے دوران بھی

مستحب کہتے ہیں۔ ابنِ حبان نے اپنی تالیف میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فلا تعد لمثل ذلك روایت کرکے لکھا ہے کہ اس میں ترکِ رکعتین کی ممانعت ہے۔ شاہ صاحب رح فرماتے ہیں کہ یہاں ابنِ حبان سے سہو ہوا۔ یہ ترکِ رکعتین کی ممانعت نہیں بلکہ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد جمعہ میں بتاخیر آنے کو روکنا ہے۔

(۱۰) مشہور محدث امام ترمذی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عشاء میں نو رکعت سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے چونکہ ابو داؤد میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر باربع وثلاث وست وثلاث وثمان وثلاث عشر و ثلاث۔ ابو داؤد کی اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ صلوۃ اللیل کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہی ہے۔

(۱۱) "فقہ اکبر" میں ابو مطیع بلخی حکم بن عبد اللہ کے سلسلہ میں ہے کہ وہ ابو حنیفہ الامام کے شاگرد ہیں حالانکہ محدثین ان کی شاگردی میں اختلاف کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک ان کا شاگرد ہونا ثابت ہے۔ "میزان الاعتدال" میں اس کا ثبوت موجود ہے۔

(۱۲) باب ماجاء اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ اس سند میں عن عبد اللہ بن عمرؓ ہے۔ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ راوی عبد اللہ بن عمرو نہیں بلکہ عبد اللہ بن عُمَرؓ ہیں۔ دار قطنی کے افراد میں عبد اللہ بن عُمَرؓ ہی کا ذکر ہے۔ نیز روایت کثیر طرق سے مروی ہے جس کے ہر سلسلہ میں عبد اللہ بن عُمَرؓ ہی ہیں۔

(۱۳) فرمایا کہ عباد بن کثیر دو ہیں۔ ایک رملی دوسرے بصری۔ رملی کی اکثر احادیث حسن ہیں بعض قرائن کی سے میری یہ رائے تھی کہ جن عباد بن کثیر کا ذکر آتا ہے وہ رملی ہیں پھر مجھے "کشف الاحوال فے نقد الرجال" میں اسکی تصریح بھی مل گئی۔ فالحمد للہ علےٰ ذلك۔

(۱۴) مشہور فقیہ و امامِ شام حضرت اوزاعی کہتے ہیں حدثنی معدان بن طلحۃ احادیث میں ابن طلحہ و ابن ابی طلحہ کا ذکر ملتا ہے جنہیں عام محدثین نے دو شخصیتیں سمجھ لیا یہ دو نہیں بلکہ ایک شخص ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن ابی بکر اور عبد اللہ بن بکر کو ایک سمجھا جا رہا ہے حالانکہ وہ دو علیحدہ علیحدہ راوی ہیں۔

(۱۵) عروہ کی روایت بسلسلہ مستحاضہ فاطمہ بنت قیس کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ فاطمہ بنتِ قیس بن حبیش ہیں۔ یہ وہ فاطمہ نہیں ہیں جن کی طلاق کا واقعہ کتبِ حدیث میں خود ان ہی

کی روایت سے موجود ہے۔ اگرچہ عروہ ان دوسری فاطمہ سے بھی روایت کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ دونوں فاطمہ کو ایک قرار دینے کی ہو رہی ہے حالانکہ یہ دو راویہ ہیں۔

(۱۶) دمِ سائل ناقضِ وضو ہے یا نہیں؟ صاحبِ ہدایہ نے اس سلسلہ میں الوضوء عن کل دم سائل والی روایت سے استدلال کیا ہے۔ زیلعی نے "نصب الرایہ" میں ابن کامل سے اس حدیث کی تخریج کی ہے لیکن کاتب نے محمد بن سلیمان کے بجائے عمر بن سلیمان لکھ دیا۔ حالانکہ محمد بن سلیمان راوی ہیں جو ایک غیر معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی طرح زیلعی کی تخریج میں ایک حدیث ہے جس کی تخریج انھوں نے دارِ قطنی سے کی ہے۔ ماخذ وماخوذ دونوں جگہ پر ہشام بن خالد روایت میں مذکور ہے۔ یہ غلط ہے صحیح ہاشم بن خالد ہے۔ اسی حدیث کی سند میں عن ابن غیلان ہے جسے دارِ قطنی مجہول کہہ رہے ہیں۔ زیلعی نے بھی اسکو بدستور ذکر کیا۔ حالانکہ اس حدیث میں ابن غیلان نہیں عمرو بن غیلان ہے۔ حافظ بن حجر نے اصابہ میں عمرو بن غیلان کے ذکر کرنے کے بعد انہیں کم سن صحابی قرار دیا ہے۔

(۱۷) حافظ ابن تیمیہ کے جد امجد مجد الدین ابن تیمیہ نے کتاب "منتقیٰ" میں محجن ابن ادرع متعین کیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ یہ ابنِ ادرع دوسرے صحابی ہیں۔ یہی غلطی جامع کبیر میں جلال الدین سیوطی سے بھی ہوگئی۔ حافظ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ بخاری نے ادب مفرد میں محجن بن محجن سے روایت کی ہے مجھے شبہ ہوا اور ادبِ مفرد کو دیکھا تو وہاں عن ابی ادرع موجود تھا۔

(۱۸) موطا امام مالک میں افتراش وتورک کی بحث میں سندِ حدیث میں عبید اللہ آگیا حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ عبد اللہ ہے۔

(۱۹) امام بخاریؒ نے قرأت خلف الامام کی بحث میں ایک روایت عن محمود بن ربیع کا ذکر کیا ہے اس میں امام بخاریؒ کو سہو ہوا چونکہ کاتب نے غلطی سے ابنِ ربیعہ لکھ دیا۔ امام بخاریؒ کو خیال ہوا کہ یہ محمود بن ربیع ہے حالانکہ وہ نافع بن محمود بن ربیع ہے۔

غرضیکہ حضرت شاہ صاحب اسماء الرجال پر تفصیلی واقفیت رکھتے اور جا بجا محدثین و اہل علم کے ان تسامحات پر توجہ دلاتے جو ان حضرات کو پیش آئے۔ جستہ جستہ کچھ نمونے اس سلسلہ کے پیش کئے گئے استقصار مقصود نہ تھا ورنہ مرحوم کی املائی تقریروں میں اس طرح کے نمونے بکثرت موجود ہیں۔ اور یہ پہلے عرض کیا جاچکا کہ رجال کی بحثوں ہی

سے انھوں نے ان روایات کو ساقط الاعتبار ہونے سے محفوظ رکھا جو فقہ حنفی کے لئے مفید ہوسکتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ فنِ حدیث سے ہٹ کر خود فقہِ حنفی کی تائید واستحکام کیلئے احناف کو اسماء الرجال کے فن سے گہری و دبیز واقفیت کی ضرورت ہے۔

فقہ حنفی کو حدیث کے ذخیرہ سے مدلل و مؤید کرنے کی بات چلی اور اُس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کاوشوں کا تذکرہ مفصل آیا۔ باقاعدہ عنوان کے تحت بھی اور ذیلاً وضمناً بھی اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حنفی تعصب میں وہ ہرجا وبے جا اقدام کے لئے تیار رہے۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ انھوں نے اس باب میں بھی منصفانہ وعادلانہ روش کو اختیار کیا اور جہاں حنفی نقطۂ نظر میں انہیں کوئی سُقم نظر آیا اس کے بیان کرنے میں تامل نہیں کیا بلکہ کہیں ایسا بھی ہوا کہ عام حنفی مسلک کے مقابل انھوں نے دوسرے فقہاء کے نقطۂ نظر ہی کو ترجیح دی چنانچہ مکہ معظمہ کی حرمت پر عام اتفاق کے باوجود مدینہ کی حرمت پر احناف کا اختلاف ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حرمتِ مدینہ کے سلسلہ میں احادیث موجود ہیں اس لئے اسکی حرمت کا انکار صحیح نہیں ہوگا البتہ مدینہ کی حرمت اس درجہ کی نہیں ہے جیسی مکہ معظمہ کی ہے یا اسی طرح علمائے احناف کا خاص انداز ہے کہ اگر کوئی بات حدیث سے ثابت ہو اور ظاہر روایت اس حدیث کے خلاف ہو تو احناف اس حدیث پر عمل کرنے کے جواز کے قائل نہیں۔ لیکن مرحوم روایت وحدیث میں تطبیق کے قائل تھے اور ایسی صورت میں (خلافِ اولےٰ میں ہے) ان کی اپنی مخصوص اصطلاح تھی۔ مثلاً سرّی نمازوں میں مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا، اذان میں ترجیع، آمین بالجہر، رفع یدین باستثنائے وقت تکبیر تحریمہ، ان سب مسائل میں فقہ حنفی سے ہٹکر وہ جواز کے قائل ہیں۔ البتہ انہیں خلافِ اولےٰ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان مختلف روایات میں مرحوم نے تطبیق کی ہے۔ فرماتے کہ احناف رفع یدین کو بجز تکبیر تحریمہ کے مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں اور میں خلافِ اولےٰ قرار دیتا ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ حنفیہ میں سے کسی کا قول خلافِ اولیٰ ہونے کا ملے تو میری تائید ہو۔ مسلسل محنت وانتظار کے بعد امام جصاص کے یہاں مجھے یہ قول ملا جو انھوں نے رؤیتِ ہلال کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ ان الخلاف فیہ فی الاولویۃ یہ دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ خدا تعالےٰ نے میری آرزو کی تکمیل کی۔ پھر میں نے دیکھا کہ حافظ بدرالدین عینی نے مبانی الاخبار شرح معانی الآثار "قلمی" میں اور حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسے ہی ان کا خاص طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں امام اعظمؒ سے مختلف روایات

ہوں اور کوئی قول مدلل طور پر راجح یا مقدم و مؤخر نہ ہو تو مرحوم پھر ان مختلف اقوال میں موافقت پیدا کر لیتے۔ مثلاً ظہر و عصر کے اوقات میں امام اعظم کے چار اقوال ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ان میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے مثلِ اول کو ظہر کے لئے اور ثالث کو عصر کے لئے مخصوص کیا۔ مثلِ ثانی دونوں میں مشترک مانا جبکہ اشتراکِ وقت خود امام طحاوی، مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ان مثالوں سے واضح ہوا کہ حنفیت سے دلچسپی و گہری وابستگی کے باوجود وہ جمود پسند عالم نہیں تھے بلکہ توسع اور فراخ حوصلگی کے ساتھ دوسرے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے جہاں ابن تیمیہ وحافظ ابن حجر وغیرہ پر بھرپور تنقید کی ہے وہیں ان کی گرفت سے حافظ بدر عینی وابن ہمام ایسے حنفی اساطین بھی محفوظ نہیں رہ سکے بلکہ متعدد مواقع پر حافظ بدر عینی کے مقابلہ میں ابن حجر کو سراہا اور ان کی تحقیقات کی کھل کر تعریف و تائید کی ہے۔ اپنے گہرے علم اور بے پناہ وسیع معلومات کی بنا پر امت کی اساسی شخصیتوں کے نہ صرف اسقام پر نظر رکھتے بلکہ ان کو واضح کرنے کی جرأت سے بھی محروم نہ تھے۔ مثلاً سیدنا امام بخاری علیہ الرحمہ کی جلالتِ علم اور حدیث میں ان کی مخصوص ژرف نگاہی تسلیم کرنے کے ساتھ ان کی فنی کمزوریوں پر مطلع کرتے چنانچہ ایک بار سبق میں فرمایا کہ

"میں نے بخاری شریف کے متن کا شروحات کے علاوہ صرف متن کا تیرہ [۱۳] بار بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور محسوس کیا کہ امام ہمام بایں جلالتِ شان جب ایک فقہی رخ اختیار کرتے ہیں تو دوسری طرف سے کلیتہً بے نیازی برتتے ہیں اور پھر اپنے پسندیدہ مذہب پر نہ روایتہً کوئی دلیل پیش کرتے ہیں نہ درایتہً حالانکہ دوسرے صحاح ستہ کے مصنف مثلاً ابوداؤد، ترمذی، نسائی دلائل کے فراہم کرنے سے چوکتے نہیں بلکہ امام بخاریؒ نے بعض مواقع پر حدیث مرفوع کے مقابلہ میں آثار سے کام لیا اور جمہور کی کھلی مخالفت کی۔ حائضہ عورت یا جنبی کو محض آثار کی بنا پر تلاوتِ قرآن کی اجازت دے رہے ہیں حالانکہ جمہور کے پاس ممانعت تلاوت کے لئے حدیثِ مرفوع ہے مگر امام بخاری نے ان احادیث مرفوعہ کی رعایت نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی فقہ کو حدیث میں

جاری کرتے ہیں حالانکہ حدیث فقہ پر موثر ہونی چاہیئے۔ نیز امام بخاری خود قیاس پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے اگر قیاس پر عمل کریں تو نکتہ چینی کرتے ہیں اس کے علاوہ امام بخاری علیہ الرحمہ کے یہاں کچھ اور چیزیں بھی محلِ نظر ہیں۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کسی فقہ سے وابستگی اور کسی شخصیت سے عقیدتِ مفرط نے حضرت شاہ صاحب کی تحقیق پسند نگاہ کو معطل ومفلوج نہیں کیا تھا۔ انھوں نے خاص کام یہ بھی کیا کہ بعض اختلافی مسائل میں احناف کی جانب سے ہمیشہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے دوسرے فقہی مکاتیب پر اقدامی حملے بھی کئے ہیں اور بتایا ہے کہ دوسرے فقہاء بھی بعض مسائل میں امام ابوحنیفہ کے طرز سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مثلاً حدیث انما الاعمال بالنیات جس کو مدار بناکر وضو میں بھی اشتراطِ نیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو عدمِ اشتراط پر مطعون کیا گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ

"دین پانچ اہم اجزاء پر حاوی ہے عبادات، عقوبات، معاملات، اعتقادات، اخلاقیات، اخلاق اور عقائد کے مباحث متعلقہ فنون میں ملیں گے جبکہ اُن میں سے تین فقہ کے موضوع بحث ہیں۔ عبادات میں اہم نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہیں۔ ان عبادات کی صحت کے لئے بالاتفاق نیت ضروری ہے۔ معاملات بھی پانچ اجزاء پر مشتمل ہیں نکاح، بیع وشراء، مقدمات، ترکات اور امانتیں۔ باتفاق فقہاء ان کی صحت کے لئے نیت ضروری نہیں۔ عقوبات یہ بھی پانچ ہیں یعنی سزائے ارتداد، سزائے تہمت تراشی، زنا، سزائے سرقہ اور قصاص ان میں سے کہیں بھی نیت ضروری نہیں جس کا حاصل یہ ہوا کہ تمام فقہاء نے متفقہ طور پر انما الاعمال بالنیات والی حدیث پر دین کے ان اہم ترین اجزاء میں عمل ترک کیا اور اس کے باوجود ان کا حدیث پر ظلم نہیں سمجھا گیا۔ غریب ابوحنیفہؒ نے صرف وضو میں نیت کی شرط تسلیم نہیں کی تو مخالفین نے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے۔ حالانکہ دریافت طلب بات یہ ہے کہ دوسرے فقہاء کے لئے ان اہم اجزاء میں حدیث پر ترکِ عمل کا کیا جواز ہے؟"

شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔

"فیالیت شعری کیف تزعموا ان الحدیث وارد علینا وموافق لہم؟ مع انہم اخرجوا عنہ المعاملات والعقوبات بتمامہا ایضاً فلو کان الحدیث یرد علینا فی الوسائل فقط فقد ورد علیہم فی المعاملات والعقوبات۔"

اس طویل اقتباس سے محسوس ہوگا کہ مرحوم نے حنفیہ کی جانب سے جواب دہی میں ہمیشہ دفاعی حیثیت اختیار نہیں کی بلکہ دوسرے مکاتیبِ نظر پر اقدامی حملہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ترکِ حدیث صرف ابوحنیفہ کے جرائم میں سے نہیں بلکہ بعض دوسرے فقہاء کو بھی کہیں حدیث پر عمل ترک کرنا پڑا۔ اگر ترکِ حدیث جرم ہے تو پھر ابوحنیفہؒ ہی کیوں مجرم ہوئے؟

حنفیہ کی جانب سے بعض مواقع پر اس نقطۂ نظر کے علاوہ بیشتر ان کی کوشش چاروں مذاہب میں تطبیق کی رہتی اور سابق میں بتایا جاچکا کہ وہ احناف کے اُن اقوال کو پسند کرتے جو باقی مذہب سے قریب تر ہیں اُن کا ایک خاص طریقہ یہ بھی تھا کہ خود صاحب مذہب کے اقوال سے استدلال کرتے اور متقدمین کی آراء کو متاخرین کے مقابلہ میں ہمیشہ ان کے یہاں ترجیح رہتی۔ اُن کے اس نقطۂ نظر کو ایک اور مثال سے سمجھیئے۔ کیا لڑکی بطورِ خود نکاح کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟ سیدنا الشافعی الامام اور امامِ اعظم کے درمیان یہ مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے۔ امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ صرف ولی کی اجازت سے نکاح کے قائل ہیں اور یہ بھی اُن کا خیال ہے کہ عورتیں خود نکاح نہیں کرسکتیں اگرچہ ولی نے ہزار بار اجازت کیوں نہ دی ہو۔ ایجاب وقبول بھی مرد ہی کرسکتا ہے۔ صنفِ نازک نکاح کا انعقاد بھی نہیں کرسکتی گویا کہ ولی کی رضا خود لڑکی کی خواہش پر مقدم ہے۔ امام ابوحنیفہ کے دو مشہور شاگرد قاضی ابویوسف وامام محمد نے لڑکی کا کیا ہوا نکاح جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ ولی کی جانب سے اجازت حاصل ہو۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ وہ حدیث کو کس طرح اپنے لئے مفیدِ مقصد سمجھ رہے ہیں۔ حدیث سے تو زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی رضا اور اس کی شرکت نکاح میں ضروری ہے۔ اجازتِ نکاح ولی کی جانب سے سابق میں حاصل ہوچکی ہو یا بروقت اور نکاح یا ولی نے کرایا ہو یا لڑکی نے خود کرلیا ہو۔ اگر حدیث

حجت ہے تو صرف مسئلہ اولیٰ میں ہے دوسرے جزء سے کوئی تعلق نہیں چونکہ حضرت عائشہؓ کی حدیث ایما امرأۃٍ نکحت بغیر اذن ولیہا فنکاحہا باطل باطل باطل اس مقصد میں صریح ہے کہ ولی کی اجازت ضروری ہے نہ کہ ولی کا خود نکاح کرانا ضروری ہے پھر خود احناف بھی ولی کی اجازت قطعاً غیر ضروری قرار نہیں دے رہے ہیں چنانچہ امام اعظمؒ کے شاگرد حسن بن زیاد نے امام صاحبؒ ہی سے نقل کیا ہے کہ اگر لڑکی نے غیر قوم میں شادی کر لی اور ولی کی اجازت کے بغیر تو وہ نکاح باطل ہے اور اولیاء کو حق ہے کہ قاضی کے یہاں مرافعہ کر کے اس نکاح کو فسخ کرا دیں۔ تو یہ کہاں اس حدیث میں ہے کہ نکاح کے لئے مرد ہی کی جانب سے ایجاب و قبول ہونا چاہیئے ممکن ہے کہ حضرات شوافع معاشرہ سے اس مسئلہ کو اخذ کر رہے ہوں کیونکہ عام رواج یہی ہے کہ لڑکیاں خود نکاح نہیں کرتیں بلکہ ان کے اولیاء کراتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں نکاح کا تذکرہ شروع میں آیا اور حقیقتِ نکاح عقد ہے تو انھوں نے انعقادِ نکاح کے لئے اولیاء کی گفتگو ضروری قرار دے دی ہو لیکن حدیث "الایم احق بنفسہا" جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کو اپنے نکاح کے معاملہ میں مختار بنایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت خود نکاح کر سکتی ہے تو جمہور نے اس حدیث کو کھینچ کر اپنے لئے موافق بنا لیا کہ بیوہ کے باب میں ولی کو لڑکی کی رضامندی کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس تفصیل کے بعد یہ بھی سنئے کہ امام ابو حنیفہؒ جس صورت میں اولیاء اور لڑکی کی رضا ایک دوسرے کی مخالف ہوں وہاں لڑکی کی رضا کو مقدم کرتے ہیں اگرچہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لڑکی کو چاہیئے کہ اپنے اولیاء کی رضا بھی حاصل کرے۔ ایسے ہی اولیاء کو بھی پابند کیا ہے کہ وہ لڑکی کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہ کریں معلوم ہوا کہ امام اعظمؒ کے خیال میں نکاح اہم ترین مسئلہ ہے اس میں ایک جانب اولیاء ہیں جنھوں نے پرورش کی لڑکی کے مستقبل کو آراستہ کیا ان کے قلوب اور دماغ شفقت سے لبریز ہیں ان کی نفع و نقصان پر نظر ہے خدا تعالیٰ نے انہیں عقلِ سلیم دی ہے بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لڑکی کو کسی نقصان میں ڈالیں گے دوسری جانب خود لڑکی ہے اسے لڑکے کے ساتھ پوری زندگی گذارنی ہے لڑکے کی برائی و بھلائی سے اسی کا سابقہ ہے ماں باپ تو نکاح کر کے یکسو ہوں گے لیکن بہتر اور برا، اچھا اور بھلا سب لڑکی کی جانب آنے والا ہے اس لئے یہ ہرگز مناسب نہیں اس کی پوری زندگی کے معاملہ میں اس کی خواہش، رضامندی کو نظر انداز کر دیا جائے اور دودھ کی مکھی کی طرح اس کو نکال دیا جائے۔ عام

معاملات میں بھی معاشرہ کسی جانب سے اس طرح اقدام نہیں کرتا کہ کسی صاحبِ معاملہ سے استصواب کئے بغیر اس کی جانب سے کوئی بات کرلی جائے جب زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی فریقین کی رضامندی ملحوظ رکھی جاتی ہے تو یہ تو عمر بھر کا معاملہ ہے انہیں لڑکیوں کو یکسر معاملہ سے علیحدہ کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ نکاح کی ذمہ داری نہ صرف اولیاء پر ڈالی جاسکتی اور نہ صرف عورتوں پر بلکہ دونوں کی مشترکہ رضامندی ہی سے یہ گاڑی چلے گی۔ اسی وجہ سے حنفیہ نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ اگر لڑکی حزم واحتیاط، سوچ بوجھ اور پوری دانشمندی کے ساتھ قوم ہی میں شادی کر رہی ہے اور نکاح خاندان کے لئے کسی حیثیت سے بھی رسواکن نہیں اولیاء سے استصواب ہی نہیں بلکہ ان کی خوشنودی کی طالب اور انہیں شریکِ کار رکھنا چاہتی ہے مگر اولیاء ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔ امام ابوحنیفہ رح کہتے ہیں کہ لڑکی اپنی شادی کرلے اور ولی کی کوئی پروانہ کرے، چونکہ زیادتی اولیاء کی ہے نا کہ لڑکی کی امام شافعی علیہ الرحمہ نے اسی مسئلہ میں یہ فرمایا کہ قاضی حکماً اس ولی کو معزول کر دے جو لڑکی کو بے بس کرنا چاہتا ہے اور کسی دوسرے کو مامور کرے گویا کہ امام شافعیؒ لڑکی کو اولیاء کے حصار میں محصور رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ پر طویل غور کیا ہے اور اس طرح کے مسائل میں شریعت کے مقاصد کو ان کے حقیقی ظروف میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں عرض کروں گا وہ شریعت کے مقاصد کی ترجمانی ہوگی۔

تفصیل یہ ہے کہ شریعت جہاں دو حق جمع ہوجاتے ہیں وہاں اس کی کوشش کرتی ہے کہ کسی صاحبِ حق کو اس کے واقعی حق سے محروم نہ کرے اور نظم عالم ومعاشرہ کو درست منہاج پر رکھنے کی یہی صورت کامیاب ہے۔ ایسے مسائل میں جہاں متعدد حقوق کا اجتماع ہو صرف ایک جانب پر نظر رکھ کر اقدام کرنا کبھی صحیح نہیں ہوگا۔ بلکہ تمام نصوصِ شرعیہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی حقیقی روح پر اطلاع ورسائی اہم ہے۔ کیونکہ شریعت کا مقصد مجموعۂ نصوص میں منتشر ہے نہ کہ اس مجموعہ کے کسی ایک جز میں۔ اس کی چند مثالیں لیجئے۔

۱۔ زکوٰۃ:۔ سب جانتے ہیں کہ اس میں دینے والا اور حکومت کے کارندے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا احساس تھا کہ مال نکالنا طبعی طور پر بیحد

دشوار ہے اور پھر ایسی معلومات بھی آپؐ کو حاصل ہوئیں تو آپؐ نے مالداروں کو مخاطب فرمایا
کہ تمہارے پاس کچھ ایسے آئیں گے جن کی آمد تمہارے لئے خوشگوار نہیں ان سے تمہاری
ناراضگی اس لئے نہیں کہ انھوں نے تمہیں کوئی نقصان پہونچایا یا ان سے کوئی ذاتی پرخاش
ہے۔ ناراضگی کی ساری وجہ یہ ہے کہ یہ تم سے حقِ شریعت وصول کرنا چاہیں گے جن کا دینا
طبعی طور پر گراں ہے یاد رکھو کہ اگر یہ آئیں تو خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرنا یہ جو
کچھ لینا چاہیں "بحق الشرع ومنصفانہ طور پر" تو مزاحم نہ ہونا اگر یہ لینے میں منصف نہ رہیں
تو انھوں نے خود اپنے کو نقصان میں ڈالا تم تو انہیں خوش ہی رکھنے کی کوشش کرنا کیونکہ ادائیگی
زکوٰۃ درحقیقت ان کارندوں کی خوشی پر موقوف ہے اور یہ خوش ہو کر تمہارے لئے دُعائے خیر
کریں گے۔ ابو داؤد میں ایک دوسری حدیث ہے کہ آپؐ کی خدمت میں کچھ گاؤں کے باشندے
حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ وصولیابی زکوٰۃ کرنے والے آتے ہیں اور وصولیابی میں
زیادتی کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ کارندوں کو خوش رکھو۔ انھوں نے عرض کیا کہ اگر وہ ہم
پر ظلم کریں؟ فرمایا جب بھی ان کو خوش رکھو۔ تیسری حدیث میں ہے کہ یا رسول اللہ وصولیابی
کرنے والے کھلی زیادتی کرتے ہیں تو ہم اپنے اموال کی اتنی مقدار چھپا لیا کریں جس پر وہ
زیادتی کرتے ہیں ارشاد ہوا ہرگز نہیں۔ یہ ہدایات آپ کی اہلِ مال کے لئے تھیں۔ پھر آپؐ نے
توجہ دوسری جانب فرمائی۔ وصول کرنے والوں کو بھی واضح ہدایات ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ
لوگوں کا بہترین مال لینے سے احتیاط کرو وصولیابی میں زیادتی نہ کرو اور مظلوم کی بد دعا سے
ڈرو مظلوم کی بددُعا اور قبولیت میں کوئی چیز آڑ نہیں۔ یاد رکھو وصولیابی میں زیادتی کرنے والا
اسی درجہ کا گنہگار ہے جس درجہ کا زکوٰۃ نہ دینے والا۔ اب ان دونوں احادیث کو دیکھا جائے
صفِ اوّل کی احادیث کا مطالعہ صاف رہنمائی دیتا ہے کہ مال میں خود صاحبِ مال کا کوئی حق
ہی نہیں تھا اسے حکومتی کارندوں کی تمام بے عنوانیوں کو برداشت کرتے ہوئے زکوٰۃ دینا تھی
اور شریعت نے اسکے لئے چون وچرا اور قیل وقال کی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی پھر دوسری
جانب کی حدیثوں پر نظر ڈالئے تو محسوس ہوگا کہ آپؐ نے کارندوں کی بے عنوانیوں پر بڑا مضبوط
حصار قائم کر دیا اور ان کے دائرہ کو محدود کرتے ہوئے چپ وراست میں ان کی حرکت کیلئے
کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ کیا بقائمی ہوش وحواس ان ہر دو احادیث میں سے کسی ایک رُخ پر
عمل کرنا اور دوسری جانب کو نظرانداز کر دینا صحیح ہوگا؟ سلامتیٔ حواس کے ہوتے ہوئے

دونوں حدیثوں کو سامنے رکھ کر کسی حقیقت کا سراغ لگانا مناسب ہوگا؟

۲۔ اور لیجئے :۔ مردوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے مت روکو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دے رہے ہیں بلکہ انہیں مساجد میں آنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور پھر جب خود عورتوں کو آپؐ نے مخاطب فرمایا تو ارشاد ہوا کہ تمہاری نماز تمہارے گھر کی ان کوٹھریوں میں بہتر ہے جو ایک گوشہ میں ہوں۔ یہ بھی فرمایا کہ عورتوں کی بہترین نماز وہ ہے کہ جس پر کسی مرد کی نظر نہ پڑ سکے۔

۳۔ تیسری نظیر لیجئے :۔ امیر کی اطاعت کا مسئلہ شروع ہوا تو آپؐ کا ارشاد تھا کہ اطاعت کرو اگرچہ حبشی غلام امیر بنا دیا جائے جو کن کٹا ہو اور دوسرے جسمانی عیوب کا حامل! مگر تم اطاعت سے سرتابی نہ کرنا تاوقتیکہ کھلے ہوئے کفر کا اس سے ظہور نہ ہو۔ پھر جب امرائ کی طرف عنانِ توجہ ہوئی تو پناہ بخدا وعید آمیز لب و لہجہ کا یہ عالم ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوش قسمت ہی امیر ہوگا جسے جہنم سے گلو خلاصی نصیب ہو سکتی ہے۔ مضمون کی تکمیل کیلئے شریعت ہی سے چوتھی نظیر پیش کرتا ہوں۔

۴۔ بلا ضرورت سوال کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان کے چہرے قیامت میں چیچک کے داغ رکھنے والوں کے مشابہ ہوں گے اس سے محسوس ہوا کہ آپؐ دنیا میں مانگنے کا دروازہ کھلا ہی رکھنا نہیں چاہتے۔ ٹھیک ان ہی اوقات میں اہلِ دولت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں دینا ہی چاہیئے اگرچہ فقیر گھوڑے پر سوار ہو کر بھی آیا ہو جو اس کی بظاہر ریاست کی علامت ہے۔

اس تفصیل کے بعد میں پھر اپنا سوال لوٹاتا ہوں کہ ان متضاد احادیث میں کسی ایک رُخ کو عمل کے لئے متعین کر کے شریعت کے پورے مطالبہ کی توفیر ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! ایک دانشور ان ہی مختلف احادیث میں سے اس حقیقت کے گرانقدر موتیوں کو اچھالے گا جن پر ہمہ جہت احادیث کی آب و تاب ہے۔ پھر بتایئے کہ کیا امام شافعی رح کا یہ اقدام صحیح ہے کہ انھوں نے تمام تر نکاح کے اختیارات اولیاء کو دیدے اور ایک جیتی جاگتی ہستی عاقلہ و فرزانہ لڑکی کو جبکہ اس کی پوری زندگی کا سودا ہو رہا تھا دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا؟ نظرِ انصاف شرط ہے۔ ابوحنیفہ الامام کے تفقہ کا امتیاز یہیں پر

محسوس ہوتا ہے کہ نہ انھوں نے لڑکی کے اختیارات معطل کئے اور نہ اولیاء کے اختیارات پر صفا کا نہ حملہ کیا بلکہ وہ درمیان کی راہ نکالی جو شرعی مقاصد کی تکمیل اور متوازن توفیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری اس تقریر کو منصفانہ نقطۂ نظر سے سمجھا گیا تو ذہنیتوں کی تبدیلی ابو حنیفہؒ کو مبغوض بنانے کے بجائے محبوب بنالے گی اور ان کے فقہ سے بدگمانی کے بجائے حسنِ ظن کی راہیں ہموار ہوں گی۔ یہ تھا حضرت علامہ کشمیری کا امتیاز کہ انھوں نے فقہِ حنفی کو اپنی ژرف نگاہی کے نتیجہ میں اقرب الی السنۃ سمجھا تھا وہ باوجودیکہ اس کا اعلان کرتے کہ میں ہر فن میں مجتہد ہوں لیکن فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا ابو حنیفہ کا مقلد ہوں مگر صاف محسوس ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کو بھی انھوں نے اپنی طویل علمی کاوشوں کے نتیجہ میں ایک ایسا سرمایۂ فکر باور کیا تھا جو بلاشبہ تقلیداً قابلِ قبول ہے۔ اقتباس طویل ہوگیا مگر قلم مرحوم کے مقصد کی توضیح کے لئے اس طوالت کے لئے مجبور تھا جس پر معذرت طلبی بھی غیر ضروری نظر آتی ہے۔

بہرحال گفتگو یہ تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث کی شرح وتبیین میں اپنے اجتہادی نقطۂ نظر سے نکتہ آفرینیوں کا جو چمن زار تیار کیا ہے اس کے کچھ شاداب مناظر قارئین کے سامنے آئیں۔ ذیلاً یہ بحث نکلی کہ حدیث ہی سے انھوں نے فقہ حنفی کی تاسیس وتائید کیلئے کیسے کیسے بلیغ اسلوب اختیار کئے۔

ان درمیانی بحثوں کے بعد پھر وہی حدیث انما الاعمال بالنیات لیجئے۔ حدیث کی تفصیل تو آپ کے علم میں ہے کہ اس حدیث کے راوی کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ محمد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفسِ قدسی سے جن لاکھوں انسانوں کی تربیت کی تھی اس مقدس سلسلہ کی دوسری کڑی سیدنا عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس حدیث کو منظرِ عام پر سنایا اور کسی اختلاف کے بغیر سب نے اسکو قبول کیا جو حدیث کے حدیث ہونے اور پختہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے اور حدیث بھی کتنی اہم جو شریعت کا دروازہ ہے جس میں انسان کے عمل کا مدار، قبولیت وعدمِ قبولیت کی تقسیم میں لانے کے لئے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ جس کی جیسی نیت ہوگی ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا اسلئے جس کی ہجرت اللہ ورسول کی خوشنودی کی خاطر تھی اس کی ہجرت اسی ذیل میں آئے گی اور جو بدنصیب دنیا یا کسی عورت کے چکر میں ترکِ وطن کر رہا ہے تو پھر یہ ہجرت اسی طرف لگ جائے گی۔

حدیث کی اہمیت کے پیشِ نظر امام بخاریؒ نے اس کو سات جگہ ذکر کیا ہے۔ سمجھانے

والے سمجھا رہے ہیں کہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث سے یہ اعتنا، اپنی نیت کی پاکیزگی کا اعلان اور دوسروں کو محتاط و با اخلاص رہنے کی تلقین ہے۔ لیکن مشہور شارح حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس توجیہ کو قبول کرنے سے انکار کیا اور لکھا ہے کہ اگر امام ہمام کا یہی مقصد ہوتا تو وہ حدیث کو تمام ابواب سے مقدم کرتے چونکہ اخلاص بتدریج حاصل نہیں ہوا بلکہ وہ عملی اقدام کی پہلی منزل و پہلے مرحلہ میں مطلوب ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ امام بخاری آغاز میں العیاذ باللہ غیر مخلص ہوں اور چند مرحلوں کے بعد احتسابِ نفس انہیں اخلاص کی دولت سے ہمکنار کرے۔ حافظ ابن حجر کے اس رد و قدح کے بعد حضرتِ شاہ صاحب کی سنیئے فرمایا۔

"عمل کی دو حیثیتیں ہیں ورودِ عمل صدورِ عمل۔ جس طرح وحی ورودِ عمل کا آغاز ہے اسیطرح نیت صدورِ عمل کا مبدأ ہے۔ انسان وحی کی رہنمائی کے بغیر حسنِ عمل اختیار نہیں کر سکتا اور نہ نیت کے بغیر اچھے اعمال معتبر ہو سکتے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس حدیث کو نیت کی ضرورت و عدمِ ضرورت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور نہ یہ اس بحث میں کوئی فیصل حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ حدیث درحقیقت اخلاص اور غیر مخلصانہ روش میں فرق کرنے کے لئے آتی ہے اسلئے اچھے اعمال کی بنیاد اگر بری نیت پر ہو تو ان سے اچھے صلے کی اُمید نہیں کی جا سکتی؟ جیسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص شب و روز عبادت کرتا ہے مگر مقصود رضائے خدا نہیں بلکہ ریاء ہے کیا اس کا یہ حسنِ عمل مقبول عند اللہ ہوگا؟ کبھی نہیں پس یہ حدیث اعمال کی اقسام و انواع پر حاوی ہے اسمیں نیت کی ضرورت و عدمِ ضرورت کی بحثیں و شاخسانے نکالنا نہ صرف دور از کار بلکہ حدیث کی روح کو کچل دینے کے مترادف ہے۔ حدیث کا صحیح رُخ اُس صحیح عمل کی تعریف ہے جس کی بنیادیں حسنِ نیت پر استوار کی گئی ہوں اور ان بدبختوں کو شدید تنبیہ ہے جنھوں نے اپنے کئے کرائے کو صرف فسادِ نیت کی بنا پر ضائع کر دیا۔"

حدیث کا جملہ ثانی "ولکل امرئ ما نوی" اس سے عمل کا ثمرہ مراد ہے۔ میں اپنے طویل مطالعہ کے نتیجہ میں اس حقیقت پر پہونچ چکا ہوں اور جس کی اصابت میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ عالمِ آخرت میں اعمال بعینہ متشکل ہو کر سامنے آجائیں گے۔ قرآنی آیت وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا

حاضرا ٹھیک ٹھیک اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے اسلئے مانوی نے بتادیا کہ عالمِ آخرت میں تمہارے اعمال تمہاری نیتوں کے مطابق متشکل ہوکر سامنے آئیں گے۔ مجھے اس تفصیل سے سردست بحث کرنا مقصود نہیں اس وقت تو میں حدیث کے اصل محمل کو متعین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں یعنی وہی کہ یہ حدیث نیت کی ضرورت و عدمِ ضرورت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس کا رُخ دوسری ہی جانب ہے جو عام علماء کی نظروں سے مستور رہا۔ بلکہ یہ نیتِ اخلاص اور نیتِ فاسد میں حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر حسنِ اعمال کے تحت نیتِ سوء کار فرما ہے تو اس پر حسنِ صلہ کی توقع نہیں کی جاسکتی چنانچہ اگر کوئی شخص بہ نیتِ ریا یا دنیائے دنی کے حصول کے لئے شب و روز نیک اعمال بجالاتا رہے تو عند اللہ اس کے اس کے اعمال کی کوئی قدر و منزلت نہیں عہ

آغازِ وحی:۔ وحی اور اسکی حقیقت، نزولِ وحی، وحی کی حفاظت و صیانت، وحی کا مخاطب کون ہوتا ہے، کن اوصاف سے متصف شخصیت کو وحی کا مخاطب بنایا جاسکتا ہے۔ یہ امور قرآن و حدیث میں جستہ جستہ مذکور ہیں اور اہلِ علم نے ان عنوانات پر سیر حاصل مباحث کا انبار لگایا ہے۔ سیدنا امام بخاری علیہ الرحمہ جو صرف حدیث کے جامع و مؤلف نہیں بلکہ ان کو ایک کامیاب مصنف سے زیادہ اسرار و رموزِ شریعت کا دانا اور فنِ حدیث کا واقعی شناسا و شناور کہا جاسکتا ہے۔ اپنی صحیح کتاب کی ترتیب و تالیف میں خداداد تفقہ و اجتہادی صلاحیتوں کے تحت مضامین کے عنوانات و احادیث کی ترتیب میں اہم حقائق کی جانب اشارے کرتے چلے جاتے ہیں انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آغازِ وحی کسطرح

عہ مستند صوفیاء بلکہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات میں بحوالہ سید الطائفہ الحاج امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نظر سے گذرا کہ اگر ابتداء میں بطور ریاء ہی حسنِ عمل کا آغاز ہوا ہے تو فکر نہ کرنی چاہیئے۔ انشاء اللہ ایک روز یہ مخلصانہ عبادت کا رنگ اختیار کرے گی۔ کیا یہ تحقیق سطورِ بالا میں محدث کشمیری کے ذکر کردہ نظریہ سے متصادم ہے؟ راقم السطور کا اپنا خیال ہے کہ سلوک و معرفت کے سوتے اگرچہ سرچشمۂ شریعت ہی سے پھوٹے ہیں تاہم کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جہاں صوفیاء کا نقطۂ نظر علمی و فنی لحاظ سے قابلِ التفات نہیں درحقیقت صوفیاء کا بہت بڑا سرمایۂ افکار و نظریات حسنِ ظن پر مبنی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ انسانی زندگی کے وہ انقلابات و تطورات جو مکتبۂ تصوف سے وابستگی کے بعد رونما ہوتے ہیں ان کے بیانات کی تائید بھی کرتے ہیں تاہم ایک محدث یا مفسر حدیث و قرآن کی شرح و تفسیر سلوک و معرفت کے نظریات و افکار سے جدا ہوکر کرتا ہے۔

تھا" سے کی ہے۔ اس جلیل القدر امام نے قرآن مجید کی ایک اہم آیت کو عنوان باب بنایا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات، مشرکین مکہ و مخالفین کی وحشت کا ازالہ، آپ پر آنے والی وحی کی نوعیت کا تعین، وحی کی کیفیتِ نزول کی تشخیص سب ہی مضامین آگئے۔ قرآن کا دستور یہ ہے کہ جب کسی شاق امر کا کسی امت کو مکلف قرار دیتا ہے تو جس وحشت کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں انہیں زائل کرنے کی بھی جد وجہد کرتا ہے چنانچہ جب امتِ محمدیہ کو "الصیام" کا مکلف قرار دیا گیا تو اس شاق عبادت کی مشقت کو ہلکی کرنے کے لئے ارشاد ہوا کہ "یہ کوئی نادر عبادت نہیں جس کے تم ہی مکلف قرار دیئے گئے ہو بلکہ تم سے پہلی امتوں کو بھی اس عبادت کا پابند کیا گیا تھا۔" مزید یہ کہ کوئی طویل عبادت نہیں بلکہ چند روزہ نفس کشی ہے اور پھر اس عبادت کا اجاگر فائدہ "لعلکم تتقون" کہہ کر واضح کر دیا گیا کہ انسانی طبائع حصولِ منفعت کے لئے ہمیشہ سرگرم کار ہیں ٹھیک اسی انداز پر اُن آیات میں جنھیں امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی تمہید میں ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم نے "وحی" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا اور اس جیسے دوسرے ذہنی اشکالات کو صاف کیا ہے اور واقعتًہ یہ امام ہمام کی ذہانت ہے کہ انھوں نے قرآن مجید سے اُن آیات کا انتخاب کیا جو اس مقصد کے لئے جامع آیات ہیں۔ پھر بھی یہ قابلِ غور ہے کہ امام نے دوسرے محدثین کی روش سے بالکل جدا ہو کر اپنی کتاب کی ابتدا وحی کے بیان سے کی ہے امام اس سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین کی بنیاد اور اس کا مدار صرف وحی پر ہے تو جب تک بنیاد ہی منقح نہ ہو اس عمارت کے بارے میں قیل و قال لاطائل ہوگی جو اس بنیاد پر کھڑی ہے۔

علامہ کشمیریؒ نے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ

"سب سے پہلے اس ثبوت کی ضرورت ہے کہ ہمارا تعلق خدا سے وحی کے ذریعہ سے ہوا ہے اسے ثابت کرنے کے لئے علم و عمل کی ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے پہلے وحی پر باب قائم کیا اس سے متصلاً علم کا پھر عمل کا۔ علم ہی وہ چیز ہے جو ثبوت تعلق مع اللہ کے ساتھ خود وحی کو بھی منکشف کرے گا اور پھر اپنے صحیح معلومات پر عمل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ امام نے اس ترتیبِ طبعی کو بھرپور انداز میں ملحوظ رکھا اور یہی انکی فقاہت کی دلیل ہے۔"

یہی حدیث جس سے آغاز وحی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اگرچہ امام کا یہ مقصد نہیں
تاہم الفاظِ حدیث پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بقولِ شارحین
امام کے عنوان کی تین طرح قرأت ہو سکتی ہے۔

بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْؤُ الْوَحْيِ

بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْؤُ الْوَحْيِ

بَابِ كَيْفَ كَانَ بَدْؤُ الْوَحْيِ

پہلی قرأت پر مطلب یہ ہوگا کہ "وحی" ہم تک کیسے پہونچی اس کا مبدأ کیا ہے۔ بظاہر وحی کی کیفیت کا بیان مقصود نہیں بلکہ حدیث کا تذکرہ پیشِ نظر ہے۔

دوسری صورت میں "باب" کی اضافت "کیف" کی جانب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ہمام "آغاز وحی کی کیفیت" کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں لیکن اس ذیل میں جن احادیث کو انھوں نے ذکر کیا ہے اُن میں ان کے مقصد کے لئے صرف ایک ہی مفید ہے باقی احادیث کارآمد نہیں۔

قرأت کی تیسری صورت معنیً پہلی دو صورتوں ہی سے موافق ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے امام کی پیش کردہ اس ذیل میں جملہ احادیث کو ان کے عنوان سے مطابق کرنا دشوار تر ہے۔ میں جہاں تک اپنے مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں دریافت حقیقت کر سکا ہوں وہ یہ ہے:۔

امام بخاری اپنے عنوان کے لئے صراحۃً مفید پہلی ہی حدیث ذکر کرتے ہیں بعد والی احادیث عنوان باب کی صریح تفسیر نہیں ہوتیں بلکہ وہ ضمناً و ذیلاً پہلی روایت کی تائیدی شرح کرتی چلی جاتی ہیں، اسلئے اگر ایک روایت بھی عنوانِ باب سے متعلق ہو اور باقی روایتیں پہلی روایت کی مؤید ہوں تو امام پر عنوان و معنون پر مخالفت کا اعتراض نہیں ہو سکتا۔ سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ امام نے عنوان میں تین لفظ انتخاب کئے ہیں "کیف" "بدؤ" "وحی"، ان تینوں کو بغیر کسی قید کے ذکر کیا ہے اس لئے "کیف" کو اگر اس کے عموم پر رکھا جائے تو زمان و مکان دونوں کی کیفیت مراد لی جا سکتی ہے اور امام بخاری پر زمانی ابتدار مراد لیکر اعتراض صحیح نہیں۔

حضرت کے خیال کے مطابق "بدایت" عام ہے خواہ ابتدار زمانہ سے ہو یا مکان سے یا پھر بدایتِ حالی ہو یا صفاتی۔ اور جب وحی میں بھی کوئی قید نہیں تو "متلو" (قرآن) بھی مراد

لی جاسکتی ہے اور "غیر متلو" (حدیث) بھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ اگر اضافتِ بیانیہ لے لی جائے تو بدؤ و وحیٔ دونوں ایک ہوجائیں گے۔ شاہ صاحبؒ کی توجیہ کے بعد عبارت یوں ہوگی "کیف کان بدؤ ھو الوحی" لیکن میرے خیال میں

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو فترۃ کا دور جس میں وحی کے سلسلے منقطع ہوگئے تھے پھر وحی کا آغاز کس طرح ہوا چنانچہ بدؤالوحی میں ایک نسخہ بدؤ الوَحْیِ (بموجودگیٔ واؤ) بھی ہے میری توجیہ پر دونوں نسخوں کا مفہوم ایک ہی ہوگا یعنی وحی جو بہت سی انواع واقسام پر مشتمل ہے کس طرح ظہور پذیر ہوئی۔ یہ مطلب نہیں کہ وحی کے متعدد اجزاء میں سے پہلے جزء کی کیفیت بیان کرنا پیشِ نظر ہے۔ وحی کو اگر اجزاء پر تقسیم کرتے ہوئے اس کا پہلا جزء مراد لیا جائے تو پھر یہ اشکال ہوگا کہ صرف غارِ حرا والی حدیث میں وحی کے پہلے جزء کا تذکرہ امام کے لئے کارآمد ہے جبکہ ذکر کردہ احادیث کا بڑا حصہ عنوان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا لیکن میری توجیہ جس میں وحی کو تمام متعلقات وحی پر حاوی کیا گیا ہے یہ اشکال نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ بدایت یہاں نہایت کے مقابل نہیں ہے کہ اولیں حصہ مراد لینے پر مجبور ہوں بلکہ بدایت کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز موجود نہیں تھی وہ کیسے رونما ہوگئی۔ اس کی دلیل میں قرآن سے پیش کرتا ہوں۔ قرآن میں ہے "کما بدأنا اول خلق نعیدہ" اس آیت میں بھی بدایت نہایت کے مقابل نہیں بلکہ معدوم کو موجود کردینے کا تذکرہ ہے۔ مزید تائید کے لئے کہ امام نے اس بدؤ کو دوسرے مقامات پر بھی عنوان میں ذکر کیا ہے مثلاً کیف کان بدء الاذان۔ کیف کان بدء الحیض۔ کیف کان بدء الخلق ان عنوانات میں لفظ بدءٌ کا انتخاب میری توجیہ کی تائید کرتا ہے۔"

راقم الحروف کہتا ہے کہ اکابر ثلثہ کی توجیہات ایک ہی مضمون سے متعلق پیشِ نظر ہیں یہ حقیر کسی ایک کو ترجیح دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اہلِ ذوق کسی برجستہ و برمحل توجیہ کا خود ہی تعین کریں گے۔

لاعلمی۔ عذر ہے یا نہیں ؟۔ اسلامی عبادات میں حج ایک اہم ترین عبادت ہے۔ لیکن عمر میں

ایک ہی بار فرضیت کی بنا پر مناسک حج کی ادائیگی میں عوام تو در کنار بیچارے پڑھے لکھے بھی اُلجھ جاتے ہیں۔ سالانہ عبادات میں مسائل و احکام سے ناواقفیت کی بنا پر عیدین میں جو کچھ غلطیاں پیش آتی ہیں اُن کا مشاہدہ تو عام ہے بلکہ وہ نماز جس سے سابقہ دن میں پانچ مرتبہ پڑتا ہے۔ اس کے عام آداب کی رعایت کچھ ہی خوش نصیب ہوں گے جو کر گزرتے ہیں۔ پھر جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حیاتِ مبارک میں سکون کے ساتھ حج کرنے کا موقعہ ایک ہی مرتبہ میسر آیا۔ ظاہر ہے کہ مناسک میں بھول چوک قطعاً متوقع تھی۔ بہرحال قصہ یہ پیش آیا جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں کہ حجۃ الوداع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں قیام پذیر تھے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے جانور کی قربانی سے پہلے ہی اپنی حجامت بنوالی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر اب حجامت کے بعد جانور ذبح کر رہے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اتنے میں ایک اور صاحب حاضر ہوئے اُن کا بیان تھا کہ میں نے رمی سے قبل قربانی کر لی۔ جواباً ارشاد ہوا کہ جاؤ رمی کر لو کوئی حرج نہیں بلکہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ یہ دن عجیب وغریب تھا جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کوئی اپنی بھول چوک

عہ مولانا غلام غوث ہزاروی صدر جمعیۃ العلمائے اسلام دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل علامہ کشمیری کے براہِ راست تلمیذ ہیں حسنِ اتفاق کہ جس سال اس بے بضاعت کو حج کی توفیق ہوئی۔ مولانا یوسف بنوری، مولانا مفتی محمود صاحب سابق وزیر اعظم صوبۂ سرحد اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی رفاقت ایامِ حج میں حاصل رہی۔ لطیفہ کی بات یہ ہے کہ بیچارے مولانا ہزاروی مناسکِ حج میں ایک موقعہ پر اُلجھ گئے۔ مولانا یوسف بنوریؒ اصلاح فرماتے وہ بار بار الجھتے۔ خوب یاد ہے کہ نتیجۃً تین دم اُن پر واجب ہوئے اور اس طرح کے مغالطے مناسک میں عامۃ الورود ہیں۔ گڑھنے والوں نے یہ لطیفہ امام اعظمؒ کے متعلق بھی تراش لیا کہ ایک حجام نے مناسک میں بوقتِ حجامت امام صاحب کو بار بار ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا سبحانك هذا بهتان عظيم۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

عہ اپنا یہ حج جس کا تذکرہ پہلے ہوا اسی میں یہ لطیفہ بھی پیش آیا کہ کچھ رفقاء نے جس میں براہِ راست مولانا یوسف صاحب بنوریؒ بھی شریک تھے منیٰ میں ایک صاحب کو قربانی کے لئے مامور کیا یہ منحر کی جانب چلے تو رفقاء نے حجامت کی تیاری شروع کر دی مولانا یوسف صاحب بنوری نے جو عالم و فاضل ہونے کے ساتھ بار ہا کے زائرِ حرم ہیں تنبیہ فرمائی کہ جب تک قربانی ہونے کی اطلاع نہ پہنچے اس وقت تک حجامت جائز نہیں حالانکہ یہ منظر بکثرت دیکھنے میں آرہا تھا کہ ہزاروں حجاج نے اپنے سر منڈ ڈالے تھے اور ابھی قربانی ہونے نہ پائی تھی۔

کا ذکر کرتا آپؐ کا ارشاد یہی تھا کہ "اب کر لو کوئی مضائقہ نہیں"۔ حالانکہ معلوم ہے کہ یوم نحر میں چار نُسک ضروری ہیں:۔ رمی۔ قربانی۔ سر کا منڈانا اور طواف۔ پہلے تین میں ترتیب ہے البتہ طواف میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے۔ چونکہ طواف ایک ایسی عبادت ہے جس کا عبادتی پہلو کبھی متروک نہیں ہوتا۔ پھر حج کی بھی متعدد اقسام ہیں:۔ افراد۔ قران و تمتع۔ مفرد پر قربانی واجب نہیں البتہ رمی و حلق اس پر واجب ہے پہلے اسے رمی کرنا ہوگی پھر قربانی۔ اور اگر قارن و متمتع ہو تو ذبح و حلق میں ترتیب رکھنا ہوگی۔ اسی واقعہ میں مسئلہ یہ بھی سامنے آیا کہ سائل کے سوال کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے تو کیا مفتی سواری کی صورت میں فتویٰ دے سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ فتویٰ دینے کے لئے اطمینان، سکونِ دماغ، اہلِ علم سے مشورہ بہتر ہے۔ چلتے پھرتے فتویٰ دینا احتیاط کے خلاف ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ اس باب سے اس وہم کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر علمی کام کے لئے سکون ضروری ہے بلکہ امام کا خیال یہ ہے اور اس باب و حدیث سے یہی بتانا چاہتے ہیں کہ فتویٰ سواری کی حالت میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ حافظ بدر عینی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مشغولیت میں بھی اہلِ علم سے مسائل دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن علامہ کشمیریؒ کا خیال ہے کہ امام بخاری اس حدیث کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جس میں سواری کی پیٹھ کو منبر بنانے کی ممانعت ہے۔ مصروف رفتار جانور کو اچانک روکنا اور باتوں میں مشغول ہونا جانور کے لئے اذیت دہ امر ہے اسی لئے اس سے روکا گیا۔ بہرحال یہ تو ذیلی بحث تھی اصل مسئلہ تو وہی چل رہا تھا کہ مناسکِ حج میں تقدیم و تاخیر کے سلسلہ میں بجوابِ سائل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ افعل ولا حرج،

امام طحاویؒ نے لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک یہ ہے کہ لاعلمی کی بنا پر تم سے یہ باتیں سرزد ہو گئیں اس لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔ گویا کہ نفی صرف گناہ کی ہے اس غلطی پر جزا بدستور باقی رہے گی۔ علامہ کشمیریؒ نے افعل ولا حرج کا ترجمہ "ذبح ہونے دو کچھ مضائقہ نہیں" کیا ہے ان کے خیال میں امر کا صیغہ یہاں اس فعل کو باقی رکھنے کے لئے ہے جو ہو رہا ہے جس کا حاصل گناہ ہی کی نفی ہوگی جزاء کی نفی نہیں ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت صحابۂ کرام کی لاعلمی کو عذر کا درجہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی ترتیب کے ترک پر کوئی تنبیہ نہیں فرمائی اگرچہ امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ عدمِ علم کی بنا پر ان افعال میں ترتیب کا سقوط نفی اثم کے ساتھ نفی جزاء بھی کرتا ہے لیکن وہ زمانہ شرعی قوانین کی تدوین

اور ان کو مناسب مواقع میں ترتیب دینے کا تھا ایسے دور میں بہت سی خامیاں برداشت کرلی جاتی ہیں اور جب قوانین مدون ہو چکے ہوتے ہیں تو ان لغزشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ کشمیری کے خیال میں امام احمد کی رائے کے مطابق رفع اثم ورفع جزاء اس مذکورہ مصلحت کے پیش نظر بھی ہوسکتی ہے۔ مگر علامہ کی حقیقی رائے یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لاعلمی صرف گناہ کو ختم کرنے کا سبب بن سکتی ہے جزاء کو ختم کرنے میں مؤثر نہیں۔ اپنی اس رائے پر بطور تائید امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی پیش فرمایا کہ غزالیؒ نے خبر واحد کو بعہد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قطعی بلکہ قطعی چیزوں کے لئے ناسخ قرار دیا ہے چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیقات کی راہیں کشادہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ "تحویل قبلہ" کے بارے میں خبر واحد پر اس دور میں اعتماد کرلیا گیا۔ آپؐ کی وفات کے بعد خبر واحد ظنی رہے گی۔ چونکہ اب آپؐ سے براہ راست تحقیقات کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ امام غزالیؒ کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی حیات و وفات کے مختلف ادوار میں مسائل میں خفت و شدت کا امکان ہے اسی لئے میں عمرو بن العاص کی اس روایت میں نفی اثم و نفی جزاء دونوں کا امکان تسلیم کرتا ہوں یہ صورت اگر اب پیش آئے تو لاعلمی کی وجہ سے گناہ تو نہیں ہوگا مگر جزاء یقیناً مرتب ہوگی۔ اس توجیہ سے انشاء اللہ حدیث نبویؐ میں کوئی غیر ضروری تاویل بھی نہیں کرنا ہوگی۔

بحث تحویل قبلہ:۔ قرآن مجید کی مشہور آیت وما کان اللہ لیضیع ایمانکم کا شان نزول مفسرین اور محدثین نے یہی بتایا ہے کہ ابتدائے اسلام میں بیت المقدس مسلمانوں کے لئے بھی قبلہ تھا۔ تحویل قبلہ کے بعد بجائے بیت المقدس کے بیت اللہ بطور قبلہ متعین ہوا تو قدرتی طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں اپنی ان نمازوں کے بارے میں تردد پیدا ہوا جو بیت المقدس کو قبلہ بنا کر ادا کی گئی تھیں کہ آیا وہ قبول ہیں یا محنت اکارت گئی؟ بخاری علیہ الرحمہ نے ایک خاص عنوان کے تحت اس خلجان وازالۂ خلجان کی پوری تفصیل حدیث ہی کی روشنی میں پیش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہنوں میں یہ خلجان کیوں پیدا ہوا جبکہ منسوخ پر عمل ناسخ سے پہلے قطعاً جائز ہے۔ علامہ کشمیری علیہ الرحمہ نے اس اشکال کا جواب ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تصریحات کے تحت یہ فرمایا کہ

> "اسلام میں یہ سب سے پہلا نسخ تھا اس لئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اُن تفصیلات سے آشنا نہیں تھے جو نسخ سے متعلق ہیں۔"

دوسری الجھن یہ ہے کہ بخاری الامام رحمہ اللہ نے "یعنی صلاتکم عند البیت" کا ترجمۃ الباب میں اضافہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ تحویلِ قبلہ کے بعد ان نمازوں میں بھی متردد تھے جو بجانبِ کعبہ رُخ کر کے پڑھی گئی تھیں حالانکہ ان حضرات کو تو اس بارے میں کوئی تردد نہیں تھا خلجان تھا تو صرف بیت المقدس کی جانب پڑھی ہوئی نمازوں میں۔ اس الجھن کو مزید تقویت اس روایت سے بھی پہونچی جو سُننِ نسائی میں ہے۔ جس میں حدیث ہی میں "صلوتکم الی بیت المقدس" کا اضافہ ہے۔ ممکن تھا کہ اسے کتابت کی غلطی قرار دے کر بخاری علیہ الرحمہ کی رفعتِ علم کو ایک ناپسندیدہ ٹھیس سے بچایا جائے۔ لیکن کتابت کی غلطی کہاں تک کہیے" گا جبکہ بخاری شریف کے تمام مطبوعہ نسخوں میں جو وقتاً فوقتاً طبع ہوتے رہے "صلوتکم عند البیت" موجود ہے۔ شارحین نے ایک جواب تو یہ دیا کہ امام بخاری کی مراد "بیت" سے بیت المقدس" ہے اور عند الیٰ کے معنی میں ہے جس کے بعد یہ عبارت ہوگی۔ "الی بیت المقدس" شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ جواب قابلِ قبول نہیں۔ یہ اس لئے کہ عام طور پر بیت سے بیت اللہ مراد ہے نہ کہ بیت المقدس۔ امام نوویؒ شارح مسلم نے فرمایا کہ مراد وہ نمازیں ہیں جو مکہ میں پڑھی گئیں اور رُخ کعبہ کی جانب تھا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب پہلے جواب سے بھی زیادہ مفلوج ہے۔ شبہ ان نمازوں کے بارے میں ہے جو مدینہ میں پڑھی گئی تھیں مکہ معظمہ کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں۔ حافظ ابن حجر نے ایک طویل بحث و نظر کے تحت اس اشکال کو حل کرتے ہوئے بتایا کہ بخاری اس مبحث میں بعض اہم حقائق کی جانب لطیف اشارے کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں کس جانب رُخ کر کے نماز ادا فرماتے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رُخ تو بجانب بیت المقدس ہوتا لیکن اس دور میں بھی یہ احتیاط ملحوظِ خاطر تھی کہ آپ خانۂ کعبہ کی جانب پشت نہ فرماتے جبکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ آپ بیت المقدس کی جانب رُخ فرماتے اور خانۂ کعبہ کے بارے میں کوئی خاص اہتمام نہ ہوتا۔ لیکن بعض کے خیال میں آپ کعبہ ہی کی جانب رُخ فرماتے جب مدینہ تشریف لائے تو بیت المقدس کی جانب رُخ فرمایا۔ یہ آخری تحقیق بہت ہی ضعیف ہے۔ اسکے نتیجہ میں دو بار نسخ ماننا پڑے گا۔ امام بخاریؒ نے اپنی رائے دیتے ہوئے بیت المقدس کے اضافے سے متعین فرمایا ہے کہ مکہ میں رہتے ہوئے آپکی نمازیں بیت المقدس کی جانب ہوتیں اور یہی وجہ ہے کہ امام نے صرف عند البیت کا اضافہ کیا جس سے وہ اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی

وہ نمازیں بھی حالِ اجر ہیں جو جوارِ کعبہ میں رہنے کے باوجود بجانب بیت المقدس پڑھی گئیں تو وہ نمازیں بالیقین صحیح ہوں گی جو دوسرے دیار میں کعبہ کو قبلہ بنا کر ادا کی جائیں۔ علامہ کشمیریؒ نے اس توجیہ کو قبول کرتے ہوئے اتنا اضافہ اپنی جانب سے فرمایا کہ "عندُ زمانیہ" ہے نہ کہ "مکانیہ"۔ اس اضافے کے بعد مطلب یہ ہوگا کہ خدائے تعالےٰ تمہاری اُن نمازوں کو بھی اکارت نہیں کرے گا جو تم نے اس زمانہ میں پڑھیں جبکہ تم جوارِ کعبہ میں تھے اور بیت المقدس کی جانب رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے۔

یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ بیت المقدس کو جو قبلہ بنایا گیا تھا وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد[ع] تھا یا یہ فیصلہ وحی کی روشنی میں کیا گیا تھا۔ حافظ ابن قیمؒ نے "ھدایۃ الحیارۃ" میں لکھا ہے کہ مکہ اور بیت المقدس دونوں سابق سے قبلے چلے آتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعین کردہ تھے۔ حالانکہ بعض علماء کی رائے میں بیت المقدس کبھی قبلہ نہیں رہا بلکہ یہود کو حکم تھا کہ تابوت سامنے رکھیں اور اسی کی جانب رُخ کرکے نماز پڑھیں مگر یہود نے اپنی فطری کج روی کی

[ع] انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجتہاد پر حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے گرانقدر افادات درج ذیل ہیں فرمایا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جملہ امور میں وحی کے منتظر رہتے ہیں۔ انتظار کے باوجود جب وحی نہیں آتی اور کسی فیصلہ پر پہونچنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ پھر اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ اس اجتہاد میں خدانخواستہ کوئی غلطی واقع ہو تو منجانب اللہ اس کے ازالہ کی صورت پیدا کر دی جاتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انبیاء اپنی اجتہادی غلطی پر موت تک قائم رہیں۔ میرے نزدیک آیتِ ربانی وما ارسلنا من رسول ولا نبی الا اذا تمنیٰ القی الشیطان فی امنیتہ کا یہی مطلب ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے تحت جو واقعات درج کئے ہیں صحیح نہیں۔ اسی طرح ابراہیمؑ کا ارشاد "ھذا ربی" کا بھی یہی مطلب سمجھتا ہوں کہ ابراہیم خارجی کسی مشاہدے کی بنا پر یہ سب کچھ نہیں فرما رہے تھے بلکہ ان کی فکر و رائے میں بمراحل جو تبدیلیاں ہوئیں یہ اسی کی داستان ہے۔ سمجھ لیا گیا یہ کہ ابراہیمؑ مختلف چیزوں کو خدا قرار دیتے ہوئے الٰہِ حقیقی تک پہونچے۔ کس قدر غلط ہے یہ بات۔ حالانکہ وہ اجتہاد فرما رہے تھے۔ اجتہاد بر اجتہاد۔ پھر اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ فنا پذیر اشیاء جن کے ساتھ طلوع و غروب لگا ہوا ہے وہ کیسے خدا ہو سکتی ہے۔

جیسے ہی یہ نکتہ ان پر واضح ہوا تو ایک مومن کے انداز میں ان کی فکر و نظر "حقیقتِ ثابتہ" کے اعلان کے ساتھ تیار ہو گئی۔

یہی وجہ ہے کہ تینؔ بار ھذا ربی کا قرآن نے ذکر کیا اس نکتہ کو فراموش نہ کیا جائے کہ ھذا ربی سے جو بظاہر مفہوم ہوتا ہے یعنی غیر خدا کو خدا قرار دینا عیاذاً باللہ انبیاء علیہم السلام سے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ممکن نہیں۔

بناپر ازخود بیت المقدس کو قبلہ بنا لیا جس کی وجہ یہ پیش آئی کہ بیت المقدس کی تعمیر کے بعد سلیمان علیہ السلام نے اس تابوت کو وہیں منتقل کر دیا تھا۔ یہود اس سے یہ سمجھے کہ بیت المقدس قبلہ بن گیا حالانکہ وہ قبلہ نہیں تھا۔ علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میری تحقیقات دوسری ہیں۔ وہ یہ کہ :-

"قربانی اسحاق عہ اور اسماعیل دونوں بھائیوں کی کی گئی ہے۔ حضرت اسحاق کی جوارِ بیت المقدس میں اس لئے بیت المقدس یہود کا قبلہ بنا اور حضرت اسماعیل کی جوارِ کعبہ ہیں۔ اس لئے یہ اولادِ اسماعیل کا قبلہ ہوا۔ توریت میں موجود ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے بیت المقدس میں ایک لکڑی گاڑ کر اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ جب شام فتح ہوجائے تو تم اسی کو قبلہ بنانا۔ خود یعقوب علیہ السلام کو تعینِ قبلہ کے سلسلہ میں یہ ہدایت ان کے آباء واجداد سے پہونچی تھی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قبلے دو ہیں اور بلاد کی تقسیم کے مطابق ہیں۔ بیت اللہ اولادِ اسماعیل کے لئے جو اس دیار کے باشندے ہیں اور بیت المقدس وہاں والوں کے لئے۔ حضرت اسماعیل کا سلسلہ بیت اللہ کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتا ہے اور سلسلہ اسحاق علیہ السلام بیت المقدس کی جانب۔ تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہتے ہوئے بجانب کعبہ رُخ فرماتے کہ یہی اس شہر اور یہاں کی نسل کا قبلہ تھا۔ ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ منتقل ہوئے تو آپؐ نے اس شہر کا جو قبلہ تھا اسی کو اپنا قبلہ بنا لیا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر دو قبلوں کی تقسیم بلاد و دیار کے اختلاف پر مبنی ہے اس لئے

عہ قربانی کے لئے کس کو پیش کیا گیا اسماعیل علیہ السلام کو یا اسحاق علیہ السلام کو؟ اہلِ کتاب اس فضیلت کو حضرتِ اسحاق علیہ السلام کے لئے مخصوص کرنے پر مصر ہیں جبکہ مسلمان حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے لئے اس امتیاز کو مختص کرتے ہیں۔
مولانا حمید الدین فراہی نے اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ علامہ کشمیریؒ کی یہ تحقیق اس اختلافی مبحث میں انشاء اللہ شافی ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ بیت اللہ قبلہ تھا پھر بیت المقدس ہو گیا اور اسی طرح یہ
بھی صحیح نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں کسی اجتہاد سے کام
لیا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اولادِ اسماعیل میں ہونے کی بنا
پر بیت اللہ کی تعیین بحیثیت قبلہ سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ میری اس تفصیل
کے بعد نسخ کے تکرار کا جھگڑا ختم ہو گیا۔"

لیلۃ المعراج اور خدا تعالیٰ کی رؤیت:۔ قرآن و حدیث کی یہ عجیب خصوصیت ہے
کہ ان کے بعض بیانات مبہم اور بعض تعبیرات متعدد معانی پر محمول ہونے کے امکانات لئے ہوئے
ہوتی ہیں۔ ایسی تعبیرات میں اوّلاً خواص اُلجھتے ہیں اور پھر یہ علمی بحثیں عوام تک پہونچ جاتی ہیں۔
حالانکہ بات صاف ہے کہ خدا تعالیٰ نے خود ہی قرآن کو محکمات متشابہات میں تقسیم کرتے ہوئے
بنیادی حیثیت محکمات کو دی اور متشابہات کی حقیقت دریافت کرنے اور اس کا سراغ لگانے
کی کوششوں سے بھی روک دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ جہاں تک ایمانیات کا تعلق ہے قرآن و
حدیث کسی گوشہ کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑتے اور جن امور کے لئے انسان مکلف نہیں اور نہ
ان پر ایمان و کفر کا مدار، انہیں میں ابہام و ایہام اختیار کیا جاتا ہے۔ کیا جناب رسولِ اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں خدا تعالیٰ کی رؤیت ہوئی یا نہیں؟ ایک حدیث کے مختصر ٹکڑے نے اس
مسئلہ کے انفصال میں ضیق پیدا کر دی۔ وہی مشہور حدیث "نُورٌ انّی اراہ" یا "انی اراہ" پھر
عدمِ رؤیت پر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتفاق اس مسئلہ
کو اور بھی اختلافی کشمکش میں پہونچانے کا موجب بنا۔ اگرچہ امت کا کثیر طبقہ رؤیت پر متفق ہے۔
اس مبحث میں حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات انشاء اللہ شفا بخش ہوں گے۔ آپ نے بخاری
شریف کی مشہور حدیث جس میں وحی کی کیفیات زیرِ گفتگو آئی ہیں اسی پر کلام کرتے ہوئے
ارشاد فرمایا کہ

"حقیقت یہ ہے کہ وحی اور اس کی حقیقت پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ شیخ اکبر
نے فتوحات میں لکھا ہے کہ جو چیز تم کو خود حاصل نہ ہو سکے تم اس کی دریافت
حقیقت سے بھی عاجز ہو۔ یہی شیخ اکبر لکھتے ہیں کہ میں ایک بار اولیاء اللہ کے
مقدس طائفہ میں پہونچا تو وہ مقامِ موسیٰ میں گفتگو کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے
کہ آپ بھی اپنی رائے دیں؟ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں گفتگو نہیں کر سکتا

چونکہ میں مقامِ موسیٰ پر نہیں پہونچا۔ غالباً وجہ یہی ہے کہ سلف نے وحی کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ارشاد فرمایا وحی کا مطلب ہے دل پر کسی چیز کا ڈال دینا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی وحی کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ ہمارے دل میں بھی کچھ چیزیں ڈالدی جاتی ہیں تو کیا وہ وحی کہلائیں گی ؟ عام طور پر وحی کی تین قسمیں ہیں :- (۱) جسپر وحی کی جاتی ہے اس کے باطن کو کلیتہً عالم قدس کی جانب متوجہ کرلیا جاتا ہے اور پھر وحی کا القاء ہوتا ہے یہ سب کچھ فرشتے کے واسطے کے بغیر ہوتا ہے۔ (۲) جس پر وحی کی جاتی ہے اس کے حواس بدستور کام کرتے ہیں۔ وہ خدا تعالےٰ کی آواز سنتا ہے۔ یہ آواز مخلوق کی آواز سے قطعاً ممتاز ہوتی ہے اور ان تمام اسالیب سے جدا جو مخلوق کی آوازیں ہوتے ہیں حضرت مجددؒ نے اسی قسم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ جزو کل، زمانی وغیر زمانی کی تقسیم میں بھی نہیں آسکتی (۳) فرشتہ آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں کہ وہ نبی کے باطن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے یا کسی انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے جیسا کہ مریمؑ کے واقعہ میں ہے فتمثل لھا بشراً سویا۔ رہ گئی یہ بحث کہ لیلۃ المعراج میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیۃ وکلام۔ دونوں نصیب ہوئے یا رؤیۃ تھی بغیر کلام۔ اور کلام ورائے حجاب سے ہوا ؛ اگر یہ کہا جائے کہ رؤیت وکلام دونوں ایک ساتھ ہوئے تو پھر یہ بھی کہنا ہوگا کہ رؤیت بھی داخلِ حجاب ہی تھی۔ ابو موسیٰ اشعری کی حدیث کہ خدا تعالےٰ کا حجاب نور ہے اگر یہ پردہ درمیان سے اٹھا دیا جائے تو جمالِ حقیقی کی شعاعیں اس حد تک مخلوق کو خاکستر کر ڈالیں گی جہاں تک وہ پہونچیں۔ معلوم ہوا کہ حجابِ نور اٹھایا ہی نہیں جاتا اس لئے رؤیت حجاب میں ہوگی اور وہ حجاب نور ہی ہے۔ مسلم کی حدیث نورٌ انّیٰ اراہ اس کی تائید بھی کرتی ہے چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رؤیت کی نفی نہیں فرمارہے ہیں بلکہ نور کا ابتداء میں لفظ استعمال فرماکر ذاتِ خدا کی کنہ، اس کا احاطہ، اس کی حقیقت کی دریافت سے اپنا عجز ظاہر فرمارہے ہیں اسلئے کہ نور جب کامل ہوگا تو بلا شبہ اس کا ادراک ممکن نہیں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ رؤیت ضرور ہوئی لیکن ایسی ہی رؤیت جو

خدا تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ اپنی نظروں کو خدا تعالیٰ کے وجہ منیر پر مرکوز کر سکے۔ ان کی کبریائی و ہیبت اس سے مانع ہے۔ خود بھی آپ دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ پر جلال شخصیتوں کو ہم صرف گوشۂ نظر ہی سے دیکھ پاتے ہیں انہیں مرکزِ نظر بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رؤیت کے بارے میں سوالات پر قطعی جواب احتیاط کے خلاف سمجھ رہے ہیں (کبھی آپ انکار کرتے ہیں کبھی اقرار، اس کی توجیہ بجز اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ رؤیت ہے بھی (جس کا اقرار ہے) اور ایسی رؤیت بھی نہیں جو منظورِ نظر کو کماحقہ کھول دے (اسی کا انکار ہے) اس کی نظیر خود قرآن مجید میں ہے "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" آیت میں نفی بھی ہے اور اثبات بھی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ معاملات ربانی کے اجمال کی تفصیل الفاظ سے ممکن بھی نہیں اس لئے اثبات و نفی میں تضاد کو ثابت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ میری گذارشات سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں نفی بھی صحیح ہے اور اثبات بھی درست۔ اور اس حدیث نے آپ کے لئے انکار کا بھی دروازہ کھول دیا اور اثبات کی راہ بھی کشادہ ہے۔ چاہے تو اس رؤیت کا انکار کیجئے جو حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ ہوا اور چاہے تو اس رؤیت کا اقرار کیجئے جس میں حقیقت کی دریافت نہیں ہوتی بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں "نور" کا استعمال قرآن سے بھی مؤید ہے چنانچہ فرمایا گیا "اللہ نور السموات والارض۔"

رہ گئی وہ حدیث جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "رأیت نوراً" (میں نے نور دیکھا) تو اس کے بھی دو ہی محل ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے نور دیکھا لیکن ذاتِ خدا نہیں دیکھی ان کا نور ان کی ذات کی رؤیت سے مانع بنا ہوا تھا دوسرا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ میں نے ایک منوّر ذات کو دیکھا۔

عام علماء ان دونوں احتمالات میں تقابل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں تقابل نہیں۔ میرا یقین ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رؤیتِ رب سے مشرف ہوئے ہیں اور آپؐ پر یہ خدا تعالیٰ کا خصوصی فضل و رحمت تھی۔ احمد بن حنبل رح نے تو فرمایا ہے کہ مکرر رؤیت ہوئی اور یہ رؤیت ایسی تھی جیسا کہ ایک

طالب کی مطلوب پر یا بندے کی اپنے آقا پر کہ عاشق محبوب کے دیکھنے سے محروم بھی نہیں رہتا لیکن جمالِ محبوب اسے مسلسل دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتا، میرے نزدیک "ما زاغ البصر و ما طغیٰ" کا یہی مطلب ہے۔ زیغ کا مطلب یہ ہے کہ جمالِ حبیب سے نظریں چرائی جائیں اور دل بھر کر نہ دیکھا جائے اور طغیان کی مراد یہ ہے کہ محبوب کے دیکھنے میں اس حد تک تجاوز ہو جس سے سوئے ادبی کا ارتکاب ہو۔ حضرتِ حق جل مجدہٗ نے اس آیت میں جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رؤیت اور اس میں حدودِ ادب کی رعایت بھرپور ثابت کی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ اس رؤیت کی کیا حقیقت تھی؟ تو یاد رکھئے کہ الفاظ و معانی کی جامعیت یا ان کا حُسن و جمال، اس رؤیت کی حقیقت و تفصیل ماہیت و کیفیت کو بیان کرنے سے درماندہ و عاجز ہے۔"

ان تفصیل سے واضح ہے کہ "علامہ کشمیری" لیلۃ المعراج میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالیٰ کی رؤیت کو ثابت مانتے ہیں۔ یہ اقتباس اگرچہ طویل تر ہو گیا لیکن مسئلہ اپنی اہمیت اور عمومی شہرت کی بنا پر اس کا مستحق تھا کہ اردو داں طبقہ کو بھی ان گرانقدر تحقیقات سے آشنا و آگاہ کیا جائے۔

اسی طرح یہ بھی ایک اختلاف چلا آتا ہے کہ کیا معراج آپ کا واقعتہً جسمانی سفر بحالتِ بیداری تھا یا کوئی حیرت انگیز خواب تھا جس کی تفصیلات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی ہیں۔ امت کا عام طبقہ اسی کا قائل ہے کہ یہ خواب نہ تھا بلکہ واقعی ایک سفر تھا۔ خواب کہنے والوں کو اہلِ علم ہمیشہ شافی جواب دیتے رہے۔ اس بحث میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقات خاصہ کی چیزیں ہیں۔ فرمایا کہ

"انبیاء علیہم السلام بیداری میں وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو عوام خواب میں دیکھتے ہیں۔ اسکو اسطرح سمجھئے کہ حضراتِ اولیاء بحالتِ کشف اشیاء کو بچشمِ سر دیکھتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم نہیں دیکھ پاتے ایسے ہی انبیاء غیب کی چیزوں کو بحالتِ بیداری، کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں اور کیونکہ یہ چیزیں ہمارے لئے محسوس و مرئی نہیں تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمارے فہم سے قریب تر کرنے کے لئے اپنے ان مشاہدات کو خواب سے تعبیر کر دیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ ہماری اور

ان کی رؤیت بالترتیب بیداری ومنامی میں یکساں نتائج پر پہونچتی ہیں تو اس کی تعبیر خواب سے بھی ہوسکتی ہے اور رؤیت سے بھی۔ میں ایک زمانہ سے یہی رائے رکھتا تھا پھر دیکھا کہ بعینہ یہی بات علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "تنویر الحوالک" میں لکھی ہے اس توارد پر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔

الحاصل کہ یہ ایسی کیفیات ہیں جنھیں الفاظ میں اس طرح نہیں ڈھالا جاسکتا کہ وہ حقیقی تفصیلات کا ایک صحیح مرقع ہوں مشہور حدیث تنام عینای ولا ینام قلبی کی تشریح میں بھی میں سب سے جدا اسی طرح کی رائے رکھتا ہوں۔

انبیاء اور اُن کے خواب:۔ غلام احمد قادیانی نے اپنے بعض خواب بیان کئے اور یہ اعلان بھی کیا کہ یہ رؤیائے صادقہ ہیں جن کی تعبیر عنقریب سامنے آئے گی۔ خدا تعالےٰ نے اس اشقی الناس کو خائب وخاسر کرنے کے لئے اُن خواب کی تعبیر پوری نہ ہونے دی۔ یہ مدعی نبوت باطلہ بجائے اسکے کہ شرمندہ وشرمسار ہوتا دیدہ دلیری سے بولا۔ کہ اگر میرے خواب غلط ہوئے تو کونسا زلزلہ آگیا؟ انبیائے سابقین کے بھی خواب غلط ہوتے رہے۔ العیاذ باللہ۔ بلکہ اس شخص نے جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بعض رؤیا کا تذکرہ کیا کہ ان کی تعبیر کبھی سامنے نہیں آئی۔ علامہ کشمیریؒ جو اس فتنۂ عیار کی سرکوبی میں یدطولےٰ رکھتے۔ آپ نے قادیانی کے ان خرافات پر احتساب کرتے ہوئے خواب کی حقیقت اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے رؤیائے صادقہ کی کیفیت پر مفصل کلام فرمایا۔ ارشاد ہے کہ

> زمانۂ دراز سے میری رائے تھی کہ خواب کو نہ نیند ہی کہا جاسکتا ہے اور نہ بیداری، بلکہ یہ ایک درمیانی کیفیت ہے اسی لئے اس کا تسلسل باقی رہتا ہے اور اسے نیند کا غلبۂ شدید ختم کرتا ہے یا بیداری۔ ایک زمانہ کے بعد فرید وجدی کی "دائرۃ المعارف" میں دانشورانِ یورپ کی خواب سے متعلق بعینہ یہی تحقیق میری نظر سے گذری۔ پھر یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بلاشبہ "وحی" ہوتے ہیں البتہ تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ان کے خواب وحی نہ ہوتے تو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کی بنا پر نورِ نظر کو ذبح کرنے کے لئے کیوں تیار ہوتے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام بھی اپنے خواب کو وحی سمجھتے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ کفار اپنی

اولاد کی ہمیشہ قربانی پیش کرتے رہے اور اسے تقربِ الٰہی کا ذریعہ گردانتے۔ لیکن کسی آسمانی دین میں اولاد کی قربانی کا جواز کبھی نہیں رہا۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے لئے بھی بیٹے کی قربانی مقصود نہ تھی بلکہ وہ ایک آزمائش تھی مگر انھوں نے جب اپنے خواب کو اس کے ظاہر پہ رکھنا چاہا تو حضرتِ حق کی طرف سے اعلان تھا "و نادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا۔" اور اس کے بعد دنبہ کی قربانی اسماعیلؑ کے عوض پیش کی گئی یہ اس لئے کہ جو وحی بذریعہ خواب ہوتی ہے اس کا انداز اس وحی سے بدلا ہوا ہوتا ہے جو صراحتہً ہو۔ خواب والی وحی میں اگر صاحبِ خواب معمولی سی بھی تعمیل کرے تو وحی کا تقاضا پورا ہو گیا، ایسا نہیں جیسا کہ شیخ محی الدین بن عربی کی رائے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہی نہیں تھا بلکہ انکو دنبہ کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن ابراہیم علیہ السلام نے خود عمل میں اپنے لئے تشدد پسند کیا اور خواب کو ظاہر سے ہٹانے کے بجائے اس کے ظاہر ہی پر عمل پیرا ہو گئے تو خدا تعالےٰ نے ان کو متنبہ کیا کہ بیٹے کی قربانی کرانا مقصود نہیں بلکہ بھیڑ کی قربانی دو۔ شیخ اکبر نے اسی وجہ سے "قد صدقت الرؤیا۔" کا مطلب بھی بدل لیا اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اے ابراہیم تم خواب کے ظاہر پر عمل کر رہے ہو حالانکہ ہم تمہارے نورِ نظر کی قربانی تم سے نہیں چاہتے بلکہ بھیڑ کی قربانی مقصود ہے۔" شیخ اکبر کی یہ توجیہات صحیح نہیں ہیں کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معاملات کے فہم میں اولیاء اللہ سے بھی پیچھے ہیں؟ کہ شیخ اکبر تو حقیقت تک پہونچ رہے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام دریافت حقیقت سے قاصر رہے۔ نیز میں واضح کر چکا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو اپنے خواب میں تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے جیسا کہ قرآن ہی کے بیان کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اپنے خواب کی اپنے والد سے تعبیر دریافت کرنا پڑی اور اسی طرح جنابِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے مقام سے متعلق خواب دیکھا آپؐ یہ سمجھے کہ شاید "یمامہ" کی جانب ہجرت کا حکم ہے حالانکہ ہجرت بجانب "مدینہ" مقدر تھی۔ اسی طرح

آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ میں نے اپنی تلوار کو جنبش دی تو وہ ٹوٹ گئی پھر اسے دوسری بار حرکت دی تو پہلے سے زیادہ بہتر ہو گئی۔ اس خواب کی تعبیر مسلمانوں کو اوّلاً شکست پھر فتحمندی تھی۔ نیز مدعیانِ نبوت کے بارے میں آپؐ نے خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہیں۔ اس کی تعبیر آپؐ ہی نے بعض باطل پرستوں کی جانب سے دعوائے نبوت لی۔ بہرحال انبیاء کے خواب صادق ہوتے ہیں اگرچہ تعبیرات کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ بھی ہے کہ عام مومنین کے خواب ہمیشہ صادق نہیں ہوتے۔ رہ گیا "شقیٔ قادیان" سو اس کی نبوت ایک دجّالی کرشمہ کاری ہے وہ کیا اور اس کے خواب کیا؟ جس کی تردید کے لئے بلا وجہ دماغ سوزی کی جائے۔ یہ بھی عرض کروں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ابتداء میں خواب اس لئے دکھاتے جاتے ہیں کہ قریبی مدت میں بحالتِ بیداری اُن سے خطاب کا آغاز ہونے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چٹانیں سلام کرتیں یا تعمیرِ کعبہ کے وقت آپؐ نے ایک آواز سنی کہ "محمد اپنے تہبند کو مضبوط باندھ لو" میرے نزدیک یہ فرشتے کی آواز تھی۔ ان تمہیدات کا مقصد انبیاء علیہم السلام کو عالمِ روحانیت وعالمِ غیب سے قریب تر کرنا ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالے عنہا نے آپؐ کے خواب کو صبح کے اجالے سے تشبیہ دی ہے یہ تشبیہ لطیف ہے اسلئے کہ آفتابِ نبوت کی ابتدا خوابوں کی شعاعوں سے ہے۔ پھر شعاعوں کے بعد خود وجودِ آفتاب تو جس کا باطن نور سے لبریز ہوتا ہے وہ نبی صادق پر ایمان لاتا ہے سب پر سابق ہوتا ہے جیسا کہ ابوبکر الصدیق۔ اور جس کا باطن سراپا ظلمت ہوتا ہے تو وہ تکذیب کرتا ہے جس کی مثال ابوجہل المکذب ہے۔ باقی تمام انسان یا روشِ ابی بکرؓ پر گامزن ہوتے ہیں یا ابوجہل کی طرح کفر و انکار کی تیرہ و تار وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔"

میں کہہ سکتا ہوں کہ جنابِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اوّلاً شرفِ وحی حاصل ہوا اور آپ کی خصوصیات وامتیازات کی تکمیل رؤیتِ خدا تعالےٰ تھی اور یہ رؤیت یقیناً بچشمِ سر تھی یہی وجہ ہے کہ سورۂ "والنجم" میں جب مضمونِ رؤیت پر خدا تعالےٰ کلام فرما رہے ہیں

تو اس مضمون کو بے پناہ مؤکد فرمایا اور حق کیونکہ ایک طے شدہ بات تھی اور عام انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی ہوتی رہتی ہے۔ اسکے بیان و اثبات میں وہ زورِ کلام اختیار نہیں کیا گیا۔ اسکو بالکل ایسا سمجھیے جیسا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام طور پر پہلے اُن سے خطاب ہوا اور پھر رؤیت۔ لیکن وہ دیکھ نہیں سکے اور اس سے پہلے ہی ان پر غشی طاری ہوگئی جبکہ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائے تعالےٰ کو دیکھا اور آپؐ پر غشی طاری نہیں ہوئی بلکہ آپ سجدہ ریز ہوگئے جو اس وقت کے مناسبِ حال ہے اور یہ لطیفہ بھی فراموش نہ کیجئے کہ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف آوری کی زحمت رؤیت ہی کے لئے دی گئی تھی اسلئے نفسِ رؤیت پر زور دینے کے بجائے ان شبہات کو قطع و برید کیا گیا اور اس پر زور انداز میں جو رؤیت کے وقوع میں ہو سکتے تھے چنانچہ قرآن نے اس موقعہ پر ضلال، غوایۃ، از خود کلام زیغ، طغیان کی نفی کرتے ہوئے علم کا ثبوت، معلم کی ذاتی خصوصیات، معلم و متعلم کے درمیان انبساط، رؤیتِ قلبی و عینی کا ثبوت۔ اور اس مضمون کا اعلان جو چشمہائے مبارک دیکھ رہی تھی قلب ان کی تصدیق میں مصروف تھا۔ یہ سب اندازِ بیان، تاکید در تاکید، سوائے اثباتِ رؤیت کے اور کس مقصد کے لئے ہے۔ پھر کیسے رؤیت کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ فبای حدیث بعدہٗ یؤمنون، ومن لم یجعل لہ نوراً فما لہ من نور۔"

حرا کی خلوت گاہ:۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے غارِ حرا میں تشریف لیجاتے اور تخلیہ میں وقت گذارتے۔ علامہ مرحوم نے فرمایا کہ

> "صوفیاء کی خلوت نشینی اور فقہاء کا اعتکاف یکساں ہیں۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کا بیشتر وقت حرا ہی میں گذارتے اور حرا کو آپؐ نے بطورِ خلوت گاہ اس لئے انتخاب فرمایا تھا کہ وہاں سے خانۂ کعبہ کا دیدار و زیارت جو مرکزِ تجلیاتِ ربّانی ہے، ہو جاتا تھا۔ ممکن ہے اسطرح آپ کی اس خلوت نشینی میں خلوت بھی تھی عبادت بھی تھی اور خانۂ کعبہ کی زیارت بھی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے دادا عبد المطلب بھی کبھی کبھی آپؐ کے ساتھ خلوت نشین ہوتے عبد المطلب ملتِ حنفیہ پر تھے اور ان کے بعض ایسے کلمات موجود تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے بھی قائل تھے۔"

ایمان و کفر :- یہ مسئلہ طویل الذیل ہے اور شاخ در شاخ ہونے کی بنا پر حدیث کے مہماتِ مسائل میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر مفصل گفتگو فرماتے آپ کی املائی تقریر "فیض الباری" میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔ اردو داں حلقہ کے لئے "ترجمان السنۃ" مطبوعہ "ندوۃ المصنفین" قابلِ مراجعت ہے۔ مؤلف مولانا بدر عالم میرٹھی نے حضرت شاہ صاحب کے افادات کو اردو میں برنگِ سہلِ ممتنع پیش فرمایا ہے اسلئے راقم السطور اس علمی و تحقیقی بحث سے حضرت شاہ صاحب کے خاص خاص افادات نظرِ قارئین کرتا ہے۔

کیا ایمان و عمل قیامت میں متشکل ہو کر مؤمن اور صاحبِ عمل کے سامنے آئیں گے ؟

فرمایا:- "میں نے اپنی عمرِ عزیز کا کافی وقت یہ معلوم کرنے میں صرف کیا کہ ایمان محشر میں متشکل ہوگا یا نہیں لیکن اس تلاش و جستجو کے بعد کوئی شافی بات ہاتھ نہ لگ سکی۔ البتہ اعمال بالیقین مناسب شکلیں اختیار کریں گے۔ اعمال کے تشکل کے سلسلہ میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے بلکہ اعراض جواہر کی شکل اختیار کریں گے عہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان عمل سے ایک جدا چیز ہے اعمال کو ایمان نہیں کہا جا سکتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مُلئت ایماناً وحکمۃً" کہ مجھے ایک خاص موقعہ پر ایمان و حکمت سے لبریز کر دیا گیا۔ تو جس چیز سے آپؐ کا سینۂ مبارک پُر کیا گیا تھا وہ ایمان تھا جس کے ثمرات اعمال ہیں۔ جب کہ حکمت کو عمل قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک مرسل روایت میں "ایمان واسلام" کے بھی متشکل ہونے کا تذکرہ ہے اُن کی روایت میں ہے کہ

عہ ان دقیق مسائل کو موجودہ سائنسی تحقیقات و اکتشافات کے نتیجہ میں سمجھنا کچھ بھی دشوار نہیں۔ آج مقیاس الحرارۃ سے بخار اور حرارت کا وزن کیا جا رہا ہے۔ برسنے والے پانی کی مقدار معلوم کی جا رہی ہے۔ آنے والے طوفان کی قبل از وقت پیشین گوئی ہو رہی ہے، پانی بھاپ بن رہا ہے اور بھاپ پانی کی صورت اختیار کرتی ہے بلکہ رقیق و سیال مادوں کو مختلف صورتوں میں منتقل کیا جاتا اور تو اور غیر مرئی چیزوں پر بھی انسانی دسترس قابو یاب ہے پھر محشر جیسیں حقائق کا انکشاف بدرجۂ اتم ہوگا وہاں یہ چیزیں جو آج ہمارے لئے غیر مرئی ہیں کوئی خاص شکل وصورت یا رنگ ولون بھی اختیار کرلیں تو تعجب ہی کیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ موجودہ سائنس اور اس کی نت نئی تحقیقات اسلام کے خلاف نہیں بلکہ بہت سی چیزوں کو قابلِ قبول بناتی چلی جا رہی ہیں

"ایمان بروزِ قیامت آئے گا اور خدائے تعالٰے سے عرض کرے گا کہ اے اللہ آپ امن دینے والے ہیں اور میں ذریعۂ حصولِ امن ہوں تو اسے بخش دیجئے جس نے مجھے اپنایا۔" اسی طرح اسلام بھی پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ "اے اللہ آپ سلامتی دینے والے ہیں اور میں سلامتی کے حصول کے لئے وسیلہ ہوں تو اسے سلامتی سے نواز دے جس نے مجھے اختیار کیا۔"
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام بھی محشر میں شکل اختیار کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

محلِ ایمان:۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کی رائے ہے کہ ایمان کا مستقر قلب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب منسوب کیا گیا کہ اُن کے خیال میں ایمان کا مستقر دماغ ہے۔ مجمع البحار میں امام صاحب کا یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ:۔

"امام صاحب رحمہ اللہ کی جانب یہ انتساب صحیح نہیں۔ متقدمین احناف کے یہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا بلکہ فقہ کی مشہور کتاب ھدایہ کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔ مصنف ہدایہ نے کتاب الجنائز میں لکھا ہے کہ امام کو جب وہ جنازہ کی نماز پڑھانے لگے میت کے قلب کے محاذ میں کھڑا ہونا چاہئے چونکہ قلب مستقر ایمان ہے۔ اس تصریح نے صاف کر دیا کہ حنفیہ بھی محلِ ایمان قلب ہی کو سمجھتے ہیں۔ خود میرے نزدیک یہ بات متحقق ہے کہ ایمان کا محل "قلب" ہے اور اس کا ظہور "دماغ" سے ہوتا ہے۔ قلب اور دماغ میں قرب ہے۔ قلب سے ایک چیز نمایاں ہوتی ہے اور اس کا ظہور دماغ سے ہوتا ہے۔ یہ بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ قلب انسانِ صغیر ہے جو انسانِ کبیر (آدمی) کے دو پہلوؤں کے درمیان رکھا گیا ہے۔ صحت کی درستگی و بگاڑ بلکہ صلاح و فساد سب کچھ اسی قلب کی صحت و مرض پر موقوف ہے۔ پھر یہ قلب جسم انسانی میں اوندھا لٹکا ہوا ہے جس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ اس کائنات میں مخلوق کئی صورتوں پر ہیں۔ بعض وہ ہیں جو زمین سے پھوٹ رہی ہیں اور ان کا رُخ آسمان کی جانب ہے جیسا کہ درخت، بعض وہ ہیں جو عرض میں پھیلی ہوئی ہیں جیسا کہ حیوانات اور انسان۔ چونکہ آسمان سے زمین

پر اتارا گیا تو اس کی خلقت اوپر سے نیچے کی جانب ہے چنانچہ انسان کا سر جو درخت کی جڑ کے مانند ہے بجائے نیچے ہونے کے اوپر آیا ہوا ہے بلکہ انسان کے تمام اعضاء نیچے کی جانب مائل ہیں جیسا کہ اس کے ہاتھ، پاؤں، بال وغیرہ۔ تو مناسب تھا کہ قلب کا رُخ زمین کی جانب ہو جو انسان کو ہمیشہ اس کا احساس دلاتا رہے کہ تیرا تعلق علو سے ہے نہ کہ اسفل سے۔ پھر یہ بھی لطیفہ ہے کہ قلب کو بائیں جانب میں رکھا تاکہ اسکی حکومت وسلطنت داہنی جانب پر رہے۔ اطباء نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء سے متعلق دس ہزار حکمتوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن قلب کے اوندھا ہونے کی کوئی حکمت نہیں بیان کی یہ میری اپنی تحقیق تھی جس کا ذکر کیا۔ ان کان صحیحا فمن اللہ۔

حیاء ایمان کی شاخ ہے:۔ عام طور پر اہل علم حیاء کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک شرعی دوسری عرفی۔ یہ اس حدیث کے ذیل میں گفتگو کی جاتی ہے جسمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو ایمان کا شعبہ وشاخ قرار دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ

"میں حیاء کو دو قسموں میں اس انداز پر تقسیم نہیں کرتا جو عام علماء کی رائے ہے یعنی شرعی وعرفی۔ میرے خیال میں حیاء کی ایک ہی قسم ہے۔ البتہ متعلق کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ جس پر ذکر الٰہی کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ خدائے تعالےٰ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب میں خدائے تعالےٰ سے حیاء کرتا ہے اور جس پر دنیا کا غلبہ ہوتا ہے وہ صرف ان چیزوں سے بچتا ہے جو اہل دنیا کی نظر میں معیوب ہوتی ہیں اسلئے حیاء ایک ہی ہے صرف اسکے متعلق بدل رہے ہیں۔ پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ بعض اخلاق حسنہ ایمان کے مبادی ہیں جو ایمان سے بھی پہلے آتے ہیں اور ان پر ایمان کا رنگ چڑھتا ہے حدیث میں ہے "لا ایمان لمن لا امانۃ لہ۔" اس سے معلوم ہوا کہ "امانت" ایمان سے مقدم ہے بلکہ حیاء کو بھی ایمان سے مقدم سمجھنا چاہئے اور یہ بھی محفوظ رہے کہ مؤمن میں بعض اوقات خصائل کفر ہوتی ہیں اور بعض کفار میں بعض ایمانی عادات واخلاق، لیکن مؤمن کافرانہ اداؤں کی بناء پر ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہ خصائل ایمان کی بناء پر زمرۂ مؤمنین میں محبوب

نہ ہوگا۔"

انبیاء اور گناہوں کا صدور:۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر" کہ اے نبیؐ خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دئے۔

اس ارشادِ ربانی کے نتیجہ میں ایک بحث یہ چل پڑی کہ کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے گناہوں کا صدور ممکن ہے؟ اشاعرہ کے خیال میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت سے پہلے اور بعد صغائر کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ یہ ارتکاب سہواً تو ہو ہی سکتا ہے بلکہ اشاعرہ کے خیال میں قصداً بھی امکان ہے۔

ماتریدیہ انبیاء سے گناہوں کا صدور ممکن نہیں مانتے، نہ ارادۃً نہ بلا ارادہ۔ پھر اس آیتِ ربانی کا کیا مطلب ہوگا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذنوب سے درگذر کرنے کا ذکر آیا۔ یہ آیت تو چاہتی ہے کہ گناہوں کا صدور تسلیم کر لیا جائے۔ علماء نے اس اشکال کا اپنے ذوق کے مطابق جواب دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ فرمایا کہ

"ذنب معصیت نہیں ہے گناہوں کی بہت سی صورتیں ہیں اور گناہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے عربی میں ہر ایک کے لئے علیحدہ الفاظ ہیں۔ معصیت کا ترجمہ ہے عدولِ حکمی، اطاعت سے سرتابی، آمر کے امر کے مقابل میں مخالف رویہ اور کھلی نافرمانی۔ یہ گناہ کی شدید قسم ہے۔ اس کے بعد خطاء ہے۔ یہ صواب کی ضد ہے اس کا ترجمہ اردو میں "نادرست" ہوگا۔ تیسرا درجہ ذنب ہے۔ یہ سب سے زیادہ ہلکی معصیت ہے جسے "عیب" ہی کہا جا سکتا ہے اسلئے میرے خیال میں آیت میں کوئی اشکال نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاکیزہ احساسات کے تحت جن ہلکی چیزوں کو اپنے لئے عیب سمجھ رہے تھے اور وہ حقیقۃً عیوب نہیں تھے آپؐ کے اطمینانِ خاطر کے لئے خدائے تعالیٰ نے ان کو بھی نظر انداز کرنے کی بشارت دے دی اسلئے اہلِ علم جو اس آیت کے ذیل میں معاصی کے ارتکاب وعدمِ ارتکاب کی گفتگو کرتے ہیں، بر محل تو کیا ہوتی بلکہ مضر ہے کیونکہ یہ تقسیم معصیت میں نافذ ہے نہ کہ ذنوب میں۔"

اس موقعہ پر اہم علمی نکات یہ بھی ذکر کئے ہیں کہ تمام انبیاء ہی مغفور ہیں پھر آنحضورؐ

صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر بشارت کیوں دی گئی۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ایک مغفرت ہے ایک مغفرت کا اعلان۔ مغفرت عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے اور اعلانِ مغفرت صرف آپؐ ہی کے لئے ہے۔ یہ اس لئے کہ آپؐ کے لئے شفاعتِ کبریٰ کا امتیاز موجود ہے اگر اس شفاعتِ کبریٰ کے وقت آپؐ احساساتِ ذنوب سے دوسرے انبیاء کی طرح متأثر ہوتے تو شفاعتِ کبریٰ کر نہیں سکتے تھے اس لئے دنیا ہی میں آپؐ کو مطمئن کر دیا گیا تاکہ آنے والے دن میں آپؐ باطمینانِ خاطر اپنے منصبِ جلیل کے مطابق شفاعتِ امم کر سکیں جبکہ دوسرے انبیاء شفاعت نہیں کر سکیں گے بلکہ حدیث میں ہے کہ امتیں اپنے انبیاء سے شفاعت کی درخواست کریں گی تو ان کا جواب یہ ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ چونکہ آپؐ کے ذنوب نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اس خصوصیت کا کیسے علم ہوتا اگر آپؐ کی مغفرت کا اعلان واطلاع نہ کر دی جاتی۔

افسوس کہ صفحات کی تنگدامنی قلم کو بار بار مصروفِ نگارش ہونے سے روکتی ہے ورنہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس بحث میں بھی عمیق فکر اور وسیعِ فکر کے جو موتی بکھیرے ہیں ان سے دیدہ زیب ہار کی تیاری کے لئے قلم کا دل بے چین ہے۔

رَئِیْسُ الْاَعْضَاء: ۔ وہ مشہور حدیث جس میں ارشاد ہے کہ جسمِ انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جس کے صلاح وفساد پر عام احوال کی خوبی ونازیبائی موقوف ہے یاد رکھو کہ وہ قلب ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا حدیثِ ذیل پر یہ افادہ قابلِ استفادہ ہے۔ فرمایا کہ

> "قلب کا تعلق پورے جسم کے ساتھ امیر و مامور کی حیثیت رکھتا ہے کہ قلب حاکم ہے اور جسم اس کا محکوم یا قلب اصل ہے اور اعضاء فروع۔ قلب ہی خزینۂ علوم ومعارف ہے اور یہی سرچشمۂ اخلاق وملکات ہے۔ بیہقی کی ایک روایت ہے کہ کان مسموعات کو خارج سے اٹھاتے ہیں اور قلب تک پہونچاتے ہیں دونوں آنکھیں ایک ہتھیار ہے جن کے ذریعہ سے انسان شجر وحجر اور موذی ومہلک اشیاء سے بچتا ہے دونوں ہاتھ دو بازو ہیں اور پاؤں قاصد ہیں۔ جگر مجسمۂ رحمت ہے اور طحال وسیلۂ ضحک۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ طحال سے ضحک صادر ہوتا ہے اطبّاء نے اس کی کوئی توجیہ نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ طحال میں انقباض وانبساط پیدا ہوتا رہتا ہے جبکہ

ضحک کی بھی یہی حقیقت ہے۔ صوفیا رنے قلب کو تمام لطائف کا مدار قرار دیا ہے چونکہ یہی مہبط انوار ومنبع اسرار ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدمؑ کا پتلا تیار ہوا تو شیطان اس کالِ بد کے ارد گرد گھوما اور پھر اس کے اندر گھس گیا اندرونی طور پر کچھ منفذ اس نے پائے تو بولا کہ یہ مخلوق ایسی ہوگی کہ اپنے نفس پر قابو نہیں پاسکے گی۔ تفسیر فتح العزیز میں یہی حدیث اس اضافہ کے ساتھ موجود ہے کہ شیطان نے جسدِ آدم میں بائیں جانب ایک بند کوٹھری دیکھی تو بولا کہ یہ کیا چیز ہے کچھ پتہ نہیں چلتا حالانکہ قلب اسی میں محفوظ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ قلب کیونکہ تجلیاتِ ربّانی کا مظہر ہے اسی لئے خدائے تعالےٰ نے اسے ہر جانب سے بند کر دیا جس میں کوئی سوراخ وشگاف نہیں ہے۔ اب قلب ایک بند قبّہ کی طرح ہے جس کے اطراف وجوانب میں بھی کوئی سوراخ نہیں ہے جس کے دروازے اور کھڑکیاں سب بند ہیں اور اس کے اسرار کو سوائے خدائے تعالےٰ کے اور کوئی جانتا بھی نہیں۔"

حقیقتِ علم:۔ علم کی کیا حقیقت ہے۔ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ یہ قلب کی ایک صفت ہے اور اسی طرح قلب میں محفوظ وموجود جس طرح کہ آنکھوں میں بینائی۔ علم کو اگر اسکے شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ حقائق کے انکشاف کا ذریعہ بنتا ہے۔ ماتریدیہ کی اس تحقیق پر معلومات بے پناہ ہوسکتے ہیں جبکہ علم میں تعدد نہیں۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ علم حصولِ صورت یا صورتِ حاصلہ کا نام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم ومعلوم میں بھرپور مغایرت ہے۔ حالانکہ فلاسفہ دونوں کو متحد قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھیئے کہ علم کی خوبی وبرائی معلومات کے برے بھلے ہونے پر موقوف ہے اگر معلومات اچھے ہیں تو علم بھی اچھا اور معلومات کی برائی علم کی برائی تک منتج ہوگی۔ علم کامل وہی ہے جو مرضیاتِ خدا کے حصول کا ذریعہ بن جائے جس علم سے یہ کام نہیں لیا گیا وہ علم نہیں بلکہ جہل بنام علم ہے۔ ایسا علم جس سے خوشنودیٔ خدا نصیب ہو انبیاء ہی کے خزانۂ علوم سے حاصل کیا جاسکتا ہے اسلئے نبوت کا اقرار بہرحال ضروری ہوگا اگرچہ عام مفسرین یہی کہتے ہیں کہ آدمؑ کی فضیلت کا راز علم ہے مگر میرے خیال میں ان کی فضیلت بندگی میں مستور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمینی خلافت کے بظاہر تین مستحق تھے آدمؑ، فرشتے، ابلیس ابلیس کی ملعونیت ومردودیت تو معلوم ہے پھر وہ زمین پر بحیثیت خلیفہ کس طرح آسکتا تھا۔

فرشتوں نے خدائے تعالےٰ سے خلافت کے اسرار معلوم کرنا چاہے چونکہ انسان کے ظاہری احوال سے وہ خونریزی کی بو سونگھ رہے تھے سوال تو کیا جا سکتا تھا لیکن سوال کا طریقہ و انداز جنابِ باری عزّ اسمہ کے شایانِ شان اختیار نہیں کیا تھا اس انداز پر خدائے تعالےٰ کو حق تھا کہ فرشتوں سے شدید مواخذہ فرماتے مگر فرشتے بہت جلد مطلع ہو گئے اور انہیں اپنی بھول چوک پر اصرار نہ تھا اس لئے خدائے تعالےٰ بھی درگذر فرما گئے۔

رہ گئے سیّدنا آدم علیہ السلام جب ان کے نسیان اور ممانعت کے باوجود متعینہ شجر کے استعمال پر مواخذہ شروع ہوا تو انھوں نے سوائے گڑگڑانے، تضرع وزاری اور عبدیت کے مظاہرہ کے اور کوئی رُخ اختیار نہیں کیا حالانکہ آدم جواب دے سکتے تھے جیساکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسی طرح کے اعتراض پر انہیں ساکت کر دیا تھا۔ رہا یہ خلجان کہ اگر عبودیت و بندگی استحقاقِ خلافت کی بنیاد تھی تو خدائے تعالےٰ نے آدم کے علم کا مظاہرہ کیوں کرایا حالانکہ ان کی عبدیت کا مظاہرہ زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علم ایسا وصف ہے جس کا اظہار ہو سکتا ہے جبکہ عبودیت بندے میں ایک مستور صفت ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کی خوبی اور اس کا شرف اسی وقت تسلیم ہوگا جب اس کے ساتھ حسنِ عمل کا پیوند لگا ہوا ہو۔

آدم کی تعریف یہی ہے کہ اُن کا عمل مطابق علم تھا اور ذرا غور سے کام لیجئے تو معلوم ہوگا کہ علم تو عمل کا وسیلہ ہے۔ وسائل مقاصد پر فائق نہیں ہوتے اس لئے علم پر عمل ہی کو ترجیح رہے گی۔

میری ان گذارشات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں علم کے شرف کا منکر ہوں درآنحالیکہ امام اعظم اور مالک رحمہا اللہ شغلِ علم کو نوافل کی مشغولیت سے بھی زیادہ افضل قرار دیتے ہیں اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے دو قول ہیں ایک یہ کہ علم افضل ہے اور دوسرا قول ہے کہ جہاد میں مشغولیت باعثِ فضیلت ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ عبادت کی اہمیت بمقابلہ علم کے قائل ہیں۔ میرا مقصود اس موقعہ پر استحقاقِ خلافت کی بنیادوں کو منقح کرنا تھا اور بس۔

نااہل اور ذمہ داریاں :۔ مشہور حدیثِ جبرئیل جسے اکثر و بیشتر محدثین نے اپنے مجموعہ میں ذکر کیا ہے اسی میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل نے قیامت کے بارے میں سوال

...یا تو آپ نے وقت کی تعیین کے بجائے قیامت کی کچھ علامات ذکر فرمائیں انہیں میں ایک
...فی کہ "جب ذمہ داریاں نا اہلوں کو سپرد کر دی جائیں تو قیامت قریب سمجھنا۔"

علامہ کشمیریؒ نے اس پر سنایا۔

"امام شافعی علیہ الرحمہ مفلوک الحال تھے ان کا گذر اوقات لوگوں کے تحائف اور ہدایا پر تھا جو کچھ ملتا فوراً خرچ کر ڈالتے ذخیرہ نہ فرماتے۔ امام کے ایک شاگرد ابن عبدالحکیم بڑے رئیس اور فارغ البال تھے۔ اپنے استاذ کی فراخ دلی سے خدمت کا جذبہ رکھتے۔ ایک مرتبہ امام شافعیؒ اپنے اس شاگرد کے یہاں مہمان ہوئے تو سعادتمند شاگرد نے باورچی کو الوان واقسام کے کھانوں کی تیاری کا حکم دیا۔ امام شافعیؒ نے ان متعدد کھانوں کے علاوہ خود بھی بعض کھانوں کی فرمائش کی۔ رشید شاگرد اس فرمائش پر اس قدر مسرور ہوئے کہ اپنا ایک غلام آزاد کر دیا۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گئی اور صحت کی عمارت شکست وریخت سے آشنا ہوئی تو عوام نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا؟ اس وقت وہی شاگرد سامنے آیا جس نے اپنا بڑا سرمایہ امام شافعیؒ کی خدمت میں صرف کیا تھا وہ منتظر تھا کہ اب استاذ مجھ ہی کو جانشین کے لئے منتخب کریں گے لیکن امام شافعیؒ نے اسماعیل بن یحییٰ المزنی کو اپنا جانشین منتخب کرنے کا اعلان کیا اور اس صحیح ومناسب انتخاب میں ابن عبدالحکیم کی گراں باریٔ احسان حائل نہ ہونے دی۔"

ایسے ہی مصنف فتح القدیر حافظ ابن ہمام الحنفی ایک خانقاہ کے متولی تھے۔ اسی خانقاہ کے ایک گوشہ میں درس وتدریس کا شغل تھا۔ تدریس پر کبھی ایک کوڑی نہیں لی۔ بادشاہِ مصر ان کا ایسا معتقد تھا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور بدر عینی کے ہوتے ہوئے اگر اسکو کبھی علمی اشکال پیش آتا تو حافظ ابن ہمام ہی سے عقدہ کشائی کرائی جاتی۔ ابنِ ہمام نے وفات کے وقت جانشین علامہ قاسم بن قطلوبغا کو کیا چونکہ یہ تمام تلامذہ میں سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔

ابوالحسن سندھی جو تیرھویں صدی ہجری کے ایک فاضلِ روزگار گذرے ہیں۔ اپنے

استاذ کے حلقۂ درس میں پوری مدتِ تعلیم کبھی ایک حرف نہ بولے جس سے حلقۂ رفقاء و عوام انہیں کندۂ ناتراش سمجھتے۔ لیکن جب ان کے شیخ کی وفات کا وقت آیا تو استاذ نے انہی ابوالحسن سندھی کو اپنا جانشین کیا یہ مسندِ تدریس پر بیٹھے اور ان کے علم کا بحرِ ناپیدا کنار جولانی پر آیا تو استاذ کے انتخاب کی سب نے داد دی۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ اسلاف جانشینی کے مسئلہ میں حقیقی استحقاق و صحیح اہلیت کا کس قدر اہتمام کرتے اور جب سے یہ دستور چھوٹ گیا اور نا اہل جلیل مناصب پر فائز ہونے لگے تو معاشرہ ایک تباہ کن دہانہ کے قریب آلگا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اہلوں کی جانشینی کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے۔

إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِي :۔ جنابِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور دینے والے حقیقت میں خدا ہی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اس حدیث کے حل میں یہ افادات ذکر کیے ہیں کہ

"دینا ہو یا تقسیم کرنا ان سب امور کا تعلق تو خدائے تعالےٰ سے ہے اگرچہ بظاہر آپؐ معطی بھی ہیں جیسا کہ آپ قاسم ہیں۔ اس لئے حدیث میں اشکال ہے کہ آپؐ نے خود اپنے اور خدائے تعالےٰ کے درمیان دینے و تقسیم کرنے کا فرق قائم کر لیا۔

میں نے غور و فکر کیا تو محسوس ہوتا ہے کہ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں جملوں میں صرف ظاہر کا لحاظ فرماتے ہوئے یہ تقسیم فرمائی اور آپؐ کا یہ ارشاد عوام کے رجحان و فکر کے مطابق ہے۔ عوام بھی فاعلِ حقیقی کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ جس سے ملتا ہے اسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ زید نے مجھ کو فلاں چیز دی۔ دینے کا فاعل زید کو بتایا گیا اور جو حقیقت میں دینے والا ہے (خدائے تعالےٰ) اس کی جانب نسبت نہیں کی گئی۔

میری اس تفصیل کے پیشِ نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے راہ کھلی ہوئی تھی کہ آپؐ نے جس طرح اپنے آپؐ کو قاسم ٹھہرایا ایسے ہی آپ اپنے کو معطی بھی کہہ سکتے تھے لیکن آپؐ نے ایک اور حقیقت پر نظر رکھی وہ یہ کہ دینے والا

بلند رتبہ اور مستقل ہوتا ہے اور تقسیم کرنے والا صرف ذریعہ بنتا ہے اور
لینے والے کی حیثیت کمتر ہوتی ہے تو آپ نے بلندی و رفعت استقلال
واستحکام خدائے تعالٰی کے لئے ثابت کیا جو ان کے شایانِ شان ہے
اور اپنی جانب وہ چیز منسوب کی جو آپکے بشریت کے حسبِ حال ہے گویا کہ آپکا یہ ارشاد
آپکے حسنِ ادب اور سلامتی طبع و فکر کا مظہر ہے اسمیں توحید افعال کی بحث کھڑی کر دینا
مناسب نہیں۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے لکھا ہے اور اسی حدیث کے تحت کہ انبیاء
علیہم السلام اپنی حیات اور ممات میں کسی چیز پر قادر نہیں ہوتے
اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو قاسم ٹھہرایا ہے اور اپنے بارے
میں مالک نہیں فرمایا۔ اگر حافظ کی یہ تقریر صحیح ہے تو پھر حدیث
میں کسی تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

برزخ اور سوال وجواب:- وہ احادیث جن میں ہے کہ قبر میں میت سے سوال وجواب
ہوگا اگر اس کے جوابات صحیح ہوں گے تو فرشتے اس سے کہیں گے کہ دلہنوں کی طرح
سو جاؤ۔ شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا کہ

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں عمل و شغل ختم ہو جائے گا جبکہ
بعض احادیث سے جو مسندِ دارمی میں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مردے
قبر میں بھی بعض مشاغل جاری رکھتے ہیں، اذان بھی دیتے ہیں، اقامت
بھی کہتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ
تلاوت بھی کرتے ہیں اور بخاری کی روایت میں تو ان کے حج کا بھی تذکرہ
ہے۔ قرآن مجید میں بھی برزخی زندگی کے بارے میں مختلف ارشادات
ہیں۔ مثلاً ایک موقعہ پر ہے کہ مردے حشر میں بعد النشر کہیں گے "من بعثنا
من مرقدنا" (ہمیں ہمارے قبور سے کس نے اٹھا دیا) اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اموات قبر میں سوتی ہیں اور انہیں کوئی بھی احساس نہیں پھر
قرآن ہی نے دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ النار یعرضون علیھا
غدوا وعشیا" (آگ صبح اور شام فرعون اور اس کے ہم خیال
لوگوں پر پیش کی جاتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں احساس ہے

ورنہ تو آگ کو سامنے لانے سے کیا فائدہ؟ میری رائے ان متضاد بیانات کی بنا پر یہ ہے کہ برزخی زندگی میں یکساں احوال نہیں بلکہ دنیاوی زندگی کے مطابق حسنِ عمل اور بدعملی کی بنا پر قبر کی زندگی کے احوال بدلتے ہیں اسلئے بعض قبر میں پڑے سوتے ہیں اور بعض برزخی حیات میں طرح طرح کی راحتوں ونعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ برزخی زندگی کو حدیث میں نوم کے ساتھ اس وجہ سے تعبیر کیا کہ لغت عرب میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو برزخ کی زندگی کی صحیح کیفیات کو ادا کر سکے اس لئے وہی لفظ انتخاب کیا گیا جو برزخی زندگی کی کیفیات کو فی الجملہ ادا کر سکے اور وہ نوم ہی ہے۔ نوم "موت" سے مشابہ ہے اسی وجہ سے حدیث میں النوم اخ الموت کے لفظ آئے ہیں۔ برزخ اس دنیوی زندگی کے انقطاع اور ایک دوسری زندگی کا آغاز ہی ہے ایسے ہی نوم میں فی الجملہ انقطاع ہے۔"

سوالِ قبر:۔ یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ قبر میں سوال کس سے ہوگا؟ آیا سب سے یا صرف منافق سے یا کفار سے بھی۔ اور پھر انبیاء سے بھی سوال ہوگا یا نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث علیہ الرحمہ نے اپنی فارسی تصنیف تکمیل الایمان میں اس موضوع پر کافی تفصیل کی ہے اہلِ علم مراجعت کر سکتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

"بعض اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ جن کا ایمان اور اعمالِ صالحہ اور جن کا کفر اور برے اعمال واضح ہیں اُن سے سوال نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ کفار سے بھی سوال ہوگا تاکہ انہیں یہ کہنے کا موقعہ نہ رہے کہ ہمارا امتحان ہی نہیں لیا گیا۔ پھر یہ بھی میرا خیال ہے کہ سوال جسم مع روح سے ہوگا۔ مصنفِ ہدایہ کے بھی بعض ارشادات ایسے ہی ہیں صوفیاء اُسے جسمِ مثالی قرار دیتے ہیں۔ مولانا جامی نے لکھا ہے کہ اس دنیا میں جسم سامنے ہے روح مستور ہے تو اجسام ہی کو احکام کا مکلف قرار دیا گیا۔ برزخ میں قصہ پلٹ جائے گا وہاں روح کا ظہور ہوگا اور اجسام مخفی ہو جائیں گے تو مخاطب بھی بدل جائے گا اور

محشر میں دونوں موجود ہوں گے اجساد بھی۔ ارواح بھی تو خطاب دونوں ہی سے ہوگا۔ صدرشیرازی نے اس مسئلہ میں جو کچھ لکھا وہ بہت اُلجھا ہوا ہے ان مسائل میں صوفیاء ہی کی تحقیق کو راجح سمجھتا ہوں۔"

دیانت وقضاء میں فرق:- یہ ایک اہم علمی بحث ہے کہ دیانت وقضاء میں کیا فرق ہے؟ خود شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ

"میں دیانت وقضاء کے صحیح فرق پر علامہ تفتازانی کی ان تصریحات سے واقف ہوا جو انھوں نے "تلویح" میں سپردِ قلم کی ہیں جہاں انھوں نے سبب وحکم کے درمیان استعارہ کی بحث کو بیان کیا ہے۔ پھر میں مسلسل اس فرق کو تلاش کرتا رہا کہ فقہاء کے یہاں بھی یہ فرق ہے یا نہیں؟ "اُصولِ عمادی" جو صاحبِ ہدایہ کے پوتے کی تصنیف ہے اسمیں مفصل اسکا تذکرہ ملا۔ اور امام طحاویؒ نے بھی "مشکل الآثار" میں اس کی تفصیلات دی ہیں۔ اس لئے میری رائے ہے کہ چاروں مذاہبِ فقہی میں یہ فرق دیانت اور قضا کا موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام علماء دیانت اور قضاء کے فروقِ باہمی پر عمیق نظر نہیں رکھتے۔"

اس لئے راقم السطور اس عنوان کے تحت شاہ صاحبؒ کی خاص تحقیقات پیش کرتا ہے فرمایا کہ

"دیانت کا عام طور پر یہ مطلب لیا گیا ہے کہ وہ معاملہ جو بندے اور خدا کے درمیان ہو اور قضا وہ ہے جو بندے اور عام لوگوں کے درمیان ہو۔ بعض علماء نے اس سے یہ سمجھا کہ جب تک کوئی چیز صرف بندے اور خدا تک محدود ہے تو وہ بذیل دیانت آئے گی اور اگر کوئی تیسرا بھی اس پر مطلع ہو گیا تو دیانت سے نکل کر حدودِ قضاء میں داخل ہو گئی۔ میں کہتا ہوں کہ دیانت اور قضاء کے درمیان یہ حد بندی صحیح نہیں ہے چونکہ دیانت وقضاء کا فیصلہ شہرت وعدمِ شہرت پر مبنی نہیں بلکہ معاملہ زیرِ دیانت ہی رہے گا تا وقتیکہ اسے قاضی کی عدالت میں نہ پہونچایا جائے اگرچہ وہ بات کتنی ہی مشہور کیوں نہ ہو گئی ہو اور یہ بھی سمجھئے کہ اگر معاملہ

پر کوئی بھی مطلع نہ ہوا ہو لیکن وہ قاضی کی عدالت میں پہونچا دیا گیا تو قضاء کے حدود میں بالیقین داخل ہو گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ شہرت وعدم شہرت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر قاضی بھی وہی ہو سکتا ہے جسے مسلمان بادشاہ یا امیر المؤمنین نے احکامِ شریعت کے نفاذ کے لئے متعین کیا ہو۔ مفتی ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو فتاوی کے جواب دے۔ اسمیں نہ امیر کی جانب سے تعین شرط ہے اور نہ احکام کا نفاذ ضروری۔ ایک فرق مفتی اور قاضی میں اور بھی ہے کہ مفتی کو صرف مسائل کا علم ہونا چاہیئے اور وہ احتمالات پر بھی جواب دے سکتا ہے یعنی "اگر ایسا ہو گا تو شریعت کا حکم یہ ہو گا۔" اور قاضی واقعہ کے تمام اطراف کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرے گا اس کے فیصلہ کی بنیاد احتمالات پر نہ ہو گی چونکہ قاضی احکام کے نفاذ کے لئے مامور ہے تو جب تک اس واقعۂ زیرِ بحث سے متعلق اس کی تحقیقات مکمل نہ ہوں وہ فیصلہ کا مجاز نہیں۔ اس تفصیل کے بعد یہ بھی پیشِ نظر رکھئے کہ دیانت کا تعلق صرف مفتی سے ہے اور قضاء کا قاضی سے۔ دیانت اور قضاءً ایک دوسرے سے جدا ہیں کبھی حکم دیانۃً قضا کے حکم کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ محقق علماء نے لکھا ہے کہ مفتی قضا کے مسئلہ میں مداخلت نہ کرے عام مفتی فی زمانہ اس نکتہ سے ناواقف ہیں اور وہ فتوے کے ساتھ ساتھ قضا میں بھی مداخلت کر جاتے ہیں حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔ اور میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ عام فقہی کتابوں میں مسائلِ قضا مذکور ہیں۔ دیانت کے مسائل موجود کتابوں میں مہیا نہیں ان کا اہتمام مبسوطات میں ہے۔ عصرِ حاضر کے غریب مفتیوں کی وہاں تک رسائی نہیں تو وہ ان ہی مسائل کا ذکر کر دیتے ہیں جو قضا کی فہرست میں آتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلطنتِ عثمانیہ میں قاضی حنفی تھا اور مفتی چاروں مذاہب کے تھے حنفی قاضی ان کے فتوے کے مطابق فیصلہ کرتا مفتیوں نے بھی قضا کے فیصلے لکھنا شروع کئے تاکہ حنفی قاضی ان کی تنفیذ کرے۔ اس طرح قضا کے فیصلے شائع ذائع ہو گئے اور دیانت کے مسائل عام

شہرت نہ حاصل نہ کرسکے۔ حالانکہ دیانت اور قضا میں اتفاق ضروری نہیں بلکہ کبھی دونوں کے احکام بالکل ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں اس کی وضاحت اس درجِ ذیل مسئلہ سے ہوسکے گی۔ فقہ کی مشہور کتاب "کنز" میں ہے کہ کسی شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تیرے لڑکا ہوا تو تجھ پر ایک طلاق لڑکی ہوئی تو دو طلاق۔ اتفاقاً اس عورت کے دونوں ہوئے یعنی لڑکا بھی لڑکی بھی اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ پہلے کون پیدا ہوا آیا لڑکا یا لڑکی۔ لکھا ہے اس مسئلہ میں قضاءً عورت پر ایک طلاق واقع ہوگی اور دیانتہً دو۔ دیکھا آپ نے کہ قاضی یقین پر فیصلہ کر رہا ہے اور مفتی اپنے فتوے میں محتاط ہے اور اگر اسی مسئلہ میں شوہر نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر تیرے لڑکی ہوئی تو تجھ پر تین طلاق۔ اور پیدائش لڑکے اور لڑکی دونوں کی ہوئی تو دیانتہً تین طلاق واقع ہوں گی جبکہ قضاءً صرف ایک ہی واقع ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حلت وحرمت کے اعتبار سے دیانت اور قضا میں کتنا فرق پیدا ہوگیا۔ لیکن خود مجھے ایک تردد ہے کہ اگر دیانت اور قضا میں حلال وحرام کا بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے تو فرض کیجئے کہ ایک مبتلا شخص نے دیانت پر عمل کیا جبکہ وہ چیز دیانتہً حرام ہو۔ پھر وہ اس معاملہ کو قاضی کے یہاں لے گیا اور وہاں اس کے لئے یہ چیز حلال کر دی گئی تو کیا قاضی کی قضا حکم دیانت کو ختم کر دے گی ؟ اور کیا حرام چیز اس کے لئے حلال ہوجائے گی ؟ مجھے اس سلسلہ میں کوئی شافی چیز نہیں مل سکی اور نہ میں کوئی ایسا قانون بیان کرسکتا کہ کب احکامِ دیانت قضاء سے ختم ہوجائیں گے اور کب ختم نہ ہوں گے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا۔

خواب میں آپؐ کی زیارت :۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے مجھ ہی کو دیکھا چونکہ شیطان میرے حلیہ میں آنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بظاہر تو یہ ارشاد صاف اور واضح تھا لیکن بعض اہم نتائج وعواقب کی بنا پر اہل علم کی دلچسپ موشگافیوں کا ایک سنہرا خواب بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا لیکن وہ حلیہ آپؐ کے حقیقی خدوخال سے مشابہ نہیں تو کیا یہ خواب صحیح ہوگا؟ یا یہ

آپؐ نے خواب میں اپنی شریعت کے خلاف کوئی حکم خواب دیکھنے والے کو دیا تو کیا
میں خلافِ شریعت حکم پر عمل جائز ہوگا؟ ان اہم مباحث نے حدیث کے پہلو اور گوشہ
فکر و نظر کے نئے دروازے کھول دئے۔ اسی لئے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ خواب
اسی وقت درست ہوگا جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے واقعی خدوخال میں دیکھا ہو
چنانچہ اگر عالمِ طفولیت میں دیکھا تو آپؐ کے اس عہدِ مبارک کا حلیہ ہونا چاہیئے۔ شباب و کہولت
و شیب میں ان ہی ادوار کے وہی حلیے ہونے چاہئیں جو شمائل و اخلاق، سیرت و صورتِ مبارکہ
سے متعلق احادیث و روایات میں موجود ہیں۔ اگر ذرہ برابر بھی فرق ہوگا تو خواب معتبر نہ ہوگا۔
بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور معبّر و تابعی ابن سیرینؒ کا یہی مسلک و عمل ذکر کیا ہے جبکہ
دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ مطابقت خواب اور حقیقت میں ضروری نہیں بلکہ جب آپؐ
کو دیکھا تو بس آپؐ ہی کو دیکھا خواہ کسی بھی حلیہ میں دیکھا ہو۔ پہلے خیال کے دانشور بحالتِ
خواب آپؐ کے ارشادات کو آپؐ ہی کا ارشاد سمجھتے ہیں اس میں کوئی خاص شرط عائد
نہیں کرتے اور دوسرا گروہ جب رؤیت کے مسئلہ میں سہولت پسند واقع ہوا تو اس نے
آپؐ کے ارشادات بحالتِ خواب کو شرائط کے ساتھ مقید کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ خواب
کے اقوال کو شریعت پر پیش کیا جائے گا اگر شریعت کے مطابق ہیں تو قابلِ قبول ورنہ
نہیں۔ چونکہ سونے والے کو اس کا بھی یقین نہیں کہ آپؐ ہی کا کلام ہے اور یہ بھی معلوم نہیں
کہ وہی مرئی صورت کلام کر رہی تھی۔ پھر یہ بچشمِ سر دیدار بھی نہیں بلکہ خواب ہے جسکی حقیقت
تمام طور پر جانتے بھی نہیں اسلئے آپؐ کے ارشادات بحالتِ خواب کے بارے میں محتاط
ہی رہنا چاہیئے ہاں جب شریعت کے خلاف بات نہ ہو تو ادب کا تقاضا ہے کہ اس کلام پر
عمل کیا جائے۔

شیخ عبدالحق محدثؒ نے لکھا ہے کہ ایک صاحب نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو دیکھا آپ اس سے فرما رہے ہیں کہ "تم شراب پیو" اس زمانہ میں شیخ علی متقی حیات
تھے۔ یہ شیخ محمد طاہر صاحبِ مجمع البحار کے استاذ ہیں (اور حنفی ہیں خود انھوں نے اسکی
تصریح کی ہے۔ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ سے غلطی ہوئی کہ انہیں شافعی شمار کیا ہے) بہرحال شیخ
علی متقی نے فرمایا تمہیں خواب میں شراب پینے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ شراب
مت پیو شیطان نے الفاظ بدل ڈالے اور جب بیداری میں بات کچھ سے کچھ ہو سکتی ہے

توبحالتِ خواب اس سے زیادہ امکانات ہیں اور شیخ نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ تم شراب پیتے ہو اس آدمی نے اقرار کیا کہ میں شراب نوش ہوں۔

لیکن میری رائے یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً فرمایا تھا کہ کیا تم شراب پیتے ہو؟ یہ معنی متکلم کے لہجہ سے محسوس ہوتے ہیں ایک ہی لفظ کبھی ایک معنی کے لئے ہوتا ہے اور وہی تعریض کے لئے۔ لیکن تعریض لہجہ سے مفہوم ہوتی ہے پھر تعریض قولاً بھی ہوسکتی ہے اور فعلاً بھی۔ نیز یہ بھی ہے کہ اگر دیکھنے والے کے احوال اچھے ہوتے ہیں تو وہ آپؐ کو بہترین حالت میں دیکھتا ہے ورنہ تو نہیں۔ ایک صاحب نے خواب میں دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سر پر انگریزی ہیٹ پہنے ہوئے ہیں انھوں نے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ سے تعبیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ اب عیسائیت کا غلبہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر بڑا دقیق فن ہے اور ہر شخص اسمیں مداخلت کا حق نہیں رکھتا۔

بہرحال میری رائے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں ایسی زیارت ضروری نہیں کہ وہ ٹھیک آپؐ کے حقیقی حلیہ کے مطابق ہو۔ بلکہ میں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیداری کی حالت میں بھی رؤیت کے جواز کا قائل ہوں۔ سیوطیؒ نے خود لکھا ہے کہ انھوں نے بائیس مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں دیکھا۔ عبدالوہاب شعرانی بھی اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ مجھے بیداری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خدائے تعالےٰ اپنے فضل ورحمت سے کسی مسلمان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ تو اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کے دل ودماغ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیالِ مبارک اس طرح راسخ ہو کہ وہی خواب بن جائے۔ یہ بھی ایک بشارت ہے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالِ مبارک سے عشق وتعلق بھی بڑی نعمت ہے اور وہ صورت جس میں شیطان کے تصرف کو کوئی دخل ہو حدیث نے واضح کر دیا کہ اس کا کوئی امکان نہیں۔

امام العصر اور فقہ: - آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ میں ہر علم وفن میں اپنی مخصوص رائے رکھتا ہوں کسی کا مقلد نہیں باستثنائے "فقہ" کہ اس میں میری کوئی رائے نہیں ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا ہوں۔ فقہ حنفی سے غیر معمولی

شغف و تاثر اور اس کی حقانیت و اصابت پر بھر پور شعور و آگہی کے ساتھ تام یقین رکھتے۔
مجھ ہی سے آپ اُن کی خدمات و مساعی کی تفصیل بھی سن چکے جنکا تعلق فقہ حنفی کا استحکام اور اس کی تائید سے ہے۔ صرف فقہِ حنفی نہیں بلکہ متداول وغیر متداول چاروں فقہوں سے متعلق تصانیف کا انھوں نے مفصل مطالعہ کیا تھا۔ ایک موقعہ پر خود فرمایا کہ طحاوی رح کی "مُختصر الطحَاوی" کا میں نے بیس بار مطالعہ کیا ہے۔ کشمیر میں بزمانۂ قیام" بارہ مولہ" تین سال تک وہ فتویٰ بھی دیتے رہے اور فرمایا کہ ان تین سالوں میں کسی فتویٰ کی کتاب کی جانب رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حضرت شافعی رح کی کتاب" الأم" کی بیحد تعریف فرماتے اور کہتے کہ میں ہر کتاب کی تلخیص پر قادر ہوں بجز کتاب" الأم" کے، یہ بھی فرمایا کہ جب کبھی کتاب" الأم" کا مطالعہ کرتا ہوں تو امام شافعی رح کی ذکاوت و ذہانت اور انکی فطانت و رزانت کا یقین بڑھتا ہے۔ حنفیہ کی کتابوں میں "بدائع" کے بیحد معتقد تھے انکی رائے میں عراقی فقہائے احناف، خراسانی فقہائے احناف کے مقابل میں زیادہ قابلِ اعتماد تھے مگر پھر بھی بدائع کے مصنف" ابو بکر کاسانی" درآنحالیکہ خراسانی ہیں تثبت اور اتقان میں کسی عراقی سے کم نہیں فرماتے کہ" بدائع صنائع" ایسی کتاب ہے کہ اگر کوئی عالم غور و فکر سے اس کا مطالعہ کرے تو خود اس کا مزاج تفقہ میں ڈھل جائے گا اور مدرسین و مؤلفین و مفتیین سب کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ مرحوم کے خیال میں کوئی شخص" بحر الرائق لابن نجیم"، "ردالمحتار" اور فقہ حنفی کے مبسوطات کا مطالعہ کئے بغیر فتویٰ دینے کا حق نہیں رکھتا۔ ایک موقعہ پر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کسی مسئلہ میں جب امام ابو حنیفہ رح کا خود کوئی قول ہوتا ہے تو میں اسی کو لائقِ التفات سمجھتا ہوں۔ اگر امام اعظم رح کی کوئی رائے نہ ہو تو پھر ابو یوسف رح الامام کی شخصیت میرے نزدیک معتمد ترین ہے اور اگر ان کی بھی کوئی رائے موجود نہ ہو تو پھر امام محمد رح کے اقوال کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان تینوں کا کوئی قول اگر نہیں تو میں امام طحاوی رح کے فکری سرمایہ سے استفادہ کرتا ہوں اور اگر عراقی و ماوراء النہر کے احناف میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے تو میں فقہائے عراق کے قول پر زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔

بہرحال فقہ میں امام اعظم رح کی مکمل تقلید کے باوجود وہ خود فقہی مسائل کو کس انداز پر حل کرتے اسکے لئے دو مثالیں نظرِ قارئین ہیں۔

(۱) مولانا شبیر احمد رح عثمانی نے "فتح الملہم" میں علامہ کشمیری کی ایک رائے ان

ہی کے حوالہ سے تحریر فرمائی ہے۔ فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ

کفار بھی معاملاتِ شرعی کے مخاطب ہیں یا نہیں؟

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ

"اگر قائلین کی رائے میں خطاب کا مطلب آخرت میں ثواب و عذاب ہے تو پھر کفار کا مخاطب ہونا تسلیم ہے اور اگر اس کی مراد دنیاوی احکام کا صحیح و غلط ہونا ہے تو پھر اس معنی کر کے کفار کو معاملات کا مخاطب سمجھنے کا مسئلہ میرے نزدیک تفصیل طلب ہے۔ میری مراد ہدایہ کے اس ذکر کردہ مسئلہ سے خوب واضح ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے:۔ اگر کسی کافر نے بغیر گواہوں کے شادی کر لی یا ایسی کافرہ سے شادی کی جو اپنے سابقہ شوہر کی عدت گزار رہی تھی اور اس طرح کی شادیاں ان کے یہاں بلا روک ٹوک جائز ہیں پھر ان دونوں (شوہر و بیوی) کو اسلام کی توفیق ہوئی تو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ دونوں کا سابقہ نکاح اسلام کے بعد باقی رہے گا اس لئے کہ حرمت کو یہاں شرعی طور پر ثابت کرنا ممکن نہیں کیونکہ کفار حقوقِ شرع کے مخاطب نہیں اور جبکہ کفار کے یہاں عدّت کا کوئی تصور بھی نہیں تو ایسی عورت پر عدّت بھی واجب نہیں جس کا شوہر مر گیا ہو۔ حافظ ابنِ ہمامؒ نے ایک اور مسئلہ لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی حربی کو مردار یا خنزیر فروخت کر دیا یا اس کے ساتھ جوا کھیلا اور پھر اس مسلمان نے قیمت فروخت کردہ اشیاء کی یا جوے میں حاصل شدہ رقم اس حربی سے لے لی تو طرفین کے یہاں یہ خرید و فروخت اور قمار بازی میں حاصل شدہ رقم جائز ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر کفار احکامِ شرع کے مخاطب صحت و فساد کے اعتبار سے تھے تو پہلے مسئلہ میں نکاح ہی صحیح نہ ہونا چاہیئے تھا اور حافظ ابنِ ہمامؒ کے ذکر کردہ مسائل میں مال لینے کی کوئی حلّت نہیں ہونی چاہیئے تھی اور جبکہ مسائل جواز و حلّت کے بیان کئے جا رہے ہیں تو سمجھا یہی جائے گا کہ کفار صحت و فساد کے اعتبار سے احکامِ شرع کے مخاطب نہیں ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ فقہاء نے جس طرح

شرعی سزاؤں میں حد شرب کا کفار کے حق میں استثنار کیا ہے ایسے
ہی معاملات میں بھی کچھ ایسی قیودات بڑھانی چاہئیں جو اس طرح کے
مسائل سے بچا سکیں جن کا بحوالۂ ہدایہ و حافظ ابن ہمام تذکرہ گزرا۔"

(۲) مسئلۂ مصراۃ (جس جانور کو فروخت کرنے کے وقت بیچنے والے نے اس کا دودھ
قصداً نہیں نکالا تاکہ خریدار اُسے بہت دودھ دینے والا سمجھ کرلے لے۔ یہ ایک قسم کا دھوکا ہے
جو بھینسوں اور دودھ دینے والے جانوروں کو فروخت کرنے والے اکثر کیا کرتے ہیں) کے
بارے میں ایک مشہور حدیث فقہار کے مابین اختلافی ہے۔

مالک، شافعی، احمد، ابو یوسف رحمہم اللہ اسکو عیب سمجھتے ہیں اور اسی لئے بیچنے والوں
کو جانور واپس کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ پھر ابو یوسفؒ کی دو روایتیں ہیں ایک وہی کہ
ایک صاع کھجور یا دودھ کی قیمت واپس کی جائے گی اور امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ بیچنے والے کی
جانب سے اس صریح دھوکا دہی کے باوجود خریدار کو جانور واپس کرنے کا حق نہیں دیتے۔
ظاہر ہے کہ ان کا فیصلہ حدیث کے بالکل خلاف ہے کیونکہ حدیث واپسی کی راہ کھولتی ہے اور
یہ دونوں واپس کرنیکا جواز نہیں مانتے ہیں۔ حنفیہ کو اس مسئلہ میں جواب دہی کے لئے کافی
پریشانی اٹھانا پڑی اور اس خاص مسئلہ میں بعض اُن آثار و آیات کو انھوں نے پیش کیا
جن سے عام ضابطے مستفاد ہوتے ہیں۔ سب سے بہتر جواب امام طحاویؒ کا ہے اور طحاویؒ
پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس مسئلہ میں حنفیہ کی جانب سے جواب دہی کی۔ امام طحاویؒ
نے اس حدیث کے مقابل "الخراج بالضمان" والی حدیث کو پیش کیا۔

میں کہتا ہوں کہ امام طحاویؒ کا یہ جواب احناف کے دوسرے جواب کے مقابل میں
زیادہ متوازن و برجستہ ہے لیکن بعض تفصیلات میں جاکر یہ جواب حنفیہ کی تصریحات کے
بالکل خلاف نکلے گا اس لئے کہ احناف "خیار عیب" کے مسئلہ میں عیب کی آٹھ صورتیں نکالتے
ہیں مثلاً کہ :- زیادتی خود مبیع میں ہے۔ یا مبیع میں نہیں۔ پھر زیادتی متصل ہے یا منفصل۔
پھر ان ہی چار صورتوں میں خریدار کے قبضہ میں جانے سے پہلے ہے یا بعد میں ہے تو
"خراج بالضمان" والی احادیث غیر متولدہ زیادتی کی صورت میں مفید ہو سکتی ہے اور وہ
صورتیں جو متعدد نکل رہی ہیں یہ مشہور حدیث ان کے لئے کار آمد نہ ہو گی اس لئے میری
ذاتی رائے یہ ہے کہ

"یہ حدیث مصراۃ دیانت کے ابواب سے تعلق رکھتی ہے قضاء سے اس کا تعلق نہیں۔ سو اگر کوئی ایسا جانور فروخت کر دیا گیا جس کے دودھ کی مقدار میں خریدار کو دھوکا دیا گیا ہے اور بعد میں اس دھوکہ کا انکشاف ہوا جس پر خریدار جانور کو واپس کرنا چاہتا ہے دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ بیچنے والا جانور واپس کرے کیونکہ اس نے کھلا دھوکا دیا ہے لیکن اگر یہی جھگڑا عدالت میں پہونچ گیا تو فروخت کرنے والا واپس کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا یہ اسلئے کہ عدالت میں فیصلے ظاہر پر ہوتے ہیں نہ کہ مستور چیزوں پر، اور جانور میں بظاہر کوئی عیب ہے نہیں رہ گیا دودھ میں وزن کا فیصلہ تو اس کا تعلق ظاہر سے نہیں ہے۔ اب یہ حدیث بے تکلف حنفیہ کے نقطۂ نظر کی تائید میں آجائے گی۔ میں جہاں تک جانتا ہوں اس مسئلہ میں ہلکا سا تنبہ حافظ ابنِ ہمامؒ کو ہوا ہے اور انھوں نے دھوکہ دہی کی دو صورتیں نکالی ہیں۔ ایک یہ کہ بیچنے والا باتوں میں دودھ کا وزن بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرے اور دوسری وہی صورت یا دودھ نہ نکالے یا کسی چیز کو کھلا پلا کر دودھ کو عارضی طور پر بڑھا دے۔ حافظؒ نے لکھا ہے کہ اگر بیچنے والے نے لفظوں میں دودھ زیادہ بتایا اور وہ اسکے بیان کے مطابق نہیں بلکہ کم ہے تو عدالت سے قیمت میں کمی کرائی جائیگی۔ اور اگر بیچنے والے نے زیادہ نہیں بتایا لیکن کسی عمل سے دودھ کی مقدار بڑھا دی تو دودھ کی حقیقی مقدار سامنے آنے پر اس خرید و فروخت کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا، البتہ دینداری کا تقاضا ہے کہ بیچنے والا اگر واپس کرنا چاہتا ہے تو اس عیب کی بنا پر جانور واپس ہو جانا چاہئے۔ ابن ہمامؒ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وہ ایک حد تک اسی نقطۂ نظر کو اپنا رہے ہیں جو میرا اس مشہور حدیث کے بارہ میں ہے۔"

راقم السطور علامہ مرحوم کے تفقہ کے سلسلہ میں ڈھیر مثالیں پیش کرنے کا خیال یہ تھا کہ ان کے تفردات و نوادرات کو زیادہ سے زیادہ جمع کیا جا سکے تاکہ عوام و خواص اس سے استفادہ کر سکیں لیکن نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو چھ سو سے زائد صفحات کا انبار سامنے ہے

حالانکہ ان کی "امالی فیض الباری" سے نوادرات کے انتخاب کے لئے تنہا ہی صفحات کی الٹ پھیر میں یہ علمی ذخیرہ جمع ہوگیا اور یہ واقعہ ہے کہ کوئی ایسا مسئلہ اختلافی نہیں جس میں مرحوم اپنی ذاتی رائے اور خصوصی حل نہ رکھتے ہوں۔ اب اگر ان نوادرات و تفردات کو اخذ والتقاط کیا جائے تو بلاشبہ اس کتاب کی ضخامت و حجم کہیں سے کہیں پہونچ جائے گا۔ خود اس بے بضاعت کے لئے یہ نہایت ہی صبر آزما مرحلہ تھا کہ ان کی قیمتی و گراں قدر تحقیقات سے عام امت کو محروم رکھا جائے لیکن سر دست کوئی ایسی صورت بھی ممکن نہیں جو اپنی دلی خواہش کی تکمیل اور قارئین کے عام فائدے کی راہ ہموار کرتی ہو خدا تعالیٰ اپنے بے کراں فضل و رحمت سے اگر کبھی توفیق عطا فرمائے گا تو لآلی و جواہر کے انبار میں کچھ دلآویز موتیوں کا اور اضافہ ہوگا۔

کل امر مرھون باوقات

لیکن کم از کم وہ تقریر جو علامہ نے صاحب "المنار" رشید رضا کی دیوبند میں تشریف آوری کے موقعہ پر فرمائی اسے بعینہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اول تو یہ علمی تبرک کی حفاظت کی ایک صورت ہوگی۔ نیز حدیث و فقہ میں مطابقت، ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے اسالیبِ فکر، باقی فقہاء کے مقابلہ میں ان کا امتیاز و تفوق، دیوبند کا ایک عمومی ذوق جس کے نتیجہ میں وہ افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر اعتدال پر آگیا پھر تحقیقِ مناط، تخریجِ مناط، تنقیحِ مناط کی تفصیلات ایسی نایاب معلومات ان ارشاداتِ عالیہ میں موجود ہیں جو انشاء اللہ قارئین کے لئے خاص طور پر مفید ہوں گی۔

وھو ھذا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آج کی اس تقریب کا پسِ منظر و پیش منظر حاضرین کے علم میں ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ ہمارے مہمان مکرم "علامہ رشید رضا" خوش قسمتی سے ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں آپ "قاہرہ" کی ممتاز شخصیت، عالمِ اسلام کی نمایاں ہستی ہیں اور آپ کی ذاتِ گرامی سے جدید و قدیم تصورات کی تاریخ وابستہ ہے۔ آپ کی گوناگوں شخصیت اور مرقع علم و دانش

کسی طویل تعارف کا محتاج نہیں اور وقت بھی مختصر ہے۔ اسلئے میں کسی طویل تمہید کے بغیر اس وقت کے مناسب کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں دار العلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس وسیع اور پُر تپاک تقریب میں کچھ عرض کرنے کا حکم دیا جس کی تعمیل میں اپنے لئے سعادت باور کرتا ہوں۔

مہمانِ مکرم کی نجی گفتگو سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ دار العلوم کے مسلک، علوم وفنون میں اسکے امتیاز، اسکے خصوصی ذوق ومشرب سے چنداں واقف نہیں ہیں جسکی بنا پر انکے لئے یہ حقیقت تقریباً مشتبہ ہے کہ فقہ حنفی کی حدیث سے مطابقت اور حدیث وقرآن کے سرچشموں سے اس فقہ کا استنباط واستخراج کس حد تک صحیح ہے۔ اسلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسی موضوع کو اپنی گذارشات کا عنوان بنا کر کچھ عرض کروں۔

مولانائے محترم! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا یہ ملک اور سرزمین وطن یعنی ہندوستان ممالکِ اسلامیہ سے بہت دور واقع ہوا ہے۔ خصوصاً اسلام کے وطنِ اوّل (مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً) اور وطن ثانی (مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً) سے بُعد مسافت کی بنا پر اسلام کے شعائر اس ملک میں دھندلے اور دینی علوم کی شمع فروزاں ہونے کے بجائے یہاں دھیمی رفتار سے نور افگن تھی الا ماشاء اللہ۔

اسلئے ہماری موجودہ اس جماعت نے جسے "علمائے دیوبند" کے نام سے شہرت حاصل ہے ہندوستان میں اسلام اور امتِ مرحومہ کے لئے جو طریق کار ومنہاج متعین کیا اسمیں یہ خصوصی حکمت ومصلحت پیشِ نظر رہی کہ یہاں صحیح ومخلصانہ خدمت کے لئے اسلام کے قدیم ہی زوایا ودوائر میں رہ کر کوئی مؤثر ومفید خدمت انجام دی جاسکتی ہے چنانچہ اکابر نے پُرعزم انداز میں اپنا موقف متعین کیا اور اُسی موقف پر گامزن ورواں دواں ہیں اسلئے سب سے پہلے دیوبند اور اکابرِ دیوبند کے باب میں اس نقطۂ نظر کو بقوۃ اپنانے کی ضرورت ہے کہ وہ کوئی تجدد پسند ادارہ نہیں اور نہ قدیم روایات کو شکست وریخت کرنا اسکے منصوبہ کا جزء ہے بلکہ وہ اسلام کو اسکی صحیح شکل وصورت اور حقیقی خدوخال میں نمایاں کرنیکی مبارک ومسعود خدمت کو اپنا دینی فریضہ یقین کرتے ہیں بایں ہمہ اسلام جس حد تک لچک رکھتا ہے اور جس انداز پر مسائل وحوادث میں اسکی قیادت پیش کی جاسکتی ہے علمائے دیوبند اس توسع

سے بھی گریز نہیں کرتے گویا کہ قدامت کے ساتھ وسیع المشربی، دینی اقدار پر تصلب کیساتھ توسع ہمارا خصوصی ذوق و ممتاز رجحان ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ہم دینی مسائل و اسلامی نقطۂ نظر میں ہندوستان میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی رحمہم اللہ سے ذہنی و عملی روابط استوار کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے امام حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف عالمِ اسلام کے ہر گوشہ میں پہونچ چکیں اور ان کی مجتہدانہ بصیرت کے مرغزار سب کے لئے دعوتِ نظارہ ہیں لیکن پھر بھی امام ہمام کے بعض احوال و سوانح ایسے ہیں جو ہم نے اپنے ثقہ اکابر سے سنے اور جو شاہ صاحبؒ کی عام سوانح میں موجود نہیں۔ ان سوانحی نشیب و فراز پر اطلاع کے بغیر شاہ صاحبؒ کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کے گوشے واضح نہیں ہوتے اسلئے مقصد کو قریب تر کرنے کے لئے میں مجبور ہوں کہ شاہ صاحبؒ کی ابتدا و انتہا پر کچھ عرض کروں۔

سوانحی خدوخال:۔ سوانحی خدوخال سے میری مراد یہ نہیں کہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے سن پیدائش، یومِ ولادت و جائے پیدائش کی غیر ضروری تفصیلات میں آپ کا وقت عزیز و قیمتی لمحات صرف کروں بلکہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی حیاتِ طیبہ کے اس موڑ سے گفتگو کا آغاز کرتا ہوں جہاں سے قدرت کے فیاض ہاتھوں نے انھیں امامت کے جلیل منصب کیلئے تراشش و خراشش کیا، وہ دور شاہ صاحبؒ کے حصولِ علم اور علمی مراحل میں تحقیق و ژرف نگاہی کا میمون عہد ہے۔ انھوں نے ابتدائی علوم اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے حاصل کئے اور پھر جذبۂ زیارت و شوق تحصیل علوم کے حسین امتزاج میں حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ سرزمینِ حرم پر شیخ ابو طاہر کردی علیہ الرحمہ سے باقاعدہ حدیث کا درس لیا اور استفادہ کی جدوجہد میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن اس استفادہ میں بھی ان کی جلیل شخصیت و تابناک مستقبل کے آثار اس طرح ہُویدا تھے کہ شیخ ابو طاہر فرماتے کہ

> "شاہ ولی اللہ مجھ سے حدیث کے الفاظ لیتے ہیں جبکہ مطالب و معارف حدیث میں میں خود ان کا تلمیذ ہوں۔"

باکمال استاذ کے اس تاریخی مقولہ کا اسکے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ فیاضِ حقیقی نے جو ذکاوت و ذہانت کی وافر دولت فقاہت اور دقیقہ سنجی کی متاعِ بے بہا حضرت شاہ

ولی اللہؒ کو عنایت فرمائی تھی اسکے نتیجہ میں وہ حدیث کی ایسی دل نشین توجیہ وتشریح پر کامیاب رسائی رکھتے تھے جو شارعؑ علیہ السلام کا حقیقی مقصد ہوتا۔ ڈھائی سال کے قیام کے بعد شاہ صاحبؒ اپنے وطن ہندوستان لوٹ آئے۔

ہندوستان کی زبوں حالی، اور نکبت وذلت کے تہ بہ تہ بادل: یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان ان وجوہ کی بنا پر جن کی جانب میں نے آغاز ہی میں متوجہ کیا تھا یعنی اسلام کے حقیقی سرچشموں سے بُعد و دوری اس سرزمین پر اسلام کو عموماً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر پائمال کئے ہوئے تھی۔ برائے نام مسلمان سلطنت کا ڈھانچہ بھی ٹوٹ رہا تھا اور ایک نئی تہذیب وتمدن ہندوستان کی جانب مسلسل بڑھ رہا اس آنے والی تہذیب سے اسلام کو جو متوقع خطرہ تھا شاہ صاحبؒ کی دوررس نظر سکے معلوم کرنے سے عاجز نہیں تھی۔ بدعات ومحدثات کے خول میں مسلمان پھنسکر رہ گئے تھے اور روایات وخرافات کے گھروندے میں الجھے ہوئے تھے شاہ صاحبؒ نے اپنی بصیرت ودانش وبینش کے نتیجہ میں یہی فیصلہ کیا کہ اس سرزمین پر اسکے سوا اور کوئی طریق کار سودمند وبارآور نہ ہوگا کہ سنّتِ نبوی علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو قائم کرتے ہوئے اسلام کی حقیقی شکل اور اس کے پائدار نفوذ کے لئے راہیں ہموار کی جائیں چنانچہ موصوف نے اصلاحی اقدام شروع کیا اور بگڑے ہوئے معاشرہ کو رُو باصلاح لانے کیلئے اس جدوجہد میں مصروف ہوگئے جو خاصانِ خدا کا خصوصی حصّہ ہے۔ اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کے سینے کی وسعتوں میں ایسی روحانی روشنی موجود تھی جسکے اجالے میں وہ مستقبل کو پڑھ لیتے اور جدوجہد کے آغاز سے اسکے انجام تک پہونچنا ان کے لئے آسان تھا۔ ان کی فراستِ ایمانی نے کھُل کر بتا دیا تھا کہ اب ہندوستان کی زمین پر حق وباطل کا ایک معرکہ شروع ہوا چاہتا ہے جسمیں حق کی حمایت ونصرت کے لئے محدود نہیں بلکہ وسیع اور جہد مسلسل کی ضرورت ہوگی چنانچہ امام دہلویؒ نے جن خطوط پر کام کیا اسکی ایک مختصر تفصیل یہ ہے۔

تجدیدی کوششوں کا آغاز اور اس کے دوائر:۔ حضرت شاہ صاحبؒ قرآنی ہدایات کو عام کرنے وعوام تک پہونچانے کے لئے منصوبہ بند پروگرام کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ جانتے تھے کہ اسلام کے اوّلیں وحقیقی ماخذ یعنی قرآن کی تعلیمات ومعارف سے براہِ راست واقفیت کے بغیر ہندوستانی مسلمان جس تہ بہ تہ گمراہی میں الجھا ہوا ہے

اس سے باہر نہیں آسکتا۔ اسلئے سب سے پہلے آپ نے اس وقت کی رائج زبان فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے اس ترجمہ کو اسرائیلیات وخرافات سے پاک وصاف رکھا اور اسطرح توحید کے مسئلہ کے لئے آپؒ نے تخم کاری کی۔ اسکے ساتھ ہی اسلام کے دوسرے سرچشمہ حدیثی مضامین سے بلا واسطہ شناسائی کے لئے حدیث کی مشہور کتاب "مؤطا امام مالک" کی شرح فارسی زبان میں "المسوّی" کے نام سے تحریر فرمائی۔ اس شرح میں فقہاء حدیث کے طریقہ پر حدیث وآثار کی شرح بہترین انداز میں آگئی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ تحقیق مناط اور تخریج مناط اور تنقیح مناط کی جانب شاہ صاحبؒ متوجہ رہے۔

مہمانِ مُکرّم! ابھی میں نے آپ کے سامنے تینؔ اصطلاحی الفاظ استعمال کئے جنکی معرفت آپ کو بخوبی حاصل ہے لیکن عام افادہ کے لئے ان اصطلاحات پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ

تحقیقِ مناط:۔ کا مطلب یہ ہے کہ شارع علیہ السّلام سے کسی جزئی صورت میں کوئی حکم صادر ہوا۔ پھر یہی حکم اس نوع کی ساری جزئیات میں ثابت کر دیا جائے مثلاً: شریعت نے حالتِ احرام اور حدود حرم میں شکار کی ممانعت کی ہے اور پھر بطور سزا و جزا حالت احرام میں شکار کرنے والے کیلئے قیمت شکار کردہ جانور کی ادا کرنا ضروری ہے اس قیمت کی تشخیص ہی تحقیق مناط ہے۔ اور چونکہ اس کا تعلق فقہ کی اہم بنیاد قیاس سے نہیں ہے اسلئے اس میں کسی اجتہاد کی بھی ضرورت نہیں اور یہ کام ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ تجربہ وشعور رکھتا ہو۔

تخریجِ مناط:۔ یہ ہے کہ شارع نے کسی سلسلہ میں کوئی حکم دیا اور اس حکم کی علت بیان نہیں کی بلکہ نص میں بھی اسکی علت موجود نہیں۔ مزید برآں وہاں چند ایسے اوصاف بھی موجود ہیں جن میں سے ہر ایک علت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں مجتہد کو اپنا سرمایۂ فکر ونظر صرف کر کے کسی ایک وصف کو بطورِ علت مشخص کرنا ہوگا۔ یہ بڑے غور وفکر اور محتاط تحقیق وتدبر کا کام ہے اسلئے عوام اسمیں قطعاً شریک نہیں کئے جا سکتے۔ اسے اسطرح سمجھئے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربوا" سے منع فرمایا لیکن اس حرمت کی کوئی علت نہیں بیان فرمائی البتہ چند اوصاف علت بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ گوناگوں اوصاف یہ ہیں:۔ "قدر، وزن، کیل، جنس، چیز کا قیمتی ہونا، شئے کا از قبیل غذا

ہونا اور قابلِ ذخیرہ ہونا۔" ظاہر ہے کہ جب یہ چند در چند اوصاف یکجا جمع ہو گئے تو علماء کے لئے راہ کھلی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ذوق ورجحان کے مطابق کسی ایک وصف کو حرمت کی علت قرار دیں۔ چنانچہ سود ہی کے مسئلہ میں امام اعظم رہ کے خیال میں حرمت کی علت قدر و جنس میں اتحاد ہے۔ اور حضرت امام مالکؒ کی رائے میں ربوا کی حرمت کی علت اشیاء کا از قبیل غذا اور قابلِ ذخیرہ ہونا ہے جبکہ امام شافعی علیہ الرحمہ نے چیز کے قیمتی ہونے کو علت بتایا ہے مکرر عرض ہے کہ تخریج مناط/مناط کی تین قسموں میں سب سے اہم اور بیحد دشوار ہے اس میں ضروری غور و فکر اور جچے تلے تدبر و تحقیق کی قدم قدم پر ضرورت ہے اور یہ کام کوئی ماہر فن ہی انجام دے سکتا ہے۔

تنقیح مناط:۔ مناط کی تیسری قسم تنقیح مناط کے نام سے موسوم ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے کسی خاص واقعہ کے تحت کوئی حکم دیا اور اس سے مقصود کسی قاعدہ کلیہ کی تشکیل نہیں بلکہ کسی واقعہ کے تحت ہی وہ حکم جاری ہوا۔ اور یہ اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے پھر بھی حکم کی علت معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہاں چند در چند چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جنہیں سے بعض علت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور بعض نہیں۔ حالانکہ یہ بھی بادی النظر میں علل معلوم ہوتی ہیں۔ اس مرحلہ میں علت کی تعین و تشخیص فقہاء کا کام ہے اور ایسی تنقیح کو "تنقیح مناط" کہا جاتا ہے اسکی مثال حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ ایک صاحب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں تباہ و برباد ہو گیا آپؐ نے دریافت فرمایا کیوں؟ کیا بات پیش آئی؟ بولا کہ رمضان کے مہینہ اور روزہ کی حالت میں میں نے اپنی بیوی سے ہمبستری کر لی۔ آپؐ نے فرمایا کہ غلام آزاد کر سکتے ہو؟ جواب تھا "نہیں"۔ تو کیا پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ جی یہ بھی نہیں۔ تو پھر اچھا متواتر دو مہینہ کے روزے رکھ سکو گے؟ حضورؐ یہ تو بہت مشکل ہے۔

اس صورت میں امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے خیال میں کفارہ واجب ہے اور اسکے وجوب کا مناط و علت رمضان اور روزے کی حالت میں عمداً روزہ افطار کرنا ہے خواہ وہ روزہ کا منافی فعل ہمبستری ہو جیسا کہ اس واقعہ میں یہی پیش آیا یا کھانا پینا ہو۔ یہ دونوں حضرات منافی صوم کے اقدام کے لئے عمداً کی قید کا اضافہ کرتے ہیں اور ماہِ رمضان کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمبستری اتفاقاً اس واقعہ میں پیش آگئی ورنہ تو منافی صوم فعل کا

ارتکاب وجوب کفارہ کا اصل سبب ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے خیال میں کفارہ کا موجب ومناط صرف جماع ہی ہے۔ پس اگر جماع کے نتیجہ میں افطار ہوا تو کفارہ واجب ہوگا۔ اکل وشرب کی صورت میں وجوب کفارہ نہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس ایک اور حدیث ابوہریرہؓ ہی کی اپنے نقطۂ نظر کی مؤید ہے وہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رمضان میں کسی شرعی رخصت کے بغیر روزہ توڑ دے تو وہ بعد میں اگرچہ عمر بھر روزہ رکھتا ہو پھر بھی اس کوتاہی کی تلافی ہرگز نہ ہوگی۔ اور یہ دونوں حضرات اس حدیث میں لفظ "افطار" سے عمداً کھانا پینا اور ان کے ذریعہ سے روزہ توڑنا مراد لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قصداً خرونوش کے نتیجہ میں روزہ کا توڑنا اور پھر عمر بھر روزہ رکھنا مفید نہیں اس لئے اسکا کوئی کفارہ بھی نہیں ہوگا۔

غرضیکہ تنقیح مناط اور تخریج مناط یہی دونوں مجتہدین ائمہ کی اصل جولانگاہ ہے اور اسی میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو علت بتاتا ہے اور دوسرا کسی دوسری چیز کو۔ اسکی ایک مثال وہ حدیث بھی ہے جسمیں آپؐ نے ارشاد فرمایا مفتاح الصلوۃ الطہور وتحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم۔ اس کے پیش نظر اکثر ائمہ نے صیغۂ تکبیر "اللہ اکبر" اور صیغۂ تسلیم "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کو رکنِ نماز قرار دیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مناطِ حکم یہ ہے کہ تکبیر سے مخصوص اللہ اکبر کا صیغہ مراد نہیں بلکہ وہ ہر ذکر اللہ ہے جسمیں تعظیم اور خدا کی کبریائی کا مفہوم موجود ہو اور تسلیم سے مراد یہ ہے کہ مصلی اپنے ارادے واختیار سے نماز کو ختم کرے گویا کہ وہ تسلیم کو خروج عن الصلاۃ کے ہم معنی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ نے ان دونوں چیزوں یعنی الفاظِ حاملِ تعظیم اور ارادے کے ساتھ نماز کو ختم کر دینے کو فرض اور رکن صلاۃ ٹھہرایا ہے لیکن چونکہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً تکبیر بشکل اللہ اکبر اور تسلیم بصورت السلام علیکم ورحمۃ اللہ، ہمیشہ ثابت ہے اسلئے امام ابوحنیفہؒ ان دونوں کو واجبِ صلاۃ کہتے ہیں۔ حافظ ابن ہمامؒ مصنف "الفتح القدیر" نے اللہ اکبر کو واجب بتایا ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ ان دونوں میں ذکر مشعر تعظیم اور خروج بصنع المصلی اسطرح موجود ہے جسطرح کوئی کلی کسی جزئی کے تحت میں موجود ہو۔ پس یہ دونوں فرض ہوں گے۔

مہمانِ مکرم!

میں تفصیل سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے مقصد کی وضاحت اختصار سے کر رہا ہوں ورنہ تو ایسی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی تھیں اب میں پھر اسی تذکرہ کی جانب رجوع کرتا ہوں یعنی حضرت شاہ ولی اللہ الدھلویؒ کے مجددانہ کارناموں کی تفصیل!

میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ صاحبؒ نے موطا کی شرح "المسوی" میں ان تنقیحات کے تینوں شعبوں کی رعایت کی ہے اور وہ ایسے فقہ کو مختار قرار دے رہے ہیں جسمیں جامعیت موجود ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی دو معرکۃ الآراء تصانیف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور "عقد الجید فی مسائل الاجتہاد والتقلید" میں یہ بات محققانہ انداز میں تحریر فرمائی ہے کہ مجتہد فیہ مسائل میں حق کسی ایک امام کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ متعدد ہو کر ہر امام کے لئے ممکن ہے وہ لکھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا وہ خود کو حق کا اجارہ دار قرار دے کر دوسرے مجتہد کو باطل پر قائم نہیں سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ

> "میں خود بھی اسی نقطۂ نظر کا حامل ہوں"۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ مجتہد فیہ مسائل سے میری کیا مراد ہے؟ تو یاد رکھیئے اجتہادی مسائل وہ ہوتے ہیں جن میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ متواترہ سے کوئی حتمی بات ثابت نہ ہو، ایسے ہی مسائل میں حق کا تعدد کیا جا سکتا ہے اور اگر کسی معاملہ میں کوئی قطعی دلیل موجود ہے تو نہ وہاں کوئی مجتہد اجتہاد کریگا اور نہ اسے اجتہادی مسئلہ کہا جا سکتا ہے وہاں حق صرف ایک ہی ہوگا اور حق وہی ہوگا جو اس دلیل قطعی کے مطابق ہو۔ پس اسے خوب ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جو اس حق کی موافقت و تائید کرے وہی حق گو و حق پسند ہے اور جو اس سے مخالفت رکھتا ہو اسے یقیناً حق کا مخالف کہا جائے گا۔

شاہ صاحبؒ نے اسکے ساتھ تشریح و عقائد اسلام کے حکم و مصالح کے بارے میں بھی ایسی تصانیف فرمائیں جو راہوں کی شمع اور دھندلکوں میں فانوس ہیں۔ ان عنوانات پر ان کی شہرۂ آفاق تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور "تفہیمات الٰہیہ" نیز "خیر کثیر" مشہور ہیں۔

اولاد و احفاد اور ولی اللٰہی شاہکار کی حفاظت و صیانت:۔ خدا کا شکر ہے کہ الامام الدھلوی کے یہ مخصوص افکار و نظریات اور انکی مجددانہ کاوشیں ان ہی پر ختم نہ ہونے

پائیں بلکہ ان کی اولاد و احفاد میں اس طریق کار پر مسلسل پیش رفت ہوتی رہی. چنانچہ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ دوسرے صاحبزادے حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ رفیع الدین مرحوم نے قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر ملک میں عام کیں اور حضرت شاہ محمد اسحاق، شاہ عبد الغنی، شاہ محمد اسماعیل علیہم الرحمہ نے نہ صرف حدیث وعقائد کی درستگی کا اہتمام کیا بلکہ یہ حضرات استخلاص وطن اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جلی وخفی کوششیں بھی کرتے رہے بلکہ حضرت شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ نے تو بدعات و محدثات کے خلاف زبردست جدوجہد کی اور بعض معرکۃ الآراء تصانیف ان کے علم ریز قلم سے تیار ہو کر ایمانیات کے سلسلہ میں مفید تر ثابت ہوئیں اور موصوف نے بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا. شاہ محمد اسحاق رح درس حدیث میں ایسے یگانۂ روزگار عالم تھے کہ اطراف ملک سے طلباء کا ان کی جانب ہجوم رہتا. غرضیکہ یہ خانوادہ علم و عمل کا مرقع، دین و دانش کا روشن مینار. بدعات کے لئے شمشیر بے نیام اور سنتِ مصطفویؐ کے احیاء کے لئے کشادہ محراب تھا.

دیوبند کا مکتبۂ فکر:- یوں تو یہی خاندان ولی اللٰہی دیوبندی مکتب فکر کا امام و سربراہ ہے پھر بھی شاہ محمد اسحاق رح کے خصوصی شاگرد حضرت شاہ عبد الغنی صاحبؒ مجددی مہاجر مدنی اپنے استاذ کے بعد مسند آرار درس حدیث ہوئے، طلباء حدیث نے ان سے ایسا استفادہ کیا جسکے آثار قیامت تک باقی رہیں گے. حضرت شاہ عبد الغنیؒ آخر میں مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کر گئے اور وہاں بھی بلاد عرب کے طلباء ان سے حدیث کی سند لیتے رہے. ان ہی حضرت شاہ عبد الغنی رح کے خصوصی تلامذہ میں ہمارے دار العلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ ہیں. بانی دار العلوم نے بخاری شریف کا حاشیہ جو ان کے استاذ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کا شروع کیا ہوا تھا مکمل فرمایا. اور دینی علوم و معارف پر اہم کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ مادہ پرست دھریہ اور اسلام خلاف فرقوں کی تردید میں مسلسل تصانیف کے ساتھ جا بجا مناظرے بھی کئے اور اس دار العلوم کو ایک ایسے تخیل کے تحت قائم فرمایا جس سے ان کے دبیز فکر اور اعلاء کلمۃ الحق و اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا مخلصانہ جذبہ ظاہر ہے ہیں نے موصوف کے مناقب و فضائل میں کچھ

قصائد کہے ہیں جس میں سے ایک قصیدہ پیشِ خدمت کرنا مناسب ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

قِفا یا صاحبیّ علی الدیار　　　فمن داب التّیجی ھوی ان دیار

یہ دونوں حضرات یعنی حضرت نانوتویؒ و حضرت گنگوہیؒ رفیق درس اور فکر و نظر میں ایک دوسرے کے معاون تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو خدائے تعالےٰ نے منفرد تفقہ عنایت فرمایا تھا جسکی بنا پر انھیں بلاتکلف "فقیہ مجتہد" کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ بدعات و محدثات کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ مسائل و حوادث میں ان کے فتاویٰ ملک میں قبول عام رکھتے جنمیں انکے تفقہ اور بصیرت کے جوہر نمایاں ہیں۔ پس کہا جا سکتا ہے اور اسمیں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ حضرت گنگوہیؒ فروع و جزئیات فقہیہ میں ہمارے امام اور حضرت نانوتویؒ اصول و عقائد میں جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان دونوں نے دیوبندی علوم کو ایسا منقح و روشن کیا کہ اب کوئی گوشہ مخفی نہیں رہا۔

علامۂ جلیل!

آپ کو معلوم ہے کہ فرنگی شاطر نے اپنی مخصوص و روایتی دسیسہ کاریوں سے کام لے کر جب ہندوستان میں اپنی حکومت کے دائرے وسیع تر کر دئے اور مسلمانوں کی بادشاہت ختم ہوگئی تو عیسائی مشنری نے ہندوستان میں عیسائیت و تثلیث کی تبلیغ کے لئے منصوبہ بند کام شروع کیا دوسری جانب مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کرتے ہوئے بعض مذموم و اسلام خلاف نظریات کو نام نہاد مسلمانوں ہی کے ذریعہ بروئے کار لانے کی بدترین کوشش کی، یہی وقت تھا کہ ان دونوں حضرات نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ اور اسلامی تعلیمات کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند کو قائم کیا۔ اس دارالعلوم نے نہ صرف اسلامی تعلیمات کو عام کیا بلکہ یہ انگریز کی دسیسہ کاریوں کے خلاف ایسا معسکر تھا جو جاں سپار و فداکار مجاہدین اسلام کو برآمد کر کے خدمت کے ہر محاذ پر روانہ کر رہا تھا۔ آج ہندوستان میں جہاں کہیں آپ کو تعلیماتِ اسلام کے چراغ روشن نظر آتے ہیں وہ اسی مدرسہ کا فیض اور یہیں سے روشن کئے ہوئے چراغ ہیں۔ دارالعلوم کی خدمات اور اس کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کہ اس مختصر وقت میں میں تفصیلات بیان کرنے سے عاجز ہوں۔

طریق تعلیم اور اغراض و مقاصد: تاہم ضروری ہے کہ میں اس عظیم درسگاہ کے کچھ بنیادی مقاصد آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ مدرسہ کے حدود و مقاصد

آپ کے لئے واضح ہوں تو لیجئے! ہمارا اصل مقصد حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس ہے اس مقصد کے حصول کے لئے کچھ دوسرے علوم بھی مبادیات کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعلیم باندازۂ ضرورت ہی ہے تاآنکہ ہماری جماعت کے دوسرے امام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے تو اپنی سربراہی وسیادت کے دور میں کچھ سال ایسے بھی گزارے جنمیں فلسفہ و منطق کی تعلیم اور اس کی انتہائی کتابوں کی تدریس متروک قرار دی تھی اور پھر یہ سلسلہ ایک عرصہ تک رکا رہا۔ گویا وہ علوم آلیہ میں بھی الجھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی منزل علوم عالیہ تھے۔ یعنی وہی حدیث و فقہ الحدیث۔ حدیث و فقہ الحدیث کی تعلیم میں ہمارا طریق کار متوازن، جچا تلا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ مسائل فقہیہ کے استخراج و استنباط کے بارے میں ائمہ اربعہ کے چار مشہور اصول ہیں۔

۱- إِمَامُ مَالِكٌ عَلَيْهِ الرَّحْمَة۔ اہل مدینہ کی اقتدار اور اتباع کو بنیاد بناتے ہیں تاآنکہ مدنی تعامل ان کے یہاں حدیث مرفوع پر بھی ترجیح رکھتا ہے۔

۲- إِمَامُ شَافِعِي عَلَيْهِ الرَّحْمَة۔ کسی باب میں صحیح ترین حدیث (اصح ما فی الباب) کو لیکر اسی مسئلہ سے متعلق باقی روایات کو تاویلاً اپنی منتخب حدیث کے موافق کرتے ہیں یا ان احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔

۳- إِمَامُ أَحْمَد بن حَنْبَل عَلَيْهِ الرَّحْمَة۔ اصح، صحیح، حسن بلکہ ضعیف (جبکہ اس کا ضعف معمولی ہو) سب کو معمول بہا بنانے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر حدیث کا مدلول و مضمون قابلِ عمل ہے اسی بنیاد پر انھوں نے اپنا مشہور مسند مرتب کیا ہے۔

۴- إِمَامُ ابُو حَنِيفَة عَلَيْهِ الرَّحْمَة۔ تمام اقسامِ حدیث کو جمع کرتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے مضمون کو قانون کلی ہونے کی بنا پر شرعی قانون کی حیثیت دیتے ہوئے دوسری روایات کی مناسب توجیہ کرتے ہیں اور ہر حدیث کے لئے کوئی برجستہ محل تلاش کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں تاویلاتِ احادیث زیادہ ہیں جبکہ شوافع کے یہاں رُواۃ پر جرح و تنقید کی کثرت ہے۔

امام شافعیؒ پہلے وہ امام ہیں جنھوں نے مرسل حدیث کو حجت تسلیم نہیں کیا البتہ اگر مرسل حدیث کے مضمون کی تائید دوسری احادیث سے ہو تو پھر وہ مرسل کو تسلیم کرتے ہیں۔

ائمۂ حدیث اور ان کے نقاط نظر:۔ الضیف الجلیل! آپ جانتے ہیں کہ ائمۂ حدیث نے بھی فقہاء کے اسی اصول وضابطہ کے تحت رہ کر اپنے مجموعے تیار کئے ہیں. چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے امام مالکؒ وشافعیؒ کے طرز کو ترجیح دے کر ان دونوں کے اصول کو مرکب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جامع میں اصح مافی الباب حدیث کا ذکر کرتے ہوئے اسکو بھی ملحوظ رکھتے ہیں کہ اس حدیث کو سلف کے تعامل کی تائید حاصل ہو۔ امام ہمامؒ نے اسکی رعایت کی ہے کہ کوئی ایسی حدیث بخاری میں نہ آنے پائے جو کسی دوسری حدیث کے معارض ہو۔ بلکہ انھیں اپنے پسندیدہ اصول کی رعایت اس حد تک ملحوظ رہی کہ صلاۃ کسوف کے بارے میں صرف اسی روایت کو انھوں نے ذکر کیا جسمیں ہر رکعت میں دو رکوع کا تذکرہ ہے۔ حدیث کے دوسرے مشہور امام یعنی مسلم بن حجاج القشیری کا زیادہ زور رُواۃ کی ثقاہت پر ہے چنانچہ انھوں نے صلاۃ کسوف کے سلسلہ میں اس روایت کو لیا جسمیں ایک رکعت میں تین یا چار رکوع کا ذکر آرہا ہے اور تو اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر موقوف اس روایت کو بھی ذکر کرنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں جس میں ایک ہی رکعت میں پانچ رکوع کا تذکرہ آرہا ہے۔ غرضیکہ امام بخاریؒ صلاۃ کسوف کے بارے میں موجود جملہ روایتوں سے اصح حدیث کا انتخاب کر رہے ہیں اور امام مسلمؒ اپنے دائرۂ کار میں محدود رہتے ہوئے بہت سی روایات کی تخریج کر رہے ہیں۔

اکابر دار العلوم کی وسیع المشربی:۔ ہمارے مشائخ یعنی اکابر دار العلوم نے ہر گوشہ میں اعتدال کو اپنایا ہے وہ تشدد سے بھی محفوظ رہے اور سہولت پسندی بھی انکے یہاں نہیں۔ ان کا خاص ذوق وشوق متعارض احادیث میں یہ رہا کہ کسی حدیث کو ترک نہ کیا جائے اس مبارک ومسعود مقصد کے لئے خدا تعالٰے نے انھیں ایسے فہم اور توجیہی ذہن سے سرفراز فرمایا کہ وہ ہر حدیث کی قابل قبول اور دلنشیں توجیہ پر مضبوط قدرت کے مالک ہیں بلکہ میرا دعوٰی ہے کہ جو منصف ومعقولیت پسند فرد ان کی کی ہوئی توجیہات کو بنظر انصاف دیکھے گا تو اسکی گہرائی وگیرائی اور دلنشیں ہونیکی داد دئے بغیر نہیں رہے گا اپنے اس مقصد کو بعض مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ حدیث قلتین کا مسئلہ اختلافی مسائل میں ہے حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ اور ان کا مکتبۂ فکر قلتین کے مسئلہ میں منفرد رائے رکھتا ہے اس سے پہلے کہ میں

اکابر دار العلوم کی مقبول توجیہ کی طرف آپ کو متوجہ کروں پہلے اس باب کی متعارض روایات پر توجہ دلاتا ہوں معلوم ہے کہ یزید بن زریع، کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ھدبہ بن خالد، وکیع اور یحیٰ بن معین نے اس روایت کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

اذا بلغ الماء قلتین او ثلث لم یحمل الخبث۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ "القلتین" اور "ثلث" کے درمیان "او" تنویع کے لئے ہے اسلئے یہ ایک اندازہ ہوگا اسے شرعی حد بندی نہیں کہا جا سکتا اور مسئلہ کا فیصلہ اس پر ہوگا کہ ایک جانب کی نجاست دوسری جانب تک مؤثر ہے یا نہیں؟ بلاشبہ اگر روایت میں "او" نہ ہوتا تو مذکورہ بالا حدیث کو بے تکلف تحدید شرعی قرار دیا جا سکتا تھا اسی لئے ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبینؒ نے مسئلہ مذکورہ میں قول فیصل نجاست کی تاثیر و عدم تاثیر کو کہا ہے جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ کی وضاحت ہے۔ حنفیہ کے اس نقطۂ نظر کے نتیجہ میں وہ احادیث تعارض سے محفوظ ہوگئیں جو قلتین والی حدیث سے متصادم نظر آتی ہیں۔ یعنی حدیث "النہی عن البول فی الماء الراکد" اور حدیث "النہی عن ادخال الید فی الاناء"۔ اور حدیث "ولوغ الکلب فی الاناء"۔

صاف نظر آرہا ہے کہ احناف کی توجیہ نے ان مختلف روایات میں تعارض و تزاحم کو کس کامیابی سے ختم کر دیا۔

ایک دوسری مثال مزید وضاحت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ وہی اختلافی مسئلہ "قرأۃ خلف الامام" کا۔ معلوم ہے کہ حضرات احناف نے امام کی اقتدار میں سورۂ فاتحہ مقتدی کے لئے نہ پڑھنے کی دلیل اس آیت کو بنایا ہے "واذا قرئ القران فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون۔" نیز یہ حدیث "واذا قرئ فانصتوا" اور مزید یہ حدیث "من کان لہ امام فقراۃ الامام لہ قراۃ"۔ تو انھوں نے اس سے بظاہر متعارض روایات مثلاً حدیث "لا تفعلوا الا بام القران فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرابہا" کی تاویل و توجیہ کی۔ یہ عرض کرنا بھی مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا آیت کے شان نزول کے بارے میں جب کوئی صحیح روایت نہیں ہے تو لازماً اسکے الفاظ میں عموم کا اعتبار رہے گا۔

امام بیہقیؒ نے کتاب القرآۃ میں احمد بن حنبلؒ سے روایت کی ہے کہ معتمد علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت "قرأۃ فی الصلوۃ" کے بارے میں ہے یہی احمد بن حنبلؒ "اذا قرأ فانصتوا

وانی حدیث کو صحیح قرار دے رہے ہیں اور ابوبکر بن الاثرم نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ امام مسلم نے باب التشہد میں ابوموسیٰ اشعری کی روایت ذکر کی اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا حوالہ دیا بلکہ ابن خزیمہ رہ، ابن طبری رہ، حافظ ابن عبدالبر رہ، ابن حزم اندلسی رہ اس روایت کی تصحیح کر رہے ہیں۔ اور تو اور حافظ ذکی الدین عبدالعظیم المنذری رہ اور یادش بخیر۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رہ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے تو دیکھا آپ نے کہ سند کی حیثیت سے اس حدیث کی قوت اور ترجیح کا کیا پایہ ہے۔ دوسری طرف تعامل سلف کے لحاظ سے اگر اس حدیث پر نظر ڈالئے تو صحابہ کی ایک جماعت "مالک" "احمد" اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ اس حدیث پر عمل پیرا ہیں۔ اور جب کسی حدیث کے راوی ثقہ و معتمد ہوں اور سلف صالحین کا تعامل بھی اسکا مؤید ہو تو وہ حدیث صحیح ہوگی بلکہ کوئی ردّ و قدح یا جرح و تنقید اس حدیث کی صحت کو مجروح نہیں کرتی۔ اب دوسری حدیث "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ" کو بھی لیجئے۔ حافظ ابن ہمامؒ نے احمد بن منیع کے حوالہ سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اسکی سند شیخین کی شرائط کے مطابق ہے اور خود میں بھی آجتک کسی ایسی علت پر مطلع نہیں ہوا جو اس حدیث کے لئے قادح ہو۔ اسکی سند یہ ہے۔ "اخبرنا اسحاق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسی بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ" بلکہ ترمذی کے یہاں ایک موقوف روایت اور دوسرے محدثین کے یہاں ایک مرسل روایت اس روایت کی خوب مساعدت و تائید کرتی ہے اسلئے اس حدیث کو بھی صحیح ماننا ہوگا۔

جب یہ بحث مختصر آپ کے سامنے آگئی تو اب اکابر دارالعلوم کی توجیہ و معارض روایات میں انکی فرحت انگیز تاویل کو سنیئے۔

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے جنکے متعلق میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ وہ فقہی جزئیات میں ہمارے مسلم پیشوا ہیں حضرت عبادہ بن صامت رضؓ کی اس روایت میں جو محمد بن اسحاق سے مروی ہے اور جسکا سیاق یہ ہے کہ لعلکم تقرؤن خلف امامکم اور اسکے جواب میں صحابۂ کرام کا ارشاد "جی ہاں۔" اور پھر اس پر آپ کا یہ ارشاد کہ "فلا تفعلوا۔" حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ

یہ دلیل اباحت ہے نہ کہ دلیل وجوب۔ معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ رضؓ آنحضورؐ کی اجازت کے بغیر قرأت کرتے تھے اسی لئے تو آپ کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی اور جب انھوں نے "نعم" سے جواب دیا تو آپ نے "فلا تفعلوا الا بام القرآن" فرمایا۔

چونکہ یہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی ایک متعین اور خصوصی سورۃ ہے جبکہ دوسری سورتیں اسطرح متعین نہیں، اسلئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سورۂ فاتحہ کا تذکرہ فرمایا اس کا تمامتر تعلق صرف اس سورۃ کی خصوصیت کی بنا پر ہے اور معلوم ہے کہ یہی وہ سورۃ ہے جسکے نہ پڑھنے سے نہ تو امام کی نماز ہوگی جبکہ وہ امامت کر رہا ہو اور نہ منفرد کی جبکہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو۔ رہا مقتدی تو اسکے حق میں سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کا معاملہ بجز مباح ہونیکے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اباحت وکراہت کا مسئلہ خود احناف کے یہاں بھی اختلافی مسائل میں ہے اگرچہ اسپر تمام احناف متفق ہیں کہ قرأۃ سورۂ فاتحہ مقتدی پر واجب نہیں۔ تاہم بعض اسکی قرأت کو بحالتِ اقتدار مباح کہتے ہیں اور جبکہ بعض اذا قری القرآن والی آیت کے پیشِ نظر ممنوع۔

حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمہ کی اس توجیہ سے تمام معارض روایات ایک دوسرے کے موافق ہوگئیں اور ان میں کوئی مخالفت وتزاحم نہ رہا۔ اور اختلافی مسئلہ لیجئے یعنی رفع یدین اور آمین بالجہر۔ اس میں بھی علماء دیوبند کا ذوق یہ ہے کہ "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے اور ترکِ رفع اور اخفاء بالتامین بھی ثبوت کے درجہ میں ہے جیسا کہ امام ابو داؤد کے یہاں صحیح سند سے موجود حدیث میں ہے بلکہ یہی نہیں، ترکِ رفع حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضؓ کی روایات صحیحہ سے بھی محقق ہے اور ترک جہر آمین کو صحابہ کرام کے جم غفیر اور سلف صالحین کے تعامل سے ثابت ہی ماننا ہوگا۔ نتیجتہً رفع وترک، آمین بالجہر وآمین سراً ہر دو سنّت ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ گفتگو جو کچھ ہوگی وہ ترجیح ہی کے باب میں رہے گی تو احناف رفع یدین کے ترک اور آمین بالسر کے ترجیح کے قائل ہیں۔

علامۂ جلیل!

میری اس مختصر گذارش وتفصیل سے آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ علماء دیوبند کا طریق کار تشدد وافراط وتفریط سے کس درجہ محفوظ ہے۔ وہ دوسرے ائمہ کے مذاہب

کو کلیتہً باطل نہیں کہتے بلکہ حق وصواب ان کے لئے بھی محفوظ مانتے ہیں۔ یہی وہ اعتدال ہے جسکی وجہ سے دیو بندیت ایک محفوظ، معتدل مسلک بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں اسناد حدیث کا مدار حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ بانیٔ دار العلوم قدس سرہ کے فخر روزگار شاگرد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر ہے۔ یہ میرے شیخ اور میرے جملہ معاصرین کے امام ہیں اور اسی طریق کار پر گامزن ہیں جو ہمارے اکابر کا خصوصی مسلک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو معارض روایات میں تطبیق اور مشکلات الحدیث میں دلپذیر توجیہ کی ایک امتیازی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ بلا مبالغہ آپ کی نظیر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام خالی ہے۔

حضرتِ شیخ کا منصبِ جلیل اور امامت فی الحدیث کا جو میں دعویٰ کرتا ہوں اسکی صداقت آپ پر بھی اسطرح واضح ہو گی کہ انکی ایک دلپذیر توجیہ سنئیے۔

مجھ سے ہی حضرت الاستاذ نے ایک بار فرمایا کہ صلوٰۃ کسوف میں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعداد رکوع کے بارے میں متعدد روایات آرہی ہیں یہ آپ کی خصوصیت پر مبنی ہے چونکہ آپ نے صلوٰۃ کسوف پڑھنے کے بعد صحابہؓ سے خطاب فرمایا تھا صلوا احدث صلوۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (تم نے جو فرض نماز ابھی تازہ پڑھی ہے یعنی فجر کی نماز تو اسی کی طرح صلوٰۃ کسوف کو بھی پڑھو) جس سے واضح ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عام امت کیلئے صلوٰۃ کسوف اور عام نمازوں کے رکوع میں کوئی فرق نہیں فرما رہے ہیں۔ میں نے اسپر عرض کیا کہ حضرت! شوافع تو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو صرف تعداد رکعت کی تشبیہ پر محمول کرتے ہیں وہ اس کا تعلق وحدۃ رکوع سے نہیں کرتے۔ اسپر فرمایا کہ یہ تو حضرات شوافع کی کوشش ایک صاف واضح حقیقت کو نظری بنانے کی جد وجہد ہے۔ بھلا آپ سوچئے تو سہی کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کی نماز متعدد رکوع کے ساتھ مجمع عظیم کو پڑھائی تو اس ارشاد کی پھر کیا ضرورت تھی اور جبکہ ارشاد فعل کے مقابلہ میں اہمیت رکھتا ہے اور سب مانتے ہیں کہ فعل میں خصوصیت کا امکان ہے اور "قول" میں اس طرح کا کوئی احتمال نہیں تو پھر آپؐ کے قول کو فعل پر کیوں نہیں ترجیح ہو گی اور معارض روایات جب اس توجیہ سے ایک دوسرے کے موافق بنتی ہیں تو پھر یہ پسندیدہ روش کیوں ترک کی جائے۔

حضرت الاستاذ کی اس وضاحت پر نہ صرف میں محظوظ ہوا بلکہ آپ کی خداداد صلاحیت کا مزید قائل ہونا پڑا۔

دیکھا آپ نے کہ اکابرِ دار العلوم کس منفرد صلاحیت اور موہبت الٰہی کے جامع ہیں۔

استاذ الجلیل!

میں نے آپ کے قیمتی لمحات مصروف کئے جسکے لئے میں معذرت طلب ہوں۔ میں آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں خود اپنی جانب سے اور اپنی جماعت کی جانب سے۔

وَاللہ یحفظکم اینما کنتم وھُوحسبی وَنعمَ الوکیل نِعمَ المولیٰ وَ نِعمَ النَّصِیر۔

عالمِ برزخ و تشکّلِ اعمال

از علامۃ العصر فرید الدہر محدّث وقت شیخ الحدیث مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

در ہمہ سیر و غربتے کشف نہ شد حقیقتے
گرچہ شدم برنگ و بو خانہ بخانہ کو بکو

گر بودم فراغتے از پس مرگ ساعتے
شرح دہم چناں بتو قصہ بقصہ ہو بہو

رہگذرِ نگہ ندید دیدہ دریں رہِ گذر
در تہ خاک خفتہ جو دشت بدشت سو بسو

تا نہ شکست صورتے جلوہ نزد حقیقتے
قید و شکستنِ ہمو رنگ برنگ بو بو

دانہ خلاف تخم نے ہرچہ بود ز جبر و قدر
آنچہ کشتہ درو حنظہ بحنظہ جو بجو

ظاہر و باطن اندراں ہمچو نواۃ و نخل دان
نے بعد ادیک زد و جنب بجنب دو بدو

رشتۂ ایں جہاں بتن جامۂ آں جہاں بتن
رشتہ برشتہ نخ بنخ تار بتار پو بپو

ہست عمل جزا ہماں آنچہ کہ دادہ ستاں
یا ز رسد بطورِ نور و تو بکار و ہم درو

ہست جزا ہمو عمل سم کہ خورد شود مرض
بیخ و شجر ہموں ہموں تخم و ثمر چنو چنو

قبر کہ بودہ وا درے سوئے جہان دیگرے
غیب شود شہود از و دیدہ بدیدہ رو برو

منکشف آں جہاں شود گرچہ دریں جہاں بود
زندگی دگر چنو ذرہ بذرہ مو بمو

مردنِ ایں طرف بود زیستنِ دگر طرف
روزن باز دید تو طبقہ بطبقہ تو بتو

احقرا گر ز خود گذر کردہ بُدے دریں سفر
زیستن ابد بداد تازہ بتازہ نو بنو

(منقول از مہاجر ۱۹۲۸ء)